اللؤلؤ المکنون

جلد چہارم

سیرت انسائیکلوپیڈیا

- رسالت مآب ﷺ کے لیے اسراء ومعراج کا یگانہ اعزاز وامتیاز
- بیعات عقبہ
- ہجرت مدینہ اور مدینہ کے حالات
- مسجد نبوی کی تعمیر اور نماز کے لیے اذان کی ابتداء
- ایثار انصار اور مہاجرین کرام کے بے مثل استغنا کی سرگزشت

دارالسلام
ریسرچ سنٹر

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ

اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے

- رسالت مآب ﷺ کے لیے اسراء و معراج کا یگانہ اعزاز و امتیاز
- بیعات عقبہ
- ہجرت مدینہ اور مدینہ کے حالات
- مسجد نبوی کی تعمیر اور نماز کے لیے اذان کی ابتداء
- ایثار انصار اور مہاجرین کرام کے بے مثل استغنا کی سرگزشت

4

نگران اعلیٰ: عبدالمالک مجاہد

تصنیف و تالیف

حافظ محمد ابراہیم طاہر کیلانی — مولانا تنویر احمد

حافظ عبداللہ ناصر مدنی — حافظ اقبال صدیق

تصحیح و تنقیح و نظرثانی

مولانا ارشاد الحق اثری — جناب محسن فارانی — مولانا محمد خالد سیف

اسراء ومعراج کے رفیع الشان واقعات،
ہجرت مدینہ، مسجد نبوی کی تعمیر، اذان کا آغاز
اور مہاجرین وانصار کی مواخات کے
بے مثل مناظر

جلد 4

نگرانِ اعلیٰ: عبدالمالک مجاہد

تصنیف وتالیف

حافظ محمد ابراہیم طاہر کیلانی
(ایم اے اسلامیات، فاضل مدینہ یونیورسٹی)

مولانا تنویر احمد
(فاضل علوم اسلامیہ)

حافظ اقبال صدیق
(فاضل مدینہ یونیورسٹی)

حافظ عبداللہ ناصر مدنی
(فاضل علوم اسلامیہ)

تصحیح وتنقیح/نظر ثانی

مولانا ارشاد الحق اثری
(فاضل علوم اسلامیہ، معروف مؤلف ومحقق)

جناب محسن فارانی
(ایم اے اردو، ماہر تاریخ، جغرافیہ ولسانیات)

مولانا محمد خالد سیف
(ر) ریسرچ سکالر اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد

معاونت

جناب احمد کامران
(سینئر صحافی وماہر اردو زبان وادب)

ڈیزائننگ وکمپوزنگ

محمد صفت الٰہی
(آرٹ ڈائریکٹر)

ہارون الرشید
(گرافک ڈیزائنر)

زاہد محمود
(ڈیزائنر/السٹریٹر)

عبدالخالق
(کمپوزر)

دارُالسّلام

کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

پرنس عبدالعزیز بن جلاوی سٹریٹ پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب

فون: 4033962-4043432 1 00966 فیکس: 4021659 www.darussalamksa.com

Email: darussalam@awalnet.net.sa info@darussalamksa.com

الریاض • العلیا فون: 00966 1 4614483 فیکس: 4644945 • الملز فون: 00966 1 4735220 فیکس: 4735221
• سویدی فون: 00966 1 4286641 • سویلم فون/فیکس: 00966 1 2860422

جدہ فون: 00966 2 6879254 فیکس: 6336270 مدینہ منورہ فون: 00966 4 8234446,8230038 فیکس: 04 8151121

الخبر فون: 00966 3 8692900 فیکس: 00966 3 8691551 خمیس مشیط فون/فیکس: 00966 7 2207055

ینبع البحر فون: 0500887341 فیکس: 8691551 قصیم (بریدہ) فون: 0503417156 فیکس: 00966 6 3696124

امریکہ • نیویارک فون: 001 718 625 5925 • ہیوسٹن: 001 713 722 0419 کینیڈا • نصیر الدین الخطاب فون: 001 416 4186619

لندن • دارالسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز لمیٹڈ فون: 0044 20 77252246-0044 20 85394885 • دارالسلام انٹرنیشنل: 0044 0121 7739309

متحدہ عرب امارات • شارجہ فون: 00971 6 5632623 فیکس: 5632624 فرانس فون: 0033 01 480 52928 فیکس: 0033 01 480 52997

انڈیا • دارالسلام انڈیا فون: 0091 44 45566249 موبائل: 0091 98841 12041 • اسلامک بکس انٹرنیشنل فون: 0091 22 2373 4180
• نیو بک ڈسٹری بیوٹرز فون: 0091 40 2451 4892 موبائل: 0091 98493 30850 • فون: 0091 44 42157847

سری لنکا • دارالکتاب فون: 0094 115 358712 • دارالایمان ٹرسٹ فون: 0094 114 2669197

پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی شوروم

لاہور 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ لاہور فون: 00 4 32 372 24 400 372 34 240 373 42 0092 فیکس: 72 540 373 042
• غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 54 200 371 42 0092 فیکس: 03 207 373 042
• Y بلاک، گول کمرشل مارکیٹ، دکان 2 (گراؤنڈ فلور) ڈیفنس، لاہور فون: 10 926 356 42 0092

کراچی مین طارق روڈ، ڈاکٹر مال سے (بہادر آباد کی طرف) دوسری گلی کراچی فون: 36 939 343 21 0092 فیکس: 37 939 343 21 0092

اسلام آباد F-8 مرکز، اسلام آباد فون/فیکس: 13 815 22 51 0092

info@darussalampk.com | www.darussalapk.com

فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر

مكتبة دارالسلام

موسوعة السيرة النبوية الجزء ٤ / مكتبة دارالسلام - الرياض، ١٤٣٣ هـ

ص: ٥٠٨ مقاس: ٢١×١٤ سم

ردمك: ٣-٠٩٦-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨

(الكتاب باللغة الاردية)

١. السيرة النبوية أ. العنوان

ديوي ٢٣٩ ١٤٣٣/٢٩٠٩

رقم الإيداع: ١٤٣٣/٢٩٠٩

ردمك: ٣-٠٩٦-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے

اللهم صل على محمد
وعلى آل محمد كما صليت على إبراهيم
وعلى آل إبراهيم إنك حميد مجيد
اللهم بارك على محمد وعلى آل محمد
كما باركت على إبراهيم وعلى آل إبراهيم
إنك حميد مجيد
صحيح البخاري : 3370
صحيح مسلم : 405-407

مدحتِ النبی ﷺ

وَاَحسَنَ مِنکَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَیْنِیْ
وَاَجْمَلَ مِنکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ کُلِّ عَیْبٍ
کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

اور آپ کی ذاتِ اَقدس سے زیادہ حسین میری نگاہ نے کبھی کوئی دیکھا ہی نہیں
اور آپ سے زیادہ حسن و جمال والا کبھی کسی ماں نے جنا ہی نہیں
آپ ہر قسم کے عیب سے پاک صاف پیدا کیے گئے ہیں
گویا آپ کی ذاتِ اَقدس کو آپ کے منشا کے عین مطابق بنایا گیا ہے

فہرست

باب: 1

اسراء و معراج

باب: 7

اذان

باب: 8

مواخات مدینہ

"پاک ہے وہ (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ
تک لے گیا جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے، تا کہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔"

(بنیؔ اسرآءیل 17:1)

اس باب میں

طائف کے انتہائی کربناک سانحے کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسالت مآب ﷺ کی تالیف قلب فرمائی۔ آپ کو اسراء و معراج کا فقید المثال اعزاز اور امتیاز عطا کیا۔ یہ واقعہ انسانی محسوسات و مفہومات کے دائرے سے ماورا ہے۔ قرآن کریم اور احادیث سے اس واقعے کی جو تفصیلات عیاں ہوتی ہیں، وہ اس باب میں پوری صراحت سے پیش کر دی گئی ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام براق کی سواری لے کر بیت اللہ میں حاضر ہوئے۔ یہاں سے آپ کو بیت المقدس لے جایا گیا۔ وہاں انبیائے کرام کی جماعت نے آپ کا والہانہ استقبال کیا اور آپ کی امامت میں نماز پڑھی، پھر آپ کو درجہ بدرجہ آسمانوں پر لے جایا گیا جہاں آپ کی حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام سے ملاقات ہوئی۔ حضرت جبرئیل نے آپ ﷺ کو جنت کی سیر کرائی۔ پھر آپ سدرۃ المنتہیٰ پہنچے اور قرب الٰہی کی اُس منزل تک رسائی حاصل کی جہاں کبھی کسی مقرب ترین فرشتے کو بھی اذنِ باریابی نہیں ملا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں۔ امت مسلمہ کے لیے پنجگانہ نماز کا تحفہ مرحمت فرمایا اور خوشخبری دی کہ میں آپ کی امت کے ہر اُس فرد کو اپنے دامن مغفرت میں جگہ دوں گا جو شرک کی نجاست سے پاک رہے گا۔ اگلے اوراق میں یہ تمام حالات و واقعات جزئیات سمیت مفصل طور پر درج ہیں۔

اسراء و معراج

مشکل اور تنگی کے بعد آسانی ہوتی ہے۔ محنت اور مشقت کے بعد انعام ضرور ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ مسلسل اسلام کی دعوت و تبلیغ میں مصروف تھے۔ کفار و مشرکین آپ ﷺ کی دعوت کا راستہ روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے لیکن انھیں پے در پے ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ آپ ﷺ کے حمایتی چچا ابوطالب اور غمگسار رفیقۂ حیات ام المؤمنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد کفارِ قریش نے آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم پر مظالم کی انتہا کر دی۔ آپ طائف تشریف لے گئے تو وہاں کے باسی اتنے اُجڈ اور بدتمیز نکلے کہ انھوں نے انسانیت کے عام آداب اور مہمان نوازی کے ادنیٰ تقاضوں کا بھی خیال نہ رکھا اور آپ کے ساتھ بے حد بدسلوکی کا مظاہرہ کیا جس کی تفصیل سابقہ صفحات میں قارئین کرام کے ملاحظے میں آ چکی ہے۔

شدید ظلم و ستم اور طوفانِ بدتمیزی کے باوجود رسول اللہ ﷺ تبلیغ اسلام کے مشن کو آگے سے آگے بڑھاتے رہے۔ آپ ﷺ کی دعوت مکہ اور دیگر تمام نواحی قبائل میں پھیل چکی تھی۔ شعب ابی طالب کے موقع پر جو ذلت آمیز سلوک کفار مکہ نے کیا، اس کی رہی سہی کسر سفر طائف میں پوری ہوگئی۔ انھی دلدوز حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسراء و معراج کی عزت سے سرفراز فرمایا۔ یہ واقعہ اس بات کی روشن دلیل تھا کہ سرور کائنات ﷺ کو کفار و مشرکین کی جانب سے جن سنگین اذیتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، وہ اس وجہ سے قطعی طور پر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ ہر دور میں اس کے محبوبوں کو خالص توحید کی دعوت دیتے

طائف کی وادی

وئے اس قسم کے سنگین حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔

اسراء و معراج کا یہ معجزہ دیگر معجزات کی طرح نہیں بلکہ ان سے بے حد مختلف اور منفرد ہے۔ مشرکین مکہ نے آپ ﷺ سے اس معجزے کا مطالبہ کیا تھا نہ خود آپ نے اپنے رب کے حضور ایسی کوئی التجا کی تھی بلکہ آپ نے معراج سے واپس آ کر بھی کفارِ قریش سے یہ نہیں کہا کہ لو! یہ ہے تمھارے مطالبے اور چیلنج کا جواب! بس پروردگارِ عالم نے خود ہی آپ پر اپنا خاص فضل و کرم فرمایا اور آپ کو یہ عظیم اور بے مثال معجزہ عطا فرمایا تھا۔ بلاشبہ اسراء و معراج کا واقعہ رسول اللہ ﷺ کی عظمت اور فضیلت کی روشن دلیل ہے، تاہم اجل علماء نے جہاں اسے آپ ﷺ کی ان نادر خصوصیات میں شمار کیا ہے جو کسی اور نبی کو عطا نہیں کی گئیں،[1] وہیں بعض نے اس خرقِ عادت واقعے کو معجزہ بھی قرار دیا ہے۔[2]

اسراء و معراج کا واقعہ تمام خاص و عام لوگوں میں ''واقعۂ معراج'' کے نام سے مشہور ہے۔ احادیث اور سیرت کی کتابوں میں محدثین کرام رحمہم اللہ اور مؤرخین رحمہم اللہ نے کم و بیش 45 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی درج کیے ہیں جن سے واقعۂ معراج مروی ہے۔ یہ واقعہ ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے پیش آیا تھا۔ اس وقت رسالت مآب ﷺ کی عمر مبارک 51 سال نو مہینے تھی۔ تاریخِ کائنات کا یہ نادر واقعہ ان خصوصی انعاماتِ ربانی میں سے ایک ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو چن لیا تھا۔ یہ واقعہ کس مقصد کے لیے ظہور میں آیا؟ اس کے بارے میں قرآن کریم نے سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ نجم میں بلیغ اشارے کیے ہیں اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دکھانا چاہتا تھا۔

اللہ رب العزت جسے چاہے اس کو اُس سے زیادہ سُنا دے جتنا سب سن رہے ہیں اور جسے چاہے اُس سے زیادہ دکھا دے جتنا سب دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں سفر معراج کی غرض و غایت یہ تھی کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ محمد رسول اللہ ﷺ کو بعض حقائق کا عینی مشاہدہ کرانا چاہتا تھا۔ یہ سفر دراصل وحی کی ایک مخصوص کیفیت کا آئینہ دار تھا۔

اسراء و معراج کے سرآغاز روح الامین رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں وہ سواری لے کر حرم کعبہ حاضر ہوئے جو بجلی سے بھی زیادہ تیز گام اور روشنی سے زیادہ سبک خرام تھی۔ جبریل علیہ السلام آپ کو زمزم کے کنویں کے پاس لائے اور آپ کا سینۂ مبارک چاک کیا لیکن آپ کو ذرہ بھر تکلیف نہیں ہوئی۔ پھر سینہ مبارک آب زمزم سے دھویا۔ سونے

---

[1] المواهب اللدنية: 7 و 15، الجواب الصحيح لابن تيمية: 169,168/6، الشفا للقاضي عياض: 231/1. [2] الشفا للقاضي عياض: 248/1، الحجة في بيان المحجة: 551/2، من معين السيرة للشامي، ص: 118-120.

کے ایک طشت میں ایمان وحکمت بھرے ہوئے تھے جنھیں جبرئیل علیہ السلام نے آپ کے سینہ مبارک میں رکھ کراُسے بند کر دیا، پھر آپ پہلے مسجد اقصیٰ لے جائے گئے۔

اس سفر کے سرِ آغاز ہی گویا یہ بتا دیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ دونوں کے انوار و برکات کے محافظ اور امین ہیں اور اب ان دونوں مسجدوں کی امامت مشرکین قریش اور وعدہ خلاف عہد شکن یہودیوں سے چھین کر آپ ﷺ کے حوالے کر دی جائے گی۔ مسجدِ اقصیٰ میں انبیائے کرام علیہم السلام کی جماعت نے آپ ﷺ کا پرتپاک استقبال کیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ سے درخواست کی کہ انبیائے کرام علیہم السلام کو نماز پڑھائیے، چنانچہ انبیائے کرام نے آپ ﷺ کی امامت میں نماز پڑھی۔ یہ دراصل اس حقیقت عظمیٰ کا اعلان تھا کہ اب قیامت تک کے لیے عالمِ انسانیت کی دینی اور سیاسی قیادت حضرت محمد ﷺ کو سونپ دی گئی ہے۔

پھر بیت المقدس سے آپ کو آسمانوں کی بلندی تک لے جایا گیا۔ آسمانوں پر آپ ﷺ کی حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت ادریس، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام سے ملاقات ہوئی، آپ ﷺ کو جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرایا گیا، پھر آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے اُن انتہائی قریبی مقامات تک لے جائے گئے جہاں ملائکہ مقربین بھی نہیں جاسکتے۔ اس موقع پر آپ کو اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کا اعزاز

مسجد الحرام (مکہ مکرمہ)

نصیب ہوا۔ اسی رات آپ ﷺ کو امت مسلمہ کے لیے پانچ نمازوں کا تحفہ دیا گیا۔ اس کے علاوہ دو مزید تحفے یہ دیے گئے کہ اولاً اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ فرمایا کہ آپ کی امت میں جو شخص بھی شرک سے پاک ہوگا، میں اُسے اپنے دامن مغفرت میں پناہ دوں گا۔ دوسرا تحفہ یہ مرحمت فرمایا کہ آپ ﷺ کو سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں فرمان خاص کے طور پر دی گئیں۔ ان میں انسان کو ایمان کی تکمیل کے اصول، اچھے یا بُرے عمل کے اچھائی اور بُرائی کے اعتبار سے لازمی نتائج اور مغفرت کے سبق سکھائے گئے۔

اسراء و معراج کے بارے میں علمائے سلف کا عقیدہ یہ تھا کہ معراج جسمانی و روحانی طور پر ہوئی۔ یہ واقعہ اللہ رب العزت کی قدرت کا نمونہ ہے اور ایمان و یقین کے لیے ایک آزمائش کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب مومنین نے رسالت مآب ﷺ سے یہ واقعہ سُنا تو انھوں نے دل و جان سے تسلیم کر لیا کہ رسول اللہ ﷺ جو کچھ فرما رہے ہیں، وہ حرف بحرف سچ ہے۔ مسلمانوں کے برعکس جب مشرکین مکہ نے یہ واقعہ سُنا تو انھوں نے رسالت مآب ﷺ کی تکذیب شروع کر دی۔ وہ کہنے لگے کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص راتوں رات مکہ سے بیت المقدس بھی پہنچ جائے اور وہاں سے سارے آسمانوں اور ملأ اعلیٰ کی سیر کر کے آرام سے اپنے گھر لوٹ آئے۔

مسجد اقصیٰ (بیت المقدس)

مسجد اقصیٰ کا صحن

مسجد اقصیٰ کا داخلی دروازہ

مسجد اقصیٰ کا اندرونی ہال

لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے مشرکین مکہ کو بیت المقدس کی ایک ایک کر کے ساری نشانیاں بتائیں تو وہ ہکا بکا ہو گئے۔

معراج کے بارے میں تہذیب جدید کے مارے مادہ پرست بھی مشرکین مکہ سے پیچھے نہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ بھلا اس طرح کا معجزہ کس طرح رونما ہوسکتا ہے کہ کوئی بشر خلائے بسیط پار کر کے آسمانوں کی انتہائی بلندیوں تک جا پہنچے۔ اس انداز فکر کے لوگ درحقیقت عقل سلیم سے محروم ہیں۔ وہ یہ موٹی سی بات سمجھنے سے بھی عاجز ہیں کہ ہمارے آس پاس ہی ہر آن، ہر گھڑی طرح طرح کے معجزے رُونما ہو رہے ہیں۔ ستاروں کا غمزہ، شمس وقمر کی گردش، دن اور رات کا الٹ پھیر، برق و رعد کی گرج چمک، بارش اور برفباری، خاکی زمین سے طرح طرح کے خوش رنگ اور خوش ذائقہ پھلوں اور عمدہ عمدہ فصلوں کا پیدا ہونا، یہ سب معجزے نہیں تو اور کیا ہیں؟ کیا یہ کسی انسان کے بس کی بات ہے کہ جب خشک سالی سے زمین پیاسی ہو رہی ہو تو وہ اپنی مرضی ومنشا سے بادلوں کے قافلے کھینچ لائے اور بارش برسا کر قحط و خشک سالی کی مصیبت دور کر دے؟ یہ تو صرف اللہ رب العزت ہی ہے جو خزاں کی پامالیوں کے بعد بہاروں کے قافلے بھیج کر زمین کو شاداب کر دیتا ہے۔

آج جب ایک عاجز و درماندہ انسان کی تحقیق وجستجو اس پائے کی ہے کہ اس کے نتیجے میں پٹرول کی قوت سے بڑے بڑے ہوائی جہاز فضائے بسیط میں اُڑتے اور دور دور تک کا سفر کرتے نظر آتے ہیں تو اُس مالک الملک اور قادر مطلق کی قدرت وقوت کا بھلا کون اندازہ کر سکتا ہے جس نے محض ''کُن'' کہہ کر ساری کائنات کو پیدا کر دیا۔ ہمارا خالق و مالک اللہ رب العالمین تو بڑے سے بڑے کام پر قادر ہے۔ وہ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے، اپنی قدرت سے کر دکھاتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ رات کے وقت رسالت مآب ﷺ کو اس طرح لے گیا جس طرح اس نے چاہا۔ اور جس جس طرح چاہا، اُس طرح اپنی نشانیوں میں سے کچھ نشان دکھائے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی شان اور اس کی عظیم القدر قوت کے مناظر دیکھے۔ پھر اُس قدرت کو دیکھا جس کے ذریعے وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو نشانیاں دکھائیں، ان کی حقیقت کیا تھی؟ بھلا اس کا اندازہ شناس کون ہوسکتا ہے۔ انسان کے فہم و ادراک کی جہاں تک رسائی ہے اور اس کی زبان میں جتنے بھی الفاظ ہیں، ان سب کا تعلق انسان کے محسوسات اور تعقلات سے ہے۔ اسراء و معراج کی رات اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو جو مناظر اور نشانیاں دکھائیں، ہم ان کی اصل حقیقت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ انسانی دماغ ان کے فہم وتحمل کی قدرت ہی نہیں رکھتا۔

انسانی عقل اس واقعے سے صرف اس بات کا ادراک کرتی ہے کہ یہ واقعہ جس عظیم الشان خوش خبری کا پیش خیمہ تھا، وہ ایک سال بعد ہی نمایاں ہوگئی۔ سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی ﷺ میں لکھا ہے کہ عین اُس وقت جبکہ اسلام اور اہل اسلام پر انتہائی نازک دور گزر رہا تھا اور مشرکین مکہ نے ظلم وستم کی انتہا کر دی تھی، واقعۂ معراج آپ ﷺ کے لیے اس امر کی بشارت تھا کہ اب درد اور درماندگی کا زمانہ ختم ہونے والا ہے اور ہجرت کے بعد سکون و آسودگی کا دور شروع ہونے والا ہے۔ چنانچہ واقعۂ معراج کے ایک سال بعد ہی مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی اور مدینہ مسلمانوں کی دینی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ جہاں قرآن وسنت کے ذریعے سے قانون سازی کی گئی اور اسلام کا دینی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام

مسجد نبوی اور سقیفہ بنی ساعدہ کا روح پرور منظر

منصۂ شہود پر آیا۔ جتنے بھی انبیائے کرام اپنے اپنے زمانے میں جہاں جہاں تشریف لائے، ان کی دعوت وتبلیغ کا واحد مقصد توحید کی تعلیم تھا۔ قرآن کریم سمیت جتنی آسمانی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے، ان سب کی تعلیم بھی یہی تھی کہ اللہ رب العزت وحدہ لاشریک ہے۔ معراج کا واقعہ بھی فی الاصل توحید ہی کا عظیم الشان مظہر ہے۔ اِس واقعے کے ذریعے سے انسان کو ہمیشہ کے لیے بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا علم و ارادہ زمان و مکان کی حدود و قیود سے ماورا اور ہر شے پر محیط ہے۔

اسراء و معراج کے معنی

اِسْرَاء: یہ أَسْرٰی یُسْرِي سے مصدر ہے۔ اس کے معنی ہیں: رات کے وقت چلانا (یا لے جانا)۔

مِعْرَاج: یہ عَرَج یَعْرُجُ عُرُوجًا سے اسم آلہ ہے۔ عُروج کے معنی چڑھنے کے ہیں، لہٰذا معراج کے معنی ہوئے: چڑھنے کا آلہ، یعنی سیڑھی وغیرہ۔ احادیث مبارکہ میں "عُرِجَ بِي" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اسی وجہ سے اس واقعے کے لیے ''معراج'' کا لفظ بولا جانے لگا۔

رسول اللہ ﷺ کے راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر کو اسراء کہا جاتا ہے۔ اور مسجدِ اقصیٰ سے عالم بالا میں تشریف لے جانے کو معراج کہا جاتا ہے۔ بسا اوقات دونوں سفروں کے مجموعے کو ایک ہی لفظ اسراء یا معراج سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں اسراء و معراج کا تذکرہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دو مقامات پر نہایت جامع اور فصیح و بلیغ انداز میں اسراء و معراج اور اس کی حکمت بیان فرمائی ہے، چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل کے آغاز ہی میں اسراء کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾

''پاک ذات ہے وہ (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے گیا جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہی خوب سننے والا (اور) خوب دیکھنے والا ہے۔''[1]

اسی طرح سورۂ نجم میں معراج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

[1] بنیٓ إسرآءیل 17:1۔

﴿ وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ○ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ○ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ○ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ○ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ○ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ○ ﴾

''اور یقیناً اس (رسول) نے اس (جبریل) کو ایک بار اور بھی دیکھا۔ سدرۃ المنتہیٰ کے قریب۔ اس کے نزدیک ہی جنت الماویٰ ہے۔ اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ تو بہکی اور نہ حد سے بڑھی۔ یقیناً اس (رسول) نے اپنے رب کی بعض بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔'' [1]

ان کے علاوہ ایک تیسری جگہ اس واقعے کی طرف اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ ﴾

''اور ہم نے آپ کو (اسراء ومعراج میں) جو کچھ دکھایا، اسے لوگوں کے لیے بس ایک فتنہ ہی بنا دیا۔'' [2]

اسراء ومعراج کی احادیث متواتر ہیں

اسراء ومعراج کے عظیم الشان واقعے کا بہت سی احادیث مبارکہ میں تذکرہ ہوا ہے۔ حدیث کی امہات الکتب میں اس کا ذکر موجود ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے اپنے اپنے دلنشین اور خوبصورت انداز میں یہ بابرکت واقعہ بیان کیا ہے۔ اس واقعے کو متواتر کا درجہ حاصل ہے۔ علاوہ ازیں امتِ مسلمہ کا اس واقعے پر اجماع بھی ہے۔

قاضی ابن عطیہ اندلسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اسراء ومعراج کا واقعہ حدیث کی تمام مصنفات میں موجود ہے اور تمام اسلامی علاقوں میں پھیلے ہوئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ متواتر کا درجہ رکھتا ہے۔ النقاش (ابوبکر محمد بن حسن بن زیاد) نے اس کے راویوں میں بیس صحابہ کا تذکرہ کیا ہے۔'' [3]

اسی طرح حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ واقعہ اسراء کی روایات متواتر ہیں۔ ان کے راوی حسب ذیل ہیں: انس بن مالک، عمر بن خطاب، علی مرتضیٰ، عبداللہ بن مسعود، ابوذر غفاری، مالک بن صعصعہ، ابوہریرہ، ابوسعید، ابن عباس، شداد بن اوس، ابی بن کعب، عبدالرحمٰن بن قرظ، ابوحبہ انصاری، ابن لیلیٰ انصاری، عبداللہ بن عمرو، جابر بن عبداللہ، حذیفہ بن یمان، بریدہ، ابوایوب انصاری، ابوامامہ، سمرہ بن جندب، ابوحمراء، صہیب رومی، ام ہانی، ام المومنین عائشہ اور اسماء رضی اللہ عنہم۔ ان میں سے بعض نے اسے مفصل اور بعض نے مختصر طور پر بیان کیا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض کی روایت صحت کی شرط پر نہیں، تاہم اسراء کے واقعے پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ صرف زندیق

[1] النجم 53:13-18. [2] بنيّ إسرآءيل 17:60. [3] المحرر الوجيز، بنيّ إسرآءيل 17:1.

اور ملحد لوگ ہی اس کا انکار کرتے ہیں۔

﴿ يُرِيدُونَ لِيُطْفِـُٔوا۟ نُورَ ٱللَّهِ بِأَفْوَٰهِهِمْ وَٱللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِۦ وَلَوْ كَرِهَ ٱلْكَـٰفِرُونَ ۝ ﴾ (الصف 8:61)

''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور (دین اسلام) اپنے منہ سے بجھا دیں جبکہ اللہ اپنا نور پورا کرنے والا ہے اگرچہ کافر ناپسند ہی کریں۔''[1]

اسراء و معراج کتنی بار ہوا؟

اس کے بارے میں بنیادی طور پر دو موقف ہیں:

اولاً یہ کہ اسراء و معراج ایک مرتبہ ہوا۔

ثانیاً یہ کہ یہ متعدد مرتبہ ہوا۔ اس موقف کے حاملین میں سے بعض کے نزدیک یہ واقعہ دو، بعض کے نزدیک تین اور بعض کے نزدیک چار مرتبہ ظہور میں آیا۔

ان دونوں میں سے پہلا موقف ہی صحیح ہے۔ دلائل سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ جن حضرات نے کہا ہے کہ اسراء و معراج متعدد بار ہوا، انھیں یہ غلط فہمی اسراء و معراج کی مختلف روایات کی وجہ سے ہوئی۔ انھوں نے ہر ایسی روایت کے بارے میں جو دوسری سے مختلف تھی، یہ سمجھ لیا کہ یہ جداگانہ واقعہ ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اسراء و معراج کی مختلف روایات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ درحقیقت ایک ہی مرتبہ ہوا تھا۔ ہر چند یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے راویوں کے زبان و بیان اور عبارتوں میں اختلاف ہوگیا ہے یا بعض راویوں نے اس میں کچھ کمی بیشی کر دی ہے۔ صرف انبیاء علیہم السلام مبرا عن الخطا ہیں۔ باقی ہر انسان سے غلطی ہوسکتی ہے۔ جس نے ہر اُس روایت کو جو دوسری روایت کے خلاف ہے، ایک الگ واقعہ بتایا ہے، اس نے متعدد اسراء ثابت کیے ہیں۔ ایسا شخص بہت دور نکل گیا اور اس نے بڑی انوکھی بات کہی۔ اس کی ساری کوشش رائیگاں گئی اور مقصود بھی حاصل نہ ہوسکا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ اگر یہ واقعہ متعدد بار ہوا ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو اس سے آگاہ کر دیتے اور لوگ اسے مسلسل، تعدد اور تکرار کے ساتھ نقل کرتے۔[2]

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی اسی بات کو صحیح قرار دیا ہے کہ اسراء ایک ہی مرتبہ ہوا تھا۔ انھوں نے ان لوگوں پر تعجب کا اظہار کیا ہے جو سمجھتے ہیں کہ یہ واقعہ متعدد بار پیش آیا۔[3] امام قسطلانی نے اس کے بارے میں مدلل بحث

[1] تفسير ابن كثير، بني إسرآئيل 1:17. ''اسراء و معراج کی روایات کا تجزیہ'' اس باب کے آخر میں ملاحظہ کیجیے۔

[2] تفسير ابن كثير، بني إسرآءيل 1:17. [3] سيرة خير العباد لابن القيم، ص: 50.

کے بعد لکھا ہے: اصل حقیقت یہی ہے کہ یہ واقعہ ایک ہی مرتبہ رونما ہوا تھا۔ انھوں نے اسے جمہور کا قول قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ صحیح احادیث سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ [1]

اسراء و معراج ایک ہی رات میں

اسراء و معراج دونوں واقعات ایک ہی رات میں ظہور میں آئے تھے جیسا کہ صحیح مسلم میں مذکور سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے پاس براق (سواری) لایا گیا۔ میں اس پر سوار ہوا حتی کہ بیت المقدس جا پہنچا۔ میں نے اس (براق) کو اسی کنڈے سے باندھ دیا جس سے انبیاء علیہم السلام باندھا کرتے تھے۔'' آپ نے آگے اسی واقعے کے بارے میں سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا: «ثُمَّ عَرَجَ بِنَا إِلَى السَّمَاءِ ......» ''پھر جبریل علیہ السلام ہمیں آسمان کی طرف لے کر چڑھے۔'' [2]

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سیاق میں دلیل ہے کہ معراج اسی رات ہوا تھا جب آپ کو مکہ مکرمہ سے بیت المقدس کی طرف لے جایا گیا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ ان کا یہ قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: انھوں نے جو یہ بات کہی ہے، یہی حق ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ [3]

بعض متاخرین نے یہ کہا ہے کہ اسراء الگ رات میں ہوا اور معراج الگ رات میں مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ان کی یہ بات کسی لحاظ سے صحیح نہیں۔ [4]

اسراء و معراج روحانی تھا یا جسمانی؟

اس کے متعلق تین اقوال ہیں:

1. حالت بیداری میں روح اور جسم دونوں کے ساتھ اسراء و معراج ہوا۔
2. اسراء حالتِ بیداری میں ہوا اور معراج روح کے ساتھ ہوئی۔ مطلب یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام (مکہ مکرمہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک حالتِ بیداری میں تشریف لے گئے، پھر وہاں سے عالمِ بالا میں روحانی طور پر گئے۔
3. اسراء و معراج خواب میں ہوا۔ [5]

دلائل کی رُو سے صرف پہلا قول صحیح ہے۔ آئیے! اب ہم آپ کو اس کے تفصیلی دلائل بتاتے ہیں۔ آخر میں ہم

---

[1] المواهب اللدنية: 3/10-12. مزید دیکھیے: فتح الباري: 7/248. [2] صحيح مسلم: 162. [3] تفسير ابن كثير، بني إسرآءيل 17:1. [4] فتح الباری: 7/247-249 و261. [5] دیکھیے: سبل الهدٰى والرشاد: 3/67-71.

ان لوگوں کے دلائل کا بھی تعاقب کریں گے جو اسے روحانی تجربہ یا خواب کا واقعہ قرار دیتے ہیں تاکہ آپ کے سامنے ساری صورتحال اچھی طرح واضح ہو جائے۔

اسراء ومعراج روح اور بدن کے ساتھ ہوا۔ اس کی سب سے بڑی اور روشن دلیل خود وہ آیات ہیں جن میں اس واقعے کی خبر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے انداز ہی ایسا اختیار فرمایا جس سے لوگوں کے ذہنوں میں جنم لینے والے اشکالات اور شبہات کا بخوبی ازالہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾

''پاک ذات ہے (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔''[1]

اس آیتِ مبارکہ میں نہایت خوبصورت اور منفرد انداز میں واقعۂ اسراء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ سرور کائنات ﷺ نے اس عظیم الشان واقعے کو بہ نفسِ نفیس اپنی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت خود اپنی طرف کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے آپ کو یہ سیر کرائی۔ اللہ تعالیٰ نے آیت کا آغاز ہی ایسے کلمے سے کیا جس میں بتایا ہی یہ گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے عیب، نقص، کمزوری، لاچاری اور بے بسی سے پاک ہے۔ یہ دراصل اس واقعے کی عظمت اور اہمیت کی طرف اشارہ ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح عظیم الشان امور کے بیان کے موقع پر ہوتی ہے۔ اگر یہ واقعہ خواب میں پیش آیا ہوتا تو یہ کوئی بڑی چیز نہ ہوتی، نہ کوئی عظیم واقعہ ہوتا، اس لیے کہ خواب میں تو انسان نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچتا ہے اور نہ جانے کیا کیا دیکھ لیتا ہے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہوتی کیونکہ وہ محض خواب ہی ہوتا ہے، کوئی حقیقت تو نہیں ہوتی۔

مزید یہ کہ اگر یہ خواب کا واقعہ ہوتا تو کفارِ قریش اس کی تکذیب میں جلدی نہ کرتے۔ وہ کہہ دیتے کہ چلو کوئی بات نہیں بس خواب ہی تو دیکھا ہے۔ اسی طرح لوگوں کی ایک جماعت جو نئی نئی مسلمان ہوئی تھی، مرتد نہ ہوتی۔ پھر درج بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے لیے ''نبی'' یا ''رسول'' وغیرہ کے بجائے بطور خاص ''عبد'' کا لفظ استعمال فرمایا۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ صرف روح نے اس سفر کی سعادت حاصل نہیں کی، یا یہ سفر خواب کی حالت میں طے نہیں ہوا بلکہ روح اور جسم دونوں نے یہ سارا سفر بحالتِ بیداری کیا، اس لیے کہ لفظ ''عبد'' روح اور جسم دونوں کا مجموعہ ہے۔ اکیلی روح یا تنہا جسم کے لیے یہ لفظ بولا ہی نہیں جاتا۔

[1] بنیٓ إسرآءيل 1:17۔

اسی طرح دوسرے مقام پر جہاں معراج کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہاں خاص طور پر یہ بیان کیا گیا ہے:

﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝﴾

''نگاہ بہکی اور نہ حد سے بڑھی۔ یقیناً اس (رسول) نے اپنے رب کی بعض بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔''[1]

درج بالا دونوں آیتوں پر غور کیجیے۔ اگر یہ واقعہ خواب میں پیش آیا ہوتا، یا روحانی ہوتا تو کیا اس کی تعبیر اس طرح کی جاتی؟ پھر نگاہ کا تذکرہ کرنے کا کیا مطلب؟ آنکھ تو اعضائے جسمانی میں سے ایک ہے۔ روح کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مزید براں یہ کہ نگاہ کے بارے میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ''نہ وہ بہکی اور نہ حد سے بڑھی۔'' کیا خواب کی حالت میں اس طرح ہونا ممکن ہے؟ اس غور و فکر کے بعد آپ بالآخر اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ سب کچھ جسم اور روح کے ساتھ بیداری کی حالت میں پیش آیا۔

اب ایک قدم ذرا اور آگے بڑھیے اور اس پہلو پر توجہ دیجیے کہ سرور کائنات ﷺ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک براق جانور پر سوار ہو کر گئے۔ اگر یہ واقعہ خواب کا ہوتا یا روحانی ہوتا تو براق پر سوار ہونے کا کیا مطلب؟ سواری کی ضرورت تو بدن کو ہوتی ہے نہ کہ روح کو، اس لیے کہ روح کو تو کوئی حرکت کرنے کے لیے کسی سواری پر سوار ہونے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔[2]

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے:

﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ﴾

''اور ہم نے آپ کو (اسراء و معراج میں) جو کچھ دکھایا، اسے لوگوں کے لیے بس ایک فتنہ ہی بنا دیا۔''[3]

اس آیتِ مبارکہ میں ﴿الرُّءْيَا﴾ سے مراد خواب نہیں بلکہ بیداری کی حالت میں آنکھوں سے دیکھنا ہے جیسا کہ اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے:

هِيَ رُؤْيَا عَيْنٍ أُرِيَهَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِهِ إِلٰى بَيْتِ الْمَقْدِسِ.

''یہ آنکھوں کا دیکھنا ہے جو رسول اللہ ﷺ کو بیت المقدس کی طرف اسراء کی رات دکھایا گیا تھا۔''[4]

اب ہم ان دلائل کا جائزہ لیں گے جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسراء و معراج روحانی تھا یا خواب میں پیش آیا تھا۔ جہاں تک صحیح بخاری کی اس روایت کی بات ہے جس میں واقعۂ معراج کے آخر میں یہ کہا گیا

---

[1] النجم 53:17،18۔ [2] دیکھیے: تفسیر ابن کثیر، بنيّ إسرآءيل 17:1۔ [3] بنيّ إسرآءيل 17:60۔ [4] صحیح البخاري: 3888۔

ہے: وَاسْتَيْقَظَ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ''پھر رسول اللہ ﷺ بیدار ہو گئے جبکہ آپ مسجد حرام میں تھے۔'' [1]
حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کے متعلق دو باتیں لکھی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ الفاظ راوی شریک بن عبداللہ کی غلطیوں میں شمار کیے گئے ہیں یا پھر یہ الفاظ اس بات پر محمول ہیں کہ ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو جانے کو بھی بیداری، افاقہ یا چوکنا ہونا کہا جاتا ہے جیسا کہ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ طائف تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں نے آپ کی تکذیب کی تو آپ نے فرمایا:

«فَانْطَلَقْتُ وَ أَنَا مَهْمُومٌ عَلَى وَجْهِي، فَلَمْ أَسْتَفِقْ إِلَّا وَ أَنَا بِقَرْنِ الثَّعَالِبِ»

''میں وہاں سے غمزدہ ہو کر چلا، پھر قرن ثعالب پہنچا تو مجھے افاقہ ہوا۔'' [2]

اسی معنی کی تائید و تصدیق ابو اُسید رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث سے ہوتی ہے کہ جب وہ اپنے بیٹے کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آئے تاکہ آپ اسے گھٹی دیں۔ انھوں نے اپنے بچے کو آپ ﷺ کی مبارک ران پر بٹھا دیا۔ آپ لوگوں سے گفتگو میں مشغول ہو گئے تو ابو اُسید رضی اللہ عنہ نے اپنا بچہ اٹھا لیا، فَاسْتَفَاقَ النَّبِيُّ ''رسول اللہ ﷺ کو افاقہ ہوا (بات چیت سے فراغت پائی)'' تو آپ ﷺ نے بچے کو نہ پایا۔ آپ کے پوچھنے پر بتایا گیا کہ بچے کو اٹھا لیا گیا ہے۔ آپ نے اس بچے کا نام مُنذِر رکھ دیا۔ [3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ درج بالا الفاظ کو اس دوسری بات پر محمول کرنا اسے غلط قرار دینے سے بہتر ہے۔ [4]

امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس سے اس نیند سے بیداری مراد ہے جو آپ نے اسراء کے بعد آ کر کی تھی، اس لیے کہ اسراء ساری رات نہیں ہوا تھا بلکہ رات کے کچھ حصے میں ہوا تھا۔ [5] بہر حال صحیح بخاری کے درج بالا الفاظ: وَاسْتَيْقَظَ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ''پھر رسول اللہ ﷺ بیدار ہو گئے جبکہ آپ مسجد حرام میں تھے۔'' سے یہ استدلال کرنا کہ اسراء و معراج کا واقعہ خواب میں پیش آیا تھا، کسی اعتبار سے صحیح نہیں۔

رہی بات ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول کی کہ رسول اللہ ﷺ اپنے جسم و جثے سمیت تشریف نہیں لے گئے بلکہ صرف آپ کی روح کو رات کے وقت لے جایا گیا۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ قول ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح سند سے ثابت ہی نہیں۔ [6] حافظ ابو الخطاب بن دحیہ نے تو اسے موضوع قرار دیا ہے۔ اسی طرح

---

[1] صحيح البخاري: 7517. [2] صحيح البخاري: 3231، صحيح مسلم: 1795. [3] دیکھیے: صحيح البخاري: 6191، صحيح مسلم: 2149. [4] البداية والنهاية (محقق): 347/3. [5] فتح الباري: 595/13. [6] دیکھیے: السيرة لابن هشام (محقق): 7/2.

شافعیوں کے امام قاضی ابوالعباس بن سُریج نے بھی اس کے متعلق کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں بلکہ یہ قول صرف صحیح حدیث کو رد کرنے کے لیے گھڑا گیا ہے۔[1]

دوسری بات یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ قول صحیح ہے تب بھی اسے محض ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی رائے قرار دیا جائے گا، اس لیے کہ یہ واقعہ خود ان کا اپنا مشاہدہ نہیں بن سکتا۔ واقعۂ اسراء و معراج کے وقت اگرچہ ان کا نکاح ہو چکا تھا لیکن ان کی رخصتی نہیں ہوئی تھی اور وہ رسول اللہ ﷺ کے گھر تشریف نہیں لائی تھیں۔ اس وقت ان کی عمر بھی بہت تھوڑی تھی۔ علاوہ ازیں انھوں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے بیان نہیں کی۔

باقی رہا مسئلہ یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ کی اس روایت کا جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ سیدنا معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے جب رسول اللہ ﷺ کے اسراء و معراج کے بارے میں پوچھا جاتا تھا تو وہ فرماتے تھے: وہ اللہ کی طرف سے ایک سچا ''رؤیا'' تھا۔[2] اس روایت کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے: پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ روایت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہی نہیں، اس لیے کہ یہ منقطع ہے۔ یعقوب بن عتبہ نے تو معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور پایا ہی نہیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ 60ھ میں فوت ہوگئے تھے جبکہ یعقوب کی وفات 128ھ میں ہوئی۔ اس اعتبار سے اس روایت کی نسبت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف کرنا صحیح نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر فرض کر لیا جائے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ہے تو پھر بھی یہ ان کی اپنی شخصی رائے ہی قرار پائے گی کیونکہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس وقت کے حالات کا خود کوئی مشاہدہ کیا نہ انھوں نے اس بات کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا بلکہ جب اسراء و معراج کا واقعہ پیش آیا تھا تو اس وقت تو وہ مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے 8ھ میں فتح مکہ والے سال اسلام قبول کیا تھا۔ تیسری بات یہ ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ اسراء و معراج خواب میں ہوا تھا، اس لیے کہ انھوں نے اس کے لیے لفظ ''رؤیا'' استعمال کیا ہے۔ ہرچند یہ لفظ اہل عرب کے ہاں زیادہ تر خواب کے لیے بولا جاتا ہے لیکن اس کا استعمال آنکھ سے دیکھنے کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس قول میں یہ دوسرے معنی مراد لینا ہی صحیح ہے جیسا کہ آپ اوپر مفسر امت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے پڑھ چکے ہیں کہ انھوں نے قرآن مجید کے لفظ ﴿الرُّءْيَا﴾ سے آنکھوں کا دیکھنا ہی مراد لیا ہے۔

بہرحال ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے اقوال سے یہ ہرگز ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اسراء و معراج

[1] سبل الهدٰى والرشاد: 70/3. [2] تفسير الطبري، بنيٓ إسرآءيل 1:17.

کا واقعہ خواب میں پیش آیا تھا۔ صحیح احادیث بلکہ قرآن مجید کا بیان اس بات کی بین دلیل ہے کہ سرور کائنات ﷺ عین بیداری کی حالت میں روح و بدن کے ساتھ اس سیر پر تشریف لے کر گئے تھے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اس کے بارے میں حق اور صحیح بات یہی ہے کہ اسراء و معراج کا پورا واقعہ متحدہ طور پر جسم اور روح کے ساتھ پیش آیا۔ قرآن مجید کی آیت، صحیح احادیث اور قیاس اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ ظاہر اور حقیقت سے تاویل کی طرف انحراف اس وقت تک جائز نہیں جب تک وہ (شرعی اور عقلی لحاظ سے) محال نہ ہو۔ اسراء و معراج کا پورے وجود کے ساتھ ہونا اور بیداری کی حالت میں ہونا محال نہیں۔''

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن عباس، جابر، انس، حذیفہ، عمر، ابوہریرہ، مالک بن صعصعہ، ابوحبہ بدری، ابن مسعود رضی اللہ عنہم، ضحاک، سعید بن جبیر، قتادہ، ابن مسیب، ابن شہاب، ابن زید، حسن، ابراہیم، مسروق، مجاہد، عکرمہ اور ابن جریج رحمہم اللہ وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔ یہی ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کی دلیل ہے (ان کا راجح قول ہے، برخلاف اس جملے کے جو ان کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے جیسا کہ آپ اوپر پڑھ آئے ہیں، یا یہ مخطوطے سے نقل کرنے والے کا وہم ہے اور عبارت یوں ہے کہ یہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کے صحیح نہ ہونے کی دلیل ہے)۔ یہی قول طبری، احمد بن حنبل اور مسلمانوں کی ایک عظیم جماعت کا ہے اور یہی قول اکثر متأخر فقہاء، محدثین، متکلمین اور مفسرین کا ہے۔ انھوں نے اس کے مختلف دلائل بھی نقل کیے ہیں۔[1] امام قرطبی، ابن حجر، ابن قیم، مقریزی اور قسطلانی رحمہم اللہ وغیرہ نے بھی اسی کی صراحت کی ہے۔[2]

معراج کا سال

مؤرخین اور سیرت نگاروں کے درمیان اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ اسراء و معراج کا یہ عظیم واقعہ کس سال پیش آیا۔ اس پر تو سبھی متفق ہیں کہ یہ واقعہ بعثت کے بعد اور ہجرتِ مدینہ سے پہلے ظہور میں آیا تھا۔ ہم اس سلسلے میں یہاں چند اقوال درج کرتے ہیں:

1. یہ واقعہ ہجرتِ مدینہ سے ایک سال پہلے پیش آیا۔ واقدی نے ابن عمرو، ام سلمہ، عائشہ، ام ہانی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہ کی جو مشترکہ روایت بیان کی ہے، اس میں یہی بات بتائی گئی ہے۔[3] امام زہری، عروہ، مقاتل اور قتادہ رحمہم اللہ نے بھی یہی کہا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت مدینہ سے ایک سال پہلے رُونما ہوا۔[4] امام نووی رحمہ اللہ نے بھی

[1] دیکھیے: الشفا للقاضي عیاض: 1/245-252. [2] تفسیر القرطبي، بنيّ إسرآءیل 17:1، فتح الباري: 7/247، سیرة خیر العباد، ص: 44، إمتاع الأسماع: 1/47، المواهب اللدنية: 3/12،13. [3] الطبقات لابن سعد: 1/213،214. [4] دلائل النبوة للبیهقي: 2/354،355، المحرر الوجیز، بنيّ إسرآءیل 17:1، فقه السیرة لابن القیم، ص: 80.

اسی کو قطعی قرار دیا ہے۔ ابن حزم نے مبالغہ کرتے ہوئے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے لیکن ان کا یہ دعویٰ ناقابلِ قبول ہے، اس لیے کہ اس مسئلے میں بہت زیادہ اختلاف ہے جو دس سے زیادہ اقوال پر مشتمل ہے۔ [1] قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک سے زیادہ علماء کا کہنا ہے کہ یہ ہجرت مدینہ سے ایک سال پہلے کا واقعہ ہے۔ [2] حافظ ابن قیم نے ذکر کیا ہے کہ یہ واقعہ طائف سے واپسی کے بعد پیش آیا۔ [3]

2 اسراء و معراج ہجرت سے سولہ ماہ پہلے ہوا۔ یہ سدی سے منقول ہے۔ [4]

3 ہجرت مدینہ اور اسراء و معراج کے درمیان ایک سال دو ماہ کی مدت کا فاصلہ ہے۔ یہ ابن عبدالبر وغیرہ کا قول ہے۔ [5]

ان کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں۔ ڈاکٹر ابوفارس نے لکھا ہے کہ تمام اقوال میں سب سے زیادہ مضبوط قول یہی ہے کہ واقعۂ اسراء و معراج ہجرت مدینہ سے ایک سال پہلے ہوا۔ یہی جمہور علماء کا قول ہے۔ [6]

معراج کا مہینہ اور دن

معراج کے مہینے اور دن کے بارے میں واقدی نے نقل کیا ہے کہ یہ واقعہ 17 ربیع الاول کی رات پیش آیا۔ [7] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام زہری اور عروہ کا قول کہ اسراء و معراج کا واقعہ ہجرت مدینہ سے ایک سال پہلے ہوا، اس حساب سے اس واقعے کے وقوع کا مہینہ ربیع الاول بنتا ہے۔ امام ابن اثیر اور ایک جماعت نے اسی کو قطعی قرار دیا ہے۔ [8] علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے ابواسحاق حربی سے نقل کیا ہے کہ 27 ربیع الاول کی رات کو اسراء و معراج ہوا۔ [9] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سیدنا جابر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا یہ قول بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام الفیل میں سوموار کے دن 12 ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔ اسی دن آپ مبعوث ہوئے۔ اسی میں آپ کو معراج کرائی گئی، اسی دن آپ نے ہجرت کی اور اسی دن آپ نے وفات پائی۔ انھوں نے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کی ہے کہ اس کی سند میں انقطاع ہے۔ [10] ایک دوسرا مشہور قول یہ ہے کہ واقعۂ اسراء و معراج 27 رجب کی رات کو ہوا۔ حافظ عبدالغنی بن سرور مقدسی نے اپنی سیرت کی کتاب میں اسی کو اختیار کیا ہے اور اس کے بارے میں ایک حدیث درج کی ہے جس کی سند صحیح نہیں۔ [11] ابن دحیہ نے کہا ہے کہ بعض قصہ گو حضرات نے ذکر کیا ہے کہ واقعۂ اسراء رجب میں

[1] فتح الباري: 254/7. [2] الشفا للقاضي عياض: 235/1. [3] زادالمعاد: 34/3. [4] دلائل النبوة للبيهقي: 355/2. [5] فقه السيرة لابن القيم، ص: 80. [6] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 243. [7] الطبقات لابن سعد: 214/1. [8] البداية والنهاية: 107/3، سبل الهدٰى والرشاد: 65/3. [9] التمهيد: 49/8. [10] البداية والنهاية: 107/3. [11] البداية والنهاية: 107/3.

ہوا تھا جبکہ یہ جھوٹ ہے۔[1] شیخ طرہونی نے اسراء و معراج کے مہینے اور رات کی تحدید و تعیین کے بارے میں وارد ہونے والی روایات کا عمیق مطالعہ کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ واقعہ 12 ربیع الاول کو سوموار کی رات ہوا۔[2] ڈاکٹر ابوشہبہ لکھتے ہیں کہ جمہور اور محقق علماء کا یہی قول ہے کہ اسراء و معراج ربیع الاول کے مہینے میں ہوا۔ پھر انھوں نے اس سلسلے میں کچھ اور اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ تحقیق اور غور و فکر کے بعد دل اسی طرف مائل ہوتا ہے کہ اسراء و معراج کا واقعہ ربیع الاول کی بارہ یا سترہ تاریخ کو ظہور میں آیا تھا۔[3] واللہ أعلم بالصواب.

معراج کے وقت نبی اکرم ﷺ کی عمر مبارک

جب معراج نبوی کا واقعہ پیش آیا، اس وقت سید الانبیاء ﷺ زندگی کی چھٹی دہائی میں داخل ہو چکے تھے۔ ابن عطیہ اندلسی رحمہ اللہ (م:546ھ) لکھتے ہیں کہ اسراء و معراج کے وقت نبی اکرم ﷺ کی عمر مبارک 51 سال، 9 مہینے اور 28 دن تھی۔[4]

صلاۃ الرغائب کی اصل حقیقت

قارئین کرام! ہم آپ کو اسراء و معراج کا واقعہ سُنانے سے پہلے یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے اپنے طور پر معراج کی رات کا تعین کر کے اس میں بہت سی عبادات گھڑ رکھی ہیں، حالانکہ اس کے لیے دو دلیلوں کی ضرورت ہے۔ ایک معراج کی رات کے تعین کی دلیل۔ دوسری خاص اسی رات میں کی جانے والی عبادات کی دلیل۔ انھی خود ساختہ چیزوں میں سے ایک یہ ہے کہ بعض لوگوں نے رجب کے پہلے جمعے کی رات کو معراج کی رات قرار دے دیا اور اس میں اپنی طرف سے ایک نماز بھی ایجاد کر ڈالی۔ اس کا نام بھی انھوں نے از خود ''صلاۃ الرغائب'' رکھ دیا۔ رغائب، رغیبۃ کی جمع ہے۔ صلاۃ الرغائب کا مطلب یہ ہے کہ وہ نماز جس میں بہت اجر و ثواب کی رغبت رکھی جاتی ہے۔[5]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے: بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ واقعۂ اسراء و معراج ماہ رجب کے پہلے جمعے کی رات کو ہوا تھا اور یہ لیلۃ الرغائب ہے جس میں مشہور نماز ایجاد کی گئی ہے۔ اس بات کی کوئی اصل نہیں۔[6]

صلاۃ الرغائب کے متعلق ایک موضوع روایت بھی بیان کی جاتی ہے جس میں اس کا مکمل طریقہ بیان ہوا ہے۔

---

[1] تبيين العجب بما ورد في شهر رجب للعسقلاني، ص: 2. [2] صحيح السيرة للطرهوني: 274/1، حاشية: 398,118 بحوالہ السيرة النبوية للمهدي: 269/1. [3] السيرة النبوية لأبي شهبة: 418/1. مزید دیکھیے: مع المصطفى ﷺ لسلمان بن فهد العودة، ص: 56. [4] المحرر الوجيز، بني إسرآئيل 1:17. [5] النهاية لابن الأثير، مادة: رغب. [6] البداية والنهاية: 107/3.

یہ روایت درج ذیل ہے:

”جو شخص رجب کی پہلی جمعرات کا روزہ رکھے، پھر (جمعے کی رات کو) عشاء اور مغرب کے درمیان بارہ رکعتیں پڑھے۔ ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرے۔ ہر رکعت میں ایک مرتبہ سورۂ فاتحہ، تین مرتبہ سورۂ قدر اور بارہ مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھے۔ پھر جب نماز سے فارغ ہو جائے تو مجھ پر ان الفاظ کے ساتھ ستر مرتبہ درود پڑھے: «اَللّٰهُمَّ! صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ وَعَلٰى آلِهٖ» پھر سجدہ کرے اور سجدے میں ستر مرتبہ یہ پڑھے: «سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ» پھر سجدے سے سر اٹھا کر ستر بار یہ دعا پڑھے: «رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ، إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْأَعْظَمُ»، پھر دوسرا سجدہ کرے اور اس میں وہی پڑھے جو پہلے سجدے میں پڑھا، پھر سجدے میں اپنی حاجت کا سوال کرے تو بلاشبہ وہ پوری کر دی جائے گی۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جو بندی اور بندہ یہ نماز پڑھے گا، اللہ تعالیٰ اس کے سارے گناہ بخش دے گا اگرچہ وہ سمندر کے جھاگ اور درختوں کے پتوں کی تعداد کے برابر ہوں۔ وہ اپنے خاندان میں سے سات سو افراد کی سفارش کرے گا۔ جب قبر میں اس کی پہلی رات ہوگی تو اس نماز کا ثواب متشکل ہو کر آئے گا۔ وہ اسے کھلے ہوئے چہرے کے ساتھ اور تیز اور فصیح زبان میں کہے گا: میرے محبوب! خوش ہو جا۔ تو ہر سختی سے نجات پا چکا۔ وہ شخص پوچھے گا: تو کون ہے؟ اللہ کی قسم! میں نے تیرے چہرے سے زیادہ حسین چہرہ کبھی نہیں دیکھا، تیری گفتگو سے زیادہ میٹھی گفتگو نہیں سنی اور تیری خوشبو سے زیادہ خوشگوار خوشبو نہیں سونگھی۔ وہ اس شخص کو جواب دے گا: میں تیری اس نماز کا ثواب ہوں جو تو نے فلاں مہینے کی فلاں رات میں پڑھی تھی۔ میں آج کی رات آیا ہوں تاکہ تیرا حق چکا دوں، تیری تنہائی میں تجھے مانوس کروں اور وحشت دور کروں۔ پھر جب صور میں پھونکا جائے گا تو میں میدانِ حشر میں تیرے سر پر سایہ کروں گا۔ خوش ہو جا۔ تو اپنے پروردگار کی طرف سے مرحمت کی جانے والی بھلائی سے کبھی محروم نہیں ہوگا۔“ [1]

حقیقت یہ ہے کہ رجب کے پہلے جمعے کی رات کے شب معراج ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ اسی طرح مذکورہ بالا نماز کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ محض ایک بدعت ہے جسے بعد میں آنے والوں نے ایجاد کیا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ نماز ایک مذموم، منکر اور

[1] دیکھیے: الموضوعات لابن الجوزي: 125,124/2، اللآلئ المصنوعة في الأحاديث الموضوعة للسيوطي: 56/2.

قبیح بدعت ہے۔ [1] شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صلاۃ الرغائب کی کوئی اصل نہیں بلکہ یہ بدعت ہے۔ یہ خود ساختہ نماز جماعت سے پڑھنا جائز ہے نہ اکیلے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جمعے کی رات کو قیام کے ساتھ اور اس کے دن کو روزے کے ساتھ مخصوص کرنے سے منع فرمایا ہے۔ [2] وہ مزید فرماتے ہیں کہ صلاۃ الرغائب نبی اکرم ﷺ نے پڑھی نہ آپ ﷺ کے کسی صحابی نے، نہ تابعین نے اور نہ ائمہ مسلمین نے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی کوئی ترغیب دی نہ ائمہ اور سلف میں سے کسی نے اس کی کوئی تاکید کی۔ انھوں نے اس رات کی کوئی خاص فضیلت بھی بیان نہیں کی۔ اس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ سے جو حدیث مروی ہے، وہ اس کی معرفت رکھنے والوں کی طرف سے متفقہ طور پر جھوٹی اور موضوع ہے۔ [3] علامہ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: رجب کے پہلے جمعے کی رات صلاۃ الرغائب کے متعلق جتنی احادیث ہیں، وہ سب رسول اللہ ﷺ پر گھڑا گیا جھوٹ ہے۔ [4]

شب معراج کی حقیقت

اسی طرح رجب کی ستائیسویں رات کو بھی بہت سے لوگ شب معراج کے طور پر مناتے ہیں۔ وہ مساجد میں چراغاں کرتے ہیں۔ خصوصی تقریبات رچاتے ہیں۔ ذکر کی محفلیں منعقد کرتے ہیں اور اس رات کو خصوصی عبادت کا اہتمام کرتے ہیں، پھر 27 رجب کے دن کا روزہ رکھتے ہیں، اس دن جلوس بھی نکالتے ہیں، آتش بازی کا طوفان برپا کرتے ہیں اور اس جیسی دیگر خرافات پر عمل کرتے ہیں اور ان تمام حرکتوں کے لیے وہ موضوع اور ضعیف روایتوں کا سہارا لیتے ہیں، جیسے یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''رجب میں ایک دن اور ایک رات ایسی ہے کہ جو اس دن کا روزہ رکھ لے اور اس رات کا قیام کرلے، وہ اس شخص کی طرح ہو جائے گا جس نے سو سال روزے رکھے۔ یہ رجب کی ستائیسویں رات اور دن ہے۔ اسی شب اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو مبعوث کیا۔'' [5]

اسی طرح کی ایک اور من گھڑت روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''رجب میں ایک رات ایسی ہے کہ جس میں عمل کرنے والے کے لیے سو سال کی نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں۔ یہ رجب کی ستائیسویں رات ہے۔ جو شخص اس میں بارہ رکعتیں پڑھے، ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور قرآن مجید کی کوئی سورت پڑھے۔ ہر دو رکعتوں میں تشہد میں بیٹھے اور ان (بارہ رکعتوں) کے آخر میں سلام پھیرے، پھر سو مرتبہ یہ پڑھے: «سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ»، سو مرتبہ

[1] السنن والمبتدعات، ص: 140. [2] صحیح مسلم: 1144. [3] مجموع الفتاوٰی لابن تیمیة: 132/23 و 135. [4] المنار المنیف، ص: 95. [5] شعب الإیمان للبیهقي: 374/3، الفوائد المجموعة للشوكاني، ص: 439.

استغفار کرے اور نبی ﷺ پر درود پڑھے اور اپنے لیے دنیا اور آخرت کے معاملے میں سے جو چاہے سوال کرے۔ پھر روزے کی حالت میں صبح کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی ساری دعائیں قبول کرے گا سوائے اس دعا کے جو نافرمانی کے لیے ہو۔''[1]

ستائیس رجب کو شب معراج کے طور پر منانا کسی بھی طرح صحیح نہیں، ایک تو یہ کہ اس کے شب معراج ہونے ہی میں شدید اختلاف ہے جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا جا چکا۔ دوسرے یہ کہ اسے روایتی رسم و رواج کے طور پر منانا اور ذکر و عبادت کے لیے خاص کرنا بدعت ہے۔[2] شیخ محمد امین شنقیطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عوام 27 رجب کے شبِ معراج ہونے کی بنیاد پر اس میں جو کچھ کرتے ہیں، یہ باطل پر مبنی ایک بدعت ہے۔ ہم نے اسے بدعت اس لیے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ کام نہیں کیا اور نہ اسے کرنے کا حکم دیا۔ آپ کے خلفائے راشدین نے بھی ایسا نہیں کیا۔ تمام بھلائی اور ہدایت صرف رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلفائے راشدین ہی کی پیروی میں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی صحیح اور حسن سند سے یہ بات ثابت نہیں کہ اسراء رجب کے مہینے میں ہوا تھا۔ اس کے بارے میں جو کچھ منقول ہے، اس کی کوئی اصل نہیں۔[3] ابوشامہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض قصہ گو حضرات جو ذکر کرتے ہیں کہ اسراء رجب کے مہینے میں ہوا تھا، یہ بات اہلِ جرح و تعدیل کے نزدیک سفید جھوٹ ہے۔[4]

اگر شب معراج میں کوئی خاص عبادت کرنا فضیلت کا باعث ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ وہ عبادت ضرور کرتے کیونکہ وہ تو سب سے زیادہ نیکیوں کے حریص تھے اور خوب جانتے تھے کہ واقعۂ معراج کس رات ہوا تھا۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ شب معراج کے مہینے، عشرے اور اس کی اصل کے متعلق کوئی دلیل نہیں بلکہ اس کے بارے میں نقل شدہ روایات منقطع، مختلف اور بے اصل ہیں۔ ان میں سے کوئی روایت ایسی نہیں جسے قطعی قرار دیا جا سکے۔ مسلمانوں کے لیے یہ مشروع نہیں کیا گیا کہ جس رات کو شب معراج باور کیا جاتا ہے، وہ اس کی قیام وغیرہ کے ساتھ تخصیص کریں۔ وہ مزید فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں ڈھونڈے سے بھی کوئی ایسا شخص نہیں مل سکا جس نے شب معراج کو کسی دوسری رات بالخصوص لیلۃ القدر پر فضیلت دی ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ شب معراج کو کسی عمل کے لیے مخصوص نہیں کرتے تھے، نہ اس کا کوئی ذکر کرتے تھے، اسی لیے سرے سے یہ معلوم ہی نہیں کہ یہ کون سی رات ہے۔ اسراء و معراج اگرچہ نبی اکرم ﷺ کے بہت عظیم فضائل میں سے ہے لیکن اس کے باوجود اس کے لیے وقت اور جگہ متعین کر کے اسے کسی شرعی عبادت

---

[1] شعب الإيمان للبيهقي: 374/3، الآثار المرفوعة والأخبار الموضوعة، ص: 61، تنزيه الشريعة: 102/2. [2] دیکھیے: السنن والمبتدعات، ص: 143. [3] منهج التشريع الإسلامي و حكمته، ص: 12. [4] الباعث على إنكار البدع، ص: 74.

کے ساتھ خاص کرنا جائز نہیں رکھا گیا۔ [1]

واقعہ اسراء و معراج

معزز قارئین! اب تک آپ اس واقعے کے حوالے سے مختلف پہلوؤں سے ضروری مباحث پڑھ چکے ہیں۔ اب ہم اصل واقعے کی طرف آتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ اسراء و معراج کی کوئی روایت ایسی نہیں جس میں اس سفر کے تمام واقعات بہ تمام و کمال موجود ہوں۔ ہر روایت میں الگ الگ طور پر مختلف واقعات کا تذکرہ اور ان کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں۔ ہم نے اسراء و معراج کی صحیح اور معتبر روایات کو الگ الگ بیان کرنے کے بجائے ممکن حد تک جمع کیا ہے اور اسراء و معراج کو خوبصورت اور دلکش انداز میں واقعاتی ترتیب دینے کی کوشش کی ہے تاکہ آپ کو دورانِ مطالعہ کوئی الجھن محسوس نہ ہو۔ آپ اسے بے تکلف پڑھتے چلے جائیں اور ساتھ ساتھ اس کے ہر پہلو پر غور و فکر کر کے اپنے لیے حکمت و بصیرت کے موتی بھی چنتے جائیں۔

تین فرشتوں کی آمد

وحی آنے سے پہلے ایک رات رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تین فرشتے آئے۔ آپ مسجد حرام میں سوئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا: ان (سوئے ہوئے لوگوں) میں سے محمد ﷺ کون ہیں؟ دوسرے نے جواب دیا: وہ ان میں سب سے بہتر ہیں۔ تیسرے نے کہا: ان میں جو سب سے بہتر ہیں، انھیں لے لو۔ اس رات بس اتنا ہی واقعہ پیش آیا۔ [2]

بعد ازاں بعثت کے بارہویں سال ایک ایسی رات آئی جو اپنے دامن میں ایک حیرت انگیز اور غیر معمولی واقعہ چھپائے ہوئے تھی۔ یہ رات عام راتوں کی طرح نہ تھی۔ اس جیسی رات آپ کی مبارک زندگی میں پھر کبھی نہیں آئی۔ ہوا یوں کہ آپ عشاء کی نماز کے بعد حسب معمول اپنے کاشانۂ مبارک میں آرام فرمانے کی غرض سے لیٹے ہوئے تھے۔ اچانک آپ کے گھر کی چھت کھلی۔ فرشتوں کے سردار جبریل علیہ السلام چھت سے نیچے اترے۔ ان کا اس طرح آنا خلافِ معمول تھا۔ وہ آپ کو وہاں سے اٹھا کر مسجد حرام میں لے آئے۔ اس میں یہ اشارہ بھی تھا کہ اسی طرح آپ کا سینہ مبارک چاک کیا جائے گا۔ اس کے بعد آپ حطیم میں نیند اور بیداری کی درمیانی حالت میں لیٹے ہوئے تھے۔ آپ کے علاوہ یہاں اور لوگ بھی سو رہے تھے۔ اتنے میں آپ نے ایک کہنے والے کو یہ کہتے ہوئے

[1] زادالمعاد: 58,57/1. [2] صحیح البخاري: 7517.

سنا: دو آدمیوں کے درمیان تیسرے (محمد ﷺ) ہیں۔ پھر وہ آپ کے پاس آئے اور آپ کو زمزم کے کنویں کے پاس لے گئے۔[1]

شقِ صدر

بعدازاں جبریل علیہ السلام نے سرور کائنات ﷺ کا سینہ مبارک چاک کیا۔ پھر اسے زمزم کے پانی سے دھویا۔ اس کے بعد وہ سونے کا ایک طشت لائے جو ایمان وحکمت سے بھرا ہوا تھا۔ اسے آپ کے سینے میں انڈیل دیا، پھر سینہ بند کر دیا۔[2]

شق صدر سے آپ نے کوئی تکلیف محسوس کی نہ آپ کسی خوف کا شکار ہوئے۔ اس سے پہلے بھی آپ ﷺ کا سینہ تین بار چاک کیا جا چکا تھا جیسا کہ ہم پیچھے ''رسول اللہ ﷺ کا لڑکپن اور شق صدر'' کے زیرِ عنوان بیان کر آئے ہیں۔ اس موقع پر شق صدر اس عظیم سفر کی تیاری کے لیے تھا جس پر آپ چند ہی لمحوں کے بعد روانہ ہونے والے تھے۔ یہ شق صدر اس لیے ہوا کہ آپ کا قلب اطہر عالم ملکوت کی سیر، تجلیات الٰہیہ اور آیاتِ ربانیہ کا مشاہدہ کرنے کے قابل ہو جائے اور آپ اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے کے اہل ہو جائیں۔ یہ سفر کس طرح ہوا؟ یہ جاننے کے لیے کشاں کشاں ہمارے ساتھ آگے چلتے رہیں۔

براق پر سواری

اللہ تعالیٰ چاہتا تو آپ کو اپنی قدرت کاملہ سے کسی سواری کے بغیر ہی بیت المقدس پہنچا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ آپ کے لیے ایک بے مثال سواری بھیجی۔ سواری کا یہ انتظام آپ ﷺ کے شرف وفضیلت میں اضافے کے لیے کیا گیا تھا۔ یہ ایسا ہی عمل تھا جیسے بادشاہ کسی معزز شخصیت کو اپنے دربار میں بلاتا ہے تو اپنے شایانِ شان اس کی تکریم وتوقیر بڑھانے کا اہتمام کرتا ہے۔ سرور کائنات ﷺ کو تو شہنشاہ کائنات نے ایسی سیر کے لیے بلایا تھا جس کی پیشتر یا مابعد کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے یہ سب انتہائی حیرت انگیز اور یگانہ انتظامات کیے۔ سیر پر روانگی کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں براق لایا گیا۔ اس کی زین کسی ہوئی تھی اور لگام پڑی ہوئی تھی۔ یہ سفید رنگ کا بڑا خوبصورت جانور تھا، گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا۔ اس کی برق رفتاری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنا سم وہاں رکھتا تھا جہاں تک اس کی نگاہ پہنچتی تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ

[1] صحيح البخاري: 3887، صحيح مسلم: 164. [2] صحيح البخاري: 3342 و 3887 و 7517، صحيح مسلم: 164,163.

اس کی نگاہ کی آخری حد کیا تھی۔ انسان اس عجیب و غریب مخلوق کی برق رفتاری کا اندازہ لگانے سے عاجز ہیں۔ سرور کائنات ﷺ براق پر سوار ہونے کے لیے ابھی پا بہ رکاب تھے کہ وہ اچانک شوخی کرنے لگا۔ جبریل علیہ السلام نے اس سے کہا:

«أَبِمُحَمَّدٍ تَفْعَلُ هٰذَا؟ فَمَا رَكِبَكَ أَحَدٌ أَكْرَمُ عَلَى اللّٰهِ مِنْهُ»

''ارے! کیا تو محمد ﷺ کے ساتھ اس طرح کر رہا ہے؟ (تو کیا جانے) تجھ پر کبھی کوئی ایسی ہستی سوار ہی نہیں ہوئی جو اللہ کی بارگاہ میں ان سے زیادہ معزز ہو۔''

یہ سن کر براق ایسا سہما کہ پسینے سے شرابور ہو گیا۔ [1] براق کو بھی اپنی خوش نصیبی کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ آج مجھے کس قدر عظیم اور بابرکت ہستی کی سواری بننے کا شرف و اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔ وہ اپنی قسمت پر کتنا ناز کر رہا ہوگا۔ آپ ﷺ اس پر سوار ہو گئے۔ وہ آپ کو لے کر روانہ ہو گیا۔ [2] براق پر آپ ﷺ کے ساتھ جبریل علیہ السلام بھی سوار تھے۔ [3]

موسیٰ علیہ السلام کی قبر سے نبی ﷺ کا گزر

راستے میں آپ کا گزر جلیل القدر پیغمبر موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کی قبر سے ہوا۔ اس کا تذکرہ رسالت مآب ﷺ ہی کی میٹھی اور مقدس زبان سے سنیے:

«مَرَرْتُ عَلٰى مُوسٰى لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِي عِنْدَ الْكَثِيبِ الْأَحْمَرِ، وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي قَبْرِهِ»

''میں اسراء کی رات سرخ ریت کے ٹیلے کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) پر سے گزرا۔ وہ اپنی قبر میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔'' [4]

اس حدیث میں یہ بات واضح نہیں کہ آپ کا یہ گزر بیت المقدس کی طرف جاتے ہوئے ہوا یا معراج سے واپسی پر ہوا۔ [5] موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قبر میں نماز پڑھنا زمین پر نماز پڑھنے کی طرح نہیں، اس لیے کہ برزخی زندگی ہماری دنیوی زندگی سے مختلف ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو بات بیان ہوئی ہے، وہ برزخی زندگی کے احوال میں سے ایک حالت ہے۔ اس کی کیفیت کیا ہے؟ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم صرف اتنی بات پر ایمان رکھتے ہیں جتنی رسالت مآب ﷺ نے ہمیں بتائی ہے۔ عالم برزخ میں انسان مکلف نہیں ہوتا لیکن اس میں

[1] جامع الترمذي: 3131. [2] صحيح مسلم: 162، مسند أحمد: 149،148/3. [3] مسند أحمد: 394/5. [4] صحيح مسلم: 2375 [5] الفتح الرباني: 104/20.

عمان
رام اللہ
اریحا
دریائے اردن
بیت المقدس (القدس)
کثیب احمر (کوہ نبو)
قمران کے غار
مادبا
جبلِ بنا (سیاغہ)
بیت لحم
کلومیٹر
100
75
50
25
0
زرقا
بحیرۂ مردار
ذیبان
فلسطین
اردن
وادی الہیدان
اللسان
الکرک
غور الصافی
وادی عربہ
الطفیلہ
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مدفن
موسیٰ علیہ السلام کا مدفن (الکثیب الاحمر) جبل بنا پر واقع ہے
جو قصبہ مادبا سے دس کلومیٹر شمال مغرب میں ہے۔ ان
دنوں اس مقام کو سیاغہ کہا جاتا ہے۔

تعجب کی کوئی بات نہیں کہ میت کے بعض نیک اعمال جن کا وہ دنیا کی زندگی میں عادی ہو، برزخ میں اس کی طرف لوٹا دیے جاتے ہوں۔ دنیا والوں کو اس کا شعور نہیں ہوتا الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ معجزے کے طور پر کسی کو دکھانا چاہے تو دکھا دے۔ برزخی احوال دنیوی زندگی کے پیمانے سے نہیں ناپے جاتے۔ نہ ان پر کسی چیز کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور نہ ان سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے بلکہ ان پر اسی طرح ایمان رکھا جاتا ہے جس طرح اس بات پر ایمان رکھا جاتا ہے کہ مومن اور متقی اپنی قبروں میں خوش حال ہوتے ہیں اور کافر اور فسادی لوگوں کو عذاب دیا جاتا ہے۔[1]

بیت المقدس میں تشریف آوری

مسجد حرام سے بھی براہِ راست آسمانوں کی سیر کے لیے جایا جاسکتا تھا لیکن اللہ رب العزت کی حکمت یہ تھی کہ آپ کو پہلے بیت المقدس کی سیر کرائی جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ جبریل علیہ السلام کی معیت میں براق پر سفر کرتے ہوئے نہایت شان و شوکت کے ساتھ بیت المقدس پہنچ گئے۔ بیت المقدس ایک ایسی سرزمین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بہت سی برکتوں سے نواز رکھا ہے۔ اسے کئی انبیاء علیہم السلام کا مسکن اور ان کی ہجرت گاہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ ایک عرصے تک اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اس اعتبار سے وہ مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے۔ آپ ﷺ کی بیت المقدس میں تشریف آوری سے اس سرزمین کو چار چاند لگ گئے، مسجد اقصیٰ کی اہمیت بہت اجاگر ہوگئی اور مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کے درمیان گہرا تعلق بھی ثابت ہوگیا۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ جس طرح وہ مسجدِ حرام کی تعظیم کرتے ہیں اور اس سے محبت کرتے ہیں، اسی طرح وہ مسجد اقصیٰ سے بھی محبت کریں اور اس کا احترام کریں۔ جس طرح بیت اللہ کو بتوں کی نجاست اور دیگر شرکیہ اعمال سے پاک رکھنا ان کی ذمہ داری ہے، اسی طرح مسجد اقصیٰ کو بھی شرک و کفر سے پاک کرنا اور شکنجۂ یہود سے آزاد کرانا انھی کی ذمہ داری ہے۔ آج مسلمانوں کو اپنی اس ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے سوچنا چاہیے کہ بیت المقدس کو ظالم یہودیوں کے خونی پنجوں سے کس طرح آزاد کرایا جاسکتا ہے! ساتھ ہی ساتھ انھیں اس مقصد کے لیے ہر ممکن کوشش بھی کرنی چاہیے۔
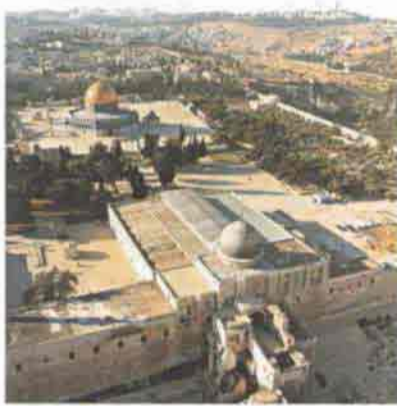
بیت المقدس کا فضائی منظر جس میں مسجد اقصیٰ کا سرمئی گنبد اور قبۃ الصخرہ کا سنہری گنبد نمایاں ہیں

[1] دیکھیے: منة المنعم: 68/4.
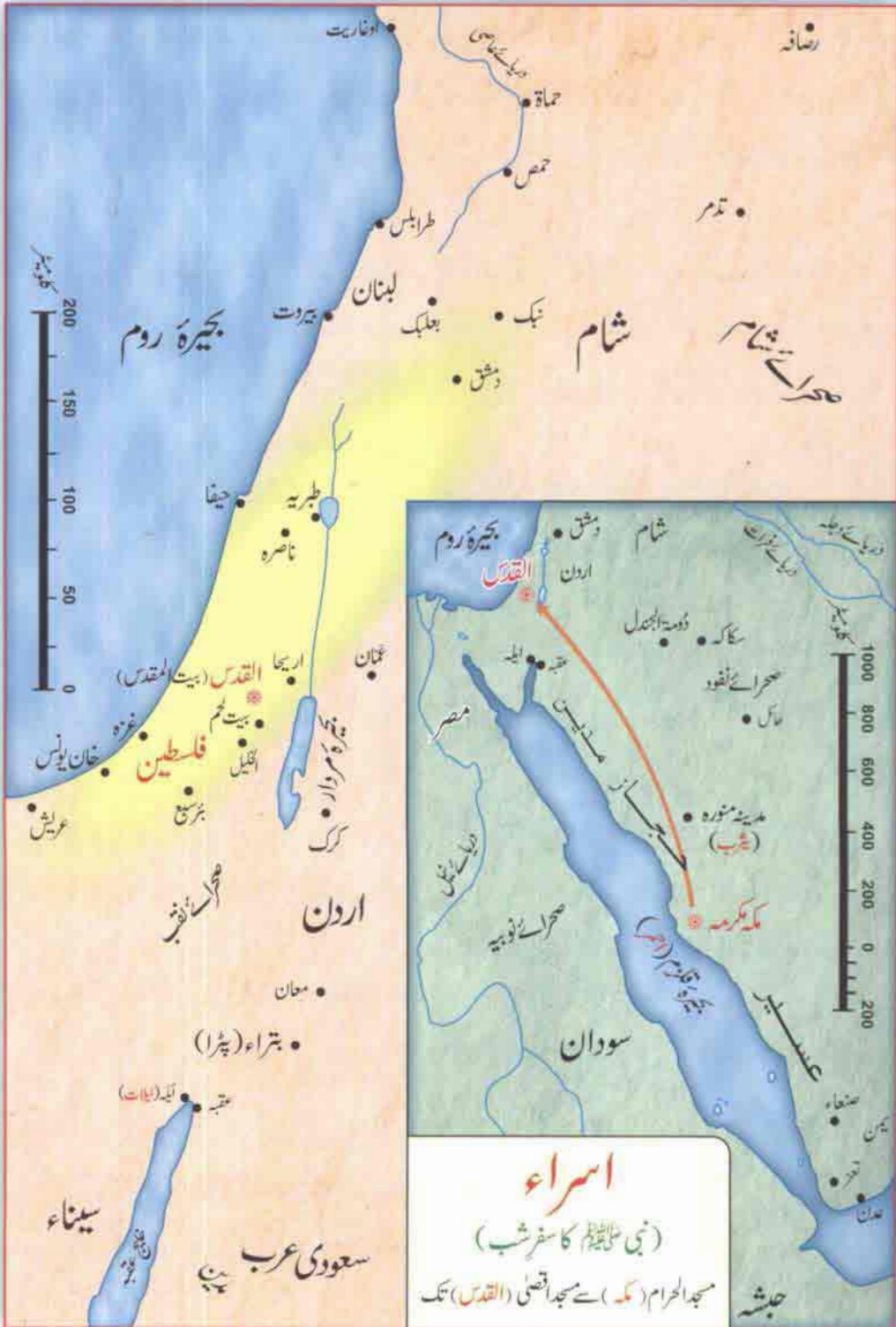
رسول اللہ ﷺ نے براق کو باقاعدہ باندھا

سرورِ کائنات ﷺ نے بیت المقدس پہنچ کر براق کو اس حلقے سے باندھ دیا جس حلقے سے انبیاء ﷺ اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے۔[1] ایک اور روایت میں ہے کہ براق کو جبریل علیہ السلام نے باندھا تھا، چنانچہ آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِي انْتَهَيْتُ إِلَى بَيْتِ الْمَقْدِسِ، فَخَرَقَ جِبْرِيلُ الصَّخْرَةَ بِإِصْبَعِهِ، وَشَدَّ بِهَا الْبُرَاقَ»

''جس رات مجھے اسراء کرائی گئی، میں بیت المقدس پہنچا۔ جبریل علیہ السلام نے اپنی انگلی سے چٹان میں سوراخ کیا اور براق کو اس سوراخ کے ساتھ باندھ دیا۔''[2]

علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے نہایت خوبصورت انداز میں ان دونوں روایتوں کے درمیان جمع و تطبیق کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ادب و احترام کے پیشِ نظر سابقہ انبیاء ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے پہلے براق کو حلقے سے باندھا، پھر جبریل علیہ السلام نے اسے حلقے سے کھولا اور چٹان میں سوراخ کر کے وہاں باندھ دیا۔[3]

براق کے بھاگ جانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تو اسے آپ ﷺ کے لیے مسخر کر دیا تھا لیکن پھر بھی براق کو باندھنے کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں ہمارے لیے یہ سبق پوشیدہ ہے کہ ظاہری اسباب کو بروئے کار لا کر اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنا چاہیے۔ یہی حقیقی توکل ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور اسبابِ کار کے لیے کوئی محنت ہی نہ کریں۔ اسباب اختیار کرنے کا حکم ہمیں خود اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی نے دیا ہے، تاہم اسباب پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ بھروسا صرف اللہ کی ذاتِ عالی ہی پر کرنا چاہیے۔ کامیابی کا سارا دار و مدار صرف اسباب ہی پر سمجھ لینا بہت گمراہ کن غلطی ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔ اسباب کو بروئے کار لاتے ہوئے ہماری نظر ہر آن ہر گھڑی اللہ ہی کی رحمت و نصرت پر ہونی چاہیے۔ کسی عارف حقیقت شاعر نے توکل کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا ہے ؎

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا — پھر انجام اس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر

بیت المقدس میں انبیائے کرام ﷺ کی امامت

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ مسجد اقصیٰ میں داخل ہوئے اور دو رکعتیں ادا فرمائیں۔[4] ایک اور روایت میں

[1] صحيح مسلم: 162. [2] جامع الترمذي: 3132، صحيح ابن حبان (الإحسان): 128/1، واللفظ له. [3] شرح المواهب للزرقاني: 103/8. [4] صحيح مسلم: 162.

ہے کہ پھر بیت المقدس میں انبیائے کرام علیہم السلام کو اکٹھا کیا گیا اور تمام انبیائے کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں نماز پڑھی۔ [1] صحیح مسلم کی حدیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«فَحَانَتِ الصَّلَاةُ فَأَمَمْتُهُمْ»

''نماز کا وقت ہوا تو میں نے ان کی امامت کروائی۔'' [2]

بعض علماء کا کہنا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے واپسی پر انبیائے کرام علیہم السلام کے اجتماع میں شامل ہوئے اور آپ نے ان کی امامت کرائی تھی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی کو زیادہ مناسب قرار دیا ہے۔ [3] اس کے برعکس حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیادہ واضح بات یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج سے پہلے جماعتِ انبیاء علیہم السلام کی امامت کرائی تھی۔ [4]

بہرحال بیت المقدس میں سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کا اکٹھے ہونا اور خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کرنا اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ سب نبوتیں ایک ہی سرچشمۂ ہدایت سے پھوٹتی ہیں اور ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔ اسی طرح سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا انبیاء علیہم السلام کی امامت کرانا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت اور پیشوائی کو تسلیم کر رکھا ہے اور اسلام نے سابقہ شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ لہٰذا اب سابقہ انبیاء علیہم السلام کی امتوں کو بھی چاہیے کہ وہ آپ کی قیادت و رسالت کو تسلیم کر لیں۔ اس میں ان حضرات کے لیے بڑی عبرت ہے جو تقاربِ ادیان یا اتحاد بین المذاہب کے علمبردار بنے ہوئے ہیں اور اس کے لیے بڑی تگ و دو اور بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں۔ انھیں مذکورہ بالا حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے اور بلا امتیاز تمام لوگوں کو رسالت محمدی اور قیادت نبوی کے جھنڈے تلے آنے کی دعوت دینی چاہیے کیونکہ اب تا ابد شریعتِ محمدی ہی جاری و ساری رہے گی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دودھ کو منتخب فرمانا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ اقصیٰ سے نکلے تو جبریل علیہ السلام نے آپ کی خدمت میں شراب اور دودھ کے دو پیالے پیش کیے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند پر موقوف تھا کہ آپ ان میں سے کوئی ایک پیالہ لے کر نوش فرمائیں۔ آپ نے پہلے تو ان دونوں پیالوں کی طرف دیکھا، پھر دودھ والا پیالہ اُٹھا کر نوش فرما لیا۔ یہ دیکھ کر جبریل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا

[1] تفسير الطبري، بني إسرآءيل 17:1. [2] صحيح مسلم: 172. [3] البداية والنهاية (محقق): 343/3 و 345. [4] فتح الباري: 262/7.

کرتے ہوئے کہا:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِي هَدَاكَ لِلْفِطْرَةِ، وَلَوْ أَخَذْتَ الْخَمْرَ غَوَتْ أُمَّتُكَ»

''سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے آپ کو فطرت کی ہدایت عطا فرمائی۔ اگر آپ شراب کا پیالہ اُٹھا لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔''[1]

جبریل علیہ السلام کے درج بالا ارشاد میں فطرت سے مراد اسلام اور استقامت ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اسلام اور استقامت کی علامت کو اختیار فرمایا۔ دودھ کو اسلام اور استقامت کی علامت اس وجہ سے بنایا گیا کہ وہ پینے میں سہل، پاکیزہ، عمدہ، خوشگوار اور صحت بخش نتائج والا ہے۔ اس کے برعکس شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے اور حال اور مآل دونوں میں طرح طرح کی برائیوں کو جنم دیتی ہے۔[2]

اس کے علاوہ دودھ اپنی اصلیت پر قائم ہے اور فطری غذا ہے۔ انسان کی صنعت گری کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ جبکہ شراب انگور یا دوسرے نشیلے مادوں میں کیمیائی تبدیلی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ مزید برآں یہ خود انسان کی اپنی ترکیب اور طور طریقوں سے بنائی ہوئی چیز ہے۔ شراب میں غذائیت بھی نہیں ہوتی بلکہ الٹا یہ انسان کی فطرت کو مسخ اور عقل کو زائل کر دیتی ہے۔ انھی نقصانات کی وجہ سے اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا ہے۔ دودھ کی افادیت، اہمیت اور فضیلت کا اس سے بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دودھ کا تذکرہ نہایت فکر انگیز اور بصیرت افروز پیرائے میں کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝﴾

''اور بے شک چوپایوں میں بھی تمھارے لیے عبرت (غور و فکر کا بڑا سامان) ہے۔ ہم تمھیں ان کے پیٹوں کے اندر گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔''[3]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بھی دودھ کی فضیلت و افادیت بیان فرمائی ہے:

«عَلَيْكُمْ بِأَلْبَانِ الْبَقَرِ، فَإِنَّهَا تَرُمُّ مِنْ كُلِّ شَجَرٍ وَهُوَ شِفَاءٌ مِنْ كُلِّ دَاءٍ»

''گائے کا دودھ ضرور پیا کرو، اس لیے کہ گائیں ہر درخت سے کھاتی ہیں اور دودھ ہر بیماری سے

[1] صحيح البخاري: 5576، صحيح مسلم: 162. [2] شرح النووي على صحيح مسلم: 2/277. [3] النحل 16:66.

شفا ہے۔“ [1]

رسول اللہ ﷺ کا دودھ والا پیالہ تھام لینا اور جبریل علیہ السلام کا یہ کہنا کہ آپ نے فطرت کو اختیار کیا ہے، اس امر کا غماز ہے کہ درحقیقت اسلام ہی دین فطرت ہے اور یہ انسان کے باطن کی آواز ہے۔ فطرت اور دین دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام انسان کی ہر جبلی ضرورت کی تکمیل فرماتا ہے اور اس کے تمام مسائل بخیر وخوبی حل کرتا ہے، فی الجملہ اسلام تمام جائز خواہشات کا احترام کرتا اور حد سے تجاوز اور خودسری کو لگام دیتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ ﴾

”پس (اے نبی!) آپ یکسو ہو کر اپنا رخ دین حنیف کی طرف سیدھا کر لیجیے۔ دینِ فطرت کی پیروی کیجیے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی پیدائش کو کسی طرح بدلنا (جائز) نہیں، یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“ [2]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ، كَمَا تُنْتَجُ الْبَهِيمَةُ بَهِيمَةً جَمْعَاءَ، هَلْ تُحِسُّونَ فِيهَا مِنْ جَدْعَاءَ؟»

”ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے۔ پس اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ جس طرح جانور صحیح وسالم بچہ جنم دیتا ہے۔ کیا تم اس میں کوئی ناک کان کٹا (بچہ) دیکھتے ہو؟“

یہ حدیث سنا کر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مذکور بالا آیت مبارکہ کی تلاوت فرماتے تھے۔ [3]

آسمانوں کی سیر

اب اِس سے آگے ایک نئے سفر کا آغاز ہوا۔ اسے ہم معراج کہتے ہیں۔ اس موقع پر جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کا دست مبارک تھاما اور آپ کو اپنے ساتھ لے کر آسمانِ دنیا پر چڑھ گئے۔ بعض روایات میں سیڑھی فراہم کرنے کا ذکر ہے کہ آپ اس پر چڑھ کر آسمان پر پہنچے لیکن ایسی سب روایات ضعیف ہیں۔ [4] وہاں پہنچ کر جبریل علیہ السلام نے آسمان

[1] المستدرك للحاكم: 403/4، السلسلة الصحيحة: 1943. [2] الروم 30:30. [3] صحيح البخاري: 1358. [4] السيرة لابن هشام (محقق): 13/2، رقم: 400، دلائل النبوة للبيهقي: 390/2-396، تفسير ابن كثير، بني إسرآءيل 1:17.

جبریل علیہ السلام نے آسمان دنیا کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھٹکھٹایا اور آسمان کے دربان سے کہا: دروازہ کھولو۔

اس نے پوچھا: کون ہے؟

جبریل علیہ السلام نے جواب دیا: میں جبریل ہوں۔

دربان نے پوچھا: کیا آپ کے ساتھ کوئی ہے؟

جبریل علیہ السلام نے کہا: ہاں، میرے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

دربان نے دریافت کیا: کیا آپ کو انھیں بلانے کے لیے بھیجا گیا تھا؟

جبریل علیہ السلام نے کہا: ہاں۔

یہ سن کر دربان اور دیگر فرشتوں نے بے حد مسرت کا اظہار کیا اور کہا:

«فَمَرْحَبًا بِهِ وَ أَهْلًا، وَلَنِعْمَ الْمَجِيءُ جَاءَ»

''خوش آمدید! آپ اپنے ہی لوگوں میں تشریف لائے ہیں۔ آنے والے کیا ہی اچھے ہیں۔''

دربان نے دروازہ کھول دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر فرشتے خوشی سے نہال ہو رہے تھے۔ آسمان میں ایک عجب سماں تھا۔ دربان نے جبریل علیہ السلام سے جو درج بالا سوالات پوچھے، ان سے یہ حقیقت پوری طرح روشن ہے کہ غیب فرشتے بھی نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ زمین میں جس کام کا ارادہ کرتا ہے، اس کی خبر فرشتوں کو بھی نہیں ہوتی جب تک کہ خود اللہ تعالیٰ انھیں آگاہ نہ فرما دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبریل علیہ السلام کی معیت میں آسمانِ دنیا پر تشریف لے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے دائیں طرف بھی لوگوں کی جماعتیں موجود ہیں اور بائیں طرف بھی۔ جب وہ اپنے دائیں جانب دیکھتا ہے تو ہنستا ہے اور بائیں طرف دیکھتا ہے تو روتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا: ''یہ کون ہیں؟''

جبریل علیہ السلام نے جواب دیا: یہ آپ کے والد آدم (علیہ السلام) ہیں۔ ان کے دائیں اور بائیں جو جماعتیں ہیں، وہ ان کی اولاد کی روحیں ہیں۔ ان میں سے دائیں طرف والے جنتی اور بائیں طرف والے جہنمی ہیں۔ جب یہ اپنے دائیں جانب دیکھتے ہیں تو خوشی سے ہنستے ہیں اور جب بائیں جانب دیکھتے ہیں تو رنج کے مارے رونے لگتے ہیں۔

جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ انھیں سلام کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سلام کیا تو انھوں نے آپ کے سلام کا جواب دیا اور کہا:

«مَرْحَبًا وَّ أَهْلًا يَا بُنَيَّ! نِعْمَ الْاِبْنُ أَنْتَ»

''پیارے بیٹے! خوب اچھے آئے اور اپنے ہی لوگوں میں آئے ہو۔ تم کتنے اچھے بیٹے ہو۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ آدم علیہ السلام نے کہا:

«مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَالْاِبْنِ الصَّالِحِ»

''نیک پیغمبر اور نیک بیٹے کو خوش آمدید!''

اس کے ساتھ ساتھ آدم علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھلائی کی دعا بھی کی۔ [1] آپ انھیں الوداع کر کے آگے بڑھ گئے۔

اب جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر دوسرے آسمان کی طرف چڑھے اور اس کے دربان سے کہا: دروازہ کھولو۔ دربان نے پوچھا: کون ہے؟ انھوں نے جواب دیا: جبریل۔ دربان نے کہا: آپ کے ساتھ کون ہے؟ انھوں نے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ اس نے پوچھا: کیا آپ کو انھیں بلانے کے لیے بھیجا گیا تھا؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ چنانچہ دربان اور دیگر فرشتوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی طرح استقبال کیا جس طرح پہلے آسمان والوں نے کیا تھا۔ دربان نے دروازہ کھولا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبریل علیہ السلام کے ساتھ دوسرے آسمان میں داخل ہو گئے۔ آپ نے وہاں یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دیکھا۔ یہ دونوں پیغمبر خالہ زاد بھائی ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے ان کا تعارف کراتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

«هٰذَا يَحْيٰى وَ عِيسٰى فَسَلِّمْ عَلَيْهِمَا»

''یہ یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام ہیں۔ انھیں سلام کیجیے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے آپ کے سلام کا جواب دیا اور کہا:

«مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ»

''نیک بھائی اور صالح نبی کو خوش آمدید۔'' [2]

انھوں نے آپ کے لیے بھلائی کی دعا بھی کی۔ [3] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسیٰ علیہ السلام کا وہ حلیہ بھی بیان فرمایا ہے جو آپ نے معراج کی رات دیکھا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام میانے قد والے، سرخ و سفید اور قدرے

[1] صحیح البخاري: 349 و 3207 و 3887 و 7517، صحیح مسلم: 163,162. [2] صحیح البخاري: 349 و 3887 و 7517. [3] صحیح مسلم: 162.

گھونگریالے بالوں والے تھے، گویا ابھی غسل خانے سے نکلے ہوں۔ لوگوں میں ان سے سب سے زیادہ مشابہت والے عروہ بن مسعود ثقفی (رضی اللہ عنہ) ہیں۔ [1]

پھر جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر تیسرے آسمان پر چڑھے اور دروازہ کھولنے کو کہا۔ وہاں کے دربان نے بھی ان سے وہی کچھ پوچھا جو پہلے اور دوسرے آسمان کے دربان نے پوچھا تھا۔ پھر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش آمدید کہا اور دروازہ کھول دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہاں ایک ایسے جلیل القدر پیغمبر سے ملاقات ہوئی جنھیں رب کائنات نے آدھے حسن و جمال سے نواز رکھا تھا۔ ان کے والد، دادا اور پردادا بھی جلیل القدر نبی تھے۔ یہ سیدنا یوسف علیہ السلام تھے۔ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا تعارف کرایا اور عرض کیا:

«هٰذَا يُوسُفُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ»

''یہ یوسف (علیہ السلام) ہیں۔ انھیں سلام کیجیے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا:

«مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ»

''نیک برادر اور نیک پیغمبر کو خوش آمدید!''

یوسف علیہ السلام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دعائے خیر بھی کی۔

پھر جبریل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر چوتھے آسمان پر چڑھے اور دربان سے کہا: دروازہ کھولو۔ دربان نے ان سے وہی کچھ پوچھا جو پچھلے آسمانوں کے دربانوں نے پوچھا تھا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش آمدید کہا اور دروازہ کھول دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچے تو آپ نے ادریس علیہ السلام کو دیکھا۔ جبریل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

«هٰذَا إِدْرِيسُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ»

''یہ ادریس (علیہ السلام) ہیں۔ آپ انھیں سلام کریں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سلام کیا تو انھوں نے آپ کے سلام کا جواب دیا اور کہا:

«مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ»

''نیک بھائی اور نیک نبی کو خوش آمدید!''

ادریس علیہ السلام نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دعائے خیر کی۔ یہ بات بیان کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادریس علیہ السلام کی

[1] صحيح البخاري: 3394، صحيح مسلم: 165 و 168 و 172.

عظمت وفضیلت پر مشتمل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مبارک تلاوت کیا:

﴿وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝﴾ (مریم 19:57)

''اور ہم نے اسے ایک بلند مقام پر اٹھالیا۔''[1]

اس کے بعد جبریل علیہ السلام نبی اکرم ﷺ کو پانچویں آسمان پر لے کر چڑھے اور دروازہ کھولنے کو کہا۔ یہاں کے دربان نے بھی پچھلے دربانوں کی طرح جبریل علیہ السلام سے سوالات کیے، پھر رسول اللہ ﷺ کو مرحبا کہا اور دروازہ کھول دیا۔ یہاں رسول اللہ ﷺ کی ملاقات ہارون علیہ السلام سے ہوئی۔ یہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بھائی، وزیر اور جانشین پیغمبر تھے۔ جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو ان سے متعارف کراتے ہوئے عرض کیا:

«هٰذَا هَارُونُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ»

''یہ ہارون (علیہ السلام) ہیں۔ انھیں سلام کیجیے۔''

آپ نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا:

«مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ»

''صالح بھائی اور صالح پیغمبر کو مرحبا!''

انھوں نے بھی آپ ﷺ کے لیے بھلائی کی دعا کی۔

پھر جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کو چھٹے آسمان پر لے کر چڑھے اور دربان سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ اس نے بھی وہی کچھ پوچھا جو پچھلے آسمانوں کے دربانوں نے پوچھا تھا، پھر اُسی طرح آپ ﷺ کو مرحبا کہا اور دروازہ کھول دیا۔ آپ ﷺ نے وہاں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا۔ جبریل امین علیہ السلام نے آپ سے عرض کیا:

«هٰذَا مُوسٰى فَسَلِّمْ عَلَيْهِ»

''یہ موسیٰ (علیہ السلام) ہیں۔ انھیں سلام کیجیے۔''

آپ ﷺ نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے آپ کے سلام کا جواب دیا، پھر کہا:

«مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ»

''نیک بھائی اور نیک نبی کو مرحبا!''

[1] صحيح البخاري: 3887، صحيح مسلم: 162.

موسیٰ علیہ السلام نے بھی آپ ﷺ کے لیے دعائے خیر کی۔ جب رسول اللہ ﷺ ان کے پاس سے رخصت ہوکر آگے تشریف لے گئے تو موسیٰ علیہ السلام رونے لگے۔ انھیں آواز دی گئی (اور پوچھا گیا): آپ کیوں رو رہے ہیں؟ انھوں نے اپنے رونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا:

«رَبِّ! هٰذَا غُلَامٌ بَعَثْتَهُ بَعْدِي، يَدْخُلُ مِنْ أُمَّتِهِ الْجَنَّةَ أَكْثَرُ مِمَّا يَدْخُلُ مِنْ أُمَّتِي»

''اے میرے رب! اس جوان کو تو نے میرے بعد مبعوث کیا ہے۔ اس کی امت کے لوگ میری امت سے زیادہ تعداد میں جنت میں داخل ہوں گے۔'' [1]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

«رَبِّ! لَمْ أَظُنَّ أَنْ تَرْفَعَ عَلَيَّ أَحَدًا»

''میرے رب! میرا خیال نہیں تھا کہ تو کسی کو مجھ سے (بھی زیادہ) بلندی عطا فرمائے گا۔'' [2]

موسیٰ علیہ السلام کا رونا حسد کی وجہ سے نہیں تھا۔ حسد کا تو عالم بالا میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس وجہ سے روئے کہ ان کی رسالت پوری دنیا کے لیے عام نہیں تھی۔ اس لحاظ سے ایک کمال باقی تھا جو انھیں حاصل نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ ان کے دل میں اپنی قوم کا درد بھی تھا۔ ان کی قوم بنی اسرائیل نے ان کے ساتھ نہایت معاندانہ اور مخالفانہ رویہ اختیار کیا تھا، بنا بریں موسیٰ علیہ السلام کو یہ اندیشہ تھا کہ وہ اس قدر بلند درجات کے حامل نہیں ہوسکیں گے جتنے وہ بنی اسرائیل کی اطاعت گزاری اور وفا شعاری کی صورت میں ہو سکتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک نبی کے جتنے زیادہ پیروکار ہوں گے، ان سب کی نیکیوں کا اجر ان کی طرف آنے والے پیغمبر کو بھی ملے گا۔ رسول اللہ ﷺ کو پوری انسانیت کی رشد و ہدایت کے لیے مبعوث کیا گیا اور آپ کی نبوت و رسالت قیامت تک قائم و دائم ہے۔ ہے۔ آپ کے ذریعے سے سلسلۂ نبوت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ آپ کی شریعت بھی انتہائی آسان ہے۔ چنانچہ روزِ قیامت سب سے زیادہ پیروکار آپ ﷺ ہی کے ہوں گے، اس لیے آپ ﷺ ہی کے درجات بھی سب سے زیادہ بلند ہوں گے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اسراء و معراج کے موقع پر چند انبیائے کرام کے پاس سے گزرے۔ ان میں سے بعض کے ساتھ ایک قوم تھی۔ بعض کے ساتھ ایک جماعت تھی اور بعض کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا، یہاں تک کہ آپ کا ایک بڑی جماعت پر سے گزر ہوا۔ آپ نے پوچھا: یہ کون لوگ

[1] صحيح البخاري: 3887، صحيح مسلم: 162 و 164، مسند أحمد: 4/207-209. [2] صحيح البخاري: 7517.

ہیں؟ آپ کو بتایا گیا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم ہے، آپ اوپر سر اٹھا کر دیکھیں۔ آپ نے دیکھا تو ایک بہت بڑی جماعت تھی جس نے دائیں اور بائیں جانب سے افق کو گھیر رکھا تھا۔ آپ سے کہا گیا کہ یہ آپ کی امت ہے اور آپ کی امت میں ان کے علاوہ ستر ہزار اور ہیں جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ [1]

بعض دیگر روایات میں رسول اللہ ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام کا وہ حلیہ بھی بیان کیا ہے جس کا آپ نے معراج کی رات مشاہدہ کیا۔ آپ نے بتایا کہ موسیٰ علیہ السلام دبلے پتلے، گھونگریالے بالوں والے، گندمی رنگ کے اور لمبے قد والے تھے گویا کہ وہ ازدشنوءہ قبیلے میں سے ہوں۔ [2]

پھر جبریل علیہ السلام آپ کو ساتویں آسمان پر لے کر چڑھے۔ یہ آخری آسمان تھا۔ انھوں نے دربان سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ اس دربان نے بھی پچھلے آسمانوں کے دربانوں کی طرح سوالات پوچھے، پھر رسول اللہ ﷺ کو مرحبا کہا اور دروازہ کھول دیا۔ وہاں پہنچ کر آپ ﷺ کی ملاقات اپنے جدامجد سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔ وہ بیت المعمور کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا:

«هٰذَا أَبُوكَ إِبْرَاهِيمُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ»

''یہ آپ کے باپ ابراہیم (علیہ السلام) ہیں۔ انھیں سلام کریں۔''

رسول اللہ ﷺ نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیا اور کہا:

«مَرْحَبًا بِالْاِبْنِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ»

''نیک بیٹے اور نیک پیغمبر کو خوش آمدید!'' [3]

ابراہیم علیہ السلام آپ کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آئے۔ انھوں نے آپ کی امت سے بھی بے پناہ محبت اور ہمدردی و خیر خواہی کا اظہار کیا اور ان کے لیے اپنا سلام اور نہایت بیش قیمت اذکار کے تحفے بھی روانہ کیے۔ انھوں نے آپ ﷺ سے فرمایا:

«يَا مُحَمَّدُ! أَقْرِئْ أُمَّتَكَ مِنِّي السَّلَامَ، وَ أَخْبِرْهُمْ أَنَّ الْجَنَّةَ طَيِّبَةُ التُّرْبَةِ عَذْبَةُ الْمَاءِ، وَأَنَّهَا قِيعَانٌ، وَ أَنَّ غِرَاسَهَا سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ»

---

[1] جامع الترمذي: 2446، مزید دیکھیے: صحیح البخاري: 5705، صحیح مسلم: 220. البتہ وہاں معراج کا تذکرہ نہیں۔ ایک اور روایت میں معراج کے بجائے حج کے موسم میں یہ واقعہ پیش آنے کا ذکر موجود ہے۔ (مسند أحمد: 403/1) [2] صحیح البخاري: 3394 و 3396، صحیح مسلم: 165 و 168. [3] صحیح البخاري: 3887، صحیح مسلم: 162، مسند أحمد: 209/4.

"اے محمد (ﷺ)! اپنی امت کو میری طرف سے سلام کہیے اور انھیں بتائیے کہ جنت کی مٹی بڑی عمدہ ہے۔ اس کا پانی میٹھا ہے۔ لیکن وہ چٹیل میدان ہے۔ اس کی شجر کاری سبحان اللہ (اللہ پاک ہے)، الحمدللہ (تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں)، لا الٰہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں) اور اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) ہے۔" [1]

ایک اور روایت میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا:

«مُرْ أُمَّتَكَ فَلْيُكْثِرُوا مِنْ غِرَاسِ الْجَنَّةِ، فَإِنَّ تُرْبَتَهَا طَيِّبَةٌ وَّ أَرْضَهَا وَاسِعَةٌ»

"اپنی امت کو حکم دیجیے کہ وہ جنت میں خوب شجر کاری کریں، اس لیے کہ اس کی مٹی عمدہ ہے اور اس کی زمین وسیع ہے۔"

رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: «وَمَا غِرَاسُ الْجَنَّةِ؟» "جنت کی شجر کاری کیا ہے؟"

ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا: «لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ»

"برائی سے بچنے اور نیکی کرنے کی طاقت صرف اللہ کی توفیق کے ساتھ ہے۔" [2]

یہ وہی عظیم کلمات ہیں جنھیں سرور کائنات ﷺ نے جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ قرار دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر ابراہیم علیہ السلام کا جو حلیہ دیکھا تھا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

«وَرَأَيْتُ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَأَنَا أَشْبَهُ وُلْدِهِ بِهِ»

"اور میں نے ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا۔ میں ان کی اولاد میں سب سے زیادہ ان کے مشابہ ہوں۔" [3]

بیت المعمور

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کو بیت المعمور (آباد گھر) دکھایا گیا۔ آپ نے جبریل علیہ السلام سے اس کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا:

«هٰذَا الْبَيْتُ الْمَعْمُورُ، يُصَلِّي فِيهِ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ إِذَا خَرَجُوا لَمْ يَعُودُوا إِلَيْهِ آخِرَمَا عَلَيْهِمْ»

[1] جامع الترمذي: 3462. [2] مسند أحمد: 418/5، السلسلة الصحيحة: 216,215/1، تحت الحديث: 105.
[3] صحيح مسلم: 168.

"یہ بیت المعمور ہے۔ اس میں روزانہ ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں۔ جب وہ (ایک مرتبہ نماز پڑھ کر) نکلتے ہیں تو پھر کبھی اس میں دوبارہ داخل نہیں ہوتے۔ یہ ان کا آخری داخلہ ہوتا ہے جو ان پر فرض کیا گیا ہے۔"[1]

اس سے اللہ کی نورانی مخلوق کی عظمت اور کثرت کا اندازہ ہوتا ہے کہ روزانہ ستر ہزار فرشتے بیت المعمور میں عبادت کے لیے آتے ہیں، پھر قیامت تک ان کی باری نہیں آتی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بیت المعمور میں فرشتے عبادت کرتے ہیں اور اس کا طواف کرتے ہیں جس طرح زمین والے اپنے کعبہ کا طواف کرتے ہیں۔ اسی طرح بیت المعمور بھی ساتویں آسمان والوں کا کعبہ ہے۔ اسی وجہ سے نبی ﷺ نے ابراہیم علیہ السلام کو بیت المعمور کے ساتھ اپنی پشت ٹیکے ہوئے پایا کیونکہ وہ زمینی کعبہ کے بانی ہیں اور جزا عمل کی جنس سے ہوتی ہے، یعنی جیسی کرنی ویسی بھرنی (As You Sow, So Shall You Reap)۔ بیت المعمور کعبہ کی سمت میں ہے۔ اسی طرح ہر آسمان میں ایک گھر ہے جس میں اس آسمان والے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور نماز پڑھتے ہیں۔ آسمانِ دنیا میں جو گھر ہے، اسے بیت العزہ کہا جاتا ہے۔ واللہ أعلم.[2]

مختلف روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بیت المعمور کعبہ کی سمت میں ہے۔[3]

بیت معمور کی اہمیت، عظمت اور فضیلت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کی قسم کھائی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالطُّوْرِ ○ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ○ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ○ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ○﴾

"قسم ہے طور (پہاڑ) کی۔ اور ایک کتاب کی (قسم) جو کھلے کاغذ میں لکھی ہوئی ہے۔ اور بیت معمور کی (قسم)۔"[4]

شراب، دودھ اور شہد کی پیش کش

مسجد اقصیٰ سے نکلتے ہوئے آپ ﷺ کو جبریل علیہ السلام نے شراب اور دودھ پیش کیا تھا۔ بعض روایات میں بیت المعمور یا سدرۃ المنتہیٰ پر دوبارہ برتن پیش کیے جانے کا بھی ذکر ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں شراب، دودھ اور شہد سے لبریز برتن پیش کیے گئے۔ آپ ﷺ نے دودھ والا برتن اُٹھا لیا اور اسے نوش فرما لیا۔ جبریل علیہ السلام نے کہا:

---

[1] صحيح البخاري: 3207. [2] تفسير ابن كثير، الطور 52:4. [3] دیکھیے: السلسلة الصحيحة: 1/857-860، تحت الحديث: 477. [4] الطور 52:1-4.

«هِيَ الْفِطْرَةُ الَّتِي أَنْتَ عَلَيْهَا وَ أُمَّتُكَ»

''یہی وہ فطرت ہے جس پر آپ اور آپ کی امت ہیں۔''[1]

صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

«أَصَبْتَ، أَصَابَ اللّٰهُ بِكَ، أُمَّتُكَ عَلَى الْفِطْرَةِ»

''آپ نے فطرت کو پا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ فطرت اور بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔ آپ کی امت فطرت پر ہے۔''[2]

بعض روایات میں پانی کا برتن پیش کیے جانے کا بھی ذکر ہے۔[3] لیکن وہ سب کی سب ضعیف ہیں۔[4]

اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بیت المقدس میں بھی دودھ اور شراب کے برتن پیش کیے گئے تھے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ممکن ہے یہ عمل بیت المقدس میں بھی ہوا ہو اور آسمان میں بھی، اس لیے کہ یہ آنے والے مہمان کی ضیافت کی علامت ہے۔[5] حافظ ابن حجر، علامہ قسطلانی، امام سہیلی، ابن دحیہ اور ابن منیر نے بھی یہی کہا ہے۔[6] ہم نے بھی اسی وجہ سے اس کا دوبارہ تذکرہ کرنا مناسب سمجھا۔

سدرۃ المنتہیٰ

الاحساء کا ایک قصبہ

اس کے بعد اگلی منزل کی طرف روانگی ہوئی۔ جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کو سدرۃ المنتہیٰ لے گئے۔ یہ بیری کا ایک عجیب و غریب درخت تھا۔ اس کا پھل ہَجَر کے مٹکوں کی طرح تھا، جو قدیم بحرین، یعنی سعودی عرب کے مشرقی علاقے الاحساء کا ایک قصبہ ہے، اس کے پتے ہاتھیوں کے کانوں جیسے تھے۔ جبریل علیہ السلام نے آپ کو اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا:

[1] صحیح البخاري: 3887 و 5610، مسند أحمد: 209/4. [2] صحیح مسلم: 164. [3] المعجم الكبير للطبراني: 39/8، تفسير الطبري، بني إسرآءيل 1:17، دلائل النبوة للبيهقي: 401/2. [4] تفسير ابن كثير، بني إسرآءيل 1:17، الإسراء و المعراج للألباني، ص: 39-41 و 70. [5] تفسير ابن كثير، بني إسرآءيل 1:17. [6] فتح الباري: 270/7، المواهب اللدنية: 73/3، سبل الهدى والرشاد: 114/3.

«هٰذِهِ سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى»

''یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے۔''[1]

سدرۃ المنتہیٰ کو ایسے رنگوں نے ڈھانپ رکھا تھا جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا أَدْرِي مَاهِيَ»

''میں نہیں جانتا کہ وہ کیا تھے۔''[2]

بعض دیگر روایات میں ہے کہ جب سدرۃ المنتہیٰ کو اللہ کے حکم نے ڈھانپا تو وہ یاقوت، زمرد یا اس جیسی حسین چیز میں تبدیل ہوگیا۔ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی بھی اس کا حسن و جمال بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔[3]

اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں سدرۃ المنتہیٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَىٰ ۝﴾

''اس وقت سدرہ (بیری) پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا۔''[4]

صحابی رسول سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے مراد سونے کے پتنگے ہیں۔[5]

سدرۃ المنتہیٰ کی وجہ تسمیہ

سدرۃ المنتہیٰ کی وجہ تسمیہ کے متعلق سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر مفسرین کہتے ہیں: اس درخت کا نام سدرۃ المنتہیٰ اس لیے رکھا گیا ہے کہ فرشتوں کا علم وہاں تک ختم ہو جاتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے سوا اس سے آگے کوئی نہیں گیا۔[6] یہ شرف اور فضیلت اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے محبوب محمد ﷺ کو عطا فرمائی۔

اس کے علاوہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ زمین سے جو چیز اوپر لے جائی جاتی ہے، وہ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے، پھر اسے یہاں سے لے لیا جاتا ہے۔ اسی طرح جو چیز اوپر سے اترتی ہے، وہ بھی یہاں پہنچ کر رک جاتی ہے، پھر اسے یہاں سے وصول کر لیا جاتا ہے۔[7]

سدرۃ المنتہیٰ کے متعلق بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ وہ چھٹے آسمان میں ہے۔[8] جبکہ اکثر روایات میں ہے

---

[1] صحيح البخاري: 3887. [2] صحيح البخاري: 349. [3] صحيح مسلم: 162، مسند أحمد: 128/3. [4] النجم 16:53.
[5] صحيح مسلم: 173. [6] شرح النووي على صحيح مسلم: 279/2. [7] صحيح مسلم: 173. [8] صحيح مسلم: 173.

کہ وہ ساتویں آسمان پر ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے۔ ان دونوں طرح کی روایات میں اس طرح مطابقت پیدا کی گئی ہے کہ ممکن ہے سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ اور تنا چھٹے آسمان میں ہو اور اس کی ٹہنیاں اور شاخیں ساتویں آسمان میں ہوں۔ [1]

سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ سے نکلنے والی نہریں

رسول اللہ ﷺ نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس چار نہریں دیکھیں جو اس کی جڑ سے نکل رہی تھیں۔ ان میں سے دو نہریں پوشیدہ تھیں اور دو نہریں کھلی تھیں۔ آپ ﷺ نے جبریل امین علیہ السلام سے پوچھا:

«مَا هٰذَانِ يَا جِبْرِيلُ ؟»

''جبریل! یہ دونوں کیا ہیں؟''

جبریل علیہ السلام نے نبی ﷺ کو بتایا کہ جو دو پوشیدہ نہریں ہیں، وہ جنت میں ہیں اور جو دو کھلی نہریں ہیں، وہ نیل اور فرات ہیں۔ [2]

ساؤتھ افریقہ سے نکلتا ہوا دریائے نیل کا ایک خوبصورت فضائی منظر

یوگنڈا میں وکٹوریہ جھیل (نیل)

بحیرۂ روم جہاں دریائے نیل گرتا ہے

[1] فتح الباري : 267،266/7. [2] صحيح البخاري : 3887، صحيح مسلم : 164.

دریائے نیل کا دلکش منظر

یہ وہی دریائے نیل اور فرات ہیں جو سطحِ زمین پر بہتے ہیں۔ دریائے نیل افریقہ کا سب سے اہم اور دنیا کا سب سے لمبا دریا ہے۔ یہ وسطی افریقہ سے نکل کر یوگنڈا، سوڈان اور مصر سے بہتا ہوا بحیرۂ روم میں جا گرتا ہے۔ اس کی لمبائی 6695 کلومیٹر ہے۔ سوڈان کا دارالحکومت خرطوم اس مقام پر واقع ہے جہاں نیل ازرق، نیل ابیض سے آ کر ملتا ہے۔ مصر کا دارالحکومت قاہرہ بھی دریائے نیل ہی کے کنارے واقع ہے۔ اسی طرح دریائے فرات شمال مشرقی ترکی میں ارارات کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور مغرب کی طرف بہتا ہے، پھر جنوب کا رخ اختیار کر کے شام میں داخل ہوتا ہے اور اس کے بیچ سے گزرتا ہوا قصبہ ابوکمال کے آگے عراق میں داخل ہوتا ہے۔ پھر جنوب مشرق کی طرف بہتا ہے۔ دریائے فرات کی لمبائی 2375 کلومیٹر ہے۔

سرور کائنات ﷺ نے ایک حدیث میں دریائے نیل اور فرات کے متعلق فرمایا:

مسجد آلِ مقرن خرطوم (سوڈان)

قاہرہ سے گزرتا ہوا دریائے نیل

شام کے شہر حلب میں جامع مسجد

دریائے فرات کا دلفریب منظر

دریائے سیحان

«سَيْحَانُ وَجَيْحَانُ، وَالْفُرَاتُ وَالنِّيلُ، كُلٌّ مِّنْ أَنْهَارِ الْجَنَّةِ»

''سیحان، جیحان، فرات اور نیل سب جنت کی نہروں میں سے ہیں۔''[1]

امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نیل اور فرات کی اصل جنت سے ہے اور یہ دونوں سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ سے نکلتی ہیں، پھر جہاں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، وہاں وہ چلتی ہیں، یہاں تک کہ زمین سے نکلتی ہیں اور اس میں چلتی ہیں۔ یہ بات عقل کے خلاف ہے نہ شریعت کے۔ حدیث کا ظاہری مطلب بھی یہی ہے، لہٰذا اسے اپنانا لازم ہے۔[2]

جبریل علیہ السلام کا اصلی شکل میں دیدار

اولادِ آدم کے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس فرشتوں کے سردار جبریل علیہ السلام کو ان کی اصلی حالت میں دیکھا۔ جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل و صورت میں دیکھنے کی سعادت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو دو بار نصیب ہوئی۔ پہلی مرتبہ زمین پر اور دوسری بار معراج کے موقع پر سدرۃ المنتہیٰ کے قریب۔ دونوں کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی مقدس کتاب قرآن مجید میں کیا ہے۔ پہلی مرتبہ دیکھنے کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ۝ ﴾

''اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں (نبی) نے تو اس (جبریل) کو روشن کنارے پر دیکھا ہے۔''[3]

اسی طرح دوسری بار کا ذکر اس انداز میں کیا:

﴿ وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ۝ ﴾

''اور یقیناً اس (رسول) نے اس (جبریل) کو ایک اور بار اترتے ہوئے بھی سدرۃ المنتہیٰ کے قریب دیکھا۔''[4]

صحابیِ رسول سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان دونوں آیتوں کی تفسیر میں وہ حدیث بیان کی ہے جس میں خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خوبصورت الفاظ میں یہ منظر اور اس کی دلکشی بیان فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

[1] صحيح مسلم :2839. [2] شرح النووي على صحيح مسلم :292/2، فتح الباري :268/7، واللفظ له. [3] التكوير 23:81. [4] النجم 14،13:53.

«رَأَيْتُ جِبْرِيلَ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى، عَلَيْهِ سِتُّ مِائَةِ جَنَاحٍ، يَنْتَثِرُ مِنْ رِيشِهِ التَّهَاوِيلُ: الدُّرُّ وَالْيَاقُوتُ»

''میں نے جبریل کو سدرۃ المنتہیٰ کے قریب دیکھا۔ ان کے چھ سو پر تھے۔ ان کے پروں سے موتی اور یاقوت جھڑ رہے تھے۔''[1]

جبریل علیہ السلام کا ایک پر اتنا بڑا تھا جتنا مشرق اور مغرب کا درمیانی فاصلہ ہے۔[2] ان کے پاؤں کے بال حسین و جمیل موتیوں کی طرح تھے، جیسے سبزی پر بارش کی بوندیں پڑی ہوں۔[3] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کے لباس کے حسن و جمال کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

«أَتَانِي جِبْرِيلُ فِي خُضْرٍ مُعَلَّقٍ بِهِ الدُّرُّ»

''جبریل میرے پاس ایسے سبز لباس میں آئے جس پر موتی جڑے ہوئے تھے۔''[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج کے موقع پر جبریل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنا، دراصل اللہ رب العزت کی طرف سے ایک عظیم نشانی تھی جس کا آپ نے مشاہدہ فرمایا۔

جبریل علیہ السلام اور خشیتِ الٰہی

اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی معراج کے موقع پر جبریل امین علیہ السلام کو ایک اور حالت میں بھی دیکھا۔ یہ وہ منظر تھا جب فرشتوں کے سردار جبریل علیہ السلام پر اللہ ذوالجلال کی زبردست ہیبت طاری تھی۔ اس ہیبت الٰہی نے انھیں ایسا کر دیا تھا جیسے پرانا بوسیدہ ٹاٹ ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

«لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِي مَرَرْتُ عَلٰى جِبْرِيلَ فِي الْمَلَاءِ الْأَعْلٰى، كَالْحِلْسِ الْبَالِي مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ»

''میں شب معراج (فرشتوں کی) مجلس بالا میں جبریل (علیہ السلام) کے پاس سے گزرا تو وہ اللہ کے ڈر کی وجہ سے ایسے ہوگئے تھے جیسے پرانا بوسیدہ ٹاٹ ہوتا ہے۔''[5]

ذرا سوچیے! جب سید الملائکہ جبریل علیہ السلام کا رب ذوالجلال کے خوف کے باعث یہ حال ہے، حالانکہ ان کے حاشیۂ خیال میں بھی گناہ و نافرمانی کا تصور تک موجود نہیں تو پھر ہم کس کھیت کی مولی ہیں جو خالق کائنات سے نڈر

[1] مسند أحمد: 412/1 و 460. [2] مسند أحمد: 407/1. [3] تفسير الطبري، النجم 13:53. [4] مسند أحمد: 407/1.
[5] السنة لابن أبي عاصم، حديث: 621.

ہو کر مسلسل گناہوں کی ذلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ پس ہم سب پر لازم ہے کہ ہم آج اور ابھی گناہوں سے توبہ کریں اور اللہ رب العزت کے احکام اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کے مطابق اطاعت کی زندگی بسر کریں۔

کیا رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟

معراج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا یا نہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو واقعۂ معراج کا مطالعہ کرنے والے ہر قاری کے ذہن میں ابھرتا ہے۔ ہم اس کے جواب میں صرف یہ عرض کرتے ہیں کہ اس کے بارے میں صحیح اور واضح ترین بات وہی ہے جو خود رسالت مآب ﷺ نے بیان فرمائی ہے۔ جلیل القدر تابعی عبداللہ بن شقیق رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا: اگر میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا تو آپ سے ایک سوال ضرور کرتا۔ ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم ان سے کیا پوچھتے؟ میں نے کہا: میں آپ سے پوچھتا کہ کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ یہ سن کر ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے یہی بات پوچھی تھی تو آپ نے جواب میں فرمایا: «رَأَيْتُ نُورًا» ''میں نے نور دیکھا ہے۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«نُورٌ أَنَّى أَرَاهُ؟»

''وہ (اللہ کا حجاب) نور ہے (جو میرے اور اللہ کے درمیان حائل ہے)، بھلا میں اسے کس طرح دیکھ سکتا ہوں؟''[1]

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ سے یہ بات پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کیا بلکہ آپ نے ایک نور دیکھا ہے۔ یہ نور ہی دراصل اللہ تعالیٰ کا حجاب ہے جو اللہ تعالیٰ کے دیدار میں حائل ہے۔ اس بات کی مزید تائید رسالت مآب ﷺ کے درج ذیل ارشاد گرامی سے ہوتی ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَايَنَامُ وَلَا يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يَنَامَ، يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهُ، يُرْفَعُ إِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ، وَعَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ، حِجَابُهُ النُّورُ - وَفِي رِوَايَةِ أَبِي بَكْرٍ: النَّارُ - لَوْكَشَفَهُ لَأَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ مَا انْتَهٰى إِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ»

''بے شک اللہ عزوجل سوتا نہیں اور سونا اس کے شایانِ شان بھی نہیں۔ وہ ترازو کو پست کرتا اور بلند کرتا

[1] صحیح مسلم: 178.

ہے (رزق میں کمی بیشی کرتا ہے)۔ اس کی طرف رات کا عمل دن کے عمل سے پہلے اور دن کا عمل رات کے عمل سے پہلے اٹھایا جاتا ہے۔ اس کا حجاب نور ہے۔ (ابوبکر بن ابی شیبہ کی روایت میں ''آگ'' کا لفظ آیا ہے۔) اگر وہ یہ حجاب ہٹا دے تو اس کے مقدس چہرے کی تجلیات اس کی زد میں آنے والی ساری مخلوق کو جلا ڈالیں گی۔'' [1]

اسی طرح اس بات کی مزید وضاحت کہ سرور کائنات ﷺ نے شب معراج اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کیا، ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث سے ہوتی ہے جسے مسروق تابعی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر تھا اور ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ انھوں نے فرمایا: اے ابوعائشہ! (یہ مسروق رحمہ اللہ کی کنیت ہے۔) تین باتیں ایسی ہیں کہ جو شخص ان میں سے ایک بات بھی کہے گا، اس نے یقیناً اللہ پر بڑا بہتان باندھا۔ میں نے پوچھا: بھلا وہ تین باتیں کون سی ہیں؟ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: جو یہ دعویٰ کرے کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے تو بے شک اس نے اللہ پر بڑا بہتان باندھا۔

مسروق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ام المؤمنین کے منہ سے یہ جُملہ سنتے ہی میں ٹیک چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ میں نے عرض کیا: ام المؤمنین! مجھے مہلت دیں، جلدی نہ کریں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝﴾

''اور بے شک یہ (نبی) تو اسے روشن افق پر دیکھ چکا ہے۔'' [2]

﴿وَ لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝﴾

''اور یقیناً اس (رسول) نے اسے ایک بار اور بھی دیکھا۔'' [3]

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: یہ میں ہی تھی جس نے اس امت میں سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ سے ان آیات کے بارے میں پوچھا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا هُوَ جِبْرِيلُ ـ عَلَيْهِ السَّلَامُ ـ لَمْ أَرَهُ عَلَى صُورَتِهِ الَّتِي خُلِقَ عَلَيْهَا غَيْرَهَاتَيْنِ الْمَرَّتَيْنِ، رَأَيْتُهُ مُنْهَبِطًا مِّنَ السَّمَاءِ، سَادًّا عِظَمُ خَلْقِهِ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ»

''ان آیتوں میں جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔ میں نے انھیں دو دفعہ کے علاوہ کبھی اصلی صورت میں نہیں دیکھا

---

[1] صحیح مسلم: 179، شرح النووي علی صحیح مسلم: 3/17-19. [2] التکویر 81:23. [3] النجم 53:13.

جس پر انھیں پیدا کیا گیا ہے۔ میں نے انھیں آسمان سے اترتا دیکھا۔ ان کا پیدائشی وجود اتنا بڑا تھا کہ اس نے آسمان سے زمین تک کے فاصلے کو ڈھانپ رکھا تھا۔"

اس کے بعد ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے مجھ سے فرمایا: کیا تم نے نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ۝ ﴾

"اس (کی حقیقت) کو نگاہیں نہیں پا سکتیں، اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے، اور وہ نہایت باریک بین، بہت باخبر ہے۔"[1]

نیز کیا تم نے نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ۝ ﴾ (الشوریٰ 51:42)

"اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر الہام (دل میں القاء) کر کے، یا پردے کے پیچھے سے، یا فرشتہ بھیج کر اور وہ (فرشتہ) اللہ کے حکم سے جو اللہ چاہے وحی کرتا ہے۔ بلاشبہ اللہ بلند مرتبہ، خوب حکمت والا ہے۔"[2]

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ بالا حدیث اس مسئلے میں پوری طرح فیصلہ کن ہے۔ انھوں نے دلائل کی روشنی میں یہ بات ثابت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کا دیدار نہیں کیا۔ اب رہ گئی بات صحیح بخاری کی اس روایت کی جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ "جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر ساتویں آسمان سے بھی اوپر بلند ہو گئے جس کا علم اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں، یہاں تک کہ سدرۃ المنتہیٰ پر لے کر گئے اور جبار رب العزت قریب ہوا اور اتر آیا یہاں تک کہ وہ آپ سے دو کمانوں کے بقدر بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب ہو گیا۔"[3]

اس روایت کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اسے شریک بن عبداللہ بن ابی نمر نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں واقعۂ معراج کو شریک بن عبداللہ کے علاوہ امام ابن شہاب زہری، قتادہ اور ثابت البنانی رحمہم اللہ نے بھی انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مفصل روایت کیا ہے۔ لیکن شریک نے انس رضی اللہ عنہ کے واسطے سے اپنی روایت میں کچھ ایسی باتیں بیان کی ہیں جو دوسرے راویوں نے بیان نہیں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے معراج کی وہ روایت جو ثابت البنانی نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، ذکر کرنے کے بعد شریک

[1] الأنعام 103:6. [2] صحيح مسلم: 177. [3] صحيح البخاري: 7517.

بن عبداللہ کی روایت کردہ حدیث کی طرف اشارہ کیا اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کی کہ شریک نے اپنی روایت میں کچھ چیزیں آگے پیچھے کر دی ہیں اور کمی بیشی کا بھی ارتکاب کیا ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ امام مسلم رحمہ اللہ کی درج بالا بات کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شریک بن عبداللہ بن ابی نمر اس حدیث میں اضطراب (تردد) کا شکار ہوا ہے۔ اس کا حافظہ خراب ہو گیا اور ٹھیک طرح سے اسے بات یاد نہیں رہی۔[2]

شریک بن عبداللہ کی معراج والی روایت میں دس سے بھی زیادہ تفردات ہیں۔ محدثین نے ان کے تفردات کو جو دوسرے راویوں نے بیان نہیں کیے، ان کا وہم قرار دیا ہے۔ لہٰذا شریک کے یہ تفردات نا قابل قبول ہیں۔ شریک کی روایت کے صرف وہ حصے صحیح ہیں جو دوسرے راویوں کی روایات کے مطابق ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ شریک کی پوری روایت ہی کو نا قابل قبول قرار دے دیا جائے، اس لیے کہ محدثین کرام نے شریک کو مجموعی طور پر ثقہ ہی قرار دیا ہے اور وہ صحیح بخاری کا راوی ہے۔ ثقہ راوی کی پوری حدیث کو اس کے وہم کی وجہ سے ساقط قرار نہیں دیا جا سکتا جیسا کہ حافظ ابوالفضل بن طاہر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر شریک کے تفرد کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آ سکتا کہ اس کی حدیث کو چھوڑ دیا جائے، اس لیے کہ ثقہ راوی کا حدیث میں کسی جگہ پر کسی واہمے میں مبتلا ہونا، اس کی پوری حدیث کو ساقط نہیں کرتا، خاص طور پر جب وہم بھی ایسا ہو جس سے کسی ناروا کام کا ارتکاب بھی لازم نہیں آتا۔ اگر اس راوی کی حدیث کو چھوڑ دیا جائے جسے محض تاریخ میں وہم ہوا ہے تو پھر ائمہ مسلمین کی ایک پوری جماعت کی حدیثوں کو چھوڑنا پڑے گا۔[3]

شریک بن عبداللہ نے اپنی معراج کی روایت میں جو اللہ ذوالجلال کے قریب ہونے کا تذکرہ کیا ہے اور آیات:

﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ○ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ○﴾

''پھر وہ قریب ہوا اور اتر آیا۔ تو وہ دو کمانوں جتنا بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب ہو گیا۔''[4]

کی ضمیروں کا مرجع اللہ تعالیٰ کو قرار دیا ہے، یہ ان کا تفرد اور وہم ہے کیونکہ یہ بات سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے کسی اور راوی نے بیان نہیں کی جیسا کہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ انھوں نے مزید کہا ہے کہ ام المؤمنین عائشہ، ابن مسعود اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کا قول جس میں انھوں نے ان آیات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جبریل علیہ السلام کو دیکھنے پر محمول کیا ہے، وہ زیادہ صحیح ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام بیہقی کے قول کا حوالہ دینے کے بعد لکھا ہے کہ امام بیہقی

---

[1] صحيح مسلم: (262)-162. [2] تفسير ابن كثير، بني إسرآءيل 1:17. [3] فتح الباري: 593/13. [4] النجم 9,8:53.

نے اس مسئلے میں جو کہا ہے، وہی برحق ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آیت: ﴿ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ ﴾ کی تفسیر جبریل علیہ السلام سے کرنے میں صحابہ میں سے کوئی بھی درج بالا صحابہ سے اختلاف نہیں رکھتا۔ [1]

لہٰذا صحیح بات یہی ہے کہ آیات: ﴿ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ ﴾ میں ضمیروں کا مرجع جبریل علیہ السلام ہی ہیں جن کا تذکرہ اس سے پچھلی آیات میں بھی ہوا ہے:

﴿ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ ﴾

''اسے مضبوط قوتوں والے (جبریل) نے سکھایا۔ جو نہایت طاقتور ہے، سو وہ (اپنی اصلی صورت میں) سیدھا کھڑا ہوگیا۔ جبکہ وہ (آسمان کے) بلند کنارے پر تھا۔'' [2]

اس بات کی مزید تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سیدنا جبریل امین علیہ السلام کی تقریباً یہی صفات قرآن مجید کے دوسرے مقام پر بھی بیان ہوئی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ ﴾

''بے شک یہ (قرآن کریم) رسول کریم (جبریل) کا قول ہے۔ جو بڑی قوت والا، عرش والے کے نزدیک بلند مرتبہ ہے۔ وہاں (آسمانوں میں) اس کی اطاعت کی جاتی ہے، امین ہے۔ اور (اے اہل مکہ!) تمھارا ساتھی (محمد ﷺ) دیوانہ نہیں۔ یہ (نبی) تو اس (جبریل) کو روشن افق پر دیکھ چکا ہے۔'' [3]

اس کے علاوہ اس حقیقت سے بھی آگاہ رہنا چاہیے کہ آیات: ﴿ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ ﴾ کا واقعۂ معراج سے سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ یہ تو نبوت کے ابتدائی دور کا واقعہ ہے۔ اس وقت اللہ کے رسول ﷺ آسمان پر نہیں بلکہ زمین پر تھے۔ آپ نے پہلی مرتبہ جبریل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں دیکھا۔ اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ ﴾

''اور یقیناً اس (رسول) نے اس (جبریل) کو ایک بار اور بھی دیکھا۔ سدرۃ المنتہیٰ کے قریب۔'' [4]

چنانچہ یہ دوسرا واقعہ معراج کی رات ہوا اور پہلا واقعہ زمین پر ظہور میں آیا تھا۔ [5] اس کے علاوہ جہاں تک

[1] تفسير ابن كثير، بنيّ إسرآءيل 1:17. [2] النجم 53:5-7. [3] التكوير 81:19-23. [4] النجم 53:13,14. [5] تفسير ابن كثير، النجم 53:9.

ابن عباس رضی اللہ عنہما کے موقف کا تعلق ہے تو ان سے دو طرح کی روایات منقول ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے۔ [1] دوسری یہ کہ آپ ﷺ نے اللہ رب العزت کو اپنے دیدۂ دل سے دو بار دیکھا۔ [2] اس کے بارے میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مطلق دیکھنے کی جو روایت ہے، اسے اس روایت پر محمول کیا جائے گا جس میں بذریعہ دل دیکھنے کی قید لگائی گئی ہے۔ جس نے ان سے آنکھ کے ذریعے سے دیکھنے کی روایت کی ہے، اس نے انوکھی اور عجیب بات کی ہے، اس لیے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کے بارے میں کوئی چیز صحیح ثابت نہیں۔ [3]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو مطلق دیکھنے کی روایات مروی ہیں، انھیں دل کے ذریعے سے دیکھنے والی مقید روایات پر محمول کرنا واجب ہے۔ انھوں نے مزید لکھا ہے کہ اس طرح ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اثباتِ رؤیت اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے دیکھنے کی نفی کرنے کے مابین جمع و تطبیق ممکن ہے۔ وہ اس طرح کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی نفی کو آنکھ کے ذریعے سے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اثبات کو دل کے ذریعے سے دیکھنے پر محمول کیا جائے۔ [4]

اس جمع و تطبیق سے تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا موقف یکساں ہو جاتا ہے اور ان کے مابین کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ سب اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کیا۔ قرآن مجید اور صحیح احادیثِ مبارکہ کی تصریحات سے بس یہی بات ثابت ہوتی ہے، لہٰذا یہی صحیح ہے۔ واللہ اعلم بالصواب.

جنت کا نظارہ

معراج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو جنت کا مشاہدہ بھی کرایا گیا۔ یہی وہ جگہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کے لیے انعام کے طور پر تیار کر رکھی ہے اور اس کا ان سے وعدہ بھی فرما رکھا ہے۔ رسالت مآب ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«ثُمَّ أُدْخِلْتُ الْجَنَّةَ، فَإِذَا فِيهَا حَبَايِلُ اللُّؤْلُؤِ، وَإِذَا تُرَابُهَا الْمِسْكُ»

''پھر مجھے جنت میں لے جایا گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس میں موتیوں کے ہار تھے اور اس کی مٹی کستوری تھی۔'' [5]

[1] جامع الترمذي: 3280، تفسير الطبري، النجم 13:53. [2] صحيح مسلم: 176. [3] تفسير ابن كثير، النجم 12,11:53. [4] فتح الباري: 774,773/8. [5] صحيح البخاري: 349

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے وہاں موتیوں کے قبے دیکھے۔[1] سیدنا انس رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

«بَيْنَا أَنَا أَسِيرُ فِي الْجَنَّةِ إِذْعُرِضَ لِي نَهْرٌ حَافَتَاهُ قِبَابُ اللُّؤْلُؤِ الْمُجَوَّفِ، قَالَ: فَقُلْتُ: يَا جِبْرِيلُ! مَا هٰذَا؟ قَالَ: هٰذَا الْكَوْثَرُ الَّذِي أَعْطَاكَ رَبُّكَ عَزَّوَجَلَّ، قَالَ: فَضَرَبْتُ بِيَدَيَّ فِيهِ، فَإِذَا طِينُهُ الْمِسْكُ الْأَذْفَرُ، وَإِذَا رَضْرَاضُهُ اللُّؤْلُؤُ»

”جنت کی سیر کرتے کرتے میں ایک ایسے دریا پر پہنچا جس کے دونوں کنارے خلا دار موتیوں کے قبوں پر مشتمل تھے۔ میں نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا: جبریل! یہ کیا ہے؟ جبریل علیہ السلام نے جواب دیا: یہ کوثر ہے جو آپ کے رب نے آپ کو عطا کی ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں: میں نے اس میں اپنے دونوں ہاتھ ڈالے تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس کی مٹی نہایت خوشبودار کستوری ہے اور اس میں پڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی کنکریاں موتی ہیں۔“[2]

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ فرشتے نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کی مٹی میں سے انتہائی خوشبودار کستوری نکالی۔[3] نہر کوثر اس خیر کثیر کا ایک حصہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سرفراز فرما رکھا ہے۔[4] اس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا ہے:

﴿إِنَّآ أَعْطَيْنَٰكَ ٱلْكَوْثَرَ ۝﴾

”(اے نبی!) یقیناً ہم نے آپ کو کوثر عطا کی۔“[5]

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے نہر کوثر کی خوبصورتی اور دلکشی ان الفاظ مبارک میں بیان فرمائی ہے:

«اَلْكَوْثَرُ نَهْرٌ فِي الْجَنَّةِ، حَافَتَاهُ مِنْ ذَهَبٍ وَمَجْرَاهُ عَلَى الدُّرِّ وَالْيَاقُوتِ، تُرْبَتُهُ أَطْيَبُ مِنَ الْمِسْكِ، وَمَاؤُهُ أَحْلٰى مِنَ الْعَسَلِ وَأَبْيَضُ مِنَ الثَّلْجِ»

”کوثر جنت کی ایک نہر ہے۔ اس کے کنارے سونے کے بنے ہوئے ہیں۔ اس کا پانی موتیوں اور یاقوت پر بہتا ہے، یعنی اس کے سنگریزے موتی اور یاقوت کے ہیں۔ اس کی مٹی کستوری سے زیادہ خوشبودار ہے۔ اس کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا اور برف سے زیادہ سفید ہے۔“[6]

---

[1] صحيح مسلم: 163. اکثر علماء نے «حَبَايِلُ اللُّؤْلُؤِ» ”موتیوں کے ہار“ والے الفاظ کو تصحیف قرار دیا ہے اور «جَنَابِذُ اللُّؤْلُؤِ» ”موتیوں کے قبے“ کے الفاظ کو صحیح قرار دیا ہے۔ (فتح الباري: 601/1، عمدة القاري: 68/4) [2] صحيح البخاري: 4964 و 6581، مسند أحمد: 232،231/3، واللفظ له. [3] مسند أحمد: 207/3. [4] صحيح البخاري: 4966. [5] الكوثر 1:108. [6] جامع الترمذي: 3361.

ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

«فِيهِ طَيْرٌ أَعْنَاقُهَا كَأَعْنَاقِ الْجُزُرِ»

''اس میں ایسے پرندے ہیں جن کی گردنیں اونٹوں کی گردنوں کی طرح ہیں۔''

یہ سن کر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ پرندے تو بہت خوش و خرم ہوں گے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَكَلَتُهَا أَنْعَمُ مِنْهَا»

''انھیں کھانے والے ان سے بھی زیادہ خوش و خرم ہوں گے۔''[1]

جنت میں سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی آواز

سرور کائنات ﷺ نے جنت کی سیر کے دوران میں جنت کی ایک طرف سے ایک آہٹ سنی۔ آپ ﷺ نے پوچھا:

«يَا جِبْرِيلُ! مَا هٰذَا؟»

''جبریل! یہ کیا ہے؟''

جبریل امین علیہ السلام نے بتایا کہ یہ بلال مؤذن کی آواز ہے۔ آپ ﷺ نے معراج سے واپس آکر لوگوں کو اس واقعے سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا:

«قَدْ أَفْلَحَ بِلَالٌ، رَأَيْتُ لَهُ كَذَا وَكَذَا»

''بلال کامیاب ہوگئے۔ میں نے انھیں (جنت میں) ایسے ایسے (انداز میں) دیکھا ہے۔''[2]

اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بلال حبشی رضی اللہ عنہ نے دین کی خاطر جو ہولناک تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کیں اور انتہائی کٹھن حالات میں بھی جس بے مثال استقامت کا مظاہرہ کیا اور زبردست ظلم و تشدد کی چکی میں پسنے کے باوجود جس طرح توحید ربانی کا ایمان افروز نعرہ ''اَحَد اَحَد'' بلند کرتے رہے، اس کے صلے میں اللہ رب العزت نے انھیں کس قدر عزت و عظمت، شرف و فضیلت اور بلند مقام و مرتبہ سے سرفراز فرمایا۔

[1] جامع الترمذي: 2542. [2] مسند أحمد: 257/1. حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی اسناد کو صحیح قرار دیا ہے (تفسیر ابن کثیر، بني إسرآءيل 1:17) تاہم شیخ البانی رحمہ اللہ وغیرہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ (الإسراء والمعراج للألباني، ص: 74,73، الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد: 167,166/4)

دخترِ فرعون کی آیا

اسی معراج کے موقع پر ایک جگہ رسول اللہ ﷺ نے بڑی خوشگوار مہک محسوس کی۔ آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا:

«يَا جِبْرِيلُ! مَا هٰذِهِ الرَّائِحَةُ الطَّيِّبَةُ؟»

''جبریل! یہ کیسی خوشگوار مہک ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ فرعون کی بیٹی کے سر میں کنگھی کرنے والی خاتون اور اس کی اولاد کی خوشبو ہے۔ رسالت مآب ﷺ نے پوچھا:

«وَمَا شَأْنُهَا؟»

''اس خاتون کا کیا قِصہ ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ ایک دن وہ فرعون کی بیٹی کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ اچانک اس کے ہاتھ سے کنگھی گر پڑی تو وہ بے ساختہ بولی: بِسْمِ اللّٰهِ ''اللہ کے نام کے ساتھ۔'' فرعون کی بیٹی نے اس سے پوچھا: کیا مطلب؟ کیا تمھاری مراد میرے باپ کے نام سے ہے؟ اس خاتون نے جواب دیا: نہیں، بلکہ میرا اور تیرے باپ کا رب اللہ ہے۔ فرعون کی بیٹی نے یہ سن کر کہا: میں تمھاری یہ بات اپنے باپ (فرعون) کو بتاؤں گی۔ اس خاتون نے کہا: ٹھیک ہے (جاؤ بتادو)۔ چنانچہ اس نے یہ بات اپنے باپ سے کہہ دی۔

فرعون طیش میں آ گیا۔ اُس نے فوراً اس خاتون کو اپنے دربار میں طلب کیا اور اس سے پوچھا: اے عورت! تیرا میرے سوا بھی کوئی رب ہے؟ اس خاتون نے انتہائی جرأت و شجاعت سے جواب دیا: ہاں، میرا اور تیرا رب اللہ ہے۔ یہ جواب سن کر فرعون نے تانبے کی ایک بڑی دیگ کو خوب تپانے کا حکم دیا۔ جب یہ دیگ خوب تپ گئی تو فرعون نے حکم دیا کہ اس خاتون کو اور اس کی اولاد کو اس میں ڈال دیا جائے۔ خاتون نے فرعون سے کہا: میری تجھ سے ایک درخواست ہے۔ فرعون نے پوچھا: کیا درخواست ہے؟ خاتون نے کہا: میں یہ پسند کرتی ہوں کہ تو میری اور میرے بچوں کی ہڈیاں ایک ہی کپڑے میں جمع کر کے ہمیں یکجا دفن کر دینا۔ فرعون بولا: یہ تیرا ہم پر حق ہے۔ پھر فرعون کے حکم پر اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے بچوں کو ایک ایک کر کے کھولتی ہوئی دیگ میں ڈال دیا گیا۔ آخر میں اس کا ایک شیرخوار بچہ باقی رہ گیا، اس خاتون کو اس بچے سے بے حد پیار تھا۔ وہ اپنے اس بچے کی وجہ سے جھجک کر ذرا پیچھے ہٹی تو وہ بچہ بول اٹھا:

«يَا أُمَّهْ! اِقْتَحِمِي ، فَإِنَّ عَذَابَ الدُّنْيَا أَهْوَنُ مِنْ عَذَابِ الْآخِرَةِ»

''اماں جان! بے خوف وخطر اس میں کود جائیے۔ بے شک دنیا کی سزا آخرت کے عذاب کے مقابلے میں کہیں ہلکی ہے۔''

چنانچہ وہ خاتون اس سلگتی ہوئی دیگ میں بے خطر کود پڑی۔ [1]

بلاشبہ اللہ رب العزت کی توحید کی خاطر دی جانے والی یہ ایک عظیم قربانی ہے جو اس بہادر خاتون نے دی۔ اس واقعے میں آج کے نام نہاد مسلمانوں کے لیے بڑی عبرت ہے جو دین کے لیے قربانیاں دینا بھول گئے ہیں اور مادیت پرستی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، حالانکہ دین جان، مال اور وقت کی قربانی ہی سے پھیلتا ہے۔ آج بھی اللہ رب العزت کی توحید کے لیے اسی قسم کی قربانیاں پیش کرنے کی اور دور حاضر کے طاغوتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کلمۂ حق کہنے کی اشد ضرورت ہے، خوب جان لیجیے کہ اسلام قربانیاں دینے کا نام ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

جہنم کا وحشت ناک منظر

سرور کائنات ﷺ نے اس وحشت ناک جہنم کا بھی مشاہدہ کیا جو اللہ رب العزت نے اپنے نافرمان، سرکش اور باغی بندوں کو عذاب دینے کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ آپ کو جہنم میں طرح طرح کے بھیانک مناظر دکھائی دیے۔ آپ نے وہاں کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ مردار کھا رہے ہیں۔ آپ نے جبریل امین علیہ السلام سے پوچھا:

«مَنْ هٰؤُلَاءِ يَا جِبْرِيلُ »

''جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟''

جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھایا کرتے تھے۔ [2]

ایک اور حدیث میں رسالت مآب ﷺ نے فرمایا:

«لَمَّا عُرِجَ بِي مَرَرْتُ بِقَوْمٍ لَهُمْ أَظْفَارٌ مِّنْ نُّحَاسٍ يَخْمِشُونَ وُجُوهَهُمْ وَصُدُورَهُمْ، فَقُلْتُ: مَنْ هٰؤُلَاءِ يَا جِبْرِيلُ؟ قَالَ: هٰؤُلَاءِ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ لُحُومَ النَّاسِ وَيَقَعُونَ فِي

[1] مسند أحمد :310,309/1. [2] مسند أحمد :257/1.

أَعْرَاضِهِمْ»

''معراج کے موقع پر میرا ایسی قوم پر گزر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے۔ وہ اپنے چہرے اور سینے نوچ رہے تھے۔ میں نے پوچھا: جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھایا کرتے تھے اور ان کی عزتیں مجروح کرتے تھے۔'' [1]

یہ ان لوگوں کا انجام بیان ہوا ہے جو لوگوں کی غیبت کرتے ہیں، پیٹھ پیچھے ان کے عیوب و نقائص بیان کرتے ہیں، ان کی عزت و وقار کو مجروح کرتے ہیں اور انھیں ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں غیبت کو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ﴾

''اور تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ تو (ظاہر ہے کہ) تم اسے ناپسند کرتے ہو۔'' [2]

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات سے غیبت کے گناہ کی سنگینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو ہماری عادات و معمولات میں رچ بچ چکی ہے۔ اس کے علاوہ سرور کائنات ﷺ نے جہنم میں ایک شخص کو دیکھا، وہ سرخ رنگ کا، نیلی آنکھوں والا، گھنگنا اور پراگندہ حال آدمی تھا۔ آپ نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا:

«مَنْ هٰذَا يَا جِبْرِيلُ؟»

''جبریل! یہ کون شخص ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ اللہ کے نبی صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا قاتل ہے۔ [3]

یہ اونٹنی سیدنا صالح علیہ السلام کو ان کی قوم کے مطالبے پر معجزے کے طور پر عطا کی گئی تھی۔ قرآن مجید میں اسے ﴿نَاقَةَ اللّٰهِ﴾ (اللہ کی اونٹنی) کہا گیا ہے۔ صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو تاکید کی تھی کہ اس اونٹنی کو اللہ کی زمین میں آزادی سے چرنے پھرنے دینا اور اسے کچھ نہ کہنا۔ [4] لیکن ظالموں نے اس اونٹنی کا کوئی احترام نہیں کیا بلکہ اسے قتل کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس اونٹنی کے قاتل کا جہنم میں مشاہدہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اس کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿إِذِ انْبَعَثَ أَشْقٰهَا ۝﴾

''جب اس قوم کا بڑا بدبخت اٹھ کھڑا ہوا۔'' [5]

[1] سنن أبي داود: 4878. [2] الحجرات 12:49. [3] مسند أحمد: 257/1. [4] الأعراف 73:7. [5] الشمس 12:91.

رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے اس اونٹنی اور اس کے قاتل کا تذکرہ کیا۔ آپ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا:

«اِنْبَعَثَ لَهَا رَجُلٌ عَزِيزٌ عَارِمٌ مَنِيعٌ فِي رَهْطِهِ مِثْلُ أَبِي زَمْعَةَ»

''اس (اونٹنی) کو مارنے کے لیے ایک شخص اٹھا جو زور آور، بدخلق اور ابوزمعہ کی طرح اپنی قوم میں بڑا طاقتور تھا۔'' [1]

اس کے علاوہ رسالت مآب ﷺ نے ان واعظوں اور خطیبوں کا عبرتناک انجام بھی دیکھا جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَرَرْتُ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِي عَلٰى قَوْمٍ تُقْرَضُ شِفَاهُهُمْ بِمَقَارِيضَ مِنْ نَارٍ، قُلْتُ: مَا هٰؤُلَاءِ؟ قَالَ: هٰؤُلَاءِ خُطَبَاءُ أُمَّتِكَ مِنْ أَهْلِ الدُّنْيَا، كَانُوا يَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَيَنْسَوْنَ أَنْفُسَهُمْ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ، أَفَلَا يَعْقِلُونَ؟»

''معراج کی رات میں ایسے لوگوں پر سے گزرا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل نے کہا: یہ دنیا والوں میں سے آپ کی امت کے خطیب ہیں۔ یہ لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے تھے اور اپنے آپ کو بھول جاتے تھے، حالانکہ وہ قرآن مجید کی تلاوت بھی کرتے تھے۔ کیا وہ عقل نہیں رکھتے تھے؟'' [2]

امت محمدیہ کے خطیبوں اور واعظوں کو معراج نبوی کے مذکورہ بالا منظر کو سامنے رکھ کر اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ وہ صرف زبان ہی سے دعوت دینے پر اکتفا نہ کریں بلکہ اپنے عمل سے بھی لوگوں کے سامنے دعوتِ حق پیش کریں اور انھیں قرآن و حدیث کی تعلیمات کی عملی تصویر بن کر دکھائیں۔

داروغۂ جہنم سے ملاقات

معراج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی داروغۂ جہنم سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس کا نام مالک ہے۔ آپ ﷺ کو اس کا تعارف کراتے ہوئے بتایا گیا کہ یہ جہنم کا داروغہ مالک ہے، آپ اسے سلام کریں۔ آپ سلام کرنے کے لیے اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے پہل کرتے ہوئے خود آپ کو سلام کیا۔ [3] ظاہر بات ہے کہ وہ بھی

[1] صحيح البخاري: 4942. [2] مسند أحمد: 180/3 و 231. [3] صحيح مسلم: 172.

آپ ﷺ کی بے مثال عظمت وفضیلت سے آگاہ ہوگیا تھا، لہٰذا اس نے خود ہی پہل کرنا مناسب سمجھا۔ یہ جہنم کا داروغہ مالک وہی ہے جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان الفاظ میں کیا ہے:

﴿ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۖ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ۝ ﴾

''اور وہ (جہنمی داروغۂ جہنم کو) پکاریں گے: اے مالک! تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کردے، وہ کہے گا: بے شک تم تو ہمیشہ (اسی عذاب میں مبتلا) رہو گے۔''[1]

اس فرشتے کی ہیبت اور رعب و دبدبے کا یہ عالم ہے کہ مضبوط سے مضبوط دل آدمی بھی اس کے آگے نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ شفقت اور رحم کا نام تک نہیں جانتا۔ جانے بھی کیسے جبکہ اس کا فرض ہی اللہ کے دشمنوں اور باغیوں کو دردناک عذاب دینا ہے۔ جہنم کی آگ بھڑکانے کی ذمہ داری بھی اسی کو سونپی گئی ہے۔[2]

دجال کی اصلی شکل کیسی ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے معراج کے موقع پر قائدِ یہود دجال کو اس کی اصلی صورت میں دیکھا۔ آپ ﷺ سے جب دجال کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے اس کا حلیہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

«رَأَيْتُهُ فَيْلَمَانِيًّا أَقْمَرَ هِجَانًا، إِحْدٰى عَيْنَيْهِ قَائِمَةٌ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ كَأَنَّ شَعْرَهُ أَغْصَانُ شَجَرَةٍ»

''میں نے دجال کو دیکھا۔ وہ عظیم الجثہ تھا۔ چاندی کی طرح سفید تھا۔ اس کی ایک آنکھ سلامت تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے روشن ستارہ ہو۔ اس کے بال ایسے تھے جیسے کسی درخت کی ٹہنیاں ہوں۔''[3]

قلموں کی سرسراہٹ

معراج کے موقع پر سرورِ کائنات ﷺ کو ایک ایسے بلند مقام پر بھی لے جایا گیا جہاں آپ کو قلموں کے چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔[4] یہ فرشتوں کے قلموں کی آوازیں تھیں جن سے وہ اللہ رب العزت کے فیصلے (اور احکام وغیرہ) لکھ رہے تھے۔ ان کے لکھنے کی حقیقی کیفیت اور نوعیت کیا تھی؟ اس کا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو علم نہیں۔

[1] الزخرف 77:43. [2] صحيح البخاري: 1386. [3] مسند أبي يعلى الموصلي: 108/5، حديث: 2720، مسند أحمد: 374/1. [4] صحيح البخاري: 349.

نماز کا رفیع الشان تحفہ

معراج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو اللہ رب العزت کی طرف سے جو سب سے عظیم تحفہ ملا، وہ نماز ہے۔ یہ ایک ایسا تحفہ ہے جس میں بندہ اپنے معبود حقیقی کے سامنے کمال عاجزی و انکسار کا مظاہرہ کرتا ہے، اس سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے اور تہ دل سے اس کی عظمت و جلالت کا اعتراف کرتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ کا قرب حاصل کرلیتا ہے اور اس کی رضا کا حقدار بن جاتا ہے۔ سرور کائنات ﷺ اب ساتویں آسمان پر تشریف فرما تھے۔ اس مقدس اور پاکیزہ ماحول میں اللہ تعالیٰ نے آپ پر اور آپ کی امت پر دن رات میں پچاس نمازیں فرض کیں۔ آپ حسبِ عادت سمع و طاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے واپس روانہ ہوگئے۔ جب آپ چھٹے آسمان پر موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے تو انھوں نے آپ سے پوچھا: آپ کے رب نے آپ کی امت پر کیا فرض عائد کیا ہے؟ آپ نے بتایا کہ ہر دن رات میں پچاس نمازیں فرض کی ہیں۔ یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ اپنے رب کے پاس واپس جائیے اور اس سے تخفیف کی درخواست کیجیے، اس لیے کہ آپ کی امت میں اس کی تعمیل کی بالکل طاقت نہیں ہوگی۔ میں لوگوں کے بارے میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں اور اس سلسلے میں بنی اسرائیل کو خوب اچھی طرح آزما چکا ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر آپ واپس اپنے رب کے پاس تشریف لے گئے اور بارگاہ الٰہی میں یہ التجا کی:

«يَا رَبِّ! خَفِّفْ عَلٰى أُمَّتِي»

”اے میرے پروردگار! میری امت پر تخفیف فرما۔“

آپ کی اس التجا پر اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں کم کر دیں۔ واپسی پر پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے تو انھوں نے پوچھا: کیا بنا؟ آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں کم کر دی ہیں۔ انھوں نے کہا: آپ کی امت اس کی بھی طاقت نہیں رکھے گی، اس لیے آپ اپنے رب کے پاس واپس جائیں اور اپنی امت کے لیے مزید تخفیف کا سوال کریں۔ آپ اللہ تعالیٰ اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان بار بار آتے جاتے رہے اور اللہ تعالیٰ پانچ پانچ نمازیں کم کرتا رہا۔ بالآخر پانچ نمازیں باقی رہ گئیں۔ اب کی بار موسیٰ علیہ السلام نے آپ سے مزید تخفیف کرانے کا کہا تو آپ نے فرمایا:

«إِنِّي أَسْتَحْيِي مِنْ رَبِّي، مِنْ كَمْ أَرْجِعُ إِلَيْهِ؟»

”بے شک مجھے اپنے پروردگار سے حیا آتی ہے۔ (آخر) کتنی بار میں اس کی طرف واپس جاؤں گا؟“

آپ ﷺ نے فیصلہ کن انداز میں فرمایا:

«لَا وَلٰكِنْ أَرْضٰى وَأُسَلِّمُ»

''اب میں اپنے رب کے پاس واپس نہیں جاؤں گا بلکہ میں رضا اور تسلیم کا اظہار کرتا ہوں۔''

جب آپ ﷺ وہاں سے آگے تشریف لے گئے تو آپ کو باری تعالیٰ کی طرف سے یہ صدا آئی:

«أَنْ قَدْ أَمْضَيْتُ فَرِيضَتِي، وَخَفَّفْتُ عَنْ عِبَادِي، وَأَجْزِي بِالْحَسَنَةِ عَشْرَ أَمْثَالِهَا»

''یقیناً میں نے اپنا فرض جاری کر دیا اور اپنے بندوں سے تخفیف کر دی۔ میں ایک نیکی کا دس گنا بدلہ دوں گا۔''

ایک اور روایت میں یہ الفاظ بیان ہوئے ہیں:

«يَا مُحَمَّدُ! إِنَّهُنَّ خَمْسُ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ، لِكُلِّ صَلَاةٍ عَشْرٌ، فَذٰلِكَ خَمْسُونَ صَلَاةً، وَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كُتِبَتْ لَهُ حَسَنَةً، فَإِنْ عَمِلَهَا كُتِبَتْ لَهُ عَشْرًا، وَمَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا لَمْ تُكْتَبْ شَيْئًا، فَإِنْ عَمِلَهَا كُتِبَتْ سَيِّئَةً وَاحِدَةً»

''اے محمد (ﷺ)! بے شک یہ ہر دن رات میں پانچ نمازیں ہیں۔ ہر نماز کا ثواب دس گنا ملے گا۔ اس طرح یہ پچاس نمازیں ہو جائیں گی۔ جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے مگر اسے کر نہ سکے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دی جائے گی۔ اگر وہ اسے کر لے تو اس کے لیے دس نیکیاں لکھ دی جائیں گی۔ اسی طرح جو شخص کسی برائی کا ارادہ کر لے مگر اسے نہ کرے تو اس کے لیے کچھ بھی نہیں لکھا جائے گا۔ ہاں! اگر وہ اسے کر گزرے تو ایک برائی لکھ دی جائے گی۔''[1]

اس سے نماز کی عظمت و اہمیت اور شرف و فضیلت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت نے پوری اولادِ آدم کے سردار محمد ﷺ کو خود اپنی بارگاہ عالی میں بلا کر یہ عظیم الشان تحفہ عنایت فرمایا۔ حقیقت یہی ہے کہ نماز مسلمانوں کی معراج ہے۔ جب دنیوی مفادات اور نفسانی خواہشات انسان کو پستی کی طرف دھکیلتی ہیں تو نماز انسان کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی اور مناجات کے ذریعے سے بلندی کی انتہا پر پہنچا دیتی ہے۔ اس واقعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام امت محمدیہ کے بارے میں کس قدر ہمدردی، بھلائی اور خیر خواہی کے جذبات رکھتے تھے۔ انھوں نے سرورِ کائنات ﷺ کو نماز میں تخفیف کرانے کا جو مشورہ دیا، وہ ان کی امت محمدیہ کے لیے کمال خیر خواہی

[1] صحيح البخاري: 3887، صحيح مسلم: 162، مسند أحمد: 4/207-210.

ہی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ اس واقعے سے یہ حقیقت بھی اجاگر ہوتی ہے کہ اللہ رب العزت اپنے محبوب محمد ﷺ کی امت پر کتنا مہربان ہے کہ ان کے لیے پچاس نمازوں میں تخفیف فرما کر پانچ نمازیں باقی رہنے دیں۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بے پناہ شفقت و رحمت اور لطف و کرم کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ اعلان بھی فرما دیا کہ یہ نمازیں تو پانچ ہی ہیں لیکن ان کا اجر و ثواب پوری پچاس نمازوں کے برابر ہی ملے گا۔ تم اگر کسی نیک کام کا ارادہ کر کے اسے عملی جامہ نہ پہنا سکے تو کیا ہوا، میں تمھارے اس نیک ارادے ہی پر تمھارے لیے ایک نیکی لکھ دوں گا۔ اگر وہ نیک کام کر لو گے تو ایک کے بجائے دس نیکیاں لکھ دوں گا۔ اس کے برعکس محض گناہ کا ارادہ کرنے پر تمھیں کچھ نہیں کہوں گا۔ ہاں! اگر گناہ کا ارتکاب کرو گے تو اتنا ہی لکھوں گا جتنا تم کرو گے بلکہ ایک اور روایت میں تو یہ بھی ہے کہ گناہ کا ارادہ کر کے اسے نہ کرنے پر بھی اللہ تعالیٰ اپنے پاس ایک پوری نیکی لکھ لیتا ہے۔[1] اس کمال شفقت و رحمت کے باوجود اب بھی اگر کوئی نماز ادا نہ کرے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہوئے اپنی تربیت و اصلاح نہ کرے، نافرمانیوں اور گناہوں کو نہ چھوڑے تو اس سے بڑا بدنصیب اور کون ہوگا؟

بارگاہِ الٰہی سے عطا ہونے والے دو اور تحفے

معراج کے موقع پر سرور کائنات ﷺ کو نماز کے علاوہ دو تحفے اور بھی عطا فرمائے گئے۔ یہ دونوں تحفے بھی انتہائی قیمتی اور رفیع الشان ہیں۔ ان میں سے ایک تحفہ سورۂ بقرہ کی آخری آیات ہیں اور دوسرا گرانقدر تحفہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی امت میں سے جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائے گا، اس کے بڑے بڑے گناہ بھی بخش دیے جائیں گے۔[2]

سورۂ بقرہ کی آخری آیات سے مراد درج ذیل یہ دو آیتیں ہیں:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

''رسول (ﷺ) اس (ہدایت) پر ایمان لائے ہیں جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل کی گئی ہے اور

[1] صحيح البخاري: 6491. [2] صحيح مسلم: 173.

سارے مومن بھی، سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں:) ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک میں بھی فرق نہیں کرتے، اور وہ کہتے ہیں: ہم نے (حکم) سنا اور اطاعت کی، اے ہمارے رب! ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اللہ کسی کو اس کی برداشت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا، کسی شخص نے جو نیکی کمائی، اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو اس نے برائی کی، اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔ اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو ہماری گرفت نہ فرما۔ اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے رب! جس بوجھ کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں وہ ہم سے نہ اٹھوا، اور ہم سے درگزر فرما، اور ہمیں بخش دے، اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا کارساز ہے، پس تو کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔" [1]

یہ عظیم اور بابرکت آیتیں آپ کو اس خزانے سے عطا کی گئی ہیں جو رحمان کے عرش کے نیچے ہے۔ آپ سے پہلے کسی کو اس جیسی آیات دی گئیں نہ آپ کے بعد کسی کو دی جائیں گی۔ یہ بات سرور کائنات ﷺ نے خود ارشاد فرمائی ہے:

«...... وَأُوتِيتُ هٰؤُلَاءِ الْآيَاتِ مِنْ آخِرِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ مِنْ كَنْزٍ تَحْتَ الْعَرْشِ، لَمْ يُعْطَهُ أَحَدٌ قَبْلِي وَلَا يُعْطَى أَحَدٌ بَعْدِي»

"...... مجھے سورۂ بقرہ کی یہ آخری آیتیں ایک ایسے خزانے سے دی گئی ہیں جو عرش کے نیچے ہے۔ یہ مجھ سے پہلے کسی کو دی گئیں نہ میرے بعد کسی کو دی جائیں گی۔" [2]

سرور کائنات ﷺ نے ان آیات کی بہت زیادہ فضیلت بیان فرمائی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«مَنْ قَرَأَ هَاتَيْنِ الْآيَتَيْنِ مِنْ آخِرِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ فِي لَيْلَةٍ كَفَتَاهُ»

"جو شخص سورۂ بقرہ کی یہ آخری دو آیتیں رات کے وقت پڑھے گا، یہ اسے کافی ہو جائیں گی۔" [3]

اس حدیث کے آخری لفظ «كَفَتَاهُ» "اسے کافی ہو جائیں گی۔" کی تشریح کرتے ہوئے بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے رات کے قیام (تہجد) سے کافی ہو جائیں گی۔ بعض کہتے ہیں کہ شیطان سے بچاؤ کے لیے کافی ہو جائیں گی۔ بعض کہتے ہیں کہ آفات سے کفایت کر جائیں گی۔ امام نووی ؒ کہتے ہیں کہ اس

[1] البقرة 2:285،286. [2] صحيح ابن حبان: 4/595، حديث: 1697. [3] صحيح مسلم: 808.

بات کا احتمال ہے کہ یہ آیات ان سب چیزوں کے سلسلے میں کفایت کر جائیں گی۔ [1]

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ کا فرمان عالی ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ كِتَابًا قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِأَلْفَيْ عَامٍ أَنْزَلَ مِنْهُ آيَتَيْنِ خَتَمَ بِهِمَا سُورَةَ الْبَقَرَةِ، وَلَا يُقْرَآنِ فِي دَارٍ ثَلَاثَ لَيَالٍ فَيَقْرَبُهَا شَيْطَانٌ»

''بے شک اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے ایک کتاب لکھی، اس نے اس میں سے دو آیتیں نازل فرمائیں اور ان پر سورۂ بقرہ کا اختتام کیا۔ جس گھر میں یہ دو آیتیں مسلسل تین راتیں نہیں پڑھی جاتیں، شیطان اس گھر کے قریب ہو جاتا ہے۔'' [2]

درج بالا دو آیتوں کی مزید عظمت و فضیلت اس حدیث سے بھی عیاں ہوتی ہے جس میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جبریل علیہ السلام نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنے اوپر کی طرف سے آتی ہوئی ایک زور دار آواز سنی۔ آپ نے سر مبارک اٹھا کر اوپر دیکھا تو جبریل علیہ السلام نے کہا: یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج ہی کھولا گیا ہے۔ آج سے پہلے یہ کبھی نہیں کھلا۔ اس میں سے ایک فرشتہ اترا تو جبریل علیہ السلام نے کہا: یہ فرشتہ جو زمین پر اترا ہے، آج سے پہلے یہ کبھی نہیں اترا۔ اس فرشتے نے سلام کیا اور کہا: ''آپ کو دو نوروں کی خوشخبری ہو جو آپ کو عطا کیے گئے ہیں۔ آپ سے پہلے وہ کسی نبی کو عطا نہیں کیے گئے۔ ایک سورۂ فاتحہ اور دوسرا سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں۔ آپ ان میں سے جب بھی کوئی حرف پڑھیں گے (مضمون کی مناسبت سے) وہ چیز آپ کو عطا کی جائے گی۔'' [3]

ہمیں رسول اللہ ﷺ کو عطا کیے جانے والے اس عظیم تحفے، یعنی سورۂ بقرہ کی آخری آیات، کو اچھی طرح زبانی یاد کر لینا چاہیے اور دل کی گہرائی سے باقاعدہ پڑھتے رہنا چاہیے تاکہ ہمیں بھی خیر و برکت حاصل ہو جائے۔

سرورِ کائنات ﷺ کو جو یہ دوسرا تحفہ ملا ہے کہ آپ کی امت میں جو شرک نہیں کرے گا، اس کے بڑے بڑے گناہ بخش دیے جائیں گے، اس کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ انسان شرک کے سوا جو مرضی گناہ کرتا رہے، اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص شرک کے سوا دوسرے بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کرے گا، وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں نہیں رہے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اسے سرے ہی سے معاف کر دے گا ورنہ اسے سزا دینے کے لیے عارضی طور پر جہنم میں داخل فرمائے گا، پھر بالآخر جہنم سے نکال کر ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل کر

[1] شرح النووي على صحيح مسلم: 6/132. [2] جامع الترمذي: 2882. [3] صحيح مسلم: 806.

دے گا۔ قرآن وحدیث کے دیگر دلائل سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔

فرشتوں کی خصوصی درخواست

معراج کے موقع پر سرورِ کائنات ﷺ کا فرشتوں کے جس گروہ کے پاس سے بھی گزر ہوا، انھوں نے آپ کو آپ کی امت کے لیے یہ پیغام دیا کہ آپ انھیں سینگی لگوانے کا حکم جاری فرمائیں۔ اس چیز کو رسالت مآب ﷺ نے خود اپنے الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

«مَا مَرَرْتُ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِي بِمَلَإٍ، إِلَّا قَالُوا يَا مُحَمَّدُ! مُرْ أُمَّتَكَ بِالْحِجَامَةِ»

''میں معراج کی رات فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے بھی گزرا، اس نے یہی کہا: اے محمد (ﷺ)! آپ اپنی امت کو سینگی لگوانے کا حکم دیجیے۔''[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ فرشتوں نے آپ ﷺ سے بھی یہی درخواست کی:

عَلَيْكَ يَا مُحَمَّدُ! بِالْحِجَامَةِ.

''اے محمد (ﷺ)! سینگی لگوایا کریں۔''[2]

سینگی لگوانے کی یہ تاکید فرشتوں نے کی ہے لیکن فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر اپنی رائے اور مرضی سے کوئی کام نہیں کرتے، اس لیے علاج کا یہ طریقہ فرشتوں کا تجویز کیا ہوا نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ ہی کا تجویز کیا ہوا ہے۔ سینگی (پچھنے) لگوانے سے مراد جسم کو نشتر یا استرے سے گود کر فاسد خون نکالنا ہے۔ یہ ایک بہترین اور کامیاب علاج ہے جو طب قدیم میں خصوصاً عربوں کے ہاں ہمیشہ سے معروف رہا ہے۔ اب مغرب میں بھی بعض ہسپتالوں میں علاج کے اس طریقے سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ سینگی تقریباً ہر بیماری کا علاج ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ معالج سمجھدار ہو اور یہ جانتا ہو کہ کس مرض کے لیے جسم کے کس حصے پر سینگی لگائی جائے۔ سینگی لگوانے سے انسان کے جسم کے اندر قائم برقی مقناطیسی نظام کی خرابیاں دور ہو جاتی
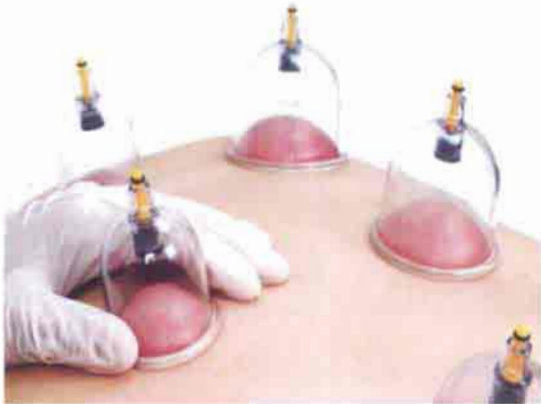
سینگی کے ذریعے فاسد خون نکالنے کا طریقہ

[1] سنن ابن ماجه: 3479، [2] سنن ابن ماجه: 3477.

ہیں اور خون کی گردش ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اس کے ذریعے سے جسمانی حرارت کی زیادتی کا خاتمہ بھی ہوتا ہے اور انسان کا مزاج مناسب حد تک معتدل ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ خود سینگی لگوایا کرتے تھے۔[1] رسول اللہ ﷺ نے اسے بہترین علاج قرار دیا ہے اور فرمایا ہے: «إِنَّ فِيهِ شِفَاءً» ''بے شک اس میں شفا ہے۔''[2]

معراج سے واپسی پر قریش کا ردعمل

رسول اللہ ﷺ آسمانوں کی بے مثل سیر سے فارغ ہو کر واپس بیت المقدس تشریف لائے، وہاں سے پھر آپ براق پر سوار ہوئے اور رات کی تاریکی ہی میں مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ راستے میں آپ کا گزر قریش کے ایک قافلے کے پاس سے ہوا۔ آپ نے انھیں سلام کیا۔ ان میں سے کچھ لوگ آپ کو جانتے تھے۔ انھیں آپ ﷺ کی آواز سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ انھوں نے بڑے تعجب سے کہا: ارے! یہ تو محمد (ﷺ) کی آواز ہے۔[3] آخر کار آپ مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ مکہ کی فضا میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لوگ نیند کے مزے لے رہے تھے۔ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ تھی کہ آج رات کس قدر عظیم اور انقلاب انگیز واقعہ رونما ہوا ہے۔ اب صرف صبح ہونے کی دیر تھی۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر سرور کائنات ﷺ کو یہ فکر لاحق ہوگئی کہ کیا آپ کی قوم اس واقعے کی سچائی تسلیم کر لے گی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا واقعہ تھا، اس جیسا واقعہ پہلے کبھی پیش ہی نہیں آیا تھا۔ کفار قریش مسلسل رسول اللہ ﷺ کی مخالفت پر اڑے ہوئے تھے۔ وہ آپ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بھلا ان سے یہ توقع کس طرح کی جا سکتی تھی کہ وہ اس حیرت انگیز اور عقل سے بالاتر واقعے کو سچا مانیں گے۔ اس کے بارے میں خود آپ ﷺ کا اپنا ارشاد گرامی ہے:

«لَمَّا كَانَ لَيْلَةُ أُسْرِيَ بِي، وَأَصْبَحْتُ بِمَكَّةَ فَظِعْتُ بِأَمْرِي وَعَرَفْتُ أَنَّ النَّاسَ مُكَذِّبِيَّ»

''جب رات کو مجھے معراج کرائی گئی اور میں نے مکہ پہنچ کر صبح کی تو میں اپنے اس معاملے سے گھبرا گیا اور میں نے جان لیا کہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے (اور میری بات کو سچا نہیں جانیں گے)۔''

یہ سوچ کر سرور کائنات ﷺ غمزدہ حالت میں بیت اللہ میں الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں اللہ کے دشمن ابوجہل کا آپ ﷺ کے پاس سے گزر ہوا۔ وہ آپ کے قریب بیٹھ گیا اور طنزیہ انداز میں بولا: کیا کوئی نئی بات پیش آگئی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے اسے جواب دیا: ہاں۔ اس نے پوچھا: وہ کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري: 5695,5694 و 5699. [2] صحيح البخاري: 5697. [3] البداية والنهاية (محقق): 345/3، دلائل النبوة للبيهقي: 2/355-357، السيرة النبوية للمهدي: 273/1.

«إِنَّهُ أُسْرِيَ بِيَ اللَّيْلَةَ»

''بے شک مجھے رات کو سیر کرائی گئی ہے۔''

اس نے پوچھا: کہاں کی؟ آپ نے فرمایا:

«إِلٰى بَيْتِ الْمَقْدِسِ»

''بیت المقدس تک کی۔''

یہ سن کر ابوجہل نے بڑی حیرت سے پوچھا: پھر آپ نے ہمارے درمیان آ کر صبح کی ہے؟ آپ ﷺ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا: ہاں۔ ابوجہل انتہائی چالاک اور شاطر انسان تھا۔ اس نے یہ ساری باتیں سن کر فوراً آپ کی تکذیب نہیں کی۔ اسے یہ ڈر تھا مبادا وہ آپ کی قوم کو آپ کی طرف بلائے اور آپ اس بات کا انکار کر دیں۔ چنانچہ اس نے خود آپ ہی سے پوچھا: بتائیے اگر میں آپ کی قوم کو بلاؤں تو کیا آپ وہ سب کچھ انھیں بتا دیں گے جو آپ نے مجھ سے بیان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ یہ سنتے ہی ابوجہل نے فوراً آواز لگائی: ارے بنوکعب بن لؤی کی جماعت! یہ آواز سنتے ہی لوگ اپنی اپنی مجلسوں کو چھوڑ کر دوڑ پڑے۔ وہ رسول اللہ ﷺ اور ابوجہل کے پاس بیٹھ گئے۔ ابوجہل نے آپ ﷺ سے کہا: اپنی قوم کو وہ سب کچھ بتائیے جو آپ نے مجھے بتایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں بتایا کہ مجھے رات سیر کرائی گئی ہے۔ انھوں نے پوچھا: کہاں کی؟ آپ نے فرمایا: بیت المقدس تک کی۔ انھوں نے بھی حیران ہو کر پوچھا: پھر آپ نے صبح بھی ہمارے درمیان کی؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ یہ سنتے ہی کچھ لوگ تالیاں بجانے لگے اور کچھ لوگوں نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیے۔ انھوں نے آپ کی بات کو (نعوذ باللہ) جھوٹ سمجھا، تعجب کے مارے انگشت بدنداں رہ گئے۔ انھیں آپ ﷺ کا امتحان لینے کی سوجھی۔ وہ کہنے لگے: کیا آپ ہمارے سامنے مسجد اقصیٰ کی صفات بیان کر سکتے ہیں؟ انھوں نے یہ سوال اس لیے کیا کہ ان میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اس شہر کا سفر کر چکے تھے اور انھوں نے مسجد اقصیٰ دیکھ رکھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس سوال سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«فَذَهَبْتُ أَنْعَتُ، فَمَازِلْتُ أَنْعَتُ حَتَّى الْتَبَسَ عَلَيَّ بَعْضُ النَّعْتِ»، قَالَ: «فَجِيءَ بِالْمَسْجِدِ وَأَنَا أَنْظُرُ حَتَّى وُضِعَ دُونَ دَارِ عِقَالٍ۔ أَوْعَقِيلٍ۔ فَنَعَتُّهُ وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَيْهِ» قَالَ: «وَكَانَ مَعَ هٰذَا نَعْتٌ لَمْ أَحْفَظْهُ»

''میں نے اس کی صفات بتانی شروع کیں یہاں تک کہ کچھ صفات مجھ پر خلط ملط ہوگئیں، چنانچہ مسجد کو میرے سامنے لایا گیا۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے عقال، یا عقیل کے گھر کے سامنے رکھ دیا گیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہوئے اس کی صفات بتائیں۔ اس کے باوجود کچھ صفات ایسی تھیں جو مجھے یاد نہیں رہیں۔''[1]

ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«لَقَدْ رَأَيْتُنِي فِي الْحِجْرِ وَقُرَيْشٌ تَسْأَلُنِي عَنْ مَسْرَايَ، فَسَأَلَتْنِي عَنْ أَشْيَاءَ مِنْ بَيْتِ الْمَقْدِسِ لَمْ أُثْبِتْهَا، فَكُرِبْتُ كُرْبَةً مَا كُرِبْتُ مِثْلَهُ قَطُّ. قَالَ: فَرَفَعَهُ اللّٰهُ لِي أَنْظُرُ إِلَيْهِ، مَا يَسْأَلُونِي عَنْ شَيْءٍ إِلَّا أَنْبَأْتُهُمْ بِهِ»

''یقیناً میں حطیم میں تھا اور قریش مجھ سے میری سیر (اسراء) کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے بیت المقدس کی کچھ ایسی چیزوں کے بارے میں پوچھا جو مجھے پوری طرح یاد نہیں تھیں، اس لیے مجھے بڑا رنج ہوا۔ مجھے ایسا رنج پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو اٹھا کر میرے سامنے نمایاں کر دیا، میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ مجھ سے جس چیز کے بارے میں بھی پوچھتے، میں انھیں بتا دیتا تھا۔''

یہ ساری نشانیاں سن کر قریش کے لوگ کہنے لگے: جہاں تک بیت المقدس کے اوصاف کی بات ہے تو اللہ کی قسم! انھوں نے سارے اوصاف بالکل ٹھیک ٹھیک بیان کیے ہیں۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے بیت المقدس کے علاوہ انھیں ان کے قافلے کی بھی خبر دی۔ آپ نے یہ قافلہ بیت المقدس سے مکہ مکرمہ واپس تشریف لاتے ہوئے راستے میں دیکھا تھا۔ آپ نے گزرتے گزرتے قافلے والوں کو سلام بھی کیا تو ان میں سے کچھ لوگ بول اُٹھے: یہ تو محمد (ﷺ) کی آواز ہے۔ آپ نے قریش کے لوگوں کو بتایا کہ میں نے تمھارے قافلے کو فلاں فلاں مقام پر دیکھا۔ ان کا ایک اونٹ گم ہوگیا تھا جسے فلاں شخص ڈھونڈ لایا اور قافلے والوں کے حوالے کر دیا۔ اب وہ اتنے فاصلے پر ہیں۔ وہ فلاں جگہ پڑاؤ ڈالیں گے، پھر فلاں جگہ ٹھہریں گے اور تمھارے پاس وہ فلاں فلاں دن پہنچیں گے۔ ان کے قافلے کے آگے ایک گندمی رنگ کا اونٹ ہے۔ اس پر سیاہ ٹاٹ پڑا ہوا ہے اور دو سیاہ بوریاں بھی لدی ہوئی ہیں۔ اب کفار قریش شدت سے اس دن کا انتظار کرنے لگے جو آپ نے قافلے کے واپس آنے کا بتایا تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی بہت سی نشانیاں پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ انھیں

[1] مسند أحمد: 309/1. [2] صحیح مسلم: 172.

آپ کی سچائی کا پورا یقین تھا۔ پھر بھی ان کے کفر و عناد کا یہ عالم تھا کہ وہ آپ کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ اب اس موقع پر ان کا خیال تھا کہ شاید اب کی بار کوئی ذرا سی بھی قابلِ اعتراض بات ہاتھ آ جائے تو ہم آپ ﷺ کے خلاف خوب شور برپا کریں گے اور ہمیں لوگوں کو ورغلانے کا بہانہ مل جائے گا۔ جب اس قافلے کے واپس آ پہنچنے کا وہ دن آیا جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا تھا تو لوگ دوپہر کے وقت ہی اس قافلے کی راہ تکنے لگے حتی کہ وہ قافلہ آ گیا۔ اس کے آگے آگے وہی اونٹ تھا جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے بتایا تھا کہ وہ گندمی رنگ کا اونٹ ہے۔[1]

یہ منظر دیکھ کر اہلِ ایمان کے چہرے کھل اٹھے اور ان کے ایمان میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہوگیا۔ اس کے برعکس مشرکین ہکا بکا ہوگئے اور اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اب آپ ﷺ کی صداقت ان کی نگاہوں کے سامنے پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ نما تھی اور ان کے پاس آپ ﷺ کی تصدیق کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ بچا تھا۔ آپ نے ان پر پوری طرح حجت قائم فرما دی تھی۔ لیکن افسوس صد افسوس! یہ سارے حقائق پوچھنے، سننے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے باوجود بھی انھوں نے آپ کے اسراء کو تسلیم نہیں کیا اور وہ آپ پر ایمان نہیں لائے۔ یہ ان کی بدبختی کی انتہا تھی۔ اس سے سرور کائنات ﷺ کی بے مثل بے باکی اور جرأت و شجاعت کا پتہ چلتا ہے کہ آپ نے قریش کی مخالفت، ان کی طرف سے بدسلوکی اور ہنسی اڑانے کے قوی اندیشے کے باوجود ان کے سامنے تمام تر جزئیات سمیت کامل سچائی کا اظہار و اعلان کر دیا اور انھیں واقعۂ اسراء کے ایسے ایسے حقائق سے آگاہ کیا جن کا تصور بھی ان کے لیے محال تھا۔ آپ نے انھیں اس واقعے سے آگاہ کرنے کے لیے کسی سے کوئی مشورہ کیا نہ کوئی رائے لی۔ آپ نے یہ بھی مناسب نہیں سمجھا کہ میں پہلے اپنے صحابہ کو اس واقعے سے آگاہ کروں، پھر ان کے مشورے اور تائید کے بعد کفار قریش کو اسراء کی حقیقت عظمیٰ سے مطلع کروں۔ گویا آپ نے اپنی امت کے لیے اہلِ باطل کے سامنے حق گوئی و بے باکی کی ایک روشن اور دائمی مثال قائم فرما دی۔

اسراء کا یہ واقعہ جہاں کفار قریش کے کفر و عناد میں اضافے کا باعث بنا، وہاں چند ایسے لوگوں کے لیے بھی ایک امتحان کی شکل اختیار کر گیا جو اسلام کی طرف مائل تھے، وہ یہ واقعہ سن کر کفر کی طرف واپس لوٹ گئے۔ انھوں نے کہا: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ محمد ﷺ جو محیر العقول باتیں کہہ رہے ہیں، ہم اس کی تصدیق کر دیں! چنانچہ اللہ تعالیٰ کا تازیانۂ تعزیر حرکت میں آیا اور غزوۂ بدر کے موقع پر ان کی گردنیں بھی ابوجہل کے ساتھ ماری گئیں۔ یوں انھیں

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 2/355-357، تفسير ابن كثير، بني إسرآءيل 17:1. حافظ ابن کثیر ؒ نے کہا ہے کہ شداد بن اوس ؓ کی اس روایت میں کچھ چیزیں صحیح ہیں اور کچھ منکر ہیں۔

نشان عبرت بنا دیا گیا۔ [1]

حسن بصری ؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مرتد ہونے والے کمزور مسلمانوں کے بارے میں یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی:

﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا﴾ (بنی إسرآءیل 60:17)

''اور ہم نے آپ کو (معراج میں) جو مشاہدہ کرایا، اسے لوگوں کے لیے بس ایک فتنہ ہی بنا دیا اور اس درخت (زقوم) کو بھی جس پر قرآن میں لعنت کی گئی اور ہم تو انھیں ڈراتے ہیں لیکن یہ چیز ان کی غایت سرکشی میں اضافہ ہی کیے جا رہی ہے۔'' [2]

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ لقب ''صدیق'' سے نواز دیے گئے

اس موقع پر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایمان سورج کی طرح جگمگا کر سامنے آیا۔ لوگ بھاگم بھاگ ان کے پاس گئے اور کہنے لگے: اب آپ کی اپنے ساتھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں کیا رائے ہے؟ وہ تو کہتے ہیں کہ انھیں راتوں رات بیت المقدس تک کی سیر کرا دی گئی ہے۔ یہ سنتے ہی ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے دریافت فرمایا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے یہ بات فرمائی ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں۔ یہ سن کر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بلا تأمل اعلان کیا: اگر انھوں نے یہ بات کہی ہے تو یقیناً انھوں نے بالکل سچ فرمایا ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ اصل ایمان کی حقیقی تعبیر ہیں اور آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ لوگ ان کا یہ ایمان افروز حتمی جواب سن کر بڑے حیران ہوئے۔ وہ کہنے لگے کہ کیا آپ ان کی اس (ماورائے عقل) بات کی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ راتوں رات بیت المقدس تک جا پہنچے اور صبح ہونے سے پہلے پہلے واپس بھی آگئے؟ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بے دریغ فرمایا: ہاں، میں تو ان کی اس سے بھی بڑی بات کی تصدیق کرتا ہوں۔ میں تو اس بات کی بھی تصدیق کرتا ہوں کہ آپ کے پاس آسمان سے صبح شام وحی آتی ہے۔ اسی فوری اور بے تأمل تصدیق کی وجہ سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام صدیق رکھ دیا گیا۔ [3]

یہ علم و یقین کا وہ سب سے اونچا درجہ ہے جو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حاصل کر لیا تھا۔ انھوں نے واقعہ معراج اور وحی کے نازل ہونے کے دعوے کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے لوگوں کو بتایا کہ عام آدمی کے لیے تو ایسا دعویٰ کرنا یقیناً ناممکن ہے۔ ہاں صرف نبی ہی ایسا دعویٰ کر سکتا ہے۔ انتہائی تعجب خیز ماورائے عقل و فہم واقعۂ معراج کی محض اس بنا

[1] مسند أحمد: 374/1. [2] السيرة لابن هشام: 399/2. [3] دلائل النبوة للبيهقي: 361,360/2، المستدرك للحاكم: 62/3.

پر آنکھیں میچ کے فوراً تصدیق کر دینا کہ یہ خبر اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ نے دی ہے، قیامت تک آنے والے والے انسانوں کے لیے رہنمائی کا لازوال چراغ ہے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس عظیم عمل میں یہ سبق جگمگا رہا ہے کہ رسالت مآب ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والا ایک ایک لفظ پوری طرح سچائی پر مبنی ہے، چاہے انسانی عقلیں اسے کتنا ہی بعید از فہم سمجھیں۔ جب بھی ہمارے سامنے آپ ﷺ کے حوالے سے کوئی بات آئے تو ہمیں بھی سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح یہ تحقیق کر لینی چاہیے کہ فی الواقع یہ بات آپ ﷺ ہی کی ہے یا نہیں؟ اگر ثابت ہو جائے کہ وہ آپ ﷺ ہی کی بات ہے تو پھر فوراً بے چون و چرا اُس بات کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے ۔

مصور کھینچ ایسا نقش جس میں یہ صفائی ہو　　　اِدھر فرمان نبوی ہو، اُدھر گردن جھکائی ہو

کفارِ قریش کو صرف اسراء کی خبر دینے کی حکمت

واقعۂ معراج کی صحیح روایات میں یہ بات موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے واپس آ کر کفار قریش کو صرف یہ بتایا کہ میں نے راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کی ہے۔ آپ نے انھیں آسمانوں کی سیر (معراج) کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کی حکمت اور وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسراء ایک زمینی واقعہ تھا۔ اس میں آپ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تشریف لے گئے تھے۔ قریش میں سے بہت سے لوگ بیت المقدس جا چکے تھے اور مسجدِ اقصیٰ سے اچھی طرح واقف تھے، اس لیے انھیں بیت المقدس کے اوصاف بتا کر اس واقعے کی عقلی اور حسی دلیل دی جا سکتی تھی اور ان سے اس کا اعتراف کرایا جا سکتا تھا۔ وہ لوگ سرور کائنات ﷺ کی مبارک زندگی سے پوری طرح آگاہ تھے اور خوب جانتے تھے کہ آپ پہلے کبھی بیت المقدس نہیں گئے۔ گویا آپ نے ان کی عقل وفہم کی سطح کا لحاظ رکھتے ہوئے انھیں صرف اسراء کی خبر دی۔ چنانچہ ہوا بھی یہی کہ پہلے پہل تو وہ لوگ اسراء کے واقعے کی خبر سن کر حیرت میں ڈوب گئے اور انھوں نے آپ کا مذاق اڑایا، پھر وہ سب یکدم خاموش ہو گئے اور انھوں نے آپ کی صداقت کا امتحان لینے کی غرض سے دلیل کے طور پر آپ سے بیت المقدس کے اوصاف پوچھے۔ جب آپ نے انھیں اس کے اوصاف بتا دیے اور ان کے قافلے کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا تو وہ دنگ رہ گئے۔ انھوں نے کھل کر صاف اعتراف کر لیا کہ آپ نے بیت المقدس کے بالکل ٹھیک ٹھیک اوصاف بیان کیے ہیں۔ یوں وہ سب کے سب لاجواب ہو گئے اور ان کے پاس اس واقعے کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پھر بھی اپنے عناد اور تعصب کی وجہ سے ایمان نہیں لائے اور انھوں نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔

ساتوں آسمانوں کی سیر (معراج) کی خبر تو اس سے بھی زیادہ حیرت خیز تھی۔ اس کے لیے اسراء کی طرح کے عقلی

اور حسی دلائل بھی موجود نہیں تھے۔ وہ تو ایک ایسی خبر تھی جسے تسلیم کرنے کے لیے دولت ایمانی کا موجود ہونا از حد ضروری تھا۔ کفارِ قریش اس دولت سے محروم تھے، لہٰذا انھیں معراج کی خبر دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ کفار قریش کو نماز کے متعلق کچھ نہیں بتاتے تھے کیونکہ وہ ایمان نہیں لائے تھے، اسی طرح آپ نے انھیں اسراء کا واقعہ سُنا دینا ہی کافی سمجھا اور معراج کا تذکرہ نہیں کیا، البتہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو، جو دولت ایمانی سے سرشار تھے، نہ صرف معراج کے متعلق بتایا بلکہ پوری طرح اس کی جزئیات سے بھی آگاہ کیا جیسا کہ آپ پیچھے معراج کا مفصل واقعہ احادیث مبارکہ کی روشنی میں پڑھ آئے ہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس واقعے کو فوراً من وعن تسلیم کر لیا اور اس کی تصدیق کر دی۔ اس سے سرورِ کائنات ﷺ کی حکمت، بصیرت اور دانائی کا اندازہ ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دین کی دعوت دینے کے سلسلے میں لوگوں کی ذہنی سطح کا پوری طرح خیال رکھتے تھے اور انھیں بتدریج حق کی دعوت دیتے تھے۔[1]

واقعۂ معراج پر کیے جانے والے لغو اعتراضات

کوئی بھی مسلمان جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہے، وہ واقعۂ معراج اور دیگر معجزات کا انکار کرنے اور انھیں اپنی عقل پر پرکھنے کی ہرگز جسارت نہیں کر سکتا، اس لیے کہ وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قدرت رکھتا ہے۔ کوئی بھی کام اس کے لیے قطعاً مشکل نہیں۔ وہ کسی طرح کے اسباب اور وسائل کا مطلق محتاج نہیں۔ اس عظیم ذات عالی کی شان تو یہ ہے:

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○﴾

”جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا حکم صرف یہ ہوتا ہے کہ اس سے کہتا ہے: ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔“[2]

مسلمان اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت کو اپنے وہم و تخمین کی حدود میں محصور نہیں کرتا، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ اس کی عقل انتہائی محدود اور نارسا ہے، البتہ وہ اس طرح کے معجزات کے بارے میں یہ تحقیق ضرور کرتا ہے کہ کیا وہ قرآن مجید یا صحیح احادیث سے ثابت ہیں؟ اگر ثابت ہوں تو وہ انھیں بلا چون و چرا تسلیم کر لیتا ہے کیونکہ اس کے ایمان کا یہی تقاضا ہے۔

واقعۂ معراج اور دیگر معجزات پر وہی لوگ انگلیاں اٹھاتے اور ان کا انکار کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ

[1] دیکھیے: من معین السیرۃ للشامی، ص: 130,129. [2] یٰس 82:36.

پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے۔ اس طرح کے لوگ اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ وہ معجزات کا انکار اور ان پر محض اس لیے اعتراضات کرتے ہیں کہ ان کی محدود عقل ان معجزات کا احاطہ نہیں کر پاتی اور وہ ان کی سوچ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ واقعۂ معراج پر اعتراضات کرنے والے بھی ایسے ہی لوگ ہیں۔ وہ اس عظیم اور بے مثال واقعے پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص رات کے کچھ حصے میں مکہ سے بیت المقدس تک جائے، پھر وہاں سے ساتوں آسمانوں کی سیر کرکے واپس بیت المقدس آئے اور وہاں سے صبح ہونے سے پہلے پہلے واپس مکہ بھی آجائے۔ اس وقت کے ذرائع آمد و رفت کے مطابق صرف مکہ سے بیت المقدس تک جانے کی مسافت چالیس دن تک کے سفر کی تھی۔ بھلا اتنا طویل سفر راتوں رات کیسے مکمل ہوگیا؟ دوسری بات یہ کہ ہوا زمین سے تقریباً دو سو میل اوپر تک موجود ہے۔ اس سے اوپر ہوا کا کوئی وجود نہیں بلکہ کرۂ نار و زمہریر ہے اور ان دونوں مقامات کو کسی جسم عنصری کا صحیح سالم زندہ حالت میں عبور کرلینا محال ہے، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ثقیل جسم کے ساتھ اسے عبور کرلیں۔ تیسرا یہ کہ فلسفۂ قدیمہ تو اجرام فلکیہ تک رسائی کو امر محال قرار دیتا ہے جبکہ فلسفۂ جدیدہ تو افلاک کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتا، لہٰذا اہل یورپ کے خیال کے مطابق جب آسمان کا وجود ہی ثابت نہیں تو ایک آسمان سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے پر ساتوں آسمانوں تک اس شان سے تشریف لے جانا کس طرح باور کیا جاسکتا ہے؟

ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ تمام اعتراضات، توہمات کے سوا کچھ نہیں۔ ان حضرات کے پاس اپنے اپنے موقف کی کوئی دلیل نہیں۔ ان اعتراضات کا جواب دینے سے پہلے ہم یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرادینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسراء و معراج کا واقعہ ایک معجزہ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ایک نمونہ ہے۔ اس واقعے کی اصل خصوصیت ہی یہ ہے کہ یہ انسان کی محدود عقل سے بالاتر ہے۔ انسانی عقل اس کا احاطہ کرسکتی ہے نہ اس کی تہ تک پہنچ سکتی ہے۔ تاہم مادہ پرست اور ان سے متاثر ہونے والے لوگوں نے جو اعتراضات پیش کیے ہیں، ان کا عقلی طور پر جواب دیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک ان کے پہلے اعتراض کی بات ہے، تمام دانشور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حرکت کی سرعت کی کوئی حد نہیں۔ اب سے ایک صدی پہلے تک تو کسی کو یہ یقین بھی نہیں آسکتا تھا کہ ایسے ہوائی جہاز بھی ایجاد ہوجائیں گے جو مہینوں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے کریں گے بلکہ آج تو یہ حالت ہے کہ خلائی جہاز مہینوں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے کر لیتے ہیں۔ اس جدید اور ترقی یافتہ دور میں ایسی ایسی مشینریاں تیار ہوچکی ہیں جو پہلے انسان کے خواب و خیال میں

بھی نہیں آسکتی تھیں۔ یہ وہ مادی چیزیں ہیں جو انسان نے اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی عقل کو بروئے کار لا کر تیار کی ہیں۔ جب ہم ربِ کائنات کی بغیر کسی واسطے اور ذریعے کے پیدا کردہ چیزیں دیکھتے ہیں تو ہماری عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں۔ سورج ہی کو دیکھ لیجیے! یہ زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ یہ سورج چوبیس گھنٹوں میں کتنا فاصلہ طے کرتا ہے؟ سورج کا مدار ساٹھ کروڑ میل ہے۔ ساٹھ کو چوبیس پر تقسیم کریں تو ہر گھنٹے میں سورج کی حرکت اڑھائی کروڑ میل بنتی ہے۔ اس حساب سے سورج ایک سیکنڈ میں تقریباً 6944 میل کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ مسلسل اس قدر تیز حرکت کرتے رہنے سے نہ سورج کا کرہ پھٹتا ہے نہ اس کے اجزاء میں کوئی فرق رُونما ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سورج کی جو شعاعیں ہم تک پہنچتی ہیں، ان پر غور کیجیے کہ وہ ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہیں۔ اسی طرح ذرا زمین کی گردش کو بھی دیکھیے۔ زمین ایک گھنٹے میں اٹھاون ہزار میل کا فاصلہ طے کرتی ہے، یعنی یہ توپ کے گولے سے بھی ایک سو بیس گنا تیز رفتار سے گردش کر رہی ہے مگر اس بے اماں حرکت سے نہ زمین کے اجزاء میں کوئی تغیر ہوتا ہے اور نہ اس حیرتناک حرکت سے ہمیں کسی قسم کی کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ بادل کی بجلی مشرق میں چمکتی ہے اور مغرب میں جا گرتی ہے۔ جس بے مثال ذات نے یہ ساری حیرتناک چیزیں پیدا کی ہیں، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ اپنے محبوب محمد ﷺ کو راتوں رات اسراء ومعراج کرا دے۔

جہاں تک دوسرے اعتراض کی بات ہے کہ زمین سے دو سو میل اوپر فضا میں ہوا کا کوئی وجود نہیں اور ناقابلِ عبور کرہ نار و زمہریر موجود ہے تو اس فلسفے کی بنیاد پر بھی واقعۂ معراج کا انکار کسی لحاظ سے قرینِ عقل نہیں۔ آج انسان اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ نت نئے ایجاد شدہ آلات کی بدولت جسم حرارت اور برودت کے خارجی اثرات سے بالکل محفوظ رہتا ہے۔ اسی طرح معدنی ایندھن کی طاقت سے انسان ہوائی جہاز کے ذریعے سے دس ہزار فٹ کی بلندی تک پرواز کر لیتا ہے۔ ہزاروں من وزنی ہوائی جہاز فضا میں ہماری آنکھوں کے سامنے اڑتے پھرتے اور گھنٹوں میں ہزاروں میل کی مسافت طے کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ منظر ساری دنیا کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس قدر ترقی کر چکا ہے تو اللہ ذوالجلال کی قدرت تو اس قدر اعلیٰ اور ارفع ہے کہ اس کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ بھلا مشتِ خاک کو ربِّ کائنات سے کیا نسبت! خود سائنسدان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم چاند تک پہنچ چکے ہیں اور ہمارے خلائی جہاز مریخ تک کا پھیرا لگا آئے ہیں۔ جب فانی انسان کے ناممکنات پر تصرفات کا یہ عالم ہے تو پھر یہ کس قدر حیرت وتعجب کی بات ہے کہ وہ

اس ذات عالی کی قدرت کو تسلیم نہ کرے جس نے اسے پیدا فرمایا اور انھیں سب کچھ عطا کیا؟

ہوا اور انسان دونوں کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمایا ہے۔ اسی نے انسان کو زندہ رہنے کے لیے ہوا کا ضرورتمند بنایا ہے۔ کیا وہ اس بات پر قدرت نہیں رکھتا کہ انسان کو ہوا سے بے نیاز کر دے اور اسے بغیر ہوا کے زندہ رکھے؟ اللہ تعالیٰ ہی تو ہے جو بچوں کو ماؤں کے بطن میں بغیر ہوا کے زندہ رکھتا ہے۔ اس نے بہت سی ایسی مخلوقات پیدا فرمائی ہیں جو سمندر میں بغیر ہوا کے زندگی گزارتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی قدرت کے اور بھی لامحدود کرشمے موجود ہیں۔ آج سرکاری باغوں میں ایسے ایسے درخت موجود ہیں جن کے نیچے پانی کے بجائے آگ روشن کی جاتی ہے اور وہ آگ کی گرمی سے سرسبز و شاداب رہتے ہیں اور جونہی آگ کی حرارت کم ہوتی ہے تو وہ خشک ہوکر رہ جاتے ہیں۔ جس قادر مطلق ذات کی قدرت کے یہ کرشمے ہیں اور جس نے خلا میں اجرامِ ساویہ کی گردش کا زبردست نظام قائم کر رکھا ہے، کیا وہ جسمِ انسانی کو خلا میں لے جانے کی قدرت نہیں رکھتا؟

باقی رہا تیسرا اعتراض تو فلسفۂ قدیمہ کا یہ دعویٰ کرنا کہ آسمان پھٹنے اور جڑنے کے قابل نہیں، یہ شبہ تو صرف بطلیموس کی تقلید کرنے سے پیدا ہوگیا تھا کیونکہ اس نے آسمان کو ٹھوس، سخت اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے قرار دیا تھا۔ اسی کا وضع کردہ نظام مسلمانوں نے ترجمہ کر کے عربی زبان میں منتقل کیا اور وہی مسلمانوں میں شائع ہوا، حالانکہ خود حکماء ہی نے اس نظام کو باطل قرار دیا اور یہ بات غلط ثابت ہوگئی کہ آسمان کا وجود ایسا سخت ہے کہ اس میں کوئی گزر ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہوا کہ ہزاروں تارے اور اجسام اس آسمان میں جو فضا کی طرح معلوم ہوتا ہے، گھومتے ہیں۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ آسمان ٹھوس اور سخت جسم کا نام ہے تو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ ان میں دروازے اور راستے نہیں ہیں! اگر بالفرض یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ آسمان میں دروازے اور راستے نہیں تو یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ آسمان پھٹنے اور جڑنے کے قابل نہیں!

رہی بات فلسفہ جدیدہ کی افلاک کو تسلیم نہ کرنے کی تو یہ افلاک کے معدوم ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔ تمام دانشوروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی چیز کا نظر نہ آنا یا اس کا ثابت نہ ہونا اس کے معدوم ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا ورنہ زمین اور آسمان کی ان ہزاروں چیزوں کا انکار لازم آئے گا جو ہماری نگاہ، عقل اور علم سے پوشیدہ ہیں۔ دانشور حضرات اس پر بھی متفق ہیں کہ کسی کی جہالت اور لاعلمی دوسرے پر حجت نہیں۔ اگر ان فلسفیوں کا یہ دعویٰ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ یہ نیلگوں چیز جو ہمیں نظر آتی ہے، فی الحقیقت آسمان نہیں، تب بھی اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس نیلگونی رنگ کے اوپر آسمانوں کا کوئی وجود نہیں؟ [1]

[1] مزید دیکھیے: مشکلات الأحادیث النبویة وبیانها، ص :176-195، سیرت مصطفیٰ ﷺ از ادریس کاندھلوی: 1/324-326، تفسیر عثمانی، بنيٓ إسرآءيل 17:1، سبل الهدیٰ والرشاد :3/74,75.

بہرحال واقعۂ اسراء و معراج اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ایک انتہائی عظیم الشان نادر نمونہ ہے۔ قدرتِ الٰہی کے سوا اس میں کسی اور چیز کا مطلق کوئی دخل نہیں۔ اکبر الہ آبادی نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں دفتر پیدا ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

جو لوگ اس واقعے پر اعتراض کرتے ہیں، یا اس کا انکار کرتے ہیں، وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی قدرت پر اعتراض کرتے اور اس کے کمالات فائقہ کا انکار کرتے ہیں۔ مخلوق میں سے کسی کو بھی اس جسارت کا کوئی حق نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو اپنی محدود عقل کی بودی کسوٹی پر پرکھے اور معجزات کو محض اس لیے ہدفِ اعتراض بنائے کہ وہ اس کی عقل سے بالاتر ہیں۔

بیت المقدس کے پادری کی گواہی

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے حافظ ابونعیم اصفہانی رحمہ اللہ کے حوالے سے یہ دلچسپ اور حیرت انگیز واقعہ نقل کیا ہے کہ جب سرور کائنات ﷺ نے دحیہ بن خلیفہ رضی اللہ عنہ کو شاہ روم ہرقل کی طرف اپنا سفیر بنا کر بھیجا تو اس موقع پر شاہِ روم نے شام میں آئے ہوئے تاجر ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) اور ان کے ساتھیوں کو اپنے دربار میں طلب کر کے ان سے وہ مشہور سوالات کیے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت میں موجود ہیں۔ ابوسفیان ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اس لیے اُن کی یہی کوشش رہی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو ہرقل کی نگاہوں میں حقیر اور کم تر بنا کر پیش کریں لیکن وہ کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم! میں اس بات سے صرف اس لیے باز رہا کہ میں یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ ہرقل کے پاس کوئی جھوٹ بولوں اور وہ میرا جھوٹ پکڑ لے اور پھر میری کسی بھی بات کو سچا نہ مانے۔ آخر کار مجھے آپ کی معراج والی بات یاد آ گئی۔ میں نے کہا: بادشاہ سلامت! کیوں نہ میں آپ کو ایک ایسی بات بتاؤں جس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس شخص (محمد ﷺ) نے جھوٹ بولا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا: وہ کیا بات ہے؟ میں نے کہا: ان کا یہ خیال ہے کہ وہ ایک رات ہمارے علاقے سرزمینِ حرم سے نکلے اور تمھاری اس مسجد، مسجد ایلیا (مسجد اقصیٰ) تک آ گئے اور اسی رات صبح ہونے سے پہلے پہلے ہمارے پاس واپس بھی پہنچ گئے۔

ایلیا کا سب سے بڑا پادری اس وقت قیصر روم کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے ابوسفیان کی یہ بات سن کر فوراً کہا: میں اس رات سے واقف ہوں۔ قیصر روم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا: تمھیں اس کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟ اس نے کہا: میری عادت یہ تھی کہ میں رات کو سونے سے پہلے مسجد کے سارے دروازے بند کر کے سویا کرتا تھا۔ اس رات میں نے سارے دروازے بند کر دیے مگر ایک دروازہ مجھ سے بند نہ ہو سکا۔ میں

نے اپنے کارندوں سے اور جو دیگر لوگ میرے پاس موجود تھے، سب سے مجموعی طور پر مدد طلب کی مگر ہم سب مل کر اس دروازے کو ہلا بھی نہ سکے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم کوئی پہاڑ اس کی جگہ سے سرکا رہے ہیں۔ میں نے ترکھانوں کو بلایا۔ انھوں نے اس دروازے کا معائنہ کر کے بتایا کہ اس پر تو چوکھٹ اور عمارت کا بوجھ پڑ گیا ہے۔ ہم اسے صبح ہونے سے پہلے نہیں ہلا سکتے۔ صبح دیکھیں گے کہ یہ بوجھ کہاں سے آ پڑا ہے۔ میں واپس آ گیا۔ دونوں دروازے کھلے ہی رہنے دیے۔ صبح ہوئی۔ میں ان دروازوں کے پاس گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ مسجد کے ایک کونے میں پڑے ہوئے پتھر میں ایک سوراخ ہوگیا ہے اور اس میں جانور کو باندھنے کا نشان بھی موجود ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: یقیناً رات کو یہ دروازہ کسی نبی ہی کے لیے کھلا رکھا گیا ہے اور انھوں نے ہماری اس مسجد میں نماز بھی پڑھی ہے۔ [1]

پانچ نمازوں کے اوقات

معراج کے موقع پر جب سرور کائنات ﷺ کو بارگاہِ الٰہی سے پانچ نمازوں کا نہایت بابرکت اور رفیع الشان تحفہ ملا تو اب ان نمازوں کے اوقات مقرر کرنے کی ضرورت تھی کہ یہ کس کس وقت ادا کی جائیں گی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اللہ رب العزت نے فرشتوں کے سردار سیدنا جبریل علیہ السلام کو بھیجا کہ وہ نماز کے اوقات کی تعلیم دیں۔ جبریل علیہ السلام اسی دن زوال کے وقت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تشریف لائے۔ انھوں نے آپ کو زبانی طور پر آگاہ کرنے کے بجائے عملی طور پر مسلسل دو دن تک پانچوں نمازوں کی ان کے ابتدائی اور انتہائی اوقات میں امامت کرائی۔ اس سلسلے میں خود رسالت مآب ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«أَمَّنِي جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ عِنْدَ الْبَيْتِ مَرَّتَيْنِ»

''جبریل علیہ السلام نے بیت اللہ کے پاس دو مرتبہ میری امامت کرائی۔'' [2]

اس موقع پر مسلمانوں کو بھی اکٹھا کیا گیا۔ جبریل علیہ السلام نے نبی اکرم ﷺ کی امامت کرائی، پھر نبی ﷺ نے لوگوں کی امامت کرائی۔ [3]

جبریل علیہ السلام نے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کو ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب سورج ڈھل گیا اور سایہ تسمے کے برابر رہ گیا۔ جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہوگیا تو عصر کی نماز پڑھائی۔ جب سورج غروب ہوگیا اور روزہ دار کے روزہ افطار کرنے کا وقت ہوگیا تو مغرب کی نماز پڑھائی۔ پھر جب شفق کی سرخی افق میں غائب ہوگئی

[1] [ضعیف] تفسیر ابن کثیر، بنيّ إسرآءیل 17:1. [2] [ضعیف] سنن أبي داود: 393. [3] المصنف لعبد الرزاق: 455،454/1، رقم: 1773.

تو عشاء کی نماز پڑھائی۔ اسی طرح جب فجر طلوع ہوگئی اور روزہ دار پر کھانا پینا حرام ہونے کا وقت شروع ہوگیا تو فجر کی نماز پڑھائی۔ یہ پانچوں نمازوں کے ابتدائی اوقات تھے جن میں جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کی امامت کرائی۔ اگلے روز انھوں نے نمازوں کے انتہائی اوقات میں امامت کرائی۔ چنانچہ جب ہر چیز کا سایہ اس کے مثل ہوگیا تو جبریل علیہ السلام نے ظہر کی نماز پڑھائی۔ پھر جب ہر چیز کا سایہ اس کے دو مثل ہوگیا تو عصر کی نماز پڑھائی۔ اسی طرح جب روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے تو مغرب کی نماز اول وقت پڑھائی۔ پھر جب رات کا تہائی حصہ گزر گیا تو عشاء کی نماز پڑھائی۔ جب صبح کی روشنی خوب پھیل گئی تو فجر کی نماز پڑھائی۔ آخر میں جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہوکر عرض کیا:

«يَا مُحَمَّدُ! هٰذَا وَقْتُ الْأَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِكَ، وَالْوَقْتُ مَا بَيْنَ هٰذَيْنِ الْوَقْتَيْنِ»

''اے محمد (ﷺ)! آپ سے پہلے کے انبیاء کے یہی اوقات ہیں اور نماز کے اوقات انھی دونوں وقتوں کے مابین ہیں۔''[1]

اس واقعے سے نماز کے اوقات کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ جس طرح نماز پڑھنا فرض ہے، اسی طرح ہر نماز کو بروقت ادا کرنا بھی فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا تذکرہ نہایت واضح انداز میں اس طرح فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتٰبًا مَّوْقُوتًا﴾ (النسآء 4:103)

''بے شک مومنوں پر مقررہ وقتوں میں نماز فرض ہے۔''

اللہ تعالیٰ بھی نماز کو اس کے مقررہ وقت پر ادا کرنے کو نہایت پسند کرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: کون سا عمل اللہ کو زیادہ محبوب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلصَّلَاةُ عَلٰى وَقْتِهَا»

''نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا۔''[2]

نمازوں کے اوقات کے ذریعے سے انسان کو دراصل وقت کی اہمیت سے روشناس کرایا گیا ہے اور یہ تربیت دی گئی ہے کہ انسان کو روزمرہ کے امور میں وقت کی پابندی کرنی چاہیے اور ہر کام کو اس کے وقت پر کرنا چاہیے۔

رکعات کی تعداد

نمازوں کے اوقات کا تعین ہو جانے کے بعد یہ بات غور طلب ہے کہ اس وقت پانچوں نمازوں کی کتنی رکعات

[1] سنن أبي داود: 393، جامع الترمذي: 149. [2] صحيح البخاري: 527.

پڑھی جاتی تھیں۔ اس کے بارے میں سب سے واضح حدیث ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ شروع شروع میں دو دو رکعتیں فرض کی گئیں، پھر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کی تو چار چار رکعتیں فرض کر دی گئیں اور سفر کی نماز دو رکعت ہی رہی۔ [1] البتہ مغرب کی نماز کی ابتدا میں تین رکعتیں تھیں، ہجرتِ مدینہ کے بعد اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا اور اس کی پہلے کی طرح تین رکعات ہی برقرار رکھی گئیں کیونکہ وہ دن کا وتر ہے۔ اسی طرح فجر کی نماز میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا گیا، اس لیے کہ اس میں قراءت لمبی ہوتی ہے۔ [2]

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسراء ومعراج کے موقع پر جب پانچ نمازیں فرض ہوئیں تو اس وقت فجر، ظہر، عصر اور عشاء کی دو دو رکعتیں اور مغرب کی تین رکعتیں ادا کی جاتی تھیں، پھر ہجرتِ مدینہ کے بعد ظہر، عصر اور عشاء کی نماز میں دو دو رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا اور فجر اور مغرب کی رکعتوں کو حسب سابق پہلے کی طرح ہی باقی رکھا گیا۔ [3]

رہی یہ بات کہ جبریل علیہ السلام نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلسل دو دن نماز پنجگانہ کی امامت کرائی تو کتنی رکعات پڑھائیں۔ اس کے بارے میں بعض روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں پڑھائیں اور مغرب کی تین اور فجر کی دو رکعتیں پڑھائیں۔ لیکن یہ روایات ضعیف ہیں۔ [4]

واقعۂ معراج کے پس پردہ حقائق اور اثرات

اسراء ومعراج انتہائی عظیم الشان واقعہ تھا۔ اس موقع پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بہت رفیع و وقیع مناظر اور بڑی روشن نشانیاں دیکھیں۔ اس واقعے میں بہت سے علوم، راز، لطافتیں، اسباق اور نصیحت آموز باتیں موجود ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی رحمہ اللہ نے اس واقعے کے بارے میں کیا خوب لکھا ہے کہ یہ محض ایک جزئی وضمنی واقعہ نہ تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کرایا گیا اور آسمان و زمین کی بادشاہت بے پردہ و بے حجاب ہو کر آپ کے سامنے آ گئی۔ نبوت کے اس غیبی اور آسمانی سفر میں اس کے علاوہ بھی بہت بلند ولطیف مطالب و معانی پوشیدہ ہیں اور اس میں بہت دور رس اشارات کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں سورتیں، سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ نجم، جو واقعۂ معراج کے سلسلے میں نازل ہوئیں، یہ اعلان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں قبلوں (مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ) کے نبی اور دونوں سمتوں مشرق ومغرب کے امام اور اپنے پیش رو

[1] صحيح البخاري: 350 و 3935، صحيح مسلم: 685. [2] مسند أحمد: 241/6، السلسلة الصحيحة، حديث: 2814. [3] مزید دیکھیے: فتح الباري: 602/1. [4] دلائل النبوة للبيهقي: 408,407/2، المصنف لعبد الرزاق: 455,454/1، رقم: 1773.

تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے وارث اور بعد میں آنے والی پوری نسلِ انسانی کے رہبر و رہنما ہیں۔ آپ کی شخصیت اور آپ کے سفرِ معراج میں مکہ مکرمہ، بیت المقدس سے اور مسجدِ حرام مسجد اقصیٰ سے ہم آغوش ہوگئی۔ آپ کی امامت میں تمام انبیاء نے نماز پڑھی۔ یہ دراصل آپ کے پیغام و دعوت کی عمومیت و آفاقیت، آپ کی امامت کی ابدیت اور ہر طبقۂ انسانی کے لیے آپ کی تعلیمات کی ہمہ گیری و صلاحیت کی دلیل و علامت تھی۔ یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا صحیح تعارف اور اس کی صحیح نشان دہی، آپ کی قیادت و امامت کا بیان، آپ کی اس امت (جس میں آپ مبعوث ہوئے) کے اصل مقام وحیثیتِ عرفی کا تعین اور اس پیغام و دعوت اور مخصوص کردار کی پردہ کشائی کرتا ہے جو اس امت کو اس وسیع و عریض دنیا اور عالمی برادری میں انجام دینا ہے۔[1]

اب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک نئے مرحلے کی طرف پیش قدمی فرمانے والے تھے۔ یہ ہجرتِ مدینہ اور ایک نئی اسلامی مملکت کے قیام کا مرحلہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس عظیم الشان مملکت کے بنیادی پتھر صحیح سلامت، ٹھوس اور آپس میں مضبوطی سے جڑے ہوئے ہونے چاہئیں۔ اس سلسلے میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ پر ایمان لانے والوں کو امتحان و آزمائش کے انتہائی صبر آزما مرحلے سے گزارا گیا تاکہ آپ کے پیروکاروں کا ہراول دستہ ہر قسم کی کمزوری، دلوں کی ہر بیماری اور شک و شبہ سے پاک ہو جائے اور طاقتور، مخلص، پکا سچا اور کھرا مومن بن جائے۔

اسراء و معراج کا یہ تاریخی واقعہ ہجرتِ مدینہ کا پیش خیمہ بن گیا۔ اس واقعے میں مظلوم اور ستم رسیدہ مسلمانوں کے لیے یہ بشارت تھی کہ اب رنج و غم اور درد و درماندگی کے دن دور ہونے والے ہیں۔ ظلم و ستم کی اندھیری رات ڈوبنے والی ہے اور امن و آشتی کی سحر طلوع ہونے والی ہے۔ روئے زمین پر مومنوں کی سطوت و شوکت کا ڈنکا بجنے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل میں اسراء کا واقعہ نہایت جامع اور مختصر انداز میں ایک آیت میں ذکر کیا اور فوراً ہی کلام کا رخ یہود کی سیاہ کاریوں اور جرائم کی طرف موڑ دیا، پھر انھیں آگاہ کیا کہ یہ قرآن اس راستے کی ہدایت دیتا ہے جو سب سے سیدھا اور صحیح ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے کو بسا اوقات شبہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں بے جوڑ سی باتیں ہیں لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اسلوب کے ذریعے سے یہ اشارہ فرما رہا ہے کہ اب یہود کو نوعِ انسانی کی قیادت سے معزول کیا جانے والا ہے، اس لیے کہ انھوں نے ایسے ایسے جرائم کا ارتکاب کیا ہے جن میں ملوث ہونے کے بعد انھیں اس منصب پر کسی صورت باقی نہیں رکھا جا سکتا۔ اب یہ منصب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سونپا جائے گا اور دعوتِ ابراہیمی کے دونوں مراکز ان کے ماتحت کر دیے جائیں گے۔

[1] نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم، ص: 191,190۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ روحانی قیادت ایک ایسی امت سے جس کی تاریخ غدر و خیانت اور ظلم و بدکاری سے بھری ہوئی ہے، چھین کر ایک ایسی امت کے حوالے کر دی جائے جس سے نیکیوں اور بھلائیوں کے چشمے پھوٹیں گے اور جس کا پیغمبر سب سے زیادہ صحیح راستہ بتانے والے قرآن کی وحی سے بہرہ ور ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ایسے تمدنی قواعد وضوابط اور دفعات و مبادی بھی بیان فرمائے ہیں جن پر آیندہ اسلامی معاشرے کی تشکیل ہونے والی تھی۔[1]

معراج کی روایات کا تجزیہ

اسراء ومعراج کے بارے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے احادیث مختلف اسانید سے مروی ہیں۔ ہم یہاں ان روایات کی تخریج صحت وضعف کے ساتھ بیان کیے دیتے ہیں تاکہ قارئین اس واقعے کی استنادی حیثیت کو سمجھ سکیں۔

- سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ: ان سے معراج کے بارے میں مختلف روایتیں کئی طرق (سندوں) سے مروی ہیں:

1. بطریق ابن شہاب زہری از انس رضی اللہ عنہ از ابوذر رضی اللہ عنہ۔ صحيح البخاري: 349، صحيح مسلم: 163.
2. بطریق قتادہ از انس رضی اللہ عنہ از مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ۔ صحيح البخاري: 3207، صحيح مسلم: 164.
3. بطریق ثابت البنانی از انس رضی اللہ عنہ۔ صحيح مسلم: 162، مسند أحمد: 149,148/3.
4. بطریق ثابت البنانی وسلیمان تیمی از انس رضی اللہ عنہ۔ صحيح مسلم: 2375.
5. بطریق شریک بن عبداللہ بن ابی نمر از انس رضی اللہ عنہ۔ صحيح البخاري: 7517، صحيح مسلم: (262)-162. شریک سے بعض جملوں کے بیان کرنے میں تسامح ہوا ہے۔
6. بطریق قتادہ از انس رضی اللہ عنہ۔ صحيح البخاري: 5610 و 4964، جامع الترمذي: 3131، مسند أحمد: 164/3 و 207/3.
7. بطریق عبدالرحمان بن ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص از انس رضی اللہ عنہ۔ دلائل النبوة للبيهقي: 362/2، تفسير الطبري، بني إسرآئيل 1:17. یہ روایت عبدالرحمٰن بن ہاشم کے مجہول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔
8. بطریق سعید بن عبدالعزیز از یزید بن ابی مالک از انس رضی اللہ عنہ۔ سنن النسائي: 451. یہ روایت یزید بن ابی مالک اور سعید بن عبدالعزیز کی وجہ سے ضعیف ہے۔
9. بطریق خالد بن یزید بن ابی مالک از پدر بزرگوار یزید از انس رضی اللہ عنہ۔ تفسير ابن كثير، بني إسرآءيل 1:17. یہ

[1] دیکھیے: الرحيق المختوم، ص: 204,203، سیرۃ النبی ﷺ: 3/279-293.

خالد بن یزید اور ان کے والد یزید بن مالک کی وجہ سے ضعیف ہے۔

10 بطریق حمید از انس رضی اللہ عنہ۔ مسند أحمد :3/103 و 128.

11 بطریق زہری از انس رضی اللہ عنہ۔ مسند أحمد : 3/161، جامع الترمذي : 213.

12 بطریق سلیمان تیمی از انس رضی اللہ عنہ (از بعض صحابہ)۔ صحیح مسلم :2375. قوسین والے الفاظ مسند أحمد : 5/59 میں ہیں۔

13 14 بطریق راشد بن سعد اور عبدالرحمٰن بن جبیر از انس رضی اللہ عنہ۔ سنن أبي داود :4878.

15 بطریق علی بن زید بن جدعان از انس رضی اللہ عنہ۔ مسند أحمد :3/180.

16 بطریق ہشام الدستوائی از مغیرہ از مالک بن دینار از انس رضی اللہ عنہ۔ موارد الظمآن :1/141,142، حديث :35.

17 بطریق جُبَارة بن مُغَلِّس از کثیر بن سلیم از انس رضی اللہ عنہ۔ سنن ابن ماجه :3479. اس کی سند میں جبارہ بن مغلس اور کثیر بن سلیم ضعیف ہیں لیکن اس روایت کے ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم کی حدیث سے شواہد موجود ہیں جن سے اس کو تقویت مل جاتی ہے۔ الإسراء و المعراج للألباني، ص :54,55.

18 بطریق ابونضر از سلیمان بن مغیرہ از انس رضی اللہ عنہ۔ تفسیر الطبري، النجم53:14.

- سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ:

بطریق حماد بن سلمہ از ابوسنان از عبید بن آدم از ابومریم از ابوشعیب از عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ۔ مسند أحمد: 1/38. اس کی سند ابوسنان عیسیٰ بن سنان کی وجہ سے ضعیف ہے۔

- سیدنا علی رضی اللہ عنہ:

بطریق زیاد بن منذر از محمد بن علی بن حسین از والد گرامی علی از حسین از والد گرامی علی رضی اللہ عنہما۔ کشف الأستار: 1/178,179، مجمع الزوائد:1/328,329. یہ زیاد بن منذر کی وجہ سے بہت ضعیف ہے۔

- عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ: ان کی روایت مختلف طرق سے بیان ہوئی ہے:

1 بطریق مالک بن مغول از زبیر بن عدی از طلحہ بن مصرف از مُرّہ از ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔ صحیح مسلم: 173.

2 بطریق قتادہ بن عبداللہ تیمی از ابوظبیان الجنبی از ابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود از ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔ تاريخ دمشق: 3/290، تفسیر ابن کثیر، بنيّ إسرآءيل 17:1. ابوعبیدہ اور ان کے والد ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے درمیان

انقطاع ہے، ان کا اپنے والد سے سماع نہیں۔ اسی طرح قتادہ بن عبداللہ تیمی مجہول ہے، لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔

3 بطریق مُؤثِر بن عَفَازَہ از ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔ سنن ابن ماجہ:4081.

4 بطریق حماد بن سلمہ از ابوحمزہ از ابراہیم از علقمہ از ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔ المستدرك للحاكم: 606/4. یہ ابوحمزہ میمون اعور کی وجہ سے ضعیف ہے۔

5 بطریق عبدالرحمٰن بن اسحاق از قاسم بن عبدالرحمٰن از عبدالرحمٰن از ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔ جامع الترمذي:3462.

6 بطریق سلیمان شیبانی از زر بن حبیش از ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔ صحیح مسلم: 174.

7 بطریق ابووائل از ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔ المعجم الكبير للطبراني: 235/10.

8 بطریق حسین بن واقد از عاصم بن بہدلہ از شقیق بن سلمہ از ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔ مسند أحمد:407/1.

9 بطریق اسحاق بن ابی الکہتلہ از ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔ مسند أحمد :407/1.

10 بطریق اسرائیل از ابواسحاق از عبدالرحمٰن بن یزید از ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔ مسند أحمد:394/1.

■ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ: ان کی روایت کے کئی طرق ہیں:

1 بطریق ابنِ شہاب زہری از انس رضی اللہ عنہ از ابوذر رضی اللہ عنہ۔ صحیح البخاري: 349، صحیح مسلم: 163. یہ طریق پہلے انس رضی اللہ عنہ کی روایات کے ضمن میں بھی گزر چکا ہے۔

2 بطریق قتادہ از عبداللہ بن شقیق از ابوذر رضی اللہ عنہ۔ صحیح مسلم: 178.

■ مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ: بطریق قتادہ از انس رضی اللہ عنہ از مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ۔ صحیح البخاري: 3207، صحیح مسلم: 164. یہ طریق انس رضی اللہ عنہ کی روایات کے ذیل میں بھی بیان ہو چکا ہے۔

■ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ: ان کی روایت درج ذیل طُرق سے مروی ہے:

1 بطریق سعید بن مسیّب از ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ صحیح البخاري: 3394، صحیح مسلم: 168.

2 بطریق ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن از ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ صحیح مسلم: 172.

3 بطریق حاتم بن اسماعیل از عیسیٰ بن ماہان از ربیع بن انس از ابوالعالیہ از ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ دلائل النبوة للبيهقي: 397/2-403، تفسير الطبري، بنيّ إسرآئيل 1:17. یہ روایت ابوجعفر رازی عیسیٰ بن ماہان کی وجہ سے ضعیف ہے۔ مزید دیکھیے: تفسير ابن كثير، بنيّ إسرآئيل 1:17.

■ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ

بطریق ابوہارون عبدی از ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ۔ دلائل النبوة للبيهقي: 2/390-396، تفسیر الطبري، بنيّ إسرآءيل: 17:1. یہ ابوہارون عبدی کی وجہ سے ضعیف ہے۔

■ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما: ان کی روایت کئی طرق سے مروی ہے:

1 بطریق قابوس از اپنے والد ابوظبیان از ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ مسند أحمد: 1/257. یہ روایت قابوس کی وجہ سے ضعیف ہے۔

2 بطریق ثابت ابو زید از ہلال از عکرمہ از ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ مسند أحمد: 1/374، مسند أبي يعلى الموصلي: 5/2720.

3 بطریق سفیان از عمرو از عکرمہ از ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ صحيح البخاري: 3888.

4 بطریق قتادہ از ابوالعالیہ از ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ صحيح البخاري: 3239، صحيح مسلم: 165.

5 بطریق حماد بن سلمہ از عطاء بن سائب از سعید بن جبیر از ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ مسند أحمد: 1/309,310.

6 بطریق عوف از زرارہ بن ابی اوفیٰ از ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ مسند أحمد: 1/309.

7 بطریق عبثر بن قاسم از حصین بن عبدالرحمٰن از سعید بن جبیر از ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ جامع الترمذي: 2446.

8 بطریق شریک از ابوعلوان عبداللہ بن عُصم از ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ سنن ابن ماجه: 1400.

9 بطریق عباد بن منصور از عکرمہ از ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ مسند أحمد: 1/354، سنن ابن ماجه: 3477.

■ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ

بطریق اسحاق بن ابراہیم بن علاء بن ضحاک زبیدی از عمرو بن حارث از عبداللہ بن سالم اشعری از محمد بن ولید بن عامر زبیدی از ولید بن عبدالرحمٰن از جبیر بن نفیر از شداد بن اوس رضی اللہ عنہ۔ دلائل النبوة للبيهقي: 2/355-357.
اس کا ایک راوی اسحاق بن ابراہیم زبیدی مختلف فیہ ہے۔

■ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ:

1 بطریق عطاء از عبید بن عمیر از ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔ المسند للشاشي: 4/252، الخصائص الكبرىٰ للسيوطي: 1/260.

2 بطریق سعید بن بشیر از قتادہ از مجاہد از ابن عباس رضی اللہ عنہما از ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔ سنن ابن ماجه: 4030. یہ سعید بن بشیر کی وجہ سے ضعیف ہے۔

■ عبدالرحمٰن بن قرط رضی اللہ عنہ:

بطریق مسکین بن میمون از عروہ بن رویم از عبدالرحمٰن بن قرط رضی اللہ عنہ۔ المعجم الأوسط للطبراني: 19/3. یہ مسکین بن میمون کے مجہول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

■ ابوحبہ انصاری رضی اللہ عنہ:

صحیح البخاري: 349، صحیح مسلم: 163.

■ ابولیلیٰ انصاری رضی اللہ عنہ:

بطریق محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ از اپنے بھائی عیسیٰ از اپنے والد عبدالرحمٰن از اپنے والد ابولیلیٰ رضی اللہ عنہ۔ الخصائص الکبریٰ للسیوطي: 283,282/1. یہ محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی وجہ سے ضعیف ہے، البتہ یہ روایت المعجم الأوسط للطبراني: 65/3 میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے مرسلاً مروی ہے۔

■ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما:

بطریق طلحہ بن زید از یونس بن یزید از زہری از سالم از اپنے والد عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما۔ المعجم الأوسط للطبراني: 413/6، مجمع الزوائد: 329/1. یہ طلحہ بن زید کی وجہ سے ضعیف ہے۔

■ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما:

1 بطریق ابن شہاب از ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن از جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما۔ صحیح البخاري: 3886، صحیح مسلم: 170.

2 بطریق عبدالکریم الجزری از عطاء از جابر رضی اللہ عنہ۔ کتاب السنة لابن أبي عاصم: 621.

■ حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ:

بطریق مسعر از عاصم بن ابی نجود از زر بن حبیش از حذیفہ رضی اللہ عنہ۔ جامع الترمذي: 3147.

■ بُریدہ بن حُصَیب اسلمی رضی اللہ عنہ:

بطریق ابوتمیلہ از زبیر بن جنادہ از ابن بریدہ از اپنے والد بریدہ رضی اللہ عنہ۔ جامع الترمذي: 3132.

■ ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ:

بطریق حَیْوَہ از ابوصخر از عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن عمر از سالم بن عبداللہ از ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ۔ مسند أحمد: 418/5.

■ ابوامامہ رضی اللہ عنہ:

بطریق ہذیل بن میمون کوفی از مطرح بن یزید از عبیداللہ بن زحر از علی بن یزید از قاسم از ابوامامہ رضی اللہ عنہ۔ مسند أحمد: 259/5. یہ علی بن یزید، عبیداللہ بن زحر اور ابومہلب مطرح بن یزید کی وجہ سے ضعیف ہے۔

■ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ:

بطریق عبدالوہاب از عوف از ابورجاء از سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ۔ مسند أحمد: 10/5. سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی روایت خواب والے واقعے کے متعلق معلوم ہوتی ہے، دیکھیے: صحیح البخاري: 7047.

■ ابوحمراء رضی اللہ عنہ:

بطریق عبادہ بن زیاد اسدی از عمرو بن ثابت از ابوحمزہ ثمالی از سعید بن جبیر از ابوحمراء رضی اللہ عنہ۔ المعجم الکبیر للطبراني: 200/22. یہ موضوع روایت ہے۔ دیکھیے: السلسلة الضعیفة للألباني: 545,544/10، رقم: 4902.

■ صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ:

بطریق یحییٰ بن عثمان بن صالح از ابواسود نضر بن عبدالجبار از ابن لہیعہ از یزید بن ابی حبیب از جعفر بن عبداللہ از عبید بن عمیر لیثی از صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ۔ المعجم الکبیر للطبراني: 39/8. یہ ابن لہیعہ کے ضعف اور یحییٰ بن عثمان بن صالح کے مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

■ ام ہانی رضی اللہ عنہا:

1 بطریق عبدالاعلیٰ بن ابی المساور از عکرمہ از ام ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہا۔ المعجم الکبیر للطبراني: 432/24-434. یہ عبدالاعلیٰ بن ابی المساور کی وجہ سے ضعیف ہے۔

2 بطریق محمد بن سائب از ابوصالح بن باذام از ام ہانی رضی اللہ عنہا۔ تفسیر الطبري، بنيَ إسرآءيل 1:17. یہ محمد بن

سائب اور ابو صالح بن باذام کی وجہ سے ضعیف ہے۔

- ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا:

بطریق محمد بن کثیر صنعانی از معمر بن راشد از زہری از عروہ از عائشہ رضی اللہ عنہا۔ دلائل النبوة للبيهقي: 2/361,360۔

یہ محمد بن کثیر صنعانی کی وجہ سے ضعیف ہے۔

- اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا:

بطریق محمد بن اسحاق از یحییٰ بن عباد بن عبداللہ بن زبیر از اپنے والد عباد از اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا۔ جامع الترمذي: 2541، المستدرك للحاكم: 2/469، تفسير الطبري، النجم 53:14۔ یہ محمد بن اسحاق کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔

باب
2
سیرت انسائیکلوپیڈیا
بیعات عقبہ
بیعاتِ عقبہ، یثرب میں سفیرِ نبوی مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی دعوتی
سرگرمیاں اور قبائل اوس وخزرج کے قبول اسلام کے
ایمان افروز احوال

”بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال
جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔“
(التوبة 9:111)

اس باب میں

مکہ اور طائف کے لوگوں نے دین حنیف کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی نصرت کے لیے اہل یثرب کو بھیج دیا۔ یہ دعوتِ اسلام کی تاریخ کا ایک فیصلہ کن موڑ ہے۔ اس باب میں آپ اسی تاریخ ساز واقعے کے ایمان افروز حالات اور سبق آموز تفصیلات پڑھیں گے۔ خزرج کے وہ سعادت مند حضرات رسالت مآب ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کرتے نظر آئیں گے جنھوں نے آپ ﷺ کو مدینہ چلنے کی دعوت دی اور تن من دھن سے ہر قسم کے ایثار و تعاون اور آپ ﷺ کی حفاظت و مدافعت کا یقین دلایا۔ ان حضرات نے بیعت کے تقاضے جس اخلاص و احترام سے پورے کیے، وہ ایسا یادگار اور لازوال واقعہ ہے جس کے نتیجے میں ہجرتِ مدینہ کی انقلابی راہ باز ہوگئی۔ نیز سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی دعوتی سرگرمیوں کا تذکرہ ملے گا۔ اسی باب میں آپ کو رسالت مآب ﷺ کی طرف سے اوس و خزرج کے خوش بخت فرزندوں کے لیے وہ مایۂ ناز پیمانِ وفا ملے گا جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم مجھ سے ہو، میں تم سے ہوں اور تمھارا خون میرا خون ہے۔

دعوتِ اسلام

رسول اللہ ﷺ نے ایک یا دو دن نہیں پورے 13 سال تک مشرکین مکہ کی طرف سے طرح طرح کی ایذائیں اور مشقتیں جھیلیں۔ مکہ کے میدانوں اور طائف کی چٹانوں پر شام وسحر پیغامِ توحید سنایا لیکن مکہ اور طائف کے مشرک سردار اتنے شقی القلب نکلے کہ انھوں نے کائنات کی سب سے زیادہ سچی اور برگزیدہ ہستی کی بات نہیں مانی۔ معراج کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے ایسا باب بشارت کھولا کہ ہر آنے والا دن آپ کے لیے یہ نوید لے کر آیا کہ بس اب مکہ کی سختیوں کا دور ختم ہوا۔ اب اچھے دن آنے والے ہیں۔ اب آپ کی دعوتِ توحید برگ و بار لائے گی اور ساری دنیا میں نورِ وحدت کا اُجالا پھیلا دے گی۔

عادتِ مبارک یہ تھی کہ آپ ﷺ جہاں کہیں کوئی مجمع دیکھ لیتے، فوراً وہاں پہنچ جاتے تھے اور دعوت الی اللہ دیتے تھے۔ اس مناسبت سے حج کے دنوں میں آپ ﷺ کی تبلیغی سرگرمیاں بہت بڑھ جاتی تھیں۔ آپ ﷺ دور ونزدیک کے علاقوں سے آنے والے حاجیوں سے ملاقات فرماتے تھے اور اس مقصد کے لیے ایک ایک خیمے پر تشریف لے جاتے تھے۔ حج کے لیے آنے والوں کے رُوبرُو انسان کی تخلیق کا اصل مقصد بیان فرماتے تھے اور اللہ کی بندگی کی دعوت پیش کر کے جنت کی بشارت دیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کو آپ ﷺ کی یہ محنت شاقہ بھا گئی۔ ہوا یوں کہ نبوت کے گیارھویں سال حج کے موقع پر یثرب کے چھ افراد نے آپ ﷺ کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کر لیا۔ کلمہ طیبہ پڑھاتے ہی آپ ﷺ نے انھیں جو سب سے پہلا سبق دیا، وہ دینِ حق کی دعوت وتبلیغ کا سبق تھا۔ آپ ﷺ نے انھیں یہ حقیقتِ عظمیٰ اچھی طرح ذہن نشین کرائی کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اب تمھارا پہلا فرض یہ ہے کہ یثرب واپس پہنچتے ہی اپنے گھرانے، اپنے قبیلے اور دیگر لوگوں کو اسلام کی دعوت دو۔ ان حضرات نے آپ ﷺ سے وعدہ کیا کہ وہ دعوت وتبلیغ کا فرض ضرور انجام دیں گے، انھوں نے اپنا وعدہ نبھایا، تبلیغ و دعوت کا فرض خوب انجام دیا۔ یوں چراغ سے چراغ جلنے لگا۔ نتیجتاً اگلے سال حج کے موقع پر ان حضرات کے ساتھ سات نئے افراد مکہ مکرمہ آئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

عقبہ (منیٰ) کا ایک منظر

رسول اللہ ﷺ امت کے دینی اور سیاسی لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت اعلیٰ پائے کے مدبر و منتظم بھی تھے۔ مشرکین مکہ کے فتور و فساد کے پیشِ نظر آپ ﷺ دعوت دین کے سلسلے میں بڑی حکمت سے کام لیتے تھے اور آنے والے وفود سے اس طرح مذاکرات فرماتے تھے کہ آپ ﷺ کے میٹھے اور مقدس بول مخاطبوں کے دل میں فوراً اُتر جاتے تھے۔ جب نئے یثربی حضرات خدمت والا میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے منیٰ کے قریب عقبہ کے مقام پر مذاکرات فرمائے۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں شاذ و نادر ہی لوگوں کا گزر ہوتا تھا۔ آپ ﷺ کے اس طرز عمل سے حکمت، دانش مندی اور راز داری سے کام لینے کی اہمیت کا سبق ملتا ہے۔ آپ ﷺ نے ان حضرات سے فرمایا:

''آؤ! مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ وحدہ لاشریک کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے۔ چوری نہیں کرو گے۔ زنا نہیں کرو گے۔ اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے۔ کسی پر بہتان نہیں لگاؤ گے اور کسی بھلی بات میں میری نافرمانی نہیں کرو گے۔ جو شخص ان باتوں پر پورا اترے گا، اللہ رب العزت سے اجر پائے گا اور جو ان باتوں میں سے کسی بھی بات کا ارتکاب کر بیٹھے گا اور اُس پر اللہ تعالیٰ پردہ ڈال دے گا تو اُس کا معاملہ اللہ کے سپرد۔ اللہ چاہے گا تو سزا دے گا اور چاہے گا تو اُسے معاف فرما دے گا۔''

ان باتوں پر یثربی حضرات نے رسالت مآب ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کر لی اور حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ جب یہ حضرات واپس جانے کے لیے پابہ رکاب تھے تو آپ ﷺ نے ان کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو پہلا مبلغ دین بنا کر مدینہ روانہ فرما دیا۔ آپ ﷺ نے انھیں تاکید فرمائی کہ نئے مسلمانوں کو اسلام کے احکام سکھاؤ اور جو لوگ شرک میں مبتلا ہیں، انھیں توحید کی تعلیم دو۔

یثرب میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ واپس جانے والے یثربی حضرات کی شاندار پذیرائی ہوئی۔ پھر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور ان نومسلم یثربی حضرات نے آرام کا سانس نہیں لیا۔ انھوں نے دن رات سخت محنت کی۔ اپنے بال بچوں، عزیز و اقارب اور دور و نزدیک کے تمام رشتہ داروں کو اللہ کا پیغام پہنچایا۔ ان

کی آنکھوں سے غفلت اور جہالت کے پردے اُٹھائے، نہایت جوش وخروش سے قرآن کریم سنایا اور اسلامی احکام کی برکتیں اور حکمتیں بتائیں۔ اس دعوتِ حق نے لوگوں کے دِل گرما دیے۔ سارے یثرب میں اسلام کا چرچا ہوگیا۔ دور دور تک قبولِ حق کی فضا پیدا ہوگئی۔ پورے یثرب میں کوئی ایسا متنفس باقی نہیں رہا جسے اسلام کا پیغام نہ پہنچا ہو۔ دنیا میں ہر جگہ اور ہر زمانے کے مسلمانوں کا اصلی فرض یہی ہے کہ وہ خود بھی سچے عملی مسلمان بنیں اور دوسروں کو بھی رجوع الی اللہ کی دعوت دیں۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور یثرب کے نومسلموں کی تبلیغ و دعوت کا نتیجہ یہ نکلا کہ نبوت کے تیرھویں سال جون 622ء میں یثرب سے 70 سے زیادہ مسلمان حج ادا کرنے آئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب سابق ان حضرات کو بھی عقبہ کی گھاٹی میں بلایا۔ یہ حضرات نہایت خاموشی سے چپکے چپکے ڈھلتی رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا اعلان کیا اور اسلام کے لیے سمع و طاعت، اخلاص اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی تعمیل کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کر لی۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ التجا کی کہ آپ ہمارے ساتھ یثرب چلیے۔

اس موقع پر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے صرف دو سوالات کیے: 1 کیا تم اللہ کے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے میری بھرپور مدد کرو گے؟ 2 کیا تم اپنے شہر میں میری اور میرے صحابہ کی اسی طرح حمایت وحفاظت کرو گے جس طرح تم اپنے اہل وعیال کی حفاظت وحمایت کرتے ہو؟

ان حضرات میں سے ایک صاحب نے کہا: بلاشبہ ہم ایسا ہی کریں گے لیکن اس کے بدلے میں ہمیں کیا ملے گا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمھیں جنت ملے گی جو اللہ رب العزت کی خوشنودی کی جگہ ہے۔

اب ایک اور صاحب بولے: اے اللہ کے رسول! ایسا تو نہ ہوگا کہ آپ کو یثرب میں قوت و اقتدار حاصل ہو جائے تو آپ ہمیں چھوڑ کر واپس تشریف لے آئیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری قوت سے فرمایا: ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ تمھارا خون میرا خون ہے۔ اب تم میرے ہو اور میں تمھارا ہوں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت وحمایت کا یہی جذبہ تھا جس پر اوس اور خزرج کے فرزندوں کو اللہ کی بارگاہ اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ''انصار'' کا مایہ ناز خطاب عطا فرمایا گیا...... تاریخ کا یہی موڑ ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہجرت مدینہ کی راہ کھلی اور مدینہ میں پہلی اسلامی ریاست کے قیام سے تاریخِ عالم کا دھارا بدل گیا۔

انصار سے رابطہ

عکاظ کے کھنڈر

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ منصبِ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ مکہ معظمہ میں دس سال قیام فرما رہے۔ حج کے موسم میں آپ حجاج کرام کے خیموں میں منیٰ تشریف لے جاتے تھے۔ آپ ﷺ عُکاظ اور مجنّہ کے مروجہ میلوں، تہواروں اور بازاروں میں بھی حاضر ہوتے تھے۔ لوگوں کے اجتماعات سے خطاب فرماتے تھے، اُنھیں اللہ تعالیٰ کے پیغام سے آگاہ کرتے تھے اور دریافت فرماتے تھے:

«مَنْ يُؤْوِينِي، مَنْ يَنْصُرُنِي، حَتّٰى أُبَلِّغَ رِسَالَةَ رَبِّي وَلَهُ الْجَنَّةُ؟»

''کوئی ہے جو جنت کے بدلے مجھے پناہ دے اور میری مدد کرے تاکہ میں اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچادوں؟''

جب یمن یا مضر قبیلے سے کوئی آدمی سفر پر نکلتا تو اس کی قوم کے لوگ اُسے تاکید کرتے تھے: ''خبردار! قریشی

صنعاء (یمن) کے قریب ایک ثقافتی شاہکار

نوجوان سے بچنا، مبادا وہ تمھیں فتنے میں مبتلا کر دے۔'' نبی ﷺ اپنی قوم کے لوگوں کی طرف تشریف لے جا رہے ہوتے تو وہ آپ کی طرف انگشت نمائیاں کر کے اشارے کرتے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا، ہمیں یثرب (مدینہ) سے آپ کے پاس (مکہ) بھیج دیا۔ ہم نے آپ ﷺ کی تصدیق کی، ہم آپ کے پشتیبان بنے، ہمارا ایک آدمی نکلتا، آپ ﷺ پر ایمان لاتا، آپ اسے قرآن کریم پڑھاتے، پھر جب وہ اپنے گھر پہنچتا تو اس کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے اس کے گھر والے بھی مسلمان ہو جاتے تھے۔ یہ مبارک سلسلہ ارتقا پا کر یہاں تک پہنچا کہ انصار کے ہر گلی کوچے میں اسلام کا چرچا پھیل گیا اور محلّہ در محلّہ لوگ علی الاعلان اپنے اسلام کا اعلان و اظہار کرنے لگے۔ [1]

رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی حکمت و بصیرت سے کام لے کر اپنے مقدس نصب العین کے لیے مسلسل انتھک کام کرتے رہے اور لوگوں تک اللہ کا دین پہنچانے میں شام و سحر مصروف رہے۔ آپ ﷺ کی عادتِ مبارک یہ تھی کہ عرب کے اطراف و اکناف سے مکہ آنے والے ہر فرد سے اس کا نام اور مقام و مرتبہ دریافت فرماتے تھے، پھر اسے اللہ کی طرف بلاتے تھے اور اس کے سامنے دعوت حق پیش فرماتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو غالب کرنے اور اپنے نبی سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کا ارادہ فرمایا تو آپ اپنی عادت مبارک کے مطابق 11 ھ/633ء میں حج کے موسم میں نکل کھڑے ہوئے، منیٰ پہنچے، وہاں منیٰ کی گھاٹی کے قریب انصار کا ایک مجمع ملا۔ آپ نے انھیں دعوتِ اسلام دی اور ان خوش نصیب لوگوں نے یہ دعوتِ حق قبول کر لی۔ [2]

انصار میں قبول اسلام کا آغاز

نبی ﷺ کی قبیلہ خزرج کے گروہ سے پہلی نتیجہ خیز ملاقات موسمِ حج میں منیٰ کی گھاٹی کے قریب ہوئی۔ آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا: «مَنْ أَنْتُمْ؟» ''آپ کون لوگ ہیں؟'' انھوں نے جواب دیا: ''ہم خزرج کی ایک جماعت ہیں۔'' یہ سن کر آپ نے پوچھا: «أَمِنْ مَّوَالِي يَهُودَ؟» ''کیا آپ یہود کے حلیف ہیں؟'' انھوں نے کہا: جی ہاں! تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ حضرات تشریف رکھیں تاکہ میں آپ سے گفتگو کر سکوں؟'' انھوں نے کہا: کیوں نہیں! یہ کہہ کر وہ لوگ بیٹھ گئے تو آپ ﷺ نے انھیں ایک اللہ کی بندگی کی دعوت دی۔ ان کے سامنے اسلام کا درخشاں دین پیش کیا، انھیں قرآن کریم پڑھ کر سنایا، پھر وضاحت سے بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام میں ان کے لیے کیسے کیسے زبردست اعزاز و اکرام کا اہتمام کر رکھا ہے۔

[1] مسند أحمد: 322/3 و 339. [2] البداية والنهاية: 146/3، السيرة لابن هشام: 424/2، 425.

یہ انصاری لوگ مدینہ میں جس مقام پر رہتے تھے، وہاں ان کے ساتھ یہودی بھی آباد تھے۔ وہ لوگ صاحبِ علم اور اہل کتاب تھے جبکہ انصار بت پرست تھے۔ ان کے مابین اکثر اوقات چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی تھی۔ جب کبھی جنگ کی نوبت آتی تھی تو یہودی انھیں دھمکیاں دیتے تھے اور کہتے تھے: ''عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے، اس کا زمانہ آ گیا ہے، ہم اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اس کی پیروی کریں گے، پھر اس کے ساتھ مل کر تمھیں عاد اور ارم[1] کی طرح ہلاک کر دیں گے۔''

جنوبی عرب میں عاد اور ارم کے کھنڈر

اب جو نبی کریم ﷺ نے ان سے گفتگو کی اور انھیں دعوت حق پیش کی تو وہ چونکے اور آپس میں کہنے لگے: ارے! یہ تو وہی نبی معلوم ہوتے ہیں جن کی آمد کی دھمکیاں یہودی ہمیں دیتے رہتے ہیں، اس لیے ان کی دعوت کو فوراً قبول کرلو مبادا یہودی ان پر ایمان لانے میں ہم سے سبقت لے جائیں، چنانچہ انھوں نے دعوتِ اسلام پر لبیک کہا اور مسلمان ہوگئے، پھر انھوں نے آپ ﷺ سے کہا: ''ہم اپنے پیچھے ایک ایسی قوم چھوڑ کر آئے ہیں کہ باہمی عداوت اور جنگ و جدل میں اس جیسی اور کوئی قوم نہیں، ممکن ہے اللہ تعالیٰ آپ کی برکت سے ان میں اتفاق پیدا کر دے، ہم ان کے پاس پہنچ کر آپ کی دعوت پیش کریں گے اور جو دین ہم نے اختیار کیا ہے، اُسے ان کے سامنے رکھیں گے۔ اگر اللہ نے ان سب کو آپ کی رسالت پر جمع کر دیا تو آپ سے بڑھ کر باعزت اور کوئی نہیں ہوگا۔'' آخر کار وہ ایمان باللہ اور تصدیقِ رسالت کے بعد اپنے وطن روانہ ہوگئے۔[2]

یثرب کے چھ سعادت مند افراد

نبیِ کریم ﷺ کی اس دعوتِ حق کے نتیجے میں دینِ حنیف کو بڑے صالح بیج دستیاب ہوئے جو دیکھتے ہی دیکھتے سرو قامت درختوں کی شکل اختیار کر گئے اور ان کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر مسلمانوں نے برسوں کے ظلم و ستم

[1] عاد اور ارم کے بارے میں دیکھیے جلد 1، باب: جزیرہ نمائے عرب کے اقوام و قبائل کے تحت ''قوم عاد''۔

[2] السيرة لابن هشام: 429,428/2، البداية والنهاية: 147,146/3، المعجم الكبير للطبراني: 363,362/20، دلائل النبوة للبيهقي: 434,433/2.

کی تپش سے نجات پائی۔ یہ مدینہ منورہ کے چھ جوان تھے اور سب کے سب قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: قبیلہ بنونجار سے 1 ابوامامہ اسعد بن زرارہ بن عُدس بن عبید بن ثعلبہ اور 2 عوف بن حارث بن رفاعہ بن سواد ابن عفراء رضی اللہ عنہم، قبیلہ بنو زُریق سے 3 رافع بن مالک بن عجلان رضی اللہ عنہ، قبیلہ بنوسلمہ بن سعد بن علی سے 4 قطبہ بن عامر بن حدیدہ رضی اللہ عنہ، قبیلہ بنوحرام بن کعب سے 5 عقبہ بن عامر بن نابی رضی اللہ عنہ اور قبیلہ بنوعبید بن عدی بن غنم سے 6 جابر بن عبداللہ بن رئاب (رِیاب) رضی اللہ عنہ۔[1]

کچھ سیرت نگار جابر بن عبداللہ بن رئاب رضی اللہ عنہ کے بجائے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کرتے ہیں۔[2] بعض مؤرخین نے چھ کے بجائے سات افراد کا ذکر کیا ہے اور وہ ساتواں فرد عامر بن عبد حارثہ بن ثعلبہ کو قرار دیتے ہیں جن کا تعلق قبیلہ بنوزُریق سے تھا۔[3]

موسیٰ بن عقبہ نے زہری سے اور انھوں نے عروہ بن زبیر کے واسطے سے بتایا ہے کہ اس گروہ کی تعداد آٹھ تھی۔ ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں: معاذ ابن عفراء، اسعد بن زرارہ، رافع بن مالک، ذکوان بن عبد قیس، عبادہ بن صامت، ابوعبدالرحمٰن یزید بن ثعلبہ، ابوالہیثم بن تیہان اور عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہم۔ یہ حضرات اسلام لے آئے اور آیندہ سال آنے کا وعدہ کیا۔[4] لیکن جمہور کے نزدیک ان کی تعداد چھ ہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جب یہ لوگ اپنی قوم کے پاس مدینہ منورہ پہنچے تو رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کیا اور اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ یوں آہستہ آہستہ مدینے میں اسلام کا چرچا ہونے لگا اور انصار کے ہر محلے میں نبی کریم ﷺ کا ذکرِ خیر ہونے لگا۔[5]

انصار میں سب سے پہلا مسلمان

انصار میں سب سے پہلے کون مسلمان ہوا؟ اس بات میں اختلاف ہے۔ ابن کلبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: سب سے پہلے رافع بن مالک رضی اللہ عنہ نے دعوتِ حق پر لبیک کہا۔ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جابر بن عبداللہ بن رئاب (رِیاب) رضی اللہ عنہ پہلے انصاری صحابی ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ مغلطائی کہتے ہیں کہ ان میں سے اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن عبد قیس پہلے مسلمان ہوئے۔ آیندہ سال رجب میں انصار میں سے چھ اور ایک قول کے مطابق آٹھ افراد مسلمان ہوئے۔ ان اقوال کے درمیان یوں بھی تطبیق دی جا سکتی ہے کہ رافع بن مالک اور جابر بن عبداللہ بن رئاب (رِیاب) رضی اللہ عنہما نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور اسعد رضی اللہ عنہ نے مذکورہ پانچ یا سات افراد

---

[1] السيرة لابن هشام :430,429/2، ودلائل النبوة للبيهقي :435,434/2. [2] المواهب اللدنية :277/1. [3] الكامل لابن الأثير :610/1. [4] البداية والنهاية :147/3. [5] السيرة لابن هشام :430/2، ودلائل النبوة للبيهقي :435/2.

کے ساتھ اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔[1]

یہ پہلا قافلۂ خیر تھا جس میں شامل خوش نصیب افراد نہ صرف خود ایمان لائے بلکہ انھوں نے تہیہ کر لیا کہ اپنی قوم کو بھی اسلام کے سایۂ رحمت میں لانے کی بھر پور جد و جہد کریں گے۔ انھوں نے دینِ اسلام سے کامل وفا داری کا ثبوت دیا۔ وہ مدینہ پہنچتے ہی دینِ حنیف کی دعوت و تبلیغ کے لیے سرگرمِ عمل ہوگئے۔ انھوں نے اپنے اہل خانہ، عزیز و اقارب اور اپنے جملہ دوست احباب کے سامنے پیغامِ حق پیش کیا۔ اس مقدس دعوت کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدینے میں گھر گھر نبی اکرم ﷺ کا ذکرِ جمیل اور اسلام کا چرچا پھیل گیا۔ ﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ یقیناً جب اللہ چاہتا ہے قوموں کی تاریخ میں فیض رسانی کے ایسے ہی فیصلہ کن انقلابی موڑ آجاتے ہیں۔

دیکھیے! مذکورہ لوگوں کی آپ سے ملاقات بظاہر اتفاقاً ہوئی۔ لیکن درحقیقت اس کام میں اللہ تعالیٰ ہی کا ارادہ کارفرما تھا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ ایک نیا چشمۂ خیر جاری ہو جائے اور یہ چشمۂ خیر ایسی انقلابی قوت سے جاری ہوا کہ پتھروں کی پوجا کی لعنت سے چھٹکارے کا لمحہ آپہنچا۔ یہ تاریخ کا انتہائی اہم موڑ ثابت ہوا۔ زمانے اور زندگی کی رفتار اندھیروں سے نکل کر ہدایت کے اُجالے میں تیز گام ہوگئی۔ اس وقت یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ اتنی تھوڑی سی مدت میں یہ متعصب بت پرست کھلم کھلا اسلام کی حقانیت و دعوت کے علمبردار، حق کے فدائی اور محمد رسول اللہ ﷺ کے سپاہی بن جائیں گے۔ وہ اپنی قوم کے پاس پہنچے تو ان کے قلوب کے ساتھ ان کے چہرے بھی نورِ حق سے جگمگا رہے تھے۔ اب ان کی کایا پلٹ چکی تھی اور وہ فتور و فساد کے عقیدے سے تائب ہو کر ایک روشن عقیدے کے حامل ہو چکے تھے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت تھی کہ اسلام کی تبلیغ کے لیے زرخیز میدان فراہم ہوگیا اور ناتوان مظلوم مسلمانوں کو محفوظ پناہ گاہ مل گئی۔

اب آشوب و آزمائش کا وہ دور بدل گیا جس میں رسول اللہ ﷺ انتہائی روح فرسا مصائب جھیل کر قبائل کے پاس جاتے تھے اور دینِ حنیف کی دعوت کے لیے نصرت و حمایت کا مطالبہ فرماتے تھے۔ اب اسلام کو مضبوط قوت والا شیر دل لشکر میسر آنے والا تھا۔ حق اور باطل کا ٹکراؤ ہونے والا تھا تاکہ سابق ایام کے نقصان کی تلافی ہو سکے۔ بلاشبہ بہتر انجام متقین ہی کے لیے ہے۔ آج کے بعد مکہ معظمہ میں خیر اور بھلائی کے قافلے اور ہراول دستے اترنے والے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے انسانی فلاح کے لیے منتخب فرما لیا تھا تاکہ وہ ہدایت پاسکیں، روشنی میں تیرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے بھلائیاں اکٹھی کریں اور جب مدینہ لوٹیں تو خیر اور نورِ ہدایت کے سفیر کبیر نظر آئیں۔[2]

یاد رہے کہ اس ملاقات میں خزرج کے لوگ صرف مسلمان ہوئے تھے۔ ابھی انھوں نے بیعت نہیں کی تھی کیونکہ

[1] شرح الزرقاني على المواهب: 77/2. [2] هجرة الرسول ﷺ و صحابته لأحمد عبدالغني النجولي الجمل، ص: 143.

یہ ایک اقلیتی جماعت تھی، اس لیے یہ حضرات دعوتِ اسلام کے مخلص مبلغ تو بن گئے لیکن سردست انھوں نے مدینہ میں اپنے قبائل سے مشورے کے بغیر کوئی معاہدہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ [1]

اس کے علاوہ ایک اور سبب بھی تھا جس نے مدینہ والوں کے لیے قبول اسلام کا راستہ ہموار کیا۔ وہ سبب جنگ بُعاث تھا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں:

بعاث کا میدان جہاں اوس وخزرج میں جنگ برپا ہوئی

''بعاث کی جنگ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے مفاد میں پہلے ہی مقدم کر رکھا تھا، چنانچہ جب آپ مدینہ تشریف لائے تو ان لوگوں کی جمعیت منتشر ہو چکی تھی۔ ان کے بڑے بڑے سردار قتل کیے جا چکے تھے اور باقی لوگ زخموں سے چور تھے، اس لحاظ سے اس جنگ کو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی آمد سے پہلے اسی لیے مقدم کیا تھا تا کہ وہ آپ کے تشریف لاتے ہی مسلمان ہو جائیں۔'' [2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے: بعاث ایک جگہ کا نام ہے، بعض نے قلعے کا نام بتایا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مدینہ سے دو میل کے فاصلے پر بنوقریظہ کے قریب ایک زرعی زمین تھی۔ یہاں اوس اور خزرج کے درمیان شدید جنگ ہوئی جس میں فریقین کے بہت سے افراد مارے گئے۔ یہ ہجرت سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ بعض نے یہ مدت کم وبیش بھی بتائی ہے۔ اس جنگ میں وہ تمام متکبر سردار مارے گئے جو کسی کے ماتحت نہیں رہ سکتے تھے نہ ان سے قبول اسلام کی امید کی جا سکتی تھی۔ اس قماش کے لوگوں میں سے ایک سردار عبداللہ بن اُبی بچ گیا تھا۔ [3]

[1] صحيح البخاري: 3777. [2] دیکھیے: فتح الباري: 141,140/7. [3] أضواء على الهجرة لتوفيق محمد سبع، ص: 274,273.

بیعت کی حقیقت، اہمیت اور مقاصد

بیعت کے لغوی و اصطلاحی معنی

بیعت کے لغوی معنی ہیں سودا کرنا، یہ سودا چاہے مال کا ہو یا کسی اور ذمہ داری کا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، پھر وہ قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، یہ اللہ کے ذمے سچا وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے؟ لہٰذا تم اپنے اس سودے پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اللہ سے کیا اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''[1]

اصطلاحی طور پر بیعت اس معاہدے کو کہتے ہیں جو امیر کی اطاعت کے لیے کیا جاتا ہے۔

جو شخص کسی کی بیعت کرتا ہے، وہ درحقیقت اسے اطاعت کا حلف دیتا ہے اور اس سے عطیہ لیتا ہے، چنانچہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص سامان فروخت کر کے اس کی قیمت وصول کرتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ خرید و فروخت کے معاملات میں اہل عرب کا طریق کار یہ تھا کہ جب بات طے ہو جاتی تھی تو (بائع اور مشتری) ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر سودا پکا کرتے تھے۔ اسی طرح جب وہ ایک دوسرے سے معاہدہ کرتے، تب بھی ایسا ہی کرتے تھے، چنانچہ جب وہ حکمرانوں یا امراء کے ساتھ معاہدہ کرتے تو اس معاہدے میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے کو بھی بیعت کا نام دیتے تھے۔[2]

[1] التوبة 9:111. [2] فتح الباري: 13/89.

بیعت عقبہ کی وجہ تسمیہ

مسجد بیعت (منیٰ) کا ایک منظر

عقبہ سے مراد عقبہ جمرہ ہے، یعنی وہ گھاٹی جہاں بڑا جمرہ ہے، جو منیٰ کے آخر میں قبلے کی جانب ہے جیسا کہ کئی ایک اہل علم نے اس کی تصدیق کی ہے۔ علامہ برہان الدین حلبی نے بھی محبّ طبری کی پیروی کرتے ہوئے اسے قوی قرار دیا ہے، اس لیے کہ وہاں اس سے زیادہ اور کوئی مقام نمایاں نہیں۔ ممکن ہے اس سے مراد وہ بلند جگہ ہو جو منیٰ کی طرف جانے والے راستے کے بائیں جانب واقع ہے۔ یہ جگہ اہل مکہ میں مسجد بیعت کے نام سے معروف ہے، اس بنا پر اس سے مراد وہ جگہ ہے جو گھاٹی کے قریب ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے منیٰ کی اس گھاٹی کے پاس مدینہ سے آنے والے مسلمانوں سے عہد لیا تھا، چنانچہ اس معاہدہ کو بھی مالی معاوضے سے تشبیہ دیتے ہوئے بیعت عقبہ کہا جاتا ہے۔[2]

رسول اللہ ﷺ کی بیعتیں

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے مختلف مواقع پر رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ قرآنِ مجید اور احادیث میں اہلِ ایمان کی بیعت کا خصوصیت سے تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ قرآنِ کریم میں مومنوں کی اللہ رب العزت سے بیعت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝﴾

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، پھر وہ قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔ یہ اللہ کے ذمے سچا وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے؟ لہٰذا تم اپنے اس سودے پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اللہ سے کیا اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''[3]

[1] شرح الزرقاني على المواهب: 74/2، سبل الهدى والرشاد: 195/3. [2] السيرة الحلبية: 161/2. [3] التوبة 111:9.

بیعتِ عقبہ: جب رسول اللہ ﷺ کا انصارِ مدینہ سے رابطہ ہوا اور مدینہ کے جو لوگ شروع شروع مسلمان ہوئے، انھوں نے اپنے اپنے قبیلے میں پہنچ کر دینِ حنیف کی دعوت دی اور اپنی قوت مضبوط کی، یوں ان کے ساتھ کچھ اور افراد مل گئے، چنانچہ اگلے سال یہ لوگ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ تیسرے سال ستر سے زیادہ افراد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ انھوں نے بھی آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان واقعات کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

حدیبیہ میں ایک خوبصورت مسجد

بیعتِ رضوان: 6ھ/628ء میں رسول اللہ ﷺ عمرے کے لیے نکلے۔ آپ کے ساتھ چودہ سو سے زیادہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ راستے میں آپ کو مقام حدیبیہ پر روک دیا گیا، آپ ﷺ نے اپنے سفیرِ کبیر کی حیثیت سے سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اہلِ مکہ کے پاس بھیجا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو واپسی میں کچھ تاخیر ہوگئی۔ اس دوران یہ افواہ پھیل گئی کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اس خبرِ وحشت اثر سے رسول اللہ ﷺ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بے قرار ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُسی وقت اپنے جاں نثاروں سے موت پر بیعت لی۔ اس کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح کیا گیا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ ﴾

''بلاشبہ جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں، وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے، پھر جس نے عہد توڑا، وہ اس عہد شکنی کا وبال خود اپنے ہی سر لیتا ہے اور جس نے (وہ) عہد پورا کیا جو اس نے اللہ سے باندھا تھا تو عنقریب اللہ اسے اجرِ عظیم دے گا۔''[1]

اس بیعت کو ''بیعت رضوان'' کے عنوان سے بھی یاد کیا جاتا ہے کیونکہ جن لوگوں نے یہ بیعت کی تھی، اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی رضا و رحمت سے نواز کر قرآنِ کریم میں یہ بشارت دی:

[1] الفتح 48:10۔

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴾

''یقیناً اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے، اللہ نے ان کے دلوں کا حال جان لیا، پس اس نے ان پر تسکین وطمانیت نازل فرمائی اور بدلے میں انھیں عنقریب رونما ہونے والی فتح سے نوازا۔'' [1]

خواتین کی بیعت: صلح حدیبیہ کے بعد کچھ خواتین ہجرت کر کے نبیِ کریم ﷺ کی خدمت میں بیعت کرنے حاضر ہوئیں، مزید برآں جب مکہ فتح ہو گیا تو لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے، اس وقت بھی نبیِ کریم ﷺ نے عورتوں سے خاص طور پر بیعت لی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جو مومنہ خاتون ہجرت کر کے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتی تھی، آپ اس کا درج ذیل آیت کے ذریعے سے امتحان لیتے تھے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (الممتحنة 60:12)

''اے نبی! جب آپ کے پاس مومن عورتیں آئیں (اور) وہ آپ سے ان (امور) پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ زنا کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر لائیں گی اور نہ کسی نیک کام میں آپ کی نافرمانی کریں گی تو آپ ان سے بیعت لے لیں اور اللہ سے ان کے لیے دعائے مغفرت مانگیں، بے شک اللہ بہت بخشنے والا اور بے حد رحم فرمانے والا ہے۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جو مومنہ عورت ان (مذکورہ) شرائط کا اقرار کر لیتی تو اللہ کے رسول ﷺ اس سے فرماتے: ''میں نے تجھ سے بیعت لے لی۔''

عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اللہ کی قسم! بیعت لیتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ نے کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا۔ رسول اللہ ﷺ خواتین سے صرف زبانی بیعت لیتے تھے۔ [2]

انفرادی بیعت: مختلف قبائل اور گروہوں کے علاوہ جو لوگ انفرادی طور پر اسلام قبول کرتے تھے، اللہ کے رسول ﷺ ان سے بھی بیعت لیتے تھے۔ ابن شماسہ مہری رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ ہم عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے،

[1] الفتح 48:18. [2] صحيح البخاري: 2713.

وہ لبِ مرگ تھے، بہت رو رہے تھے۔ انھوں نے اپنا چہرہ دیوار کی طرف کر لیا۔ ان کا بیٹا کہنے لگا: ابا جان! کیا رسول اللہ ﷺ نے آپ کو فلاں فلاں چیز کی بشارت نہیں دی تھی؟ کیا آپ کو فلاں فلاں بات کی خوشخبری نہیں سنائی تھی؟ وہ رخ پھیر کر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

إِنَّ أَفْضَلَ مَا نُعِدُّ، شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ.

''بلاشبہ جو زادِ راہ ہم (آیندہ کے لیے) تیار کرتے ہیں، اس میں سب سے اچھی متاع یہ گواہی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔''

زندگی کے تین مرحلے

پھر سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اپنی زندگی میں تین درجوں (مرحلوں) میں رہا۔ پہلا مرحلہ تو وہ تھا جب میری حالت یہ تھی کہ مجھ سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے کسی کو بغض نہ تھا اور میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں آپ ﷺ پر قابو پا کر آپ ﷺ کو قتل کر ڈالوں۔ اگر میں اس حالت میں مر جاتا تو یقیناً دوزخی ہوتا۔ دوسرے مرحلے میں جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی محبت پیدا کر دی تو میں نبیِ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے درخواست کی: ''اپنا دایاں ہاتھ بڑھایئے تاکہ میں آپ کی بیعت کروں۔'' آپ نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا تو میں نے معاً اپنا ہاتھ (پیچھے) کھینچ لیا۔ آپ ﷺ نے تعجب سے دریافت فرمایا: «مَالَكَ يَاعَمْرُو!» ''اے عمرو! تمھیں کیا ہو گیا؟'' میں نے عرض کی: میں ایک شرط طے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: «تَشْتَرِطُ بِمَاذَا؟» ''کیا شرط طے کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے گزارش کی: یہ شرط کہ مجھے معافی مل جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَمَا عَلِمْتَ يَاعَمْرُو! أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟ وَ أَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَاكَانَ قَبْلَهَا؟ وَ أَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟»

''اے عمرو! کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اسلام وہ تمام گناہ ساقط کر دیتا ہے جو اس سے پہلے کے ہوں؟ اور ہجرت وہ سارے گناہ نابود کر دیتی ہے جو اس سے پہلے سرزد ہوئے تھے؟ اور حج ان تمام گناہوں کا خاتمہ کر دیتا ہے جو اس سے پہلے ہوئے تھے؟''

اس وقت مجھے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی محبوب نہ تھا، نہ میری نظر میں آپ سے زیادہ کسی کی عظمت تھی، میں آپ کی عظمت و جلالت کے باعث آپ ﷺ کو آنکھ بھر کر دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر مجھ سے

آپ کا حلیہ پوچھا جائے تو میں بتا نہ سکوں گا کیونکہ میں آپ کو آنکھ بھر کر دیکھتا ہی نہ تھا۔ اگر میں اس حالت میں مرجاتا تو امید تھی کہ میں جنتی ہوتا، پھر تیسرا مرحلہ یہ آیا کہ ہم نے کچھ معاملات کی ذمہ داری سنبھال لی، میں نہیں جانتا کہ ان کے بارے میں میرا کیا حال رہا؟ پھر آپ نے وصیت کی:

فَإِذَا أَنَا مُتُّ فَلَا تَصْحَبْنِي نَائِحَةٌ وَّلَا نَارٌ فَإِذَا دَفَنْتُمُونِي فَشُنُّوا عَلَيَّ التُّرَابَ شَنًّا، ثُمَّ أَقِيمُوا حَوْلَ قَبْرِي قَدْرَ مَا تُنْحَرُ جَزُورٌ وَّيُقْسَمُ لَحْمُهَا حَتّٰى أَسْتَأْنِسَ بِكُمْ، وَ أَنْظُرَ مَاذَا أُرَاجِعُ بِهِ رُسُلَ رَبِّي.

”میں مرجاؤں تو کوئی نوحہ کرنے والی میرے ساتھ نہ جائے، میری میت کے ساتھ آگ بھی نہیں ہونی چاہیے۔ جب تم مجھے دفن کر چکو تو میری لاش پر آہستہ آہستہ مٹی ڈالنا، پھر میری قبر کے گرد اتنی دیر تک (دعائے مغفرت کرتے ہوئے) ٹھہرنا جتنی دیر میں اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جا سکتا ہے تاکہ میں تمھاری وجہ سے مانوس ہو جاؤں اور یہ دیکھ لوں کہ میں نے اپنے رب کے بھیجے ہوئے فرشتوں کو کیا جواب دیا ہے۔“ [1]

شرائع اسلام پر بیعت کی شرعی حیثیت

یہاں یہ جان لینا چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت والے ہر کام، اسلام، ہجرت، جہاد، نماز، زکاۃ، نصیحت، امر بالمعروف نہی عن المنکر اور دیگر شرائع اسلام پر بیعت کرنا صحیح عمل ہے اور اس بیعت میں نبی کریم ﷺ کی اطاعت تو بہرحال فرض ہے۔ بعد کے امراء وخلفاء کے لیے بھی سمع و طاعت کی بیعت کا حکم دیا گیا ہے لیکن یہ حکم اس شرط سے مشروط ہے کہ وہ کسی گناہ کی طرف بلائیں گے تو ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِيمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ إِلَّا أَنْ يُؤْمَرَ بِمَعْصِيَةٍ، فَإِنْ أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ»

”ہر مسلمان پر سمع و طاعت لازم ہے، چاہے پسندیدہ امر ہو یا ناپسندیدہ الا یہ کہ اسے کسی گناہ کا حکم دیا جائے، اگر گناہ کا حکم دیا جائے تو سمع و طاعت نہیں ہوگی۔“ [2]

[1] صحيح مسلم: 121۔ [2] صحيح البخاري: 7144، صحيح مسلم: 1839، واللفظ له.

خلیفۂ وقت کی بیعت

خلیفۂ وقت کی بیعت بھی بہت اہم ہے اگر اس کے مقابلے میں خلافت کا کوئی دوسرا دعوے دار پیدا ہو جائے تو حکم ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔[1] یہ حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ اسلامی مملکت میں انتشار اور بدامنی کی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ایسا تبھی ممکن ہے جب خلیفہ کے پاس مکمل اقتدار ہو، وہ حدود نافذ کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور جنگ و صلح کے معاہدوں کا مجاز ہو۔

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بیعت کا ذکر امامت کبریٰ تک محدود ہے۔ کسی ایسے امام، امیر جماعت، یا کسی شیخ و مرشد کی بیعت نہیں کی جاسکتی جو اقتدار کا حامل ہو نہ حدود نافذ کر سکتا ہو نہ صلح و جنگ کے معاہدے کا مجاز ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾

”اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو فرقوں میں بٹ گئے اور ان کے پاس واضح نشانیاں آجانے کے بعد انھوں نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔“[2]

1 دیکھیے: صحیح مسلم: 1844۔ 2 آل عمران 3:105۔

پہلی بیعت عقبہ

12 نبوی کے موسم حج میں مدینہ منورہ سے بارہ افراد حج کے لیے آئے۔ انھوں نے نبی ﷺ سے گھاٹی میں ملاقات کی۔ ان میں سے چار افراد تو انھی چھ افراد میں سے تھے جو پچھلے سال بھی آئے تھے اور رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کر کے نور ایمان سے منور ہو چکے تھے۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے چند صحابہ کی موجودگی میں ملے اور آپ کی بیعت کی سعادت حاصل کی۔ ان میں سے دس خزرج اور دو اوس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک قول کے مطابق ان بارہ افراد میں سے پانچ افراد انھی چھ افراد میں شامل تھے جو گزشتہ سال بھی آئے تھے۔ [1]

پہلی بیعت کی تفصیل

سیدنا عبادہ بن صامت خزرجی رضی اللہ عنہ اس بیعت کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:

میں اس بیعت میں شامل تھا۔ ہم بارہ افراد تھے۔ ہم نے عورتوں کی بیعت کی طرز پر بیعت کی، یعنی اس بیعت کے مطابق جو فتح مکہ کے وقت عورتوں کے بارے میں نازل ہوئی اور یہ ہم پر جہاد فرض ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ [2]

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جو بدر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ عقبہ کی رات رسول اللہ ﷺ کے گرد صحابہ کی ایک جماعت موجود تھی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«تَعَالَوْا بَايِعُونِي عَلٰى أَنْ لَّا تُشْرِكُوا بِاللّٰهِ شَيْئًا، وَلَا تَسْرِقُوا، وَلَا تَزْنُوا، وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ، وَلَا تَأْتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُونَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ، وَلَا تَعْصُونِي فِي مَعْرُوفٍ، فَمَنْ وَّفٰى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ بِهِ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ لَهُ كَفَّارَةٌ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَسَتَرَهُ اللّٰهُ فَأَمْرُهُ إِلَى اللّٰهِ، إِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ، وَإِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ»

[1] موسوعة الغزوات الكبرى لباشميل: 35/1، فتح الباري: 275/7، الرحيق المختوم، ص: 165، السيرة الحلبية: 161/2. [2] السيرة لابن هشام: 433/2، فتح الباري: 277/7.

''آؤ مجھ سے اس بات کا عہد کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، اپنی طرف سے گھڑ کر کسی پر تہمت نہ لگاؤ گے اور اچھی باتوں میں میری نافرمانی نہیں کرو گے، پس جو شخص اپنے اس عہد پر قائم رہے گا، اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے اور جس شخص نے اس میں کمی کی اور اسے دنیا میں اس کی سزا مل گئی تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جس نے اس میں سے کسی چیز کا ارتکاب کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ پوشی فرمائی تو اس کا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے، چاہے اسے سزا دے، چاہے معاف کر دے۔''

سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے انھی امور پر بیعت کی۔ [1]

پہلی بیعت کے شرکاء

بیعت کے شرکاء قبیلۂ بنو نجار میں سے اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ اور عفراء رضی اللہ عنہا کے دو بیٹے عوف بن حارث اور معاذ بن حارث رضی اللہ عنہما تھے۔ ان میں سے اسعد بن زرارہ اور عوف بن حارث رضی اللہ عنہما پچھلے سال بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف ملاقات حاصل کر چکے تھے۔ قبیلۂ بنو زُریق میں سے رافع بن مالک بن عجلان اور ذکوان بن عبد قیس رضی اللہ عنہما تھے۔ ان میں سے رافع رضی اللہ عنہ بھی پچھلے سال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کر گئے تھے۔ بعض نے ذکوان بن عبد قیس کا تذکرہ بھی سابقہ صحابہ میں کیا ہے۔ اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔ بنو عوف میں سے عبادہ بن صامت اور ابوعبدالرحمٰن یزید بن ثعلبہ بن خزمہ رضی اللہ عنہما تھے۔ سیدنا یزید رضی اللہ عنہ قبیلۂ بنو بلی سے تھے اور بنو عوف کے حلیف تھے۔ بنو سالم میں سے عباس بن عبادہ بن نضلہ رضی اللہ عنہ تھے۔

قبیلۂ بنو سلمہ میں سے عقبہ بن عامر بن نابی رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ بھی پچھلے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف باریابی حاصل کر چکے تھے۔ بنو سواد میں سے قطبہ بن عامر بن حدیدہ رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ اس پہلے گروہ خزرج میں سے تھے جس نے اسلام قبول کیا۔ یہ دس افراد قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے اور دو افراد اوس میں سے تھے۔ بنو عبدالاشہل میں سے ابوالہیثم مالک بن تیہان رضی اللہ عنہ تھے اور بنو عمرو میں سے عُوَیم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ تھے۔ [2]

مدینہ میں اسلام کا پہلا سفیر

بیعت پوری ہوگئی اور حج ختم ہوگیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے ساتھ یثرب میں اپنا پہلا سفیر بھیجا تاکہ وہ مسلمانوں کو اسلام کے احکام سکھائے، قرآن کریم کی تعلیم دے اور جو لوگ اب تک شرک پر چلے آرہے ہیں، انھیں

[1] صحيح البخاري: 3892، صحيح مسلم: 1709. [2] السيرة لابن هشام: 2/431-433، تاريخ الإسلام للذهبي (السيرة)، ص: 291.

اسلام کی دعوت دے، نبی ﷺ نے اس سفارت کے لیے سابقین اولین میں سے سیدنا مصعب بن عمیر عبدری رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا۔

یہ مدینہ میں ''مقرئ المدینہ'' (مدینہ کے استاد) کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی رہائش اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے ہاں تھی۔ چونکہ اوس اور خزرج ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا پسند نہ کرتے تھے، اس لیے حضرت مصعب رضی اللہ عنہ ان کی امامت بھی کرتے تھے۔[1]

امام بیہقی اور ذہبی رحمہما اللہ نے موسیٰ بن عقبہ رحمہ اللہ کے واسطے سے امام زہری کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان چھ آدمیوں کے بعد بھیجا تھا جو آپ ﷺ سے عقبہ کے پاس ملے تھے۔[2]

امام بیہقی رحمہ اللہ نے ابن اسحاق کی ایک اور مرسل روایت نقل کی ہے جو ابن اسحاق نے عاصم بن عمر سے روایت کی ہے۔ اس میں صراحت سے لکھا ہے کہ انھوں نے مدینہ پہنچ کر آپ ﷺ کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ کسی شخص کو تبلیغ دین کے لیے بھیج دیجیے تو آپ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ عبداللہ بن ابوبکر اور عبداللہ بن مغیرہ بن معیقیب کی ابن اسحاق کی سند سے ایک اور روایت میں یہ الفاظ درج ہیں: رسول اللہ ﷺ نے حضرت مصعب کو ان بارہ آدمیوں کے ساتھ بھیجا تھا جنھوں نے پہلی بیعت عقبہ کی تھی۔[3]

ابن سعد نے ایک اور روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مصعب رضی اللہ عنہ کو اُس وقت بھیجا جب اہل مدینہ نے مدینہ پہنچنے کے بعد آپ ﷺ کو لکھا کہ ان کے پاس ایسا آدمی بھیجا جائے جو انھیں قرآن پڑھائے۔ اس روایت کی سند میں واقدی ہے۔[4]

اسی طرح ابن اسحاق رحمہ اللہ کی دو روایات ہیں جو بتاتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مصعب رضی اللہ عنہ کو اہل مدینہ کی واپسی پر انصار کے ساتھ روانہ کیا تھا۔[5] ان کی تیسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مصعب رضی اللہ عنہ کو اہل مدینہ کی واپسی پر استادِ قرآن روانہ کرنے کی درخواست کرنے کے بعد بھیجا۔[6] یہ روایت ابن سعد کی روایت سے متفق ہے۔ تطبیق یوں ممکن ہے کہ پہلے چھ اشخاص نے مدینہ واپس پہنچ کر آپ ﷺ سے مبلغ بھیجنے کی درخواست ارسال کی۔ اتنے میں دوسرے سال کا حج آگیا تو آپ نے بیعت کرنے والے بارہ حضرات کے ساتھ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کو بھی مدینہ روانہ کر دیا۔[7]

[1] السيرة لابن هشام :435,434/2، تاريخ الإسلام للذهبي (السيرة)، ص : 293. [2] دیکھیے: دلائل النبوة للبيهقي : 431/2، تاريخ الإسلام للذهبي (السيرة)، ص : 294. [3] دلائل النبوة للبيهقي :438,437/2. [4] الطبقات لابن سعد : 220/1. [5] السيرة لابن هشام : 434/2، دلائل النبوة للبيهقي : 437/2. [6] دلائل النبوة للبيهقي : 437/2. [7] السيرة النبوية للمهدي (حاشية):291/1، سبل الهدى والرشاد : 197/3.

شاندار کامیابی

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نہ صرف دینی غیرت اور قوتِ ایمانی میں ممتاز تھے بلکہ اپنے یگانہ اوصاف کے باعث ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ جونہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآنی آیات نازل ہوتی تھیں، آپ انھیں فوراً حفظ کر لیتے تھے۔ آپ کی ذہانت مسلّم تھی، اخلاق نہایت عمدہ تھے، مزید برآں قادرِ مطلق نے آپ کو دانائی سے نوازا تھا۔ مدینہ میں آپ کی سعیِ بلیغ سے اکثر گھرانوں میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ اول اول سردارانِ قوم اسلام میں داخل ہوئے، پھر ان کی قوم کے لوگ جوق در جوق مشرف بہ اسلام ہوتے چلے گئے۔[1]

سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بطورِ سفیر شاندار کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ انھوں نے اہل مدینہ کے سامنے دینِ اسلام کی تعلیمات پیش کیں اور ان کی مکمل تشریح و توضیح فرمائی۔ قرآن کریم کی تعلیم دی۔ مزید برآں دعوتی سرگرمیوں کو تیزی سے آگے بڑھانے کے لیے ایک پر امن مرکز کے حصول کی تلاش میں کوشاں رہے۔ آپ نے ایک طرف نئے مسلمانوں میں اسلامی اخوت کی رُوح پھونکی تو دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مکہ میں بسنے والے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی رابطہ استوار رکھا۔[2] اور مدینہ میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اپنی مساعی جلیلہ کی رپورٹ ارسال کرتے رہے۔

مدینہ میں پہلا جمعہ

سیدنا عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: جب میرے والد کی آنکھوں کی بینائی زائل ہوگئی تو میں ان کی رہبری کرنے لگا۔ میں جب بھی آپ کو ادائے جمعہ کے لیے لے جاتا تھا، آپ (جمعے کی) اذان سن کر حضرت ابوامامہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دعائے مغفرت اور دعائے خیر فرماتے تھے۔ میں کچھ عرصہ ان کی زبان سے مسلسل یہی دعائیں سنتا رہا۔ آخر میں نے اپنے دل میں کہا: یہ تو بڑی کم عقلی کی بات ہے کہ میں ان سے اس عمل جاریہ کی وجہ بھی دریافت نہ کروں، حالانکہ میں ہر جمعے کو، جونہی وہ جمعے کی اذان سنتے ہیں، انھیں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دعائے مغفرت اور دعائے خیر کرتے سنتا ہوں۔ آخر کار جب ایک بار میں انھیں حسبِ معمول نماز جمعہ کے لیے لے کر چلا اور انھیں اذان کی آواز سنائی دی تو انھوں نے اپنے معمول کے مطابق فوراً دعائے مغفرت شروع کر دی۔ میں نے پوچھا: اباجان! آپ جب بھی جمعے کی اذان سنتے ہیں، حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کو دعائیں دیتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ انھوں نے فرمایا: پیارے بیٹے! وہی تو تھے جنھوں

[1] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 187,186. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة :441/1.

نے سب سے پہلے ہمیں جمعے کی نماز پڑھائی، اُس وقت تک رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف نہیں لائے تھے۔ انھوں نے یہ نماز حرۂ بنی بیاضہ میں نقیع الخضمات میں پڑھائی تھی۔ میں نے پوچھا: اس دن نماز جمعہ میں کتنے افراد تھے؟ انھوں نے فرمایا: چالیس آدمی تھے۔[1]

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا کہ وہ مدینہ میں نماز جمعہ کا اہتمام کریں۔ لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں غرابت ہے۔[2]

حضرت اسعد بن زرارہ اور مصعب رضی اللہ عنہما کی دعوتی سرگرمیاں

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی رہنمائی میں تمام مسلمانانِ مدینہ دعوتی میدان میں سرگرم عمل ہو گئے۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے اس جماعت کی قیادت کی۔ وہ دعوت کے میدان میں اپنے معلم حقیقی سے سیکھے ہوئے قرآنی اسلوب سے کام لیتے تھے۔ قرآن کریم کی آیات کی ایسی دلنشین تشریح فرماتے تھے کہ بذات خود اس آیت کی عملی تصویر بن جاتے تھے:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾

(النحل 16:125)

''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ کے ساتھ دعوت دیجیے اور ان سے پسندیدہ طریقے کے ساتھ بحث کیجیے۔''[3]

اس مقدس کام میں ابوامامہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ تمام مسلمانانِ مدینہ سے بڑھ کر حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کے شانہ بشانہ رہے، دونوں نے مل کر اہل یثرب میں نہایت جوش و خروش سے اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ تبلیغ کے سلسلے میں ان کی کامیابی کا ایک شاندار واقعہ یہ ہے کہ ایک روز حضرت اسعد بن زُرارہ انھیں ساتھ لے کر بنوعبدالاشہل اور بنوظفر کے محلے میں تشریف لے گئے۔ وہاں بنوظفر کے ایک باغ میں مرق نامی ایک کنویں پر بیٹھ گئے۔ ان کے آس پاس چند مسلمان بھی آ پہنچے۔ اس وقت تک بنوعبدالاشہل کے دونوں سردار، یعنی حضرت سعد بن معاذ اور حضرت اسید بن حُضیر رضی اللہ عنہما مسلمان نہیں ہوئے تھے، جب انھیں پتہ چلا کہ حضرت اسعد اور مصعب رضی اللہ عنہما لوگوں کو دعوتِ اسلام دے رہے ہیں، لوگ ان کی دعوت پر اسلام قبول کر رہے ہیں اور شرک و بت پرستی کی گندگی سے توبہ کر رہے ہیں تو

[1] سنن أبي داود: 1069، سنن ابن ماجه: 1082، واللفظ له. [2] البداية والنهاية: 149/3. [3] السيرة النبوية للصلابي: 417/1.

حضرت سعد نے حضرت اسید رضی اللہ عنہ سے کہا: ذرا جاؤ اور ان دونوں کو ڈانٹ پلاؤ۔ یہ ہمارے کمزوروں کو بے وقوف بنانے آ گئے ہیں، انھیں ہمارے محلے میں آنے سے منع کر دو چونکہ اسعد میری خالہ کا بیٹا ہے، اس لیے تمھیں بھیج رہا ہوں ورنہ یہ کام میں خود ہی انجام دیتا۔[1]

اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کی سرگزشت

حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے فوراً اپنا نیزہ اٹھایا اور حضرت اسعد اور حضرت مصعب رضی اللہ عنہما کے پاس جا پہنچے۔ حضرت اسعد رضی اللہ عنہ نے انھیں دیکھ کر سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ سے کہا: یہ اپنی قوم کا سردار ہے۔ تمھارے پاس آرہا ہے، اللہ کے نام پر اس سے دوٹوک بات کرنا۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر یہ بیٹھے گا تو ضرور بات کروں گا۔ اسید پہنچ کر ان کے پاس کھڑے ہو گئے اور انھیں سخت سست کہنے لگے، پھر پوچھا: تم دونوں یہاں کیا لینے آئے ہو؟ تم ہمارے کمزوروں کو بے وقوف بناتے ہو؟ اگر تمھیں اپنی جان پیاری ہے تو ہم سے کنارہ کش ہی رہو۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ تشریف رکھیں اور ہماری بات سنیں۔ اگر آپ کو ہماری بات پسند آجائے تو قبول کرلیں، نہ پسند آئے تو چھوڑ دیں۔ حضرت اسید نے کہا: یہ تو تم نے انصاف کی بات کی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنا نیزہ گاڑ کر بیٹھ گئے۔

اب حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے اسلام کی تعلیمات پیش کیں اور قرآن کی تلاوت فرمائی۔ ان کا بیان ہے: اللہ کی قسم! ابھی اسید بولنے بھی نہ پائے تھے کہ ہمیں ان کے چہرے کی بڑھتی ہوئی چمک دمک دیکھ کر ہی ان کے قبول اسلام کی پیشگی بشارت مل گئی۔ اس کے بعد انھوں نے زبان کھولی تو فرمایا: یہ تو بڑا اعلیٰ اور بہت خوب کلام ہے۔ تم لوگ کسی کو اس دین میں داخل کرنا چاہتے ہو تو کیا طریقہ اختیار کرتے ہو؟ انھوں نے کہا: آپ غسل کرلیں، کپڑے پاک کرلیں، پھر حق کی شہادت دیں اور دو رکعت نماز پڑھیں۔ انھوں نے غسل کیا، کپڑے پاک کیے، کلمۂ شہادت پڑھا، پھر دو رکعت نماز ادا کی، پھر بولے: میں پیچھے ایک اور شخص چھوڑ آیا ہوں اگر وہ تمھارا پیرو کار بن جائے گا تو اس کی قوم کا کوئی شخص پیچھے نہ رہے گا، سب کے سب مسلمان ہو جائیں گے۔ میں اسے ابھی تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لینے کے بعد اپنا نیزہ اٹھایا اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس واپس جا پہنچے۔ وہ

[1] المعجم الكبير للطبراني: 363/20، البداية والنهاية: 149/3، السيرة لابن هشام: 436,435/2.

اپنی قوم کے ساتھ محفل میں شریک تھے۔ حضرت اسید رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر بولے: اللہ کی قسم! اسید جیسا چہرہ لے کر یہاں سے گیا تھا، ویسے چہرے کے ساتھ واپس نہیں آرہا۔ حضرت اسید رضی اللہ عنہ مجلس کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا ہوا؟ اسید رضی اللہ عنہ کہنے لگے: میں نے ان دونوں آدمیوں سے بات کی ہے۔ کوئی خطرے کی بات نہیں ہے، پھر بھی میں نے انھیں منع کر دیا ہے اور انھوں نے میری بات تسلیم کر لی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بنو حارثہ اسعد بن زرارہ کو قتل کرنے کے لیے نکلے ہیں، وہ تمھاری خالہ کا بیٹا ہے اور بنو حارثہ تم سے بدعہدی کرنا چاہتے ہیں۔

یہ سن کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے، اپنا نیزہ سنبھالا اور یہ کہتے ہوئے وہاں سے چل دیے کہ تو نے کوئی تسلی بخش کام نہیں کیا۔ وہ ان دونوں کے پاس پہنچے تو دیکھا وہ دونوں بڑے سکون سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ دراصل اسید کا مقصد یہ تھا کہ میں خود دین کے بارے میں ان حضرات کی بات سُن لوں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کھڑے کھڑے ہی انھیں برا بھلا کہنے لگے، پھر اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ سے کہا: اللہ کی قسم! اے ابوامامہ! اگر میری تمھاری آپس میں رشتے داری نہ ہوتی تو تم میری طرف سے ہرگز کسی نرمی اور نوازش کے مستحق نہ ٹھہرتے۔ کیا تم ہمارے ہی محلے میں ہماری مرضی کے خلاف اپنے نظریات پھیلا رہے ہو؟ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے حضرت اسید رضی اللہ عنہ کی یہ بات مدنظر رکھی کہ یہ شخص اپنی قوم کا سردار ہے۔ اگر یہ مسلمان ہوگیا تو کوئی آدمی قبول اسلام میں اس سے پیچھے نہ رہے گا، چنانچہ انھوں نے بڑی نرمی سے کہا: صحیح طریق کار یہ ہے کہ آپ تشریف رکھیں، اطمینان سے ہماری بات سنیں۔ پسند آئے تو قبول کرلیں، ورنہ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ سیدنا سعدؓ نے کہا: تم نے بڑے انصاف کی بات کی ہے، پھر وہ نیزہ گاڑ کر بیٹھ گئے۔ اب سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ نے نہایت دلکش انداز میں اسلام کی دعوت پیش فرمائی اور قرآن کی تلاوت کی۔ موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ انھوں نے سورۂ زخرف کا ابتدائی حصہ تلاوت کیا۔ اسعد اور مصعب رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم ان کے چہرے کی بدلتی ہوئی فضا، ان کی نرم روی اور خندہ پیشانی ہی سے بھانپ گئے تھے کہ اب یہ مسلمان ہو جائیں گے۔

پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: جب آپ کسی کو مسلمان کرنا چاہتے ہیں تو کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں؟ ان دونوں نے کہا: آپ غسل کریں، پھر پاکیزہ کپڑے زیب تن کریں، حق کی گواہی دیں اور دو رکعت نماز پڑھیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس ہدایت پر فوراً عمل کیا۔

قبیلۂ بنوعبدالاشہل پرچم اسلام کی چھاؤں میں

جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرلیا تو حضرت اسید کے ساتھ اپنی قوم کے پاس آئے۔ قوم نے دیکھتے ہی کہا: ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ سعد جس حالت میں گیا تھا، اس حالت میں واپس نہیں آیا۔ جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ ان کے پاس پہنچے تو سوال کیا: اے بنوعبدالاشہل! میرے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے جواب دیا: آپ ہمارے سردار ہیں، سب سے بہتر ہیں اور خوب تر سوچ والے انسان ہیں، آپ کی قیادت بے مثال ہے۔ اس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تمھارے مردوں اور عورتوں میں سے کسی سے اس وقت تک کوئی کلام نہ کروں گا جب تک کہ تم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لے آؤ۔ ان کی اس بات کا ایسا زبردست اثر پڑا کہ شام ہونے تک اس قبیلے کا ہر مرد اور ہر عورت مسلمان ہوگئی۔ [1] صرف ایک صاحب رہ گئے۔ اُن کا نام عمرو بن ثابت بن وقش اور لقب اصیرم تھا۔ بالآخر انھوں نے بھی احد کے دن اسلام قبول کرلیا اور جنگ میں لڑتے لڑتے جام شہادت نوش فرماگئے۔ انھوں نے ابھی تک اللہ کے لیے ایک بھی سجدہ نہیں کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (ان کی شہادت کی) خبر دی گئی تو فرمایا: «عَمِلَ قَلِيلًا وَّ أُجِرَ كَثِيرًا» ''انھوں نے کام تھوڑا کیا اور ثواب زیادہ لے گئے۔'' [2]

اصیرم عمرو بن ثابت کے بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے سوال کیا: مجھے بتاؤ وہ کون شخص ہے جس نے کبھی نماز نہیں پڑھی لیکن وہ جنتی ہے۔ جب لوگ جواب نہ دے سکے تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ بنوعبدالاشہل کا اُصیرم عمرو بن ثابت بن وقش ہے۔ [3]

قبولِ اسلام میں انصار کے چند گھرانوں کی تاخیر

جبل سلع کے پاس خندق کے آثار

انصار کے گھرانوں میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس کی عورتیں اور مرد مسلمان نہ ہو چکے ہوں، سوائے بنوامیہ بن زید، بنوخطمہ، بنووائل اور بنوواقف کے جو ''اوس اللہ'' یعنی اوس بن حارثہ کی نسل سے تھے۔ ان کے اسلام نہ لانے کی وجہ یہ تھی کہ ان میں ایک شاعر ابوقیس بن اسلت تھا۔ یہ ان کا قومی شاعر اور قائد تھا۔ وہ اس کی ہر بات سنتے اور مانتے تھے۔ یہ لوگ اس کی وجہ سے کفر پر اڑے رہے۔ یہاں تک کہ 5 ھ/627ء میں خندق کا معرکہ پیش آیا۔ اس وقت ان کی آنکھوں سے تعصب کا پردہ اُٹھا، اندھی تقلید کی پٹی کھلی اور انھیں اسلام کی

[1] السيرة لابن هشام :2/435-437، البداية والنهاية : 3/149-151، تاريخ الطبري : 2/88-90، دلائل النبوة للبيهقي : 2/431,432، المعجم الكبير للطبراني :20/362-364، [2] دیکھیے: صحيح البخاري : 2808، صحيح مسلم : 1900، فتح الباري :6/32. [3] مسند أحمد :5/428,429، صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص :291.

دولت نصیب ہوئی۔

سعید بن یحییٰ بن سعید اموی بیان کرتے ہیں: ابوقیس نے بت پرستی سے دلبرداشتہ ہوکر زمانۂ جاہلیت ہی میں رہبانیت اختیار کر لی تھی۔ اونی لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔ غسلِ جنابت کیا کرتا تھا، حائضہ عورتوں سے اجتناب کرتا تھا۔ پہلے اس نے عیسائی بننے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے ایک حجرے میں رہائش اختیار کر لی۔ وہیں عبادت کرتا تھا۔ اس حجرے میں کسی حائضہ عورت اور کسی جنبی کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ وہ کہتا تھا: میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رب کی عبادت کیا کروں گا۔ جب نبیِ اکرم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو اس نے پیرانہ سالی میں اسلام قبول کر لیا اور اسلامی تعلیمات پر بڑے حسن و خوبی سے عمل پیرا رہا۔ وہ بڑا حق گو تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی اللہ تعالیٰ کی پرستش کرتا تھا۔ [1]

سفیرِ اسلام کی واپس مکہ تشریف آوری

جب اسلام کے سفیر مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اسلامی دعوت کی کامیابی پر مطمئن ہو گئے اور خوب دیکھ لیا کہ اللہ کا دین تیزی سے پھیل رہا ہے اور اسلام کو مضبوط عسکری قوت نصیب ہوگئی ہے تو وہ 9 ماہ بعد بعثت نبوی کے تیرہویں سال حج کے موسم سے پہلے مکہ پہنچے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ کے مسلمانوں کے احوال اور آئندہ امکانات کی مکمل رپورٹ پیش کی۔ انھوں نے بتایا کہ اسلام کس طرح اوس اور خزرج کے تمام قبائل میں داخل ہو چکا ہے اور اب ساری قوم آپ سے بیعت کرنے کے لیے تیار اور آپ ﷺ کی حمایت و نصرت کے لیے مستعد ہے۔ نبی ﷺ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی اس عظیم الشان کامیابی پر بہت خوش ہوئے۔ [2]

[1] السيرة لابن هشام: 438,437/2، سبل الهدٰى والرشاد: 200,199/3. [2] موسوعة الغزوات الكبرٰى لباشميل: 36/1، التحالف السياسي للدكتور منير الغضبان، ص: 72.

اسلام کی اولین مسجد (قباء)

دوسری بیعت عقبہ

اب اہلِ مدینہ کو بھی ان شدید آلام و مصائب کا پتہ چل گیا تھا جو سیدالانبیاء حضرت محمد ﷺ کو بے بصر اہل مکہ کے ہاتھوں شام و سحر جھیلنے پڑتے تھے۔ نبوت کے تیرھویں سال موسم حج میں مدینہ کے ستر سے زیادہ مسلمان ادائے حج کے لیے مکہ تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ان کی قوم کے مشرک بھی تھے۔ یہ لوگ ابھی یثرب ہی میں تھے یا مکہ کے راستے میں تھے کہ آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے: آخر ہم کب تک اللہ کے رسول ﷺ اور آپ کے صحابہ کو یوں ہی مکہ میں پریشان ہوتے، ٹھوکریں کھاتے، طعن و تشنیع سنتے اور ہروقت ہدفِ تشدد بنتے دیکھتے رہیں گے۔ بہت ہو چکا، اب ہم اپنے پیارے محبوب کو مکہ میں نہیں رہنے دیں گے۔ انھیں اپنے ساتھ مدینہ لائیں گے اور اہل مکہ نے ان کی راہ میں جو کانٹے بچھائے ہیں، انھیں اپنی پلکوں سے چن لیں گے۔

جونہی یہ مسلمان مکہ پہنچے، انھوں نے چپکے چپکے نہایت رازداری سے رسول اللہ ﷺ سے رابطہ کیا اور آپ ﷺ سے خفیہ مذاکرات کیے۔ ملاقات کے لیے وقت اور جگہ کا تعین ہوا۔ آخر کار اس بات پر اتفاق ہوگیا کہ دونوں فریق ایام تشریق کے درمیانی دن (12 ذوالحجہ) منیٰ میں جمرۂ اولیٰ، یعنی جمرہ عقبہ کے پاس جمع ہوں گے، جسے آج کل بڑا شیطان کہا جاتا ہے، اور یہ اجتماع رات کی تاریکی میں نہایت خاموشی سے بالکل خفیہ طریقے پر رازداری کے ساتھ ہو۔ [1]

[1] السیرۃ لابن ھشام: 438/2، موسوعۃ الغزوات الکبریٰ لباشمیل: 36/1.

منیٰ میں مقام بیعت عقبہ جس کے پاس جمرات نظر آ رہے ہیں

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی زبانی ملاقات کی تفصیل

سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم لوگ حج کے لیے نکلے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایام تشریق کے درمیانی روز ملاقات طے پائی۔ بالآخر وہ رات آ گئی جس رات آپ سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ ہمارے ساتھ ہمارے ایک معزز سردار عبداللہ بن حرام بھی تھے۔ وہ ابھی نعمتِ اسلام سے محروم تھے۔ ہم نے انھیں بھی ساتھ لے لیا ورنہ ہمارا معمول یہ تھا کہ ہم اپنی اپنی قوم کے مشرکین سے اپنا معاملہ خفیہ رکھتے تھے۔ مگر ہم نے عبداللہ بن حرام سے بات چیت کی، انھیں اعتماد میں لیا اور کہا: اے ابوجابر! آپ ہمارے بہت معزز اور شریف سربراہ ہیں۔ ہم آپ کو آپ کی موجودہ حالت سے نکالنا چاہتے ہیں تاکہ آپ آگ کا ایندھن بننے سے بچ جائیں۔ اس کے بعد ہم نے انھیں اسلام کی دعوت پیش کی اور بتایا کہ آج رات ہم نے منیٰ کی گھاٹی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کا وقت مقرر کیا ہے۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور ہمارے ساتھ منیٰ کی گھاٹی تشریف لے گئے۔

سیدنا کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم لوگ حسب دستور سرِ شام ہی اپنی قوم کے ساتھ اپنے خیموں میں سو گئے۔ تہائی رات گزر گئی تو ہم لوگ خاموشی سے ایک ایک دو دو کر کے اُٹھے، خیموں سے نکلے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے طے شدہ مقام پر جا پہنچے۔ ہم نے رازداری پوری طرح برقرار رکھی۔ ہم اس طرح چپکے چپکے دبک دبک کر نکلتے تھے جس طرح چڑیا اپنے گھونسلے سے سکڑ سکڑ کر نکلتی ہے، اسی طرح ہم بھی دبے پاؤں نکلتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم سب عقبہ میں جمع ہو گئے۔ ہماری کل تعداد پچھتر تھی۔ تہتر مرد تھے اور دو خواتین تھیں۔

ام عمارہ نُسَیبہ بنت کعب مازنیہ بنونجار سے تھیں اور ام مَنِیع اسماء بنت عمرو کا تعلق بنوسلمہ سے تھا۔ ہم سب لوگ گھاٹی میں جمع ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرنے لگے۔ انتظار کی گھڑیاں جلد ہی ختم ہوئیں، آپ تشریف لے آئے۔ آپ کے ساتھ آپ کے چچا سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بھی تھے، ہرچند وہ ابھی تک اپنی قوم کے دین پر تھے مگر چاہتے تھے کہ بھتیجے کے معاملے میں بذاتِ خود موقع پر موجود رہیں اور ان کے معاملات کے بارے میں پورا اطمینان حاصل کر لیں۔ اس موقع پر سب سے پہلے بات بھی انھی نے شروع کی۔[1]

دینی اور دفاعی تعاون کے مذاکرات

جب مجلس کی کارروائی نقطۂ اختتام تک پہنچی تو دینی اور دفاعی تعاون کے حتمی معاہدے کا مرحلہ آ گیا۔ اس موضوع کے حوالے سے بہت اہم نکات پر گفتگو شروع ہوئی۔ یہ معاہدہ اوس اور خزرج کے نمائندہ افراد اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

[1] السيرة لابن هشام: 441/2، موسوعة الغزوات الكبرٰى لباشميل: 37/1.

درمیان تشکیل پا رہا تھا۔ اس عظیم تاریخی اجتماع سے سب سے پہلے نبی ﷺ کے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے خطاب کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس اہم ترین ذمے داری کی نزاکت اور اس کے ممکنہ نتائج پوری طرح اُجاگر کر دیں جو اس عہد و پیمان کے نتیجے میں ان حضرات کے سر پڑنے والی تھی، چنانچہ انھوں نے کہا: خزرجی بھائی! (عرب اس زمانے میں انصار مدینہ کو اسی نام سے پکارتے تھے، چاہے وہ قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے ہوں یا اوس سے) ہم لوگوں میں محمد (ﷺ) کی جو (ممتاز اور منفرد) حیثیت ہے، وہ تمھیں معلوم ہے۔ ہم نے انھیں اب تک ان کے مخالفین سے محفوظ رکھا ہے۔ اس وقت وہ اپنی قوم میں ہیں، اپنے شہر میں ہیں، قوت، عزت اور حفاظت کے حصار میں ہیں۔ اب تم لوگ اصرار فرما رہے ہو کہ محمد ﷺ تمھارے ساتھ تمھارے شہر جائیں۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ ان سے کیا ہوا عہد پورا کر سکو گے اور انھیں ان کے مخالفین (کے حربوں) سے محفوظ رکھ سکو گے تو بڑی خوشی سے یہ ذمہ داری اٹھاؤ۔ لیکن اگر تمھیں یہ خدشہ ہو کہ تم انھیں اپنے پاس لے جانے کے بعد ان کا ساتھ چھوڑ بیٹھو گے اور کنارہ کش ہو جاؤ گے تو پھر انھیں یہیں رہنے دو۔ یہ اپنی قوم اور اپنے شہر میں عزت اور حفاظت سے رہ رہے ہیں۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی یہ باتیں سن کر ہم نے جواب دیا: ہم نے آپ کی ساری باتیں سن لی ہیں اور سب کچھ اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے۔ اے اللہ کے رسول! اب آپ ارشاد فرمائیں۔ آپ اللہ تعالیٰ اور اپنی ذاتِ گرامی کے سلسلے میں ہم سے جو چاہیں عہد لے لیں۔

رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کا عہد

اس جواب سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عظیم الشان ذمے داری اٹھانے اور اس کے انتہائی پُر خطر عواقب و نتائج جھیلنے کے سلسلے میں انصار کے ایمان کی مضبوطی، دلیری، بے باکی، فدویت اور قلبی اخلاص کا کیا حال تھا۔ عسکری حفاظت کے حوالے سے اس معاہدے کی ایک اہم شق یہ تھی کہ اوس اور خزرج نے رسول اللہ ﷺ کی اُسی طرح حفاظت کی ذمہ داری قبول کی جس طرح وہ اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے گفتگو فرمائی۔ آپ نے پہلے قرآنی آیات کی تلاوت کی۔ تمام ابنائے آدم کے نام اللہ تعالیٰ کا پیغام سُنایا۔ اسلام کے فضائل بیان فرمائے، پھر ارشاد فرمایا:

«أُبَايِعُكُمْ عَلٰى أَنْ تَمْنَعُونِي مِمَّا تَمْنَعُونَ مِنْهُ نِسَاءَكُمْ وَ أَبْنَاءَكُمْ»

”میں تم سے بیعت لیتا ہوں کہ تم جس طرح سے اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہو، اُسی طرح تم میری حفاظت بھی کرو گے۔“

براء بن معرور رضی اللہ عنہ کی یقین دہانی

سیدنا براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک تھام لیا اور عرض کیا: قسم اس ذاتِ عالی کی جس نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا! ہم آپ کی اس طرح حفاظت کریں گے جس طرح خود اپنی عزت کی حفاظت کرتے ہیں۔ اللہ کے رسول ہم سے بیعت لے لیجیے، اللہ کی قسم! ہم نے جنگوں کا دودھ پیا ہے اور ہم اسلحے کی کاٹ کے ماہر ہیں۔ نسل در نسل سے ہمارا یہی شیوہ چلا آرہا ہے۔

ابوالہیثم رضی اللہ عنہ کے خدشے کا ازالہ

ابھی حضرت براء رضی اللہ عنہ یہ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ ابوالہیثم بن تیہان رضی اللہ عنہ بول اٹھے: اللہ کے رسول! ہم نے کچھ لوگوں (یہودیوں) سے معاہدے کر رکھے ہیں، ہم انھیں ختم کر رہے ہیں، ایسا نہ ہو کہ ہم تو سب سے منقطع ہونے کے بعد الگ تھلگ ہو کر رہ جائیں اور اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ نصیب فرمائے تو آپ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم کے پاس واپس آجائیں۔ یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا:

«بَلِ الدَّمَ الدَّمَ وَالْهَدْمَ الْهَدْمَ، أَنَا مِنْكُمْ وَ أَنْتُمْ مِنِّي، أُحَارِبُ مَنْ حَارَبْتُمْ وَ أُسَالِمُ مَنْ سَالَمْتُمْ»

''(نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔) تمھارا خون میرا خون ہے۔ تمھاری عزت میری عزت ہے۔ میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو، جس سے تمھاری جنگ ہے، اس سے میری بھی جنگ ہے، جس سے تم صلح کرو گے، اُس سے میں بھی صلح کروں گا۔'' [1]

بیعت کی دفعات اور جملہ تفصیلات

بیعت کا واقعہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مفصل بیان کیا ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہم آپ سے کس بات پر بیعت کریں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«تُبَايِعُونِي عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي النَّشَاطِ وَالْكَسَلِ، وَالنَّفَقَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ، وَعَلَى الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَأَنْ تَقُولُوا فِي اللّٰهِ، لَا تَخَافُونَ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ، وَعَلَى أَنْ تَنْصُرُونِي فَتَمْنَعُونِي إِذَا قَدِمْتُ عَلَيْكُمْ مِمَّا تَمْنَعُونَ مِنْهُ أَنْفُسَكُمْ وَأَزْوَاجَكُمْ

[1] السيرة لابن هشام: 2/441-443، موسوعة الغزوات الكبرٰى لباشميل: 1/38,37، فتح الباري: 7/276

وَ أَبْنَائَكُمْ، وَلَكُمُ الْجَنَّةُ»

”تم میری بیعت کرو اس بات پر کہ 1 چستی ہو یا سستی تم بہرحال بات سنو گے اور اس پر عمل کرو گے۔ 2 تنگی ہو یا خوش حالی ہر حال میں مال خرچ کرو گے۔ 3 بھلائی کا حکم دو گے اور برائی سے روکو گے۔ 4 اللہ کے بارے میں حق بات کہنے پر کسی ملامت گر کی پروا نہ کرو گے۔ 5 میں تمھارے پاس آ جاؤں گا تو میری مدد کرو گے اور جس چیز سے اپنی جان اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہو، اس سے میری بھی حفاظت کرو گے اور تمھارے لیے جنت ہے۔“ [1]

ایک روایت میں سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«وَ عَلٰى أَنْ لَّا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ، قَالَ: إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ فِيهِ بُرْهَانٌ»

6 ”ہم خلافت کے معاملے میں حاکم سے کوئی جھگڑا نہیں کریں گے۔ آپ ﷺ نے مزید فرمایا: مگر یہ کہ تم کھلم کھلا کفر دیکھو اور اس کے متعلق تمھارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل ہو۔“ [2]

بیعت کی نزاکت اور نتائج کی دوبارہ یاد دہانی

بیعت کی شرائط طے پا گئیں۔ لوگوں نے بیعت شروع کرنے کا ارادہ کیا تو صف اول کے انصاری مسلمان سیدنا عباس بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو ان کی ذمے داری کی نزاکت اور خطرات سے دوبارہ دوٹوک الفاظ میں خبردار کیا تاکہ لوگ اس معاملے کے تمام پہلوؤں کا اچھی طرح جائزہ لیں اور کامل احساسِ ذمہ داری سے بیعت کریں۔ اس بات سے یہ بھی معلوم کرنا مقصود تھا کہ قوم کس حد تک قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔ سیدنا عباس بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تم لوگ جانتے ہو کہ تم نبی ﷺ سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ تمام حاضرین نے جب ہاں میں جواب دیا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: تم ان سے سرخ اور سیاہ لوگوں سے جنگ پر بیعت کر رہے ہو۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ جب تمھارے اموال کا صفایا کر دیا جائے گا اور تمھارے اشراف قتل کر دیے جائیں گے تو تم ان کا ساتھ چھوڑ دو گے تو بہتر ہے کہ ان کا ساتھ ابھی چھوڑ دو کیونکہ اگر تم نے انھیں لے جانے کے بعد چھوڑ دیا تو یہ تمھارے لیے دنیا اور آخرت کی رسوائی ہوگی اور اگر تمھارا یہ خیال ہے کہ تم مال کی تباہی اور اشراف کے قتل کے باوجود وہ عہد نبھاؤ گے جو تم نے ان سے کیا ہے تو پھر بے شک تم انھیں لے جاؤ کیونکہ اللہ کی قسم! اس میں دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔

اس پر سب نے بیک زبان کہا: ہم مال کی تباہی اور اشراف کے قتل کا خطرہ مول لے کر انھیں دل و جان سے

[1] مسند أحمد: 322/3. [2] صحيح البخاري: 7056، صحيح مسلم: 1709، قبل حديث: 1841.

قبول کرتے ہیں۔ اے اللہ کے رسول! ہم اپنے اس قول و قرار پر پورے اتریں گے تو ہمیں اس کے عوض کیا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جنت!'' لوگوں نے التجا کی: اپنا ہاتھ پھیلائیے! آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ پھیلایا۔[1]

اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی تاکید مزید

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جونہی ہم بیعت کرنے اُٹھے، حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے، جو میرے سوا قوم میں سب سے چھوٹے تھے، آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے: اے اہل یثرب! ذرا ٹھہر جاؤ، ہم آپ ﷺ کی خدمت میں اونٹوں پر اتنا طویل سفر کر کے اس یقین و ایمان کے ساتھ حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ آج آپ ﷺ کو یہاں سے لے جانے کا مطلب سارے عرب سے دشمنی مول لینا ہے، تمھارے سردار قتل ہوں گے اور تلواریں تم پر ٹوٹ پڑیں گی۔ اگر یہ سب کچھ برداشت کر سکتے ہو، تب تو بخوشی محمد رسول اللہ ﷺ کو ساتھ لے چلو۔ تمھارا اجر اللہ کے ذمے ہے اور اگر تمھیں اپنی جان عزیز ہے تو انھیں ابھی چھوڑ دو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ قابلِ قبول عذر ہوگا۔ اس پر سب نے بیک آواز کہا: اے اسعد! راستے سے ہٹ جائیے، ہم یہ بیعت ہر قیمت پر کریں گے۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ہم سب کھڑے ہوگئے، ہم نے آپ ﷺ کی بیعت کی اور آپ نے ہم سے بیعت لی، شرائط کا تذکرہ فرمایا اور اس کے عوض ہمیں جنت کی بشارت دی۔[2]

بیعت کی تکمیل

بیعت کی دفعات پہلے ہی طے ہو چکی تھیں۔ معاملے کی نزاکت بھی پوری طرح واضح کر دی گئی تھی اور اب یہ تاکید مزید بھی ہوگئی۔ لوگوں کے جواب سے حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کو پوری طرح معلوم ہوگیا کہ قوم راہِ حق میں جان دینے کے لیے کس قدر بے تاب ہے۔

بیعت کا طریقہ

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ لوگوں نے کہا: آپ اپنا ہاتھ پھیلائیے تو آپ نے اپنا دستِ مبارک پھیلایا، یعنی آپ ﷺ بیعت لیتے ہوئے ان کا ہاتھ تھامتے تھے اور ان سے عہد و پیمان لیتے تھے۔ باقی رہیں وہ دو عورتیں جو اس موقع پر حاضر تھیں تو ان کی بیعت صرف زبانی ہوئی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی غیر محرم عورت سے

[1] السيرة لابن هشام: 446/2، روضة الأنوار، ص: 89,88. [2] مسند أحمد: 323,322/3، البداية والنهاية: 157/3.

ہاتھ نہیں ملایا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ مسلمان عورتیں جب ہجرت کرتیں تو آپ ﷺ اس آیت کے مطابق ان کا امتحان لیتے تھے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ إِذَا جَآءَكَ ٱلْمُؤْمِنَٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰٓ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِٱللَّهِ شَيْـًٔا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ..... ﴾

''اے نبی! جب آپ کے پاس مسلمان عورتیں بیعت کرنے آئیں، اس بات پر کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہیں کریں گی، زنا نہیں کریں گی......'' [1]

جو عورت ان باتوں کا اقرار کرتی تھی، وہ گویا بیعت کا اقرار کرتی تھی۔ جب وہ اقرار کر لیتی تو رسول اللہ ﷺ اس سے فرماتے: ''جاؤ، میں نے تم سے بیعت لے لی۔'' اللہ کی قسم! آپ کا ہاتھ کبھی کسی غیر محرم عورت کے ہاتھ سے مس نہیں ہوا، آپ ﷺ ان سے صرف زبانی بیعت لیتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے کوئی اقرار نہیں لیا۔ بس جس بات کا اللہ نے حکم دیا صرف وہی اقرار لیا اور آپ ﷺ کی ہتھیلی کسی غیر محرم عورت کی ہتھیلی سے کبھی نہیں لگی۔ آپ ﷺ کا طریقہ مبارک یہ تھا کہ جب کوئی خاتون آپ ﷺ سے بیعت کر لیتی تو آپ زبانی طور پر فرما دیتے کہ ''میں نے تم سے بیعت لے لی۔'' [2]

بیعتِ عقبہ کی فضیلت

وہ بیعت جو عقبہ کی رات کی گئی، زبردست اہمیت کی حامل ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے کیا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں کہ عقبہ کی رات میں نبیِ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس وقت ہم نے اسلام پر قائم رہنے کا پکا عہد کیا۔ میرے نزدیک لیلۃ العقبہ (کی بیعت) بدر کی لڑائی میں حاضری سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے، ہر چند لوگوں میں بدر کا چرچا اس سے زیادہ ہے۔ [3]

مسجد بیعت کا اندرونی منظر

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ بدر میں شریک ہونے

[1] الممتحنة 60:12. [2] صحيح مسلم: 1866. [3] صحيح البخاري: 3889، صحيح مسلم: 2769.

والے صحابہ زیادہ فضیلت کے حامل ہیں کیونکہ یہ پہلا غزوہ تھا جس میں اسلام کو قوت وعظمت نصیب ہوئی لیکن عقبہ کی بیعت کی اہمیت وفضیلت یہ ہے کہ یہ اسلام کے فروغ کا سبب بنی اور اسی بیعت کی بنا پر معرکہ بدر پیش آیا۔[1]

سب سے پہلے کس نے بیعت کی؟

اس بات پر اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے بیعت کی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ عقبہ کی رات سب سے پہلے براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔ ابن اسحاق کعب بن مالک سے بیان کرتے ہیں کہ سب سے پہلے بیعت کرنے والے براء بن معرور ہیں۔ بنوعبدالاشہل کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ابوالہیثم بن تیہان رضی اللہ عنہ نے بیعت کی۔ بنونجار کا خیال ہے کہ سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے ابوامامہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ تھے۔[2]

ابن سعد رحمہ اللہ نے سلیمان بن سُحَیم سے بیان کیا ہے کہ اوس اور خزرج نے اس شخص کا اوجِ تقدیر دیکھ کر ایک دوسرے پر فخر کیا جس نے عقبہ کی رات سب سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ انھوں نے کہا کہ اس شخص کے حوالے سے عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا، چنانچہ وہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا تو انھوں نے بھی یہی کہا: ہاں! اس شخص کے بارے میں مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا۔ اس رات سب سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے اسعد بن زرارہ تھے، پھر براء بن معرور اور ان کے بعد اسید بن حضیر رضی اللہ عنہم نے بیعت کی۔[3]

ابوشہبہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے اس اختلاف کا سبب یہ ہو کہ ان تمام حضرات نے کھڑے ہو کر بات چیت کی، پھر بیعت کی، اس لیے ہر شخص نے اپنے علم کے مطابق صورتحال بیان کی ہے۔

درحقیقت حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر مدینے میں دعوتِ اسلام دیتے تھے اور مدینہ منورہ کے سب سے بڑے مبلغِ دین تھے۔ اسی لیے قدرتی طور پر وہی بیعت کرنے والوں کے دینی سربراہ بھی تھے، لہٰذا سب سے پہلے بیعت کرنے والے بھی وہی تھے۔ ان کی بیعت کے بعد عام بیعت ہوئی۔[4]

---

[1] فتح الباري: 275/7. [2] فتح الباري: 276/7، السيرة لابن هشام: 447/2. [3] الطبقات لابن سعد: 9/4. [4] السيرة النبوية لأبي شهبة: 451/1، الرحيق المختوم، ص: 172.

کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے والے اولین فرد

سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنی قوم کے مشرکین کے ساتھ حج کے لیے نکلے۔ ہمارے ساتھ سیدنا براء بن معرور رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ جب ہم یثرب (مدینہ) سے مکہ آ رہے تھے تو حضرت براء رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے کہا: میری ایک رائے ہے، معلوم نہیں تم اس سے اتفاق کرو گے یا نہیں۔ لوگوں نے پوچھا: آپ کی کیا رائے ہے؟ براء رضی اللہ عنہ نے کہا: میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس عمارت، یعنی کعبہ مشرفہ کی طرف پشت نہ کروں اور نماز میں اسی کی طرف رخ پھیرلوں۔ سب نے کہا: اللہ کی قسم! ہمیں تو یہی خبر ملی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم شام، یعنی بیت المقدس کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں، ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہیں کرنا چاہتے۔ براء کہنے لگے: میں تو کعبے ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھوں گا۔ ہم نے کہا: لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے، چنانچہ جب نماز کا وقت ہوتا تو ہم سب بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور براء رضی اللہ عنہ کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے یہاں تک کہ ہم مکہ پہنچ گئے۔ ہم نے براء رضی اللہ عنہ کے اس عمل پر انھیں معیوب ٹھہرایا لیکن وہ اسی عمل پر ڈٹے رہے۔

سیدنا کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب ہم مکہ پہنچ گئے تو براء رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا: اے بھتیجے! میرے ساتھ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چلو تاکہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معاملے سے آگاہ کر دیں اور اس عمل کی صحت یا عدم صحت دریافت کریں جو ہمیں اس سفر میں پیش آیا ہے۔ پورے سفر میں تم میری مخالفت میں رہے، یعنی قافلے نے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی اور میں قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھتا رہا۔ اللہ کی قسم! میرے دل میں اس معاملے کے بارے میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ فرماتے ہیں: ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پہچانتے تھے کیونکہ ہم نے اب سے پہلے آپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا، ہم نے اہل مکہ میں سے ایک آدمی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ملیں گے؟ اس نے ہم سے پوچھا: کیا تم انھیں پہچانتے ہو؟ ہم نے جواب دیا: نہیں۔ وہ بولا: کیا تم ان کے چچا عباس بن عبدالمطلب کو پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: جاؤ مسجد الحرام میں داخل ہو جاؤ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہیں حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ بیٹھے ہوں گے۔ ہم مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ ہم نے سلام کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: اے ابوالفضل! کیا تم ان دونوں کو جانتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: جی ہاں۔ یہ اپنی قوم کے سردار براء بن معرور (رضی اللہ عنہ) ہیں اور یہ کعب بن مالک ہیں۔ کعب کہتے ہیں: اللہ کی قسم! میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کبھی نہیں بھولتا۔ آپ نے دریافت فرمایا: ((اَلشَّاعِرُ؟)) ''(کیا

وہی کعب) جو شاعر ہیں؟'' عباس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: جی ہاں! اب حضرت براء بن معرور نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں اپنے اس سفر پر نکلا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام کی توفیق مل چکی تھی، خیال گزرا کہ میں کعبہ کی طرف پیٹھ نہ کروں، چنانچہ میں بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا رہا مگر میرے ساتھی اس کے بارے میں مجھ سے متفق نہیں ہوئے۔ مجھے اس بارے میں خلجان محسوس ہو رہا ہے۔ اے اللہ کے رسول! آپ اس معاملے کی بابت کیا فرماتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آپ قبلے ہی پر تھے، کاش! اس پر قائم رہتے۔''

کعب رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ براء رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا قبلہ اختیار کر لیا، یوں وہ ہمارے ساتھ شام (بیت المقدس) کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔ ان کے اہل خانہ کہتے ہیں کہ انھوں نے زندگی بھر مکہ ہی کی طرف منہ کر کے

مسجد اقصیٰ

مسجد الحرام

نماز پڑھی جبکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ بہر حال انھیں یہ شرف ضرور حاصل ہے کہ سب سے پہلے وہی تھے جنھوں نے کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ [1]

بارہ نقیبوں کا انتخاب

جب لیلۃ العقبہ کی بیعت میں پیمانِ وفا باندھا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تجویز رکھی کہ بارہ سربراہ منتخب کر لیے جائیں جو اپنی اپنی قوم کے نقیب (نمائندے) اور اس بیعت کی دفعات پر عملدرآمد کے لیے اپنی اپنی قوم کے ذمہ دار ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا:

«أَخْرِجُوا إِلَيَّ مِنْكُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا يَكُونُونَ عَلٰى قَوْمِهِمْ بِمَا فِيهِمْ»

''آپ لوگ مجھے اپنی صفوں سے بارہ نقیب پیش کریں، وہی لوگ اپنی قوم کے معاملات کے ذمہ دار

[1] مسند أحمد: 461/3، السيرة لابن هشام: 440,439/2، البداية والنهاية: 156/3.

ہوں گے۔"

آپ ﷺ کے اس ارشاد پر نقیبوں کا انتخاب فی الفور عمل میں آ گیا۔ نو نقیب خزرج سے منتخب کیے گئے اور تین اوس سے۔

خزرج کے نقیبوں کے اسمائے گرامی

1. ابوامامہ اسعد بن زرارہ بن عدس رضی اللہ عنہ بنونجار کے نقیب بنائے گئے۔
2. سعد بن ربیع بن عمرو رضی اللہ عنہ بنوحارث بن خزرج کے نقیب مقرر ہوئے۔
3. عبداللہ بن رواحہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ بنوثعلبہ کے نقیب بنے۔
4. رافع بن مالک بن عجلان بنوزریق کے نقیب بنائے گئے۔
5. براء بن معرور رضی اللہ عنہ بنوعبید بن عدی بن غنم کے نقیب چنے گئے۔
6. عبداللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ بنوحرام بن کعب کے نقیب بنائے گئے۔
7. عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بنوسالم بن عوف کے نقیب قرار پائے۔
8. سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بنوساعدہ کی شاخ ابوحزیمہ بن ثعلبہ کے نقیب مقرر ہوئے۔
9. منذر بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ بنوساعدہ کی ذیلی شاخ ثعلبہ بن خزرج کے نقیب بنائے گئے۔

اوس کے نقیبوں کے اسمائے گرامی

1. اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ بنوعبدالاشہل کے نقیب بنائے گئے۔
2. سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ بنوسلم کے نقیب قرار پائے۔
3. رفاعہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ بنوعمرو بن عوف کے نقیب مقرر ہوئے۔[1]

اسلام کی دعوت و تبلیغ ہر مسلمان کا بنیادی اہم فریضہ ہے۔ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ہر مسلمان نے یہ عظیم ذمہ داری خوب نبھائی لیکن مدینہ کے قبیلۂ خزرج اور قبیلۂ اوس کے جن نقیبوں کے اسمائے گرامی اوپر درج کیے گئے ہیں۔ تاریخ اسلام نے ان کی شان فدویت اور جذبۂ عزیمت و استقامت ہمیشہ کے لیے نمایاں کر دی ہے۔

[1] السيرة لابن هشام: 2/443،444، البداية والنهاية: 3/159، فتح الباري: 7/276.

رسول اللہ ﷺ کے
12
انصاری نقیب
حارثہ
اوس
بنو اوس کا جد امجد
خزرج الاکبر
بنو خزرج کا جد امجد

نقیبوں کو نصیحت

ان نقیبوں کا انتخاب ہو چکا تو بلحاظِ عہدہ ان کی نئی ذمہ داری کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے انھیں نصیحت فرمائی:

«أَنْتُمْ عَلٰى قَوْمِكُمْ بِمَا فِيهِمْ كُفَلَاءُ كَكَفَالَةِ الْحَوَارِيِّينَ لِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ، وَأَنَا كَفِيلٌ عَلٰى قَوْمِي»

''آپ لوگ اپنی قوم کے جملہ معاملات کے کفیل ہیں۔ جس طرح حواری عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی طرف سے کفیل ہوئے اور میں اپنی قوم (مسلمانوں) کا کفیل ہوں۔''

سب سرداروں نے اپنے فرائض پورے کرنے کا یقین دلایا اور ذمہ داری قبول کر لی۔ [1]

معاہدہ منکشف ہو گیا

رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ یہ معاہدہ بالکل خفیہ رکھا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اصحابِ بیعت نے شروع ہی سے بے حد احتیاط ملحوظ رکھی۔ وہ ایک ایک کر کے بیدار ہوتے رہے، انتہائی منظم انداز میں چپکے چپکے نکلتے رہے اور دو دو نفر کی جوڑی بن کر چھپ چھپ کر مسافت طے کرتے رہے۔ اس طرح وہ بے حد خاموشی اور راز داری سے مقررہ جگہ پر پہنچے۔ شرکائے بیعت کو تاکید کر دی گئی تھی کہ اپنی آواز پست رکھیں اور لمبی گفتگو سے گریز کریں مبادا کوئی جاسوس ان کی آواز سن لے یا اُن کے حرکات و سکنات دیکھ لے۔ [2]

تکمیل بیعت کے بعد یہ جلیل القدر افراد ابھی واپسی کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ اچانک ایک شیطان کے کان میں اس اجتماع کی بھنک پڑ گئی۔ چونکہ اُس شیطان پر یہ انکشاف بالکل آخری لمحات میں ہوا تھا، اس لیے اُسے اتنی مہلت نہیں ملی کہ وہ یہ خبر جلدی سے قریش کو پہنچا دیتا اور وہ اچانک اس اجتماع پر ٹوٹ پڑتے اور انھیں گھاٹی میں جا لیتے، اسی لیے اس شیطان نے جھٹ ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر، اتنی اونچی آواز سے جو شاید ہی کبھی سنی گئی ہو، یہ پکار لگائی: اے خیمے والو! (نعوذ باللہ) مذمم (محمد ﷺ) کو دیکھو، اس وقت بد دین اس کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ یہ تم سے لڑنے کے لیے جمع ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ صدا سنی تو فرمایا: ''یہ اس گھاٹی کا شیطان ہے۔'' پھر فرمایا: ''او اللہ کے دشمن! سن لے! اب میں جلد ہی تیرے لیے فارغ ہو رہا ہوں۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے لوگوں سے کہا کہ اب آپ حضرات اپنے خیموں میں چلے جائیں۔ [3]

[1] فتح الباري: 276/7، السيرة لابن هشام: 446/2، البداية والنهاية: 160/3. [2] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص: 62. [3] السيرة لابن هشام: 447/2، البداية والنهاية: 162/3، زاد المعاد: 49،48/3.

انصار کی طرف سے قریش پر ضرب لگانے کی درخواست

شیطان کی یہ آواز سن کر سیدنا عباس بن عبادہ بن نضلہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! اگر آپ حکم دیں تو صبح ہم تمام اہل منیٰ پر تلواریں لے کر ٹوٹ پڑیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَمْ نُؤْمَرْ بِذٰلِكَ، وَلٰكِنِ ارْجِعُوا إِلٰى رِحَالِكُمْ»

''ہمیں اس بات کا حکم نہیں دیا گیا، بس اب آپ حضرات واپس اپنی قیام گاہوں پر چلے جائیں۔''

اس کے بعد یہ حضرات واپس آ کر سو گئے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ [1]

قریش کا واویلا اور رؤسائے یثرب سے شدید احتجاج

تمام تر احتیاطی تدابیر کے باوجود اس اجتماع کی بھنک قریش کے کانوں میں پڑ ہی گئی۔ یوں قریش کی صفوں میں کہرام مچ گیا اور وہ غم و غصے سے پاگل ہو گئے کیونکہ اس بیعت کے جو نتائج ان کی جان و مال پر مرتب ہو سکتے تھے، اس کا انھیں اچھی طرح اندازہ تھا، چنانچہ صبح ہوتے ہی ان کے سردار اور جملہ اکابر کا جتھا احتجاج کے لیے اہل یثرب کے خیموں پر پہنچا اور کہنے لگا:

''اے خزرج کے لوگو! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ ہمارے اس صاحب کو ہمارے ہاں سے نکال لے جانے کے لیے آئے ہیں، ہم سے جنگ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں اور اس مقصد کے لیے آپ اس کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں، حالانکہ کوئی عرب قبیلہ ایسا نہیں جس سے جنگ کرنا ہمارے لیے اس قدر ناگوار ہو جتنا آپ حضرات سے ناگوار ہے۔'' (ہم تو آپ لوگوں سے لڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے) [2]

اہل یثرب کا جواب

بعض مشرکینِ خزرج اس بیعت سے بالکل بے خبر تھے کیونکہ یہ اجتماع پوری طرح رازداری کے ساتھ رات کی تاریکی میں ہوا تھا، اس لیے ان مشرکین نے اللہ کی قسم کھائی اور اکابرِ قریش کو یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات ہرگز نہیں ہوئی بلکہ ہم تو اس طرح کے اجتماع کی کوئی بات سرے سے جانتے ہی نہیں۔ اب اکابر قریش کا یہ جتھا عبداللہ بن ابی کے پاس پہنچا۔ اُس نے بھی اس طرح کے کسی اجتماع کی تردید کی اور کہا: یہ بالکل غلط ہے، ایسا نہیں ہوا۔ یہ

[1] السيرة لابن هشام: 448/2، البداية والنهاية: 162/3. [2] السيرة لابن هشام: 448/2.

ہرگز نہیں ہوسکتا کہ میری قوم مجھے چھوڑ کر اس طرح کا کام کر گزرے۔ اگر میں یثرب میں ہوتا تب بھی مجھ سے مشورہ کیے بغیر میری قوم ایسا کام نہ کرتی۔

اس موقع پر موجود مسلمان ساری حقیقت سے خوب آگاہ تھے۔ وہ قریش کے سرداروں کا واویلا چپ چاپ سُن رہے تھے، انھوں نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور چپ سادھ لی، ان میں سے کسی نے ہاں یا نہ میں زبان ہی نہیں کھولی۔ آخر قریشی سردار اس اطمینان کے ساتھ واپس چلے گئے کہ مشرکین کی بات سچ ہے۔ حضرت کعب فرماتے ہیں کہ جب قریشی واپسی کے لیے کھڑے ہوئے تو ان میں حارث بن ہشام بن مغیرہ مخزومی بھی موجود تھا، اُس نے نئے جوتے پہن رکھے تھے۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جابر رضی اللہ عنہ کے والد عبداللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ سے کہا: اے ابوجابر! تو ہمارا سردار ہے، کیا تیرے پاس بھی ایسے جوتے ہیں؟ ...... یہ بات کہنے سے میری اصل غرض یہ تھی کہ قریشی سرداروں اور عبداللہ بن ابی کی گفتگو میں کسی طرح میں بھی شریک ہو جاؤں، چنانچہ میری یہ بات حارث نے سن لی۔ اُس نے فوراً اپنے جوتے اتارے اور میری طرف پھینک دیے، پھر کہنے لگا: اللہ کی قسم! تو یہ جوتے ضرور پہنے گا۔ ابوجابر نے مجھ سے کہا: واللہ! تم نے اس نوجوان کو غصہ دلایا ہے۔ اس کے جوتے واپس کر دو۔ میں نے کہا: ہرگز نہیں! اللہ کی قسم! میں جوتے واپس نہیں دوں گا۔ یہی تو نیک فال ہے۔ اگر یہ سچ ثابت ہوئی تو میں یقیناً اس کا سلب (سامان) حاصل کروں گا۔ [1]

بیعت کرنے والوں کا تعاقب

رؤسائے مکہ قریب قریب اسی یقین وطمانیت کے ساتھ واپس گئے تھے کہ اجتماع کی خبر غلط ہے لیکن وہ چین سے نہیں بیٹھے۔ اس معاملے کی چھان پھٹک میں لگ گئے۔ بالآخر وہ معاملے کی اصلیت تک پہنچ ہی گئے۔ انھیں صاف معلوم ہوگیا کہ یہ خبر صحیح ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت ہوچکی ہے لیکن اُن پر یہ حقیقت اس وقت منکشف ہوئی جب حُجاج اپنے اپنے وطن روانہ ہو چکے تھے، اس لیے ان کے سواروں نے بڑی تیز رفتاری سے اہل یثرب کا پیچھا کیا لیکن موقع اُن کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، وہ اسی تگ و دو میں تھے کہ اچانک انھوں نے سعد بن عبادہ اور منذر بن عمرو رضی اللہ عنہما کو دیکھا۔ وہ ان کے پیچھے لپکے اور انھیں جا لیا لیکن منذر بہت تیز رفتار تھے۔ وہ نکل بھاگے، البتہ سعد بن عبادہ دھر لیے گئے، مشرکین نے ان کا ہاتھ ان کی گردن کے پیچھے انھی کے کجاوے کی رسی سے باندھ دیا، پھر وہ انھیں مارتے پیٹتے اور ان کے بال نوچتے ہوئے مکہ لے گئے۔

[1] مسند أحمد: 462/3، السيرة لابن هشام: 449,448/2.

سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اسی حالت میں گرفتار تھا کہ چند قریشی ادھر آ نکلے۔ ان میں سے ایک شخص اتنا خوبصورت تھا کہ اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ میں نے سوچا ان میں سے اگر کسی سے بھلائی کی توقع کی جا سکتی ہے تو وہ یہی خوبرو شخص ہے لیکن جب وہ میرے نزدیک آیا تو اس نے میرے منہ پر زناٹے دار طمانچوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں اس کے غیر متوقع تشدد سے بہت مایوس ہوا۔ جس وقت وہ لوگ مجھے گھسیٹ رہے تھے اور زدوکوب کر رہے تھے تو ایک آدمی میرے قریب آیا اور مجھ سے بڑی رازداری سے پوچھنے لگا کہ تیرا یہاں کسی قریشی سے دوستی کا کوئی معاہدہ ہے؟ میں نے کہا: ہاں! جب جبیر بن مطعم کے کارندے میرے علاقے میں سامانِ تجارت لے کر جاتے تھے اور میں انھیں اپنی پناہ میں لے لیتا تھا تو کسی کی مجال نہ ہوتی تھی کہ ان پر دست درازی کرے۔ اسی طرح حارث بن حرب بن امیہ جو ابوسفیان کا نائب ہے، اس سے بھی میرے دوستانہ مراسم ہیں۔

وادی ابطح کا ایک منظر

اس شخص نے کہا: اللہ تمھارا بھلا کرے! تم ان دونوں کی دہائی کیوں نہیں دیتے، چنانچہ میں نے ان دونوں کے نام کی دہائی دی۔ وہ آدمی جلدی سے ان کی تلاش میں نکل گیا، وہ لوگ اسے مسجد الحرام میں کعبہ مشرفہ کے پاس مل گئے۔ اس نے انھیں جا کر کہا: ابطح میں خزرج قبیلہ کے ایک شخص کو لوگ بُری طرح مار رہے ہیں اور وہ تم دونوں کے نام کی دہائی دے رہا ہے۔ انھوں نے پوچھا: وہ کون ہے؟ اس نے بتایا: وہ سعد بن عبادہ (رضی اللہ عنہ) ہے۔ نام سن کر انھوں نے تصدیق کی کہ وہ تو واقعی ہمارا محسن ہے۔ ہمارے کارندے جب بھی اس کے علاقے میں جاتے ہیں تو وہی انھیں پناہ دیتا ہے اور ہر طرح کے ظلم و زیادتی سے بچاتا ہے۔ جب یہ دونوں موقع پر پہنچے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ان قریشیوں کے تشدد سے نجات ملی اور وہ واپس مدینہ روانہ ہوگئے۔ ادھر انصار ان کی گرفتاری کی خبر سے بہت بے قرار تھے۔ وہ آپس میں مشورہ کر رہے تھے کہ کیوں نہ قریش پر دھاوا بول دیا جائے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اُن کی گرفت سے چھڑایا جائے مگر اسی دوران حضرت سعد رضی اللہ عنہ واپس آتے دکھائی دیے تو انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد یہ سب حضرات بخیریت مدینہ پہنچ گئے۔ جس شخص نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تھپڑ رسید کیے تھے، وہ سہیل بن عمرو تھا اور جس شخص نے پیغام رسانی کی اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی نجات کا سبب بنا، وہ ابوالبختری بن ہشام تھا۔[1]

[1] السیرۃ لابن ہشام: 450,449/2، زادالمعاد: 49/3.

شرکائے بیعت عقبہ ثانیہ

دینی اور دفاعی تعاون کے اس معاہدے میں شریک ہونے والے مردانِ حُر کی تعداد 73 تھی۔ مزید برآں دو عورتیں بھی تھیں۔ ان میں سے گیارہ افراد قبیلہ اوس سے تھے۔ باسٹھ مرد اور دو عورتیں قبیلہ خزرج سے تھیں۔

اوسی شرکاء کے اسمائے گرامی

بنوعبدالاشہل: 1 اسید بن حضیر 2 قبیلہ بنو بلی سے تعلق رکھنے والے بنوعبدالاشہل کے حلیف ابوالہیثم بن تیہان 3 سلمہ بن سلامہ بن وقش رضی اللہ عنہم۔

بنوحارثہ: اس قبیلے سے تین افراد شامل ہوئے: 1 ظہیر بن رافع بن عدی 2 قبیلہ قضاعہ سے تعلق رکھنے والے اور بنوحارثہ کے حلیف ابوبردہ بن نیار 3 نہیر بن ہیثم رضی اللہ عنہم۔

بنوعمرو بن عوف بن مالک: اس قبیلے کے پانچ افراد نے شرکت کی: 1 سعد بن خیثمہ 2 رفاعہ بن عبدالمنذر 3 عبداللہ بن جبیر 4 معن بن عدی بن جد، ان کا تعلق بنوبلی سے تھا لیکن وہ اس قبیلے کے حلیف تھے۔ 5 عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہم۔

خزرجی شرکاء کے اسمائے گرامی

بنونجار: اس قبیلے کے گیارہ آدمیوں نے شرکت کی: 1 ابوایوب انصاری خالد بن زید بن کلیب 2 معاذ بن حارث بن رفاعہ 3 ان کے بھائی عوف بن حارث 4 ان کے بھائی معوذ بن حارث 5 عمارہ بن حزم بن زید 6 ابوامامہ اسعد بن زرارہ 7 سہل بن عتیک 8 اوس بن ثابت بن منذر 9 ابوطلحہ زید بن سہل 10 قیس بن ابوصعصعہ 11 عمرو بن غزیہ بن عمرو رضی اللہ عنہم۔

بنوحارث بن خزرج: اس قبیلے کے سات افراد نے شرکت کی: 1 سعد بن ربیع 2 خارجہ بن زید بن ابوزہیر 3 عبداللہ بن رواحہ 4 بشیر بن سعد بن ثعلبہ 5 عبداللہ بن زید بن ثعلبہ 6 خلاد بن سوید بن ثعلبہ 7 عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ رضی اللہ عنہم۔

بنو بیاضہ بن عامر: ان کے تین افراد بیعت میں شریک ہوئے: 1 زیاد بن لبید بن ثعلبہ 2 فروہ بن عمرو بن وذفہ 3 خالد بن قیس بن مالک رضی اللہ عنہم۔

بنوسلمہ بن سعد: ان میں سے یہ گیارہ افراد حاضر ہوئے: 1 براء بن معرور 2 بشر بن براء بن معرور 3 سنان بن صیفی بن صخرہ 4 مسعود بن زید بن سبیع 5 یزید بن حرام بن سبیع 6 جبار بن صخر بن امیہ 7 طفیل بن نعمان بن خنساء

8 معقل بن منذر بن سرح 9 یزید بن منذر بن سرح 10 ضحاک بن حارثہ بن زید 11 طفیل بن مالک بن خنساء رضی اللہ عنہم۔

بنوسواد بن غنم: اس قبیلے کے صرف ایک صاحب شریک بیعت تھے۔ ان کا اسم گرامی کعب بن مالک بن ابوکعب رضی اللہ عنہ ہے۔

بنوغنم بن سواد: اس قبیلے کے پانچ افراد شریک ہوئے: 1 سلیم بن عمرو بن حدیدہ 2 قطبہ بن عامر بن حدیدہ 3 یزید بن عامر بن حدیدہ 4 ابوالیسر کعب بن عمرو 5 صیفی بن سواد بن عباد رضی اللہ عنہم۔

بنونابی بن عمرو بن سواد: اس قبیلے سے بھی پانچ اشخاص نے شرکت کی: 1 ثعلبہ بن غنمہ بن عدی 2 عمرو بن غنمہ بن عدی 3 عیسیٰ بن عامر بن عدی 4 قبیلہ قضاعہ سے تعلق رکھنے والے بنونابی کے حلیف عبداللہ بن انیس 5 خالد بن عمرو بن عدی رضی اللہ عنہم۔

بنوحرام بن کعب بن غنم: ان کے سات افراد شریک ہوئے: 1 عبداللہ بن عمرو بن حرام 2 جابر بن عبداللہ 3 معاذ بن عمرو بن جموح 4 ثابت بن جذع 5 عمیر بن حارث بن ثعلبہ 6 خدیج بن سلامہ بن اوس بن عمرو، یہ اس قبیلے کے حلیف تھے لیکن خود بنوبلی سے تعلق رکھتے تھے۔ 7 معاذ بن جبل بن عمرو بن اوس رضی اللہ عنہم۔

بنوعوف بن خزرج: ان کے چار اشخاص نے شرکت کا شرف حاصل کیا: 1 عبادہ بن صامت 2 عباس بن عبادہ بن نضلہ 3 ابوعبدالرحمٰن یزید بن ثعلبہ بن حزمہ 4 عمرو بن حارث بن لبدہ بن عمرو رضی اللہ عنہم۔

بنوسالم بن غنم بن عوف: اس قبیلے کے دو افراد شریک ہوئے: 1 رفاعہ بن عمرو بن زید 2 بنوغطفان سے تعلق رکھنے والے بنوسالم کے حلیف عقبہ بن وہب بن کلدہ رضی اللہ عنہما۔

بنوساعدہ بن کعب بن خزرج: اس قبیلے سے بھی دو افراد شریک ہوئے: 1 سعد بن عبادہ 2 منذر بن عمرو بن خنیس رضی اللہ عنہما۔

شریکِ معاہدہ خواتین: اس بیعت میں شرکت کرنے والی دو عورتیں بھی تھیں جو قبیلہ خزرج ہی سے تھیں: 1 ام منیع اسماء بنت عمرو بن عدی، ان کا تعلق بنوسلمہ سے تھا۔ 2 ام عمارہ نسیبہ بنت کعب بن عمرو رضی اللہ عنہما۔[1]

ام عمارہ کے بیٹے کی استقامت وشہادت

ام عمارہ نسیبہ بنت کعب کے حوالے سے علامہ حلبی لکھتے ہیں کہ ان کے خاوند (زید بن عاصم بن عمرو مازنی) جب

[1] موسوعة الغزوات الكبرىٰ لباشميل :1/42-46، السيرة لابن هشام :2/454-467.

بھی جہاد کے سفر پر نکلتے تھے، یہ شیر دل خاتون التزاماً اپنے دونوں بچوں حبیب اور عبداللہ کو ساتھ لے کر اُن کے ہمراہ جہاد کے لیے جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ ان کے بیٹے حبیب کو رسول اللہ ﷺ نے اپنا قاصد بنا کر مسیلمہ کذاب کی طرف یمامہ روانہ کیا۔ مسیلمہ کذاب نے انھیں گرفتار کر لیا اور ان پر ہولناک تشدد کیا، وہ ان سے پوچھتا: أَتَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ؟ ''کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں؟'' تو یہ ہاں میں جواب دیتے۔ پھر وہ پوچھتا: أَتَشْهَدُ أَنِّي رَسُولُ اللّٰهِ؟ ''کیا تم یہ گواہی بھی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟'' آپ فوراً ڈٹ کر جواب دیتے کہ نہیں ہرگز نہیں۔ ہر مرتبہ جب بھی حبیب اس کذاب کی جعلی نبوت کا انکار کرتے، وہ ظالم ان کا ایک عضو کاٹ دیتا تھا۔ وہ یہ دونوں سوال بار بار پوچھتا رہا اور آپ اسی طرح پوری استقامت سے جواب دیتے رہے اور اپنا ایک ایک عضو مسلسل کٹواتے رہے حتی کہ وہ یہ ہولناک سفاکی برداشت کرتے کرتے بڑی پامردی سے جامِ شہادت نوش کر گئے۔ انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی باطل کے سامنے سر جھکانا گوارا نہ کیا۔[1]

بیعت عقبہ کے عظیم الشان نتائج

اس بیعت کے چند نتائج تو فوری طور پر مرتب ہوئے اور کچھ بعد میں ظاہر ہوئے۔ فوری نتائج یہ تھے:

- انصار اچھی طرح سمجھ گئے کہ رسول اللہ ﷺ کی حمایت کا واضح مطلب یہ ہے کہ اب انھیں نبی کریم ﷺ کے دشمنوں، مشرکین اور یہود کی عداوت اور نتیجتاً لازمی طور پر اُن سے جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا، یعنی اللہ کے راستے میں جہاد کرنا ہوگا۔ ہر چند بیعت کی شرطوں میں اس امر کی کوئی صراحت نہیں تھی لیکن مذاکرات کرنے والوں کی بات سے یہ حقیقت بالکل عیاں تھی، مثلاً: حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے صاف کہا تھا: اے اللہ کے رسول! ہم سے بیعت لے لیجیے، اللہ کی قسم! ہم نے جنگوں کا دودھ پیا ہے اور ہم ہتھیار چلانے کے ماہر ہیں۔
ابوالہیثم رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: بلاشبہ ہمارے اور یہودیوں کے درمیان کچھ معاہدے ہیں اور اب ہم انھیں توڑنے والے ہیں۔
اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے کہا: آج آپ ﷺ کو یہاں سے نکال لے جانے کا صاف مطلب یہ ہے کہ گویا ہم نے سارے عرب سے دشمنی مول لے لی اور اب تمھارے چیدہ چیدہ سردار قتل ہوں گے اور چمکتی ہوئی تلواریں تمھارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گی۔
حضرت عباس بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: اگر آپ حکم دیں تو ہم صبح سویرے ہی تلواریں سونت کر اہل منیٰ پر ٹوٹ پڑیں گے۔

---

[1] الاستیعاب، ص: 180، السیرۃ الحلبیۃ: 174/2۔

- مشرکین مکہ کا مدینہ کے مسلمانوں کا تعاقب کر کے انھیں پکڑنے کی تگ و دو کرنا اس حقیقت کی بڑی پکی دلیل ہے کہ شرک اور کفر کی ایمان اور توحید کے ساتھ دشمنی ابدی، ہمہ وقت اور ہمہ گیر ہے۔
- یہ بیعت رازداری کا سبق دیتی ہے اور یہ حقیقت ذہن نشین کراتی ہے کہ معاملات انجام دیتے وقت احتیاط کا دامن تھامے رہنا نہایت ضروری ہے، خصوصاً اس وقت جبکہ معاملہ دعوت و تبلیغ کے مستقبل سے تعلق رکھتا ہو۔
- یہ بیعت رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا سر آغاز ہے جو ایک ابدی انقلابِ عظیم کی لازوال بنیاد بن گئی۔
- مدینہ میں اسلام کو غلبہ نصیب ہوا۔ اس سے پہلے جس نے اپنے اسلام کو چھپا رکھا تھا، اب اس نے بھی سرعام اپنے دینِ قیم کا اعلان کر دیا۔
- جب کفار مکہ نے یہ سمجھ لیا کہ رسول اللہ ﷺ کے مدینہ والوں سے تعلقات ہمارے لیے خطرے کی گھنٹی ہیں تو انھوں نے مسلمانوں کا ناطقہ بند کرنے کی نت نئی کوششیں شروع کر دیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو جلد از جلد مدینہ ہجرت کر جانے کا حکم دے دیا۔
- مابعد نتائج پر غور کرنے سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہی بیعت مدینہ منورہ میں اسلامی حکومت کے قیام کی بنیاد بنی جس کے نتیجے میں اسلام کا آفتاب سرزمین مدینہ منورہ میں نصف النہار پر پہنچا اور اس کی کرنیں ساری دنیا میں پھیلتی اور کفر و شرک کی تاریکیاں مٹاتی چلی گئیں۔ اسلام اور مسلمانوں کا یہ عروج و اقبال درحقیقت اُنھی صالح اور صحت مند بیجوں کا ثمر تھا جو منیٰ کی گھاٹی میں اس بیعت کے موقع پر بو دیے گئے تھے۔
- ان فوری اور مابعد نتائج کی بنا پر اس بیعت کی اہمیت اتنی زبردست قوت سے ظاہر ہوئی کہ اس بیعت میں حصہ لینے والوں کی عظمت و فضیلت غزوۂ بدر، ہجرت حبشہ، ہجرت مدینہ اور بیعتِ رضوان میں شریک ہونے والے

حبشہ (اتھوپیا) کا دلکش منظر
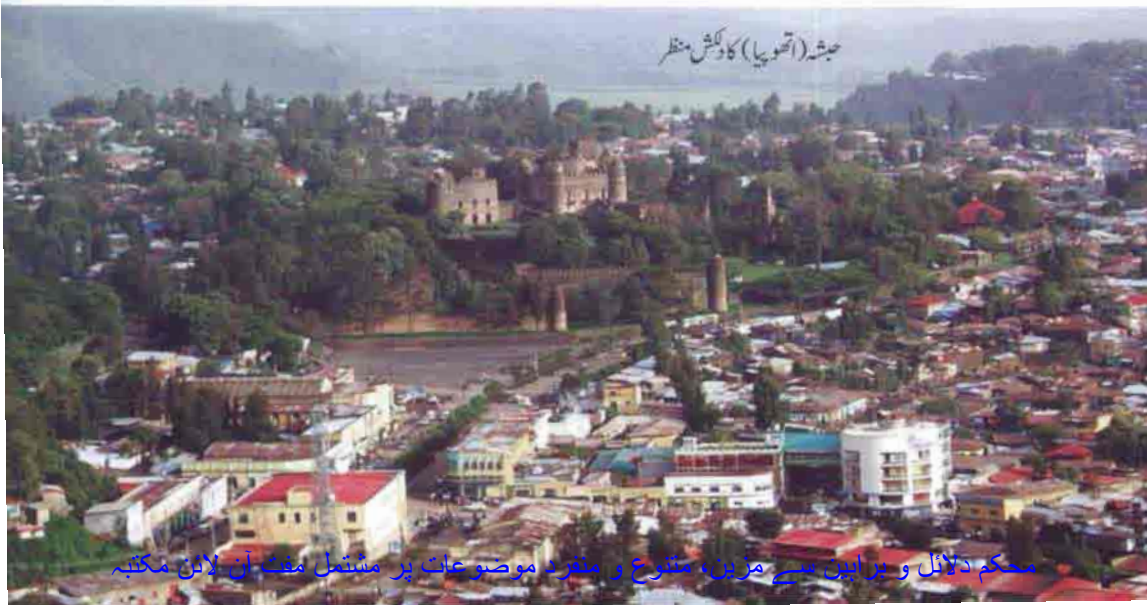
برگزیدہ صحابۂ کرام سے کسی طرح کم نہیں۔

- شیطان کی حق دشمنی اور اسلام کی سرفرازی پر اس کی بے چینی ابتدا ہی سے عیاں ہے، اس لیے وہ اسلام کے دشمنوں کو رسول اکرم ﷺ اور مدینہ منورہ کے مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ بھڑکاتا رہا۔
- بیعت عقبہ ثانیہ اسلام کے ان تمام اصول و مبادی پر مشتمل تھی جو ہجرت مدینہ کے بعد نافذ کیے گئے، مثلاً: جہاد اور دعوت اسلامیہ کا دفاع، ہر چند یہ چیز مکہ مکرمہ میں مشروع نہ تھی مگر آپ کو الہامی طور پر علم تھا کہ مستقبل قریب میں یہ حکم نافذ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عباس بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے منیٰ والوں سے لڑائی کی بات کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! ابھی ہمیں اس کی اجازت نہیں ملی۔'' اس بات پر تمام ثقہ علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ جہاد کی مشروعیت کے بارے میں سب سے پہلے یہ آیت اتری:

﴿ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴾

''وہ لوگ جن سے لڑائی کی جاتی ہے، انھیں (جہاد کی) اجازت دے دی گئی ہے، اس لیے کہ بے شک ان پر ظلم کیا گیا اور یقیناً اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔''[1]

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو ہجرت پر مجبور کیے جانے پر اظہار ناپسندیدگی کرتے ہوئے کہا: افسوس! قریش نے اپنے نبیِ کریم ﷺ کو مکہ سے نکال دیا۔ اب یہ لوگ یقیناً تباہ و برباد ہوں گے۔ پھر جب یہ آیت اتری تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مجھے تو پہلے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ اب جنگ کا بگل بجے گا۔''[2]

- یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی ہی رحمت و شفقت تھی کہ رب ذوالجلال نے یہ چاہا کہ جب تک مسلمانوں کو ایسا دارالاسلام مہیا نہ ہو جائے جو ان کے لیے مضبوط اور محفوظ پناہ گاہ کا کام دے، ان پر فریضۂ جہاد عائد نہ کیا جائے۔ مسلمانوں کے لیے مدینہ منورہ سب سے پہلا ''دارالاسلام'' تھا۔ مزید برآں یہ کہ ان کی اتنی مؤثر تربیت ہو جائے کہ ان کے پائے ثبات کو کوئی بڑے سے بڑا طوفان بھی نہ ہلا سکے اور وہ پوری طرح ڈٹ کر جہاد کرنے کے قابل ہو جائیں۔[3]

[1] الحج 39:22. [2] جامع الترمذي: 3171. [3] السيرة النبوية للمهدي: 1/299-301، من معين السيرة للشامي، ص: 150-152، فقه السيرة للبوطي، ص: 125,12.

ایمانی جذبوں سے لبریز بیعت

عقبہ کی یہی دوسری بیعت ہے جسے بیعت عقبہ کبریٰ کہا جاتا ہے۔ یہ بیعت ایسی فضا میں ہوئی جو محبت و وفاداری، منتشر اہلِ ایمان کے مابین تعاون، باہمی اعتماد، قربانی و جاں سپاری اور شجاعت و سخاوت کی شمیم و شبنم سے معطر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یثربی اہلِ ایمان کے دل اپنے کمزور مکی بھائیوں کی شفقت و محبت سے لبریز تھے۔ ان کے سینوں میں ان بھائیوں کی حمایت کا جوش موجزن تھا۔ وہ ان پر ظلم کرنے والوں کے خلاف غم و غصہ سے لبریز تھے۔ ان کے سینے اپنے ان بھائیوں کی محبت سے سرشار تھے جنھیں دیکھے بغیر ہی وہ محض لِلّٰہ فِي اللّٰہ اپنا بھائی قرار دے چکے تھے۔

یہ جذبات و احساسات کسی ایسی عارضی یا فوری کشش کا نتیجہ نہ تھے جو وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہے بلکہ اس کا منبع ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالکتاب تھا، یعنی وہ ناقابلِ تسخیر ایمان جو ظلم و عدوان کی بڑی

بن غازی (لیبیا) میں مسجد سیدنا عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ

سے بڑی قوت کے سامنے بھی سرنگوں ہونا نہیں جانتا۔ وہ ایمان ایسا ایمان تھا کہ جب اس کی بادِ بہاری چلتی ہے تو صحیح عقیدے کی ڈالیوں پر حُسنِ عمل کے گلاب کھل اٹھتے ہیں۔ اسی ایمان کی بدولت مسلمانوں نے صفحاتِ زمانہ پر ایسے ایسے کارنامے ثبت کیے اور ایسے نادر آثار و نشانات چھوڑے کہ ان کی مثال سے ماضی و حال کے لیل و نہار خالی ہیں اور مستقبل بھی خالی ہی رہے گا۔[1]

عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

جب انصار حج کے بعد اسلام کی دولت سے مالا مال ہو کر مدینہ واپس آئے تو اب ان کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ انھوں نے پوری بصیرت کے ساتھ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ہم اسلام کے فروغ کے لیے جئیں گے اور اسلام ہی کی عظمت کے لیے مرمٹیں گے۔ انھوں نے ساری مصلحتوں اور ان کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھا اور خوب کھل کر علی الاعلان اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ تبلیغ دین کے ایمان افروز نتائج نکلے۔ نوجوان طبقے کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔

ابن جموح کی بت پرستی

مدینہ میں کئی ایسے بوڑھے بھی تھے جو اپنی پرانی روش پر ڈٹے ہوئے تھے۔ انھی بوڑھوں میں سے، جو بڑی سختی سے کفر و شرک پر جمے ہوئے تھے، قبیلۂ بنوسلمہ کے سردار عمرو بن جموح (رضی اللہ عنہ) بھی تھے۔ ان کا بیٹا معاذ بن عمرو اسلام کا شیدائی تھا اور بیعت عقبہ ثانیہ میں شرکت کا شرف حاصل کر چکا تھا۔ اسی کے بارے میں آتا ہے کہ اس نے فرعون هٰذه الْأُمَّة (اس امت کے فرعون) ابوجہل کو قتل کیا تھا۔ عمرو (رضی اللہ عنہ) نے دیگر اشراف کی طرح اپنے لیے نہایت قیمتی لکڑی کا بت بنوایا تھا اور ماہر کاری گر نے اس کی تراش خراش اور تزئین و آرائش میں کوئی کمی باقی نہیں چھوڑی تھی۔ عمرو اس بت پر فدا تھے۔ وہ اسے روز خوشبو میں بساتے، سنوارتے، سجاتے، صبح و شام اس کی زیارت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے مال و متاع کا بہت بڑا حصہ اسی بُت پر نچھاور کر دیا۔

دونوں معاذ اسکیم بناتے ہیں

حضرت معاذ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو اپنے باپ کی "منات" سے محبت کا علم تھا، انھوں نے اپنے گہرے دوست معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مل کر ایک منصوبہ بنایا۔ یہ دونوں بنوسلمہ کے نوجوان تھے۔ رات کو جب والد سو گئے تو یہ دونوں منصوبے

[1] الرحیق المختوم، ص: 175.

کے تحت منات کے پاس پہنچے، اسے اٹھایا، باہر لائے اور بنوسلمہ کے کنویں میں پھینک آئے۔ یہ ایک اندھا بے آباد کنواں تھا۔ قبیلہ بنوسلمہ کے لوگ اس کنویں میں غلاظت پھینکا کرتے تھے۔

عمرو (رضی اللہ عنہ) صبح سویرے اٹھے اور حسب عادت ''حصولِ تبرک'' کی غرض سے اپنے نابکار بت کی پوجا پاٹ کے لیے ''منات'' کی طرف چل دیے۔ جب انھیں اپنا معبود نظر نہ آیا تو چراغ پا ہوگئے۔ بڑے زور سے چیخنے چلانے لگے: ''تمھارا خانہ خراب! یہ آج رات ہمارے معبود کے ساتھ کس نے ظلم کیا ہے؟'' ان کے بیٹے باپ کا واویلا سن رہے تھے لیکن انھوں نے اس چیخ پکار کو کوئی اہمیت نہیں دی اور والد کے شور وغل کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

منات گندگی کے کنویں میں اوندھا پڑا تھا

عمرو اپنے پیارے بت کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ وہ غصے سے کانپ رہے تھے اور خود کلامی کرتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے، انھوں نے اپنے ''منات'' کو بہت تلاش کیا۔ دائیں بائیں دیکھا، مگر وہ نظر نہیں آیا۔ آگے بڑھے تو دیکھا ''منات'' گندگی کے کنویں میں اوندھا گرا ہوا ہے۔ انھوں نے اسے جلدی سے باہر نکالا، دھویا، خوشبو لگائی اور اسے دوبارہ اس کی مسند پر بحال کر دیا، پھر کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! اگر مجھے پتہ چل جائے کہ یہ کام کس نے کیا ہے تو میں اسے بُری طرح ذلیل و رسوا کروں گا۔''

اگلی رات جب عمرو (رضی اللہ عنہ) سو گئے تو حضرت معاذ بن عمرو اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما نے اپنے دوسرے نوجوان دوستوں سے مل کر ''منات'' کے ساتھ پھر پہلے جیسا سلوک کیا۔ عمرو صبح سویرے اپنی عادت کے مطابق پھر ''منات'' کی پوجا کرنے کے لیے اس کے کمرے میں گئے مگر ''منات'' وہاں موجود نہ تھا۔ وہ بھاگم بھاگ کنویں کی طرف گئے تو دیکھا کہ ان کا پیارا معبود ''منات'' گندگی کے ڈھیر سے اٹا پڑا ہے۔ انھوں نے اسے گندگی کے ڈھیر سے نکالا، دھویا، خوشبو لگائی اور دوبارہ اس کی مقررہ جگہ پر رکھ دیا۔ یہ عمل متواتر کئی راتوں تک جاری رہا۔ عمرو (رضی اللہ عنہ) ''منات'' کو گندگی کے ڈھیر سے نکال کر لاتے، اسے غسل دیتے، خوشبو لگاتے، ایک دن انھوں نے منات کے گلے میں تلوار لٹکا دی اور کہا: اے منات! اے میرے معبود!! اللہ کی قسم! مجھے نہیں معلوم کہ تیرے ساتھ یہ سلوک کون کر رہا ہے۔ اگر تجھ میں کوئی بھلائی ہے تو دیکھ یہ تلوار تیرے پاس ہے، اب تجھے اس سے اپنا دفاع کرنا چاہیے۔

صنم کا مردہ کتے کے ساتھ لپٹنا

اگلے دن ان نوجوانوں نے نیا کام دکھایا۔ انھوں نے منات کو اٹھایا، ایک مرے ہوئے کتے کے ساتھ لپیٹا، رسی

سے باندھا، پھر اسے پھینک کر اس کے اُوپر تلوار رکھ دی۔

اگلی صبح بوڑھے عمرو اٹھے۔ سیدھے منات کے کمرے میں گئے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ چونکہ آج رات میرے ''معبود'' کے پاس بے نیام تلوار موجود تھی، اس لیے آج کسی گستاخ کو اس مسلح بت کے قریب جانے کی ہمت نہیں ہوئی ہوگی اور اگر کسی نے ازراہِ حماقت یہ جرأت کی بھی ہوگی تو اس کی لاش خون میں لت پت پڑی ہوگی۔ لیکن جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ حسب معمول اُن کا ''معبود'' غائب ہے، نہ وہاں کوئی لاش ہے، نہ کسی کے خون کا کوئی نام ونشان۔ وہ ٹپٹا کر رہ گئے۔ کنویں کی طرف بھاگے تو یہ دیکھ کر سراسیمہ ہوگئے کہ ان کا پیارا ''منات'' کتے کے ساتھ لپٹا ہوا ہے اور گندگی میں لت پت اوندھا پڑا ہے۔

معبودِ ذلیل سے معبودِ حقیقی تک

اپنے ''معبود'' کا یہ حشر دیکھ کر اب عمرو کو عقل آئی۔ ان کی آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے یک دم اٹھ گئے اور وہ بے اختیار پکار اٹھے:

وَاللّٰهِ! لَوْ كُنْتَ إِلٰهًا لَمْ تَكُنْ أَنْتَ وَكَلْبٌ وَسْطَ بِئْرٍ فِي قَرَنْ

''اللہ کی قسم! اگر تو واقعی معبود ہوتا تو تُو اور یہ کتا اس گندے کنویں میں کبھی اکٹھے نہ ہوتے۔''

أُفٍّ لِمَلْقَاكَ إِلٰهًا مُسْتَدَنْ اَلْآنَ فَتَّشْنَاكَ عَنْ سُوءِ الْغَبَنْ

''تمھاری اس ذلت آمیز ملاقات پر صد حیف! اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تیرے بارے میں ہم دھوکے میں مبتلا رہے۔''

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ ذِي الْمِنَنْ اَلْوَاهِبِ الرَّزَّاقِ دَيَّانِ الدِّيَنْ

''سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو بلند ہے اور احسان فرمانے والا ہے۔ وہی عطا کرتا ہے، وہی رازق بھی ہے اور وہی تمام اہل دین کو جزا دینے والا ہے۔''

هُوَ الَّذِي أَنْقَذَنِي مِنْ قَبْلِ أَنْ أَكُونَ فِي ظُلْمَةِ قَبْرٍ مُرْتَهَنْ

''وہی ذاتِ عالی ہے جس نے مجھے یہ نوبت آنے سے پہلے ہی بچالیا کہ میں قبر کے اندھیروں میں رہن رکھ دیا جاتا۔''

اپنے ''منات'' کا انجام دیکھ کر اب عمرو رضی اللہ عنہ غفلت کی نیند سے بیدار ہو چکے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اصل حقیقت جلوہ گر ہو چکی تھی۔ چنانچہ انھوں نے دیر نہیں لگائی۔ فوراً کلمۂ طیبہ پڑھا اور اسلام قبول کر لیا۔[1]

[1] السيرة لابن هشام 2/453,452، الاستيعاب، ص :565، أسد الغابة :3/361,360، سير أعلام النبلاء :1/253-255.

باب 3

سیرت انسائیکلوپیڈیا

ہجرت کے وقت مدینہ کے حالات و آثار

ہجرتِ نبوی سے پہلے یثرب میں آباد قبائل کے
باہمی تعلقات اور دینی وتمدنی احوال

”اور اگر وہ آپ کو دھوکا دینا چاہیں تو بے شک آپ کے لیے اللہ کافی ہے، وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے آپ کی تائید کی۔“ (الأنفال 62:8)

اس باب میں

رسالت مآب ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کو مختلف خیالات و نظریات کی قبائلی بستیاں نظر آئیں ۔ ہر قبیلے کے اپنے اپنے جدا گانہ رنگ ڈھنگ تھے۔ شہری زندگی جیسی کوئی تنظیم نہیں تھی۔ کوئی قانون نہیں تھا۔ کوئی ضابطہ نہیں تھا۔ یہاں اوس و خزرج کے قبیلے رہتے تھے۔ عیسائیوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت بھی مقیم تھی اور یہودیوں کے بہت سے چھوٹے بڑے گڑھ بھی موجود تھے۔ یہودیوں نے اپنے سودی دھندے کے جال میں مدینہ کے بہت سے لوگوں کو پھانس رکھا تھا۔ باشندگان مدینہ کی اکثریت کھجوروں کی کاشت پر گزران کرتی تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد یہودیوں نے میثاق مدینہ کے تحت رسول اللہ ﷺ سے مدینہ کے تحفظ و دفاع کے سلسلے میں قول و قرار کرلیا۔ لیکن درحقیقت یہ بدباطن لوگ تھے۔ اسلام اور مسلمانوں سے ہمیشہ خار کھاتے رہے۔ ان کے علاوہ خود مسلمانوں کی صف میں منافق بھی موجود تھے۔ ان کا سرغنہ عبد اللہ بن ابی تھا۔ یہ خزرج قبیلے کا سردار تھا۔ اہل خزرج اسے اپنا بادشاہ بنانے پر راضی ہوگئے تھے۔ لیکن رسالت مآب ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اس شخص کے تخت و تاج کا خواب بکھر گیا۔ یوں یہ شخص باطنی طور پر آپ ﷺ کے خلاف ہوگیا۔ پھر اس شخص نے جو فتنے پھیلائے، وہ تاریخ کا حصہ بن گئے۔ اس باب میں یہ تمام واقعات اور تاریخی تفصیلات مستند حوالوں کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔

ہجرت کے وقت مدینہ کے احوال

شہر یثرب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کا دارالہجرت بنایا، اسلام کی عالمی دعوت کا مرکز ٹھہرایا اور ظہورِ اسلام کے بعد اس قریۂ جمال کو اولین اسلامی معاشرے کا گہوارہ بننے کا شرف عطا کیا۔ اس حسنِ انقلاب کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ہمیں یثرب کی تمدنی، معاشرتی، اقتصادی اور دینی و ثقافتی صورتِ حال، قبائل کے باہمی تعلقات، مقامی یہودیوں کی معاشرتی، اقتصادی اور جنگی اہمیت اور اس زرخیز شہر کے معیار زندگی کو سمجھنا ہوگا۔ اس شہر میں متعدد مذاہب، ثقافتیں اور جداگانہ تہذیبی رویے بیک وقت دوش بدوش پنپ رہے تھے۔

یثرب کی بڑی آبادی دو گروہوں پر مشتمل تھی۔ ایک گروہ اوس اور خزرج کے قبیلوں پر مشتمل تھا اور دوسرا گروہ یہودیوں کا تھا جس کے تین نمایاں قبیلے تھے جو بنوقریظہ، بنونضیر اور بنوقینقاع کے نام سے موسوم تھے۔

یثرب کے یہودی

سن 70ء میں جب یہودی بغاوت کے نتیجے میں رومیوں کے ہاتھوں فلسطین اور بیت المقدس کے علاقے تاراج ہوگئے اور یہود دنیا کے مختلف علاقوں میں بکھر گئے تو ان کی بہت سی جماعتوں نے بلادِ عرب کا رخ کیا جیسا کہ یہودی مؤرخ جوزیفس نے لکھا ہے۔ وہ خود بھی اس جنگ میں شریک تھا اور بعض مواقع پر اس نے یہودی

مسجد نبوی (ایک عہد کی تصویر)
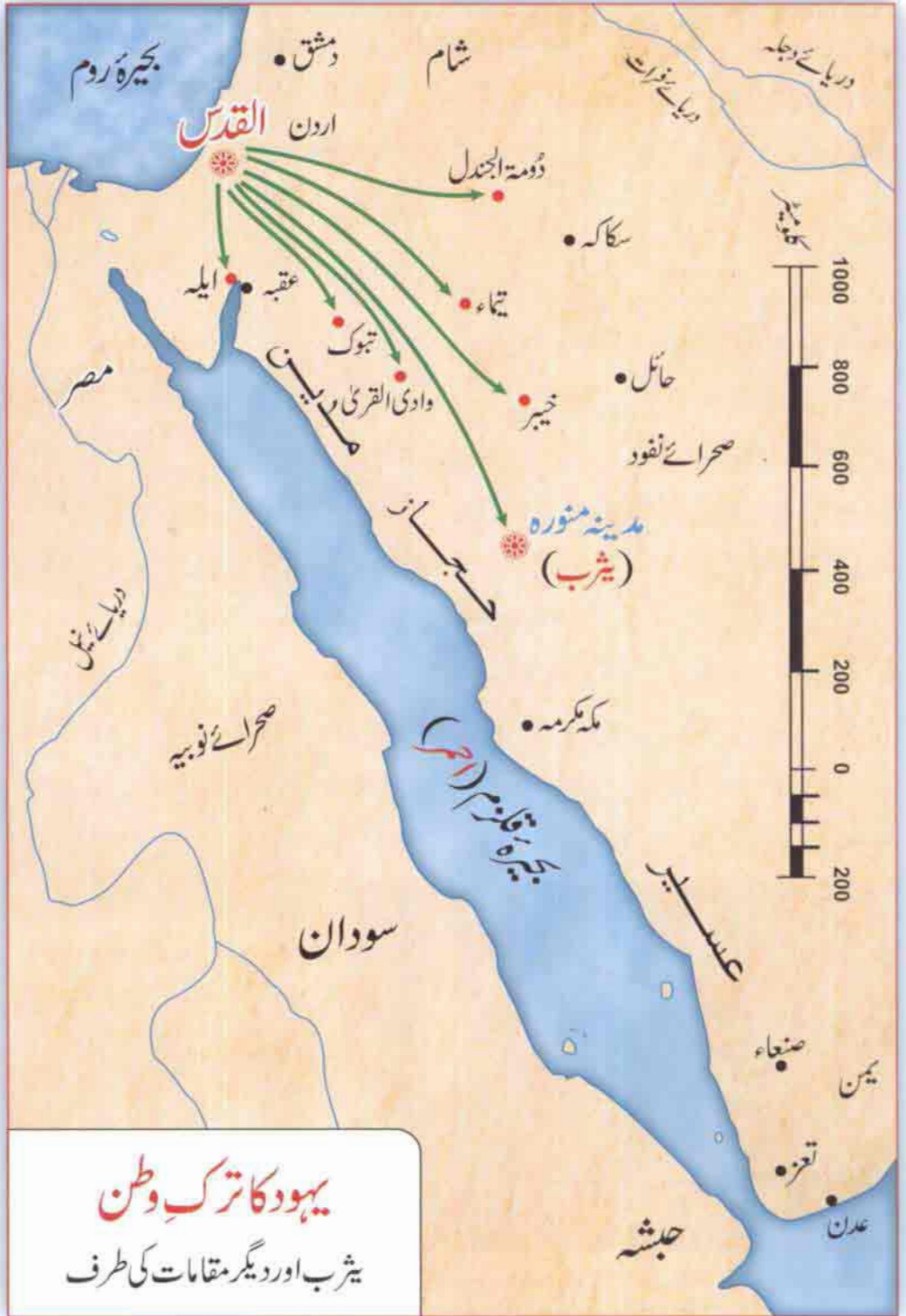
بحیرۂ روم
دمشق
شام
القدس
اردن
دریائے دجلہ
دریائے فرات
دومۃ الجندل
سکاکہ
ایلہ
عقبہ
تیماء
تبوک
مدین
وادی القریٰ
حائل
خیبر
مصر
صحرائے نفود
حجاز
مدینہ منورہ
(یثرب)
دریائے نیل
مکہ مکرمہ
صحرائے نوبیہ
بحیرۂ قلزم (احمر)
عسیر
سوڈان
صنعاء
یمن
تعز
عدن
حبشہ
1000
800
600
400
200
0
200
یہود کا ترکِ وطن
یثرب اور دیگر مقامات کی طرف

دستوں (Units) کی قیادت بھی کی تھی، نیز عربی مآخذ بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں۔[1]

اس کے علاوہ یہودیوں کی ایک اور بڑی تعداد اس وقت حجاز پہنچی جب 132 اور 135ء کے دوران میں رومیوں کے خلاف ان کی ایک اور بغاوت ناکام ہوگئی اور قیصر ہیڈرین نے یہود کی جلاوطنی کا حکم صادر کیا۔ ان مختلف گروہوں نے مل کر مدینہ اور حجاز میں ایک قوم کی شکل اختیار کرلی۔[2]

یثرب میں یہودیوں کے آباد ہونے کے اسباب

یہودیوں کے معروف قبائل بنونضیر اور بنوقریظہ یثرب آکر آباد ہوگئے۔ ان کے یہاں آنے کی دو وجوہ تھیں: ایک تو اس شہر کی زرخیز زمین نے انھیں اپنی طرف مائل کیا۔ دوسری بڑی کشش جو انھیں یہاں کھینچ لائی، وہ یثرب کی تجارتی شاہراہ تھی جو شام کی طرف جاتی تھی۔ ان قبائل نے شہر کے مشرقی جانب حرہ واقم کے پاس سکونت اختیار کی جو یثرب کا سب سے زیادہ زرخیز علاقہ تھا۔[3] یہودیوں کا ایک اور مشہور قبیلہ بنوقینقاع تھا جس کی اصلیت کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ یہ لوگ باہر سے حجاز آنے والے یہودی تھے یا وہ عرب تھے جنھوں نے یہودی مذہب قبول کرلیا تھا؟ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

بنوقینقاع، بنونضیر اور بنوقریظہ بڑے قبیلے تھے۔ ان کے ماتحت کچھ شاخیں بھی تھیں جیسا کہ بنو ہدل بنی قریظہ کے تابع تھے۔ ان میں سے بعض نے شرف صحابیت حاصل کیا، اسی طرح بنو زنباع بھی بنی قریظہ کی شاخ تھی۔ دیگر عرب قبائل جیسے بنوقصیص، بنو ناغصہ، بنومرید، بنومعاویہ، بنو ماسکہ، بنو مُحَمَّم (مُحَمَّر)، بنوزعوراء، بنو زید اللات، بنوحجر، بنوثعلبہ، بنوشطیبہ، بنوعکرمہ، بنومرایہ اور بنوعوف کے بہت سے لوگ بھی یہودیت کے پیروکار تھے۔ اسی لیے سمہودی کا کہنا ہے کہ یہود کے قبیلے بیس سے زیادہ تھے۔ ان یہودی قبائل کے بالغوں کی تعداد، جو لڑائی اور جنگوں میں حصہ لے سکتے تھے،

جہاں بنونضیر رہتے تھے

[1] نبی رحمت ﷺ، ص: 222. [2] مدنی معاشرہ، ص: 67. [3] مکة والمدینة في الجاهلیة وعهد الرسول ﷺ، ص: 240 و 246.

دو ہزار سے اوپر تھی۔ بنو قینقاع کے لڑنے والوں کی تعداد اندازاً 700 تھی۔ بنو نضیر کے جنگجو بھی اتنے ہی تھے جبکہ بنو قریظہ کے بالغوں کی تعداد سات سو اور نو سو کے درمیان تھی۔ [1]

یہود کا باہمی تعلق

یہود مدینہ کے مختلف محلوں میں رہتے تھے۔ یہ محلے انھی کے لیے مخصوص تھے۔ یہود کی چھوٹی چھوٹی شاخیں ان کے پڑوس میں یا مدینہ کے عربوں کے پڑوس میں رہتی تھیں۔ یہودیوں نے قلعے اور گڑھیاں بنا رکھی تھیں جو ان کی قوت کا باعث تھیں اور ان کے دفاع کا کام دیتی تھیں۔ سمہودی نے ان کے انسٹھ (69) قلعوں اور گڑھیوں کا ذکر کیا ہے۔ [2]

یہ لوگ یثرب میں رس بس تو گئے لیکن انھیں یہودی حکومت بنانے کا موقع نہیں ملا۔ وہ قبائلی سرداروں کی حمایت و حفاظت کے سائے میں بڑے چین سے رہتے تھے۔ اس حمایت کے بدلے وہ سردارانِ قبائل کو سالانہ محصول (ٹیکس) ادا کرتے تھے۔ اس طرح وہ بدوؤں کے حملوں سے بھی محفوظ رہتے تھے۔ یہودی اپنے تحفظ کی تدابیر میں بڑے ہوشیار تھے۔ ہر یہودی سردار اَعراب (بدو) اور رؤسائے عرب میں سے کسی نہ کسی کو اپنا حلیف ضرور بنائے رکھتا تھا۔ [3] ایک طرف تو یہ اپنے دفاع کے لیے اتنے حساس تھے مگر دوسری طرف یہ آپس میں لڑتے بھی رہتے تھے۔

بنی قینقاع اور یہودِ مدینہ میں دیرینہ عداوت چلی آتی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بنی قینقاع بنی خزرج کے ساتھ یوم بُعاث میں

وادی الشعراء (بلاد الزہران) میں بنو سلیم کی بستی

قلعہ عروہ بن زبیر کے آثار

قلعہ موسیٰ بن نصیر

قلعہ کعب بن اشرف

[1] وفاء الوفا: 165/1، مكة والمدينة في الجاهلية و عهد الرسول ﷺ، ص: 245. [2] مكة والمدينة في الجاهلية وعهد الرسول ﷺ، ص: 245، وفاء الوفا: 165/1. [3] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 516/6.

شریک تھے۔ اور بنی نضیر اور بنی قریظہ نے بنی قینقاع کا بڑی سفاکی سے کشت وخون کیا تھا، اور اُن کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا، چنانچہ یوم بعاث کے بعد یہودی قبائل میں مسلسل باہمی عداوت چلی آ رہی تھی، جب قینقاع اور انصار کے درمیان جنگ ہوئی تو انصار کے مقابلے میں ان کا کسی یہودی نے ساتھ نہیں دیا۔

یہود کے تینوں قبائل بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قینقاع کے باہمی تعلقات کشیدہ رہتے تھے اور ان میں کبھی لڑائیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ قرآن مجید نے یہود کی باہمی عداوت کی طرف ان مقدس الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ﴾

''(اے بنی اسرائیل!) جب ہم نے تم سے وعدہ لیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہ اپنے لوگوں کو اپنے وطن سے نکالو گے، پھر تم نے اقرار کیا اور تم (اس بات کے) گواہ ہو۔ پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنوں میں سے ایک فریق کو ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو۔ تم ان کے خلاف گناہ اور زیادتی کے (حربوں کے) ساتھ دوسروں کی مدد کرتے ہو۔ اور اگر وہ تمھارے پاس قیدی ہو کر آئیں تو تم انھیں فدیہ دے کر چھڑاتے ہو، حالانکہ تم پر ان کا نکال دینا ہی حرام کر دیا گیا تھا۔'' [1]

بنو نضیر اور بنو قریظہ نے بنو قینقاع کو مدینہ کے نواحی محلے سے بھگا دیا، چنانچہ وہ شہر کے اندر ایک خاص محلے میں رہنے لگے۔ بنو نضیر مدینہ سے دو تین میل کی دوری پر وادی بطحان کی بلندی پر رہتے تھے۔ یہ وادی کھجور کے شاداب درختوں سے اٹی ہوئی تھی اور لہلہاتے ہوئے سرسبز کھیت یہاں دور تک اپنی بہار دکھاتے تھے۔ بنو قریظہ مدینہ کے جنوب میں چند میل کے فاصلے پر واقع مہروز کے علاقے میں رہتے تھے۔ [2]

[1] البقرة 2:84، 85. [2] بنو إسرائيل في القرآن والسنة، ص: 77.

کھجوروں کے شاداب درخت

یہود کی مذہبی اور اخلاقی حالت

یہود اپنے آپ کو ایک مستقل آسمانی شریعت کا حامل سمجھتے تھے۔ وہ اپنے مدرسوں میں، جنھیں وہ مِدراس کہتے تھے، اپنے دینی اور دنیوی امور، اپنے مخصوص شرعی قواعد وضوابط، تاریخ اور اپنے انبیاء اور رسولوں کے حالات پڑھتے پڑھاتے تھے۔ اسی طرح وہ اپنی مخصوص عبادت گاہوں میں عبادت بھی کرتے تھے اور اپنے مذہبی شعائر بھی انجام دیتے تھے...... یہودی اپنے مخصوص دینی قوانین پر عمل کرتے تھے۔ ان قوانین میں سے کچھ انھوں نے اپنی کتابوں سے اخذ کیے تھے اور کچھ ان کے کاہنوں اور عالموں نے اپنی طرف سے گھڑ لیے تھے۔ اسی طرح وہ اپنی عیدیں بھی الگ مناتے تھے اور کچھ خاص دنوں میں روزے بھی رکھتے تھے۔ یومِ عاشوراء کا روزہ رکھنا بھی ان کا معمول تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودِ مدینہ کا اپنے اصل دین اور اپنی کتابوں کی تعلیمات سے تعلق بہت کمزور ہو گیا تھا۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنے ہمسایہ عربوں ہی کی طرح ہو گئے تھے اور اخلاقی پستی کی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ وہ اپنی حاجت روائی کے لیے سفلی اعمال کرتے تھے۔ جادو ٹونہ بھی کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے مخالفین سے چھٹکارا پانے کے لیے کھانے میں زہر بھی ملا دیتے تھے۔ طنز و تعریض کے تیر برساتے تھے اور دھوکے میں ڈالنے والے ذو معنی کلمات بول کر خوش ہونا ان کی عادت ثانیہ بن گئی تھی۔

یہودیوں کے جادو ٹونے کے بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے:

﴿وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ .....﴾

"اور انھوں نے اس کی پیروی کی جسے شیاطین سلیمان کی سلطنت میں پڑھتے تھے......" [1]

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ یہود کا یہ شغف عہد رسالت میں بھی باقی تھا۔ یہودی مستشرق مارگولیتھ لکھتا ہے: "مدینہ کے یہود فن سحر میں بڑے ماہر تھے۔ وہ علانیہ جنگ اور مردانہ وار صف آرائی پر کالے کرتب (جادو) کو ترجیح دیتے تھے۔"

قلعہ خیبر کے آثار

غزوۂ خیبر کے موقع پر یہود کی طرف سے نبی ﷺ کو بکری کا زہر آلود گوشت پیش کیا گیا۔ اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے آپ ﷺ محفوظ رہے لیکن بشر بن براء بن معرور رضی اللہ عنہ یہی زہر آلود گوشت کھانے کے باعث شہید

[1] البقرۃ 102:2.

ہو گئے۔[1]

امام بخاری نے عروہ کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے جس میں وہ یہود کی ذو معنی گفتگو کے حوالے سے فرماتی ہیں: یہود آنحضرت ﷺ کو سلام کرتے وقت اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ کہتے تھے اور السام سے مراد موت لیتے تھے۔[2]

اسی مذموم رویے کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللَّهُ﴾

''اور وہ (یہود) جب آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو ایسے لفظ سے سلام کہتے ہیں جس سے اللہ نے آپ کو سلام نہیں کہا۔''[3]

غرضیکہ یہود ایسی اخلاقی پستی میں گرے ہوئے تھے جس کی کسی مہذب اور آسمانی تعلیمات کے علمبردار معاشرے سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس سلسلے میں اس عرب عورت کا واقعہ یہود کی اخلاقی پستی کی بڑی گھناؤنی مثال ہے جو بنو قینقاع کے بازار میں اپنا سامان فروخت کر کے کسی کام سے ایک یہودی کاریگر کے پاس جا بیٹھی۔ اس یہودی کاریگر نے اس سے چہرے کا نقاب اتارنے کے لیے اصرار کیا۔ اس غیور مسلمان خاتون سے حرفِ انکار سن کر اس بدبخت کاریگر نے اس خاتون کے کپڑے کا ایک کنارہ پشت سے باندھ دیا۔ جب یہ خاتون کھڑی ہوئی تو اس کا کپڑا اگر پڑا اور وہ بے پردہ ہوگئی۔ اس کی بے پردگی پر سب یہودی ہنس پڑے۔ عورت فرطِ حیا سے چیخ اٹھی۔ یہ الم انگیز چیخ ایک مسلمان نے سنی تو اس نے لپک کر اپنی شمشیرِ جوہر دار سے اس نابکار یہودی کاریگر کا کام تمام کر دیا۔ بعد ازاں یہود نے اس مسلمان کو شہید کر دیا۔[4]

یہود کا اقتصادی غلبہ

دوسری قوموں سے یہود کے بیشتر مالی معاملات رہن (گروی) اور سود کی بنیاد پر قائم تھے۔ مدینہ جیسے زرعی علاقے میں انھیں حصولِ زر کا سنہرا موقع بھی حاصل تھا کیونکہ کسانوں کو کھیتی کی کاشت کے موقع پر اکثر قرض کی ضرورت پیش آتی تھی۔[5]

یہودیوں میں رہن کا رواج صرف زر و مال تک ہی محدود نہ تھا بلکہ غریبوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ

[1] صحيح البخاري: 4249، سنن أبي داود: 4512،4511. [2] صحيح البخاري: 6024، تفسير القرطبي، المجادلة 8:58، تحفة الأحوذي: 159/9. [3] المجادلة 8:58. [4] السيرة لابن هشام: 51/3. [5] بنو إسرائيل في القرآن و السنة، ص: 81،80.

قلعہ کعب بن اشرف کے آثار

ان کی عورتیں اور بچے بھی رہن رکھ لیتے تھے۔ اس ضمن میں کعب بن اشرف کے قتل کے واقعے پر امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل کی ہے:

''محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کعب سے کہا: ہم چاہتے ہیں کہ تم ایک یا دو وسق غلہ ہمیں قرض دے دو۔ اس نے کہا: میں آپ کو غلہ دے دوں گا لیکن شرط یہ ہے تم میرے پاس کچھ رہن رکھو۔ انھوں نے پوچھا: تم کیا چیز رہن رکھنا چاہتے ہو؟ کعب نے کہا: آپ میرے پاس اپنی عورتوں کو بطور رہن رکھ دیں۔ انھوں نے کہا: ہم اپنی عورتوں کو تمھارے پاس کیسے رہن رکھ دیں جبکہ تم عربوں میں خوبصورت ترین انسان ہو۔ اس نے کہا: عورتیں نہیں رکھ سکتے تو اپنے بیٹوں کو رہن رکھ دو۔ یہ سن کر انھوں نے کہا: ہم تمھارے پاس اپنے بیٹوں کو کیسے رہن رکھ دیں کیونکہ بعد میں انھیں طعنہ دیا جائے گا کہ تم ایک یا دو وسق کے عوض رہن رکھے گئے تھے۔ یہ ہمارے لیے بڑی شرم کی بات ہوگی، ہاں! البتہ ہم تمھارے پاس اپنے ہتھیار رہن رکھ سکتے ہیں۔'' [1]

مدینہ کی اقتصادیات پر یہودیوں کے اس تسلط کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا معاشی غلبہ بہت بڑھ گیا اور وہ منڈیوں میں من مانی کرنے لگے۔ وہ اپنی مصلحت و منفعت کے تحت مصنوعی قلت پیدا کر کے چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کے ذریعے سے بھاری رقم کمانے لگے، اس لیے مدینہ کے باشندوں کی اکثریت ان کی دھاندلی، حد سے زیادہ سود خوری اور نفع اندوزی کی وجہ سے ان سے نفرت کرنے لگی۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ عام عرب یہودیوں سے دور دور رہنے لگے۔ [2]

ان کی حرص، ہوسِ زر اور توسیع پسندی کے پیش نظر ڈی لیسی اولیئری (De Lacy O'Leary) نے اپنی

[1] صحيح البخاري: 4037، [2] بنو إسرائيل في القرآن والسنة، ص: 79.
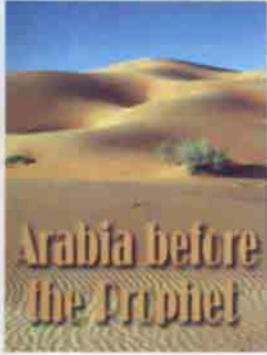
کتاب ''Arabia before Mohammad'' میں لکھا ہے:

''اصل بدوی باشندوں اور نوآباد یہودیوں کے باہمی تعلقات ساتویں صدی عیسوی میں بہت خراب ہوگئے تھے کیونکہ یہودیوں نے اپنی کاشت کے علاقے بدوؤں کی چراگاہوں تک وسیع کر لیے تھے۔''[1]

یہودیوں کی دینی وسماجی حالت

بلادِ عرب کے یہود کی زبان قدرتی طور پر عربی ہی تھی لیکن وہ خالص نہیں رہ گئی تھی بلکہ اس میں عبرانی کی آمیزش بھی ہوگئی تھی۔ انھوں نے عبرانی کا استعمال پوری طرح نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اپنی عبادتوں اور تعلیمی امور میں عبرانی زبان ہی بروئے کار لاتے تھے۔[2]

یہود دعوتِ دین سے گریز کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اسرائیل ولفنسن لکھتے ہیں: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ یہود کو عرب میں اپنا دینی اقتدار وسیع کرنے کے بھرپور وسائل میسر تھے اور وہ اگر چاہتے تو حاصل شدہ اقتدار سے کہیں زیادہ اثر ونفوذ پیدا کر سکتے تھے لیکن تاریخ یہود جاننے والا ہر شخص جانتا ہے کہ انھوں نے دوسری قوموں کو اپنا دین قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں کیا اور بعض وجوہ سے اشاعتِ دین ان کے لیے ممنوع رہی۔''[3]

اس کی تائید اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ مدینہ میں یہودیوں کے پڑوس میں اوس وخزرج کی آمد سے پہلے بھی عربی خاندان آباد تھے۔ یہ عربی خاندان اپنے آبائی دین پر قائم رہے۔ انھوں نے یہودیت قبول نہ کی، حالانکہ وہ یہود کے ساتھ صدیوں سے رہتے چلے آرہے تھے اور یہودی مدینہ میں صاحبِ زر اور صاحبِ اثر لوگ تھے۔[4]

یہودی بڑے بے حس تھے۔ وہ عرب کی گھناؤنی بت پرستی اور پست ترین جاہلیت دیکھ کر بھی خاموش رہتے تھے۔ انھوں نے عربوں کو اس عقیدۂ توحید کی کبھی دعوت نہیں دی جس کے وہ صدیوں سے اپنے اخلاقی انحطاط اور قومی کمزوریوں کے باوجود حامل وقائل چلے آرہے تھے۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ کسی غیر اسرائیلی فرد کو اپنے دین کی دعوت دینے کے قائل ہی نہ تھے۔ یہودیت کو نسلی دین سمجھنے کا عقیدہ ان میں راسخ ہو چکا تھا۔ ان کی راحت کوشی، آرام طلبی اور حد سے بڑھی ہوئی تجارتی و معاشی سرگرمیاں بھی اس سلسلے میں رکاوٹ تھیں، تاہم اوس وخزرج اور

[1] Arabia before Mohammad (london 1927), p: 174.

[2] مكة والمدينة في الجاهلية وعهد الرسول ﷺ، ص:251. [3] تاريخ اليهود في بلاد العرب، مكة والمدينة في الجاهلية وعهد الرسول ﷺ، ص: 248. [4] مكة والمدينة في الجاهلية و عهد الرسول، ص: 249.

دوسرے عرب قبائل کے بہت سے افراد نے یہودیت اپنی مرضی سے یا رشتہ داری یا یہودی ماحول میں پرورش پانے کے باعث اختیار کرلی تھی۔ ممتاز یہودی تاجر اور مشہور شاعر کعب بن اشرف نضری نسباً قبیلۂ طے کا ایک فرد تھا۔ اس کے باپ نے بنی نضیر میں شادی کی تھی، نتیجتاً کعب ایک پرجوش یہودی کی صورت میں پروان چڑھا۔
ابن ہشام نے لکھا ہے: ''اس کا آبائی تعلق قبیلۂ طے کی شاخ بنی نبہان سے تھا اور اس کی ماں بنی نضیر سے تھی۔''

عجیب وغریب نذر

عربوں میں رواج تھا کہ جس کا بیٹا زندہ نہیں رہتا تھا، وہ یہ نذر مانتا کہ اگر بیٹا زندہ رہا تو اسے یہودیوں کے سپرد کردے گا تاکہ وہ اسے اپنے مذہب میں شامل کرلیں، چنانچہ بہت سے عرب اس طرح بھی یہودی بن گئے تھے۔ سنن ابوداود میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے:

كَانَتِ الْمَرْأَةُ تَكُونُ مِقْلَاتًا، فَتَجْعَلُ عَلَى نَفْسِهَا إِنْ عَاشَ لَهَا وَلَدٌ أَنْ تُهَوِّدَهُ، فَلَمَّا أُجْلِيَتْ بَنُو النَّضِيرِ كَانَ فِيهِمْ مِّنْ أَبْنَاءِ الْأَنْصَارِ، فَقَالُوا: لَا نَدَعُ أَبْنَاءَنَا، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: ﴿لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (البقرة 2:256)

''عرب (اوس وخزرج) کی کسی عورت کے بچے زندہ نہ رہتے تو وہ نذر مانتی تھی کہ اگر اس کا بچہ زندہ رہا تو وہ اسے یہودی بنا دے گی۔ جب بنونضیر کو جلا وطن کیا گیا تو ان میں انصار کے لڑکے بھی تھے (جو مذکورہ نذر کے تحت یہودی بنائے گئے تھے۔) انصار نے کہا: ہم اپنے بیٹوں کو نہیں جانے دیں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ''دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔ ہدایت گمراہی کے مقابلے میں واضح ہوچکی ہے۔'' [1]

اوس وخزرج

اوس کے لفظی معنی ''بھیڑیا یا عطیہ'' اور خزرج کے لفظی معنی ''ٹھنڈی ہوا یا شیر'' ہیں۔ اوس وخزرج مدینہ میں آباد دو بڑے قبائل تھے۔ اُن کا سلسلۂ نسب عموماً یمن کے قحطانی قبیلۂ ازد سے ملایا جاتا

[1] سنن أبي داود: 2682، السيرة لابن هشام: 514/2.

ہے۔ ہم پہلی جلد میں اوس وخزرج کے عدنانی اسماعیلی ہونے کے وہ مضبوط شواہد بیان کر چکے ہیں جو محققین نے پیش کیے ہیں۔ اوس کے قبائل مدینہ کے جنوب مشرق میں یہود کے پڑوس میں اس مقام پر آباد ہوئے جو ''عوالی'' کہلاتا ہے اور مدینہ کا زرخیز زرعی علاقہ ہے۔ خزرج کے قبائل وسطی اور شمالی علاقے میں آباد ہوئے جو مدینہ کا نشیبی حصہ ہے۔ خزرج جہاں ٹھہرے تھے وہ علاقہ زیادہ سرسبز نہ تھا۔ ایک بڑا یہودی قبیلہ بنو قینقاع ان کا پڑوسی تھا۔ اوس وخزرج کے کچھ لوگ بھی سودی کاروبار کرنے لگے تھے مگر وہ یہود کی نسبت بہت کم تھا۔[1]

ہجرت کے وقت مدینہ میں عربوں کو بالادستی اور اقتدار حاصل تھا۔ یہود اپنے ان حریفوں کے مقابلے میں متحد اور منظم نہیں تھے۔ ان میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ کچھ قبیلے اوس کے ساتھ معاہدہ کیے ہوئے تھے اور کچھ خزرج کے حلیف تھے۔ اپنے ہم مذہبوں سے لڑائی کے معاملے میں وہ عربوں سے زیادہ سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ بنونضیر اور بنوقریظہ سے عداوت ہی کے نتیجے میں بنوقینقاع نے اپنے کھیت چھوڑ دیے تھے اور صنعت وحرفت کے پیشے اختیار کر لیے تھے۔

اوس اور خزرج کے درمیان بھی بہت سی جنگیں ہوئیں۔ ان میں سے پہلی جنگ سُمیر اور آخری جنگ بُعاث تھی۔ یہ ہجرت سے 5 سال پہلے برپا ہوئی تھی۔ یہود اوس اور خزرج کے مابین اختلاف کی آگ بھڑکاتے رہتے تھے تاکہ عرب ان کی طرف سے غافل رہیں۔ یہودیوں کی ان چالبازیوں کو عرب بھی خوب سمجھتے تھے، اسی لیے وہ ان کو ثَعالِب (لومڑیاں) کہتے تھے۔

مدینہ منورہ کی گڑھیاں

مدینہ میں یہود کی گڑھیوں یا قلعہ بند محلّوں کی تعداد انسٹھ تھی۔ عرب بھی گڑھیاں بنانے میں یہود سے پیچھے نہیں تھے۔ عربوں کے ایک خاندان کی انیس گڑھیوں کا ذکر ملتا ہے۔ ڈاکٹر ولفنسن ان گڑھیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''یثرب میں گڑھیوں کی بڑی اہمیت تھی۔ جب مرد لڑنے کے لیے چلے جاتے تھے تو وہاں دشمن کے حملے سے بچاؤ کے لیے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذور لوگوں کو پناہ ملتی تھی۔ یہ گڑھیاں گودام کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھیں۔ ان میں غلّہ، پھل اور ہتھیار رکھے جاتے تھے۔ سامان سے لدے ہوئے تجارتی قافلے گڑھیوں کے قریب ہی اترتے تھے۔ ان کے دروازوں پر بازار بھی لگتا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان گڑھیوں میں عبادت گاہیں اور یہودی مدراس بھی ہوتے تھے...... وہاں دینی کتابیں بھی رکھی رہتی تھیں، وہاں بحث ومشورہ کے لیے یہودی سردار جمع

[1] مكة والمدينة في الجاهلية و عهد الرسول ﷺ، ص: 257-261.

ہوتے تھے۔ وہ اہم معاملات طے کرتے وقت یا معاہدے کرتے ہوئے کتب مقدسہ کی قسمیں کھاتے تھے۔"[1]

یثرب قلعوں کا مجموعہ تھا

یثرب انھی محلوں اور قلعہ بندیوں کا نام تھا۔ درحقیقت یہ آس پاس کی بستیوں کا مجموعہ تھا جو وسعت پا کر شہر بن گیا تھا۔ قرآن کریم نے یہودِ بنونضیر کی جلاوطنی اور مالِ فَے کے حصول کے حوالے سے ان بستیوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾

"اللہ اپنے رسول کی طرف بستیوں والوں (کے مالِ فَے) سے جو کچھ دلوا دے تو وہ اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور (اس کے) قرابتداروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔"[2]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِیْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ﴾

"وہ سب مل کر تم سے ہرگز نہیں لڑ سکتے مگر قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں کی اوٹ سے۔"[3]

حرّاتِ مدینہ

مدینہ طیبہ میں حرّات کی بھی بڑی اہمیت تھی۔ "حرّہ" یا "لابہ" ایسے جلے ہوئے سیاہ پتھروں کے علاقے کو کہتے ہیں جنھیں آتشیں سیال مادے نے اُبل کر ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہو۔ یہاں سخت نوکیلے آڑے ترچھے پتھر

[1] مكة والمدينة في الجاهلية و عهد الرسول ﷺ، ص: 244، اليهود في بلاد العرب، ص: 117،116. [2] الحشر 7:59.
[3] الحشر 14:59.

حرّۂ مدینہ

حرّۂ واقم (مدینہ)

جرف
بنو حارثہ
مجمع الاسیال کی طرف
وادی قناۃ
عرصہ
شیخین
بنو عبدالاشہل وزعوراء
السافلہ
بنو ظفر
حرۂ واقم (اللابۃ الشرقیۃ)
بنو معاویہ
بنو حارث بن خزرج
ثنیۃ الوداع
بنو سلمہ
راس الثنیہ
بدائع
مسجد نبوی
بنو نجار
(مالک ومازن
اور دینار وعدی)
البقیع
جبل سلع
وادی بطحان
حرۂ وبرہ (اللابۃ الغربیۃ)
بنو زریق
بنو واقف
بنو ساعدہ
بنو حارث بن خزرج
بنو قینقاع
یثرب
وادی مہزور
بنو بیاضہ
بنو سالم بن عوف
بنو قریظہ
بنو امیہ
وادی مذینب
العالیہ
بنو نضیر
بنو عوف بن خزرج
قلعہ کعب بن اشرف
وادی رانوناء
عصبہ
بنو عوف بن مالک بن اوس
قباء
مسجد قباء
بنو انیف
قبائلِ اوس وخزرج کے مقامات
یثرب (مدینہ) میں
بنو اوس کی گڑھیاں
بنو خزرج کی گڑھیاں

کوسوں دور کی مسافت تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان پر پیدل چلنا آسان نہیں۔ یہاں اونٹوں اور گھوڑوں کا گزر بھی محال ہے۔ مدینہ کے دو حرے مشہور ہیں۔ ایک جانبِ مغرب میں جسے ''حرۃ الوبرۃ'' کہتے ہیں اور ایک جانبِ مشرق جو ''حرۂ واقم'' کے نام سے مشہور ہے...... ان دونوں حروں نے مدینہ کو ایک قلعہ بند شہر بنادیا ہے۔ اس پر صرف شمالی جانب سے فوج کشی ہوسکتی تھی (اور یہی وہ جانب ہے جسے غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق کھود کر محفوظ کردیا گیا تھا۔) جنوبی طرف کا علاقہ گھنے نخلستانوں، باغات اور گنجان آبادی کے باہم متصل مکانات سے اس طرح گھرا ہوا ہے کہ ادھر سے بھی بیرونی حملہ مشکل ہے۔ گویا ہجرت کے لیے مدینہ کے انتخاب میں مدینہ کے اس قدرتی استحکام اور فوجی خصوصیت و اہمیت کو بھی دخل تھا۔

حرۂ واقم مدینہ کے مشرق میں تھا اور حرۃ الوبرہ سے زیادہ گنجان آباد تھا۔ جب نبیِ کریم ﷺ ہجرت فرما کر یثرب تشریف لائے تو اس وقت حرۂ واقم میں یہود کے اہم قبائل بنونضیر اور بنوقریظہ وغیرہ رہتے تھے۔ ان کے ساتھ اوس کی اہم شاخیں بنوعبد الاشہل، بنوظفر، بنوحارثہ اور بنومعاویہ بھی مقیم تھیں۔ محلّہ واقم بنی عبدالاشہل ہی کے علاقے میں تھا جس کے نام پر حرۂ واقم کا نام رکھا گیا۔[1]

اوس وخزرج کی دینی حالت

مدینہ کی عرب آبادی بیشتر معاملات میں قریش کے تابع رہتی تھی۔ وہ قریشِ مکہ کو کعبہ کا متولی، دینی رہنما اور عقیدہ وعمل میں لائقِ تقلید مثال سمجھتے تھے۔ وہ جزیرہ نمائے عرب کی عام روش کے مطابق بت پرست تو تھے ہی لیکن وہ ان بتوں کو خاص طور پر پوجتے تھے جنھیں قریش اور اہلِ حجاز پوجتے تھے۔ ہرچند بعض قبائل کی علاقائی بتوں سے زیادہ گہری وابستگی تھی۔ ''مناۃ'' اہلِ مدینہ کا سب سے زیادہ محبوب اور پرانا بت تھا۔ اوس وخزرج اسے مقدس ترین ''معبود'' سمجھتے اور اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے۔ یہ بت جبل قدید کے بالمقابل مُشَلَّل کے مقام پر واقع تھا جو ساحل کی طرف مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے۔ ''لات'' اہلِ طائف کا محبوب بت تھا۔ ''عُزّٰی'' اہلِ مکہ کا قومی بت تھا، اس لیے ان شہروں کے لوگ اپنے اپنے بتوں سے بڑا جذباتی تعلق رکھتے تھے۔ اہلِ مدینہ میں بھی جو لکڑی یا کسی اور چیز کا بت اپنے گھر میں رکھتا تھا تو اسے ''مناۃ'' ہی کے نام سے پکارتا تھا جیسا کہ بنی سلمہ کے ایک سردار عمرو بن الجموح نے اسلام لانے سے پہلے اپنا ''مناۃ'' بنا رکھا تھا۔[2]

[1] مكة والمدينة في الجاهلية و عهد الرسول ﷺ، ص: 257. [2] بلوغ الأرب في معرفة أحوال العرب (اردو): 2/157،158، 3/87،88.

بنو اوس اور بنو خزرج
کا شجرہ نسب
حارثہ
اوس
خزرج الاکبر

مروہ: سعی کا مقام

صفا: سعی کا مقام

حضرت عروہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوکر یہ آیت پڑھی:

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾

''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، پس جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے۔''[1]

میں نے اس آیت کے بارے میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر صفا و مروہ کی سعی نہ کریں تو کسی پر کچھ گناہ نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اے میرے بھانجے! تو غلط بات کہہ رہا ہے۔ اگر اللہ کا یہ مطلب ہوتا تو آیت کریمہ یوں ہوتی: لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا ''ان کا طواف نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔'' اصل بات یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ اسلام لانے سے پہلے مناۃ کے لیے احرام باندھا کرتے تھے جس کی وہ مقام مُشلّل کے قریب عبادت کرتے تھے، اس لیے ان میں سے جو شخص احرام باندھتا تھا، وہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا گناہ سمجھتا تھا۔ جب یہ لوگ مسلمان ہوگئے تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی بابت دریافت کیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! ہم لوگ تو صفا و مروہ کے درمیان سعی کو برا سمجھتے تھے، اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''صفا اور مروہ دونوں اللہ کی نشانیاں ہیں......۔''[2]

[1] البقرة 2:158. [2] صحيح البخاري: 1643، صحيح مسلم: 1277.

اہلِ یثرب کا تہوار

مکہ کی طرح مدینہ میں بتوں کی بھرمار نہیں تھی۔ مکہ کے ہر گھر میں ایک خاص بت ہوتا تھا۔ وہاں لوگ پھیری لگا کر بھی بت بیچتے تھے۔ یوں مکہ بت پرستی میں مقتدیٰ اور رہنما کی حیثیت رکھتا تھا جبکہ مدینہ کی حیثیت ذیلی تھی۔
اہل مدینہ سال کے دو دنوں میں کھیل کود کے تہوار مناتے تھے۔ نبیِ کریم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے اہل مدینہ سے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَبْدَلَكُمْ بِهِمَا خَيْرًا مِّنْهُمَا: يَوْمَ الْأَضْحٰى وَ يَوْمَ الْفِطْرِ»

"بے شک اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان دو دنوں کے بدلے میں دن سے بہتر دن عید الاضحیٰ اور عید الفطر عطا کیے ہیں۔"[1]

شارحین حدیث نے "دو دنوں" کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ "نوروز" اور "مہرجان" کے دن تھے۔ شاید ان لوگوں نے ان دو دنوں کے تہوار اہل ایران سے لیے تھے۔[2]

اوس و خزرج کا مدینہ میں معاشرتی کردار

اوس اور خزرج کی شرافتِ نسب کا اعتراف قریش کو بھی تھا۔ قریش ان سے شادی بیاہ کا تعلق بھی رکھتے تھے۔ سردارِ قریش ہاشم بن عبد مناف نے بنی نجار میں شادی کی تھی جو خزرج کی ایک شاخ تھے۔ ان کی شادی سلمٰی بنت عمرو بن زید سے ہوئی تھی جو بنی عدی بن نجار سے تھیں، تاہم قریش خود کو مدینہ کے عرب قبائل سے برتر سمجھتے تھے جیسا کہ جنگ بدر کے دن انھوں نے اپنے مقابلے میں آنے والے انصار کو لوٹا دیا اور لڑائی کا آغاز اپنی قوم کے افراد عبیدہ بن حارث، حمزہ اور علی (رضی اللہ عنہم) سے کیا اور کہا یہ شرفاء ہیں اور ہمارے جوڑ کے ہیں۔[3]
اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش کاشت کاری کو، جس کے اہل مدینہ اپنے علاقائی حالات کی وجہ سے عادی تھے، زیادہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس کا اظہار ابوجہل کے اس جملے سے بھی ہوتا ہے جو دو انصاری لڑکوں کے ہاتھوں قتل ہوتے وقت اُس کی زبان سے نکلا۔ اس موقع پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ابوجہل کا سر کاٹنے کے لیے لپکے تو ابوجہل نے کہا: کاش! مجھے کاشتکاروں کے سوا کسی اور نے قتل کیا ہوتا۔[4]
مکہ کی زندگی ایک خاص اسلوب سے چلتی تھی جس میں پرسکون فضا اور مقامی باشندوں کے اتحاد کا بڑا عمل دخل تھا۔ ان سب کا مقصد ایک تھا: بیت اللہ کی دیکھ بھال اور تجارت کے امور کو منظم طریقے سے چلانا۔ اس حرمت

[1] سنن أبي داود: 1134. [2] عون المعبود: 341/3، بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب (اردو): 162/2-173. [3] السيرة لابن هشام: 625/2، مكة والمدينة في الجاهلية و عهد الرسولﷺ، ص: 128. [4] فتح الباري: 368/7، شرح النووي علٰى صحيح مسلم: 223,222/12.

والے شہر میں ان کے رزق کا واحد ذریعہ تجارت تھا۔ اس کے مقابلے میں مدینہ میں مکہ جیسے پُر امن حالات میسر نہ تھے۔ مدینہ کی آبادی مخلوط تھی۔ یہاں کے باشندے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔ ان میں یہود بھی تھے اور عرب بھی۔ ان کا کوئی مشترکہ ہدف اور نظام نہیں تھا۔ ان کی زندگی فقط زرخیز زرعی زمین کے حصول اور اس کی آبادکاری کے لیے وقف تھی۔ [1]

مدینے کی زراعت، باغات اور کنویں

زرعی علاقہ ہونے کے باعث مدینہ کے باشندوں کا انحصار زراعت اور باغبانی پر تھا۔ یہاں کی اہم پیداوار کھجور اور انگور تھے۔ ان کے علاوہ غلہ (جو) اور سبزیاں بھی اُگائی جاتی تھیں۔ کھجوریں قحط اور خشک سالی کے وقت لوگوں کی بیشتر غذائی ضرورت پوری کرتی تھیں، مزید برآں ان سے سکے کی طرح بیع و شراء میں بھی مدد لی جاتی تھی۔ اس طرح کھجور کے باغ اہل مدینہ کی زندگی میں خیر و برکت کا سرمایہ تھے۔ انھیں وہ تعمیرات، ایندھن اور جانوروں کو چارہ کھلانے کے کام میں بھی لاتے تھے۔ [2]

وادی عقیق

مدینہ کی وادیوں میں سب سے مشہور ''وادی عقیق'' تھی جو اہل مدینہ کی تفریح گاہ تھی۔ اس میں پانی با افراط رہتا تھا اور باغوں کی کثرت تھی۔ مدینہ کی زمین کنویں کھودنے کے لیے بھی موزوں تھی۔ باغوں کی آب پاشی کے لیے کنویں کھودنے کا رواج عام تھا۔ باغات کے گرد چار دیواری بھی ہوتی تھی۔ ایسے باغ کو حائط کہتے تھے۔

مدینہ کے بہت سے کنویں اپنے پانی کی فراوانی و شیرینی کے لیے مشہور تھے۔ وہاں نہروں اور رہٹ کا نظام بھی تھا جس کے ذریعے سے وہ اپنے باغوں تک پانی پہنچاتے تھے۔ غلوں میں اولیت جو کو حاصل تھی۔ گیہوں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ کھیتی باڑی کے طور طریقوں اور معاملات کی کئی قسمیں تھیں، مثلاً: مزابنہ، محاقلہ، مخابرہ، معاومہ۔ ان شکلوں میں سے بعض کو اسلام نے باقی رکھا اور بعض کی ممانعت یا اصلاح کر دی۔

رائج الوقت سکے

اُس دور میں اہل عرب جو سکے استعمال کرتے تھے، وہ رومی، بازنطینی اور ایرانی ساخت کے تھے۔ مکہ، مدینہ اور

[1] مكة والمدينة في الجاهلية و عهد الرسول ﷺ، ص: 263. [2] دیکھیے: صحيح البخاري، العلم، باب طرح الإمام المسئلة على الناس...... اور اس باب کی شرح فتح الباري یا عمدة القاري میں ملاحظہ ہو۔

جزیرہ نمائے عرب میں اس وقت رائج سکے دو قسم کے تھے: ایک درہم اور دوسرا دینار۔ درہم کی بھی دو قسمیں تھیں: ایک قسم وہ جس پر سلطنت فارس کا نقش اور مہر تھی۔ اس کو ''بغلیہ'' اور ''سواء دامیہ'' کہتے تھے۔ دوسری قسم وہ جس پر روم کا نقش تھا اور اس کو زیادہ تر ''طبریہ'' اور ''بیزنطیہ'' یعنی بازنطینی کہتے تھے۔ وہ سب چاندی کے سکے تھے اور ان کے مختلف اوزان تھے، اسی لیے اہل مکہ ان کے شمار پر نہیں بلکہ وزن پر معاملہ کرتے تھے۔

دینار سونے کا ہوتا تھا۔ زمانۂ جاہلیت اور اسلام کے ابتدائی دور میں شام اور حجاز میں دینار ہی کا رواج تھا۔ یہ دینار رومی تھے اور روم (قسطنطنیہ) میں ڈھالے جاتے تھے۔ ان پر بادشاہِ روم کی تصویر ہوتی تھی۔ اس کا نام رومی زبان میں کندہ تھا جیسا کہ ابن عبد البر ؒ نے ''التمہید'' میں لکھا ہے۔ لفظ دینار دراصل ایک قدیم رومی سکہ (Denarius) سے عربی زبان میں آیا ہے۔ بعض مغربی ممالک میں یہ لفظ اب تک رائج ہے۔ انجیل میں اس کا ذکر متعدد بار آیا ہے۔ دینار کا وزن ایک مثقال کے برابر مانا جاتا ہے۔ [1]

ناپ تول کے پیمانے اور باٹ

اہل مکہ کے مقابلے میں اہل مدینہ کو ناپ تول کے پیمانوں سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا کیونکہ وہاں کے باشندوں کا سرمایہ غلّہ اور پھل تھے۔ مدینہ میں استعمال ہونے والے پیمانے یہ تھے: ''مُدّ، صاع، فرق، عرق، وسق۔'' وزن کے لیے یہ چیزیں بطور باٹ استعمال ہوتی تھیں: ''درہم، شقاق، دانق، قیراط، نواۃ، رِطل، قنطار اور اوقیہ۔''

اہل مدینہ کے پاس اونٹ، گائیں اور بکریاں بھی تھیں۔ اونٹ کو زمین سینچنے کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔ ان کے پاس چراگاہیں بھی تھیں جہاں وہ مویشی بھی چراتے تھے اور وہیں سے لکڑی بھی حاصل کرتے تھے۔ مدینہ کی مشہور چراگاہیں ''زغابہ'' اور ''غابہ'' تھیں۔ [2]

[1] مكة والمدينة في الجاهلية وعهد الرسول ﷺ، ص: 293،292. [2] نبی رحمت ﷺ، ص: 247.

یونانی سکہ

فارسی دینار

عربی دینار

رومن دینار

مدینہ کے بازار

مدینہ میں کئی بازار تھے۔ یہ کھلی فضا میں لگتے تھے۔ بازاروں میں دکانوں کے لیے کوئی باقاعدہ عمارتیں نہیں تھیں جن میں تاجر اپنا بکاؤ سامان رکھتے ہوں۔ جو پہلے آجاتا تھا، وہ اپنا سامان جہاں چاہتا تھا رکھ دیتا تھا اور وہیں خرید و فروخت شروع کر دیتا تھا۔ عام معمول یہ تھا کہ تاجر اپنا سامان اتار کر سر بازار رکھ دیتا تھا اور آس پاس گھومتا تھا اور اپنے سامان پر نگاہ رکھتا تھا۔ سب سے اہم سوق (بازار) بنی قینقاع تھا جو سونے چاندی کے زیورات، مصنوعات اور کپڑے والوں کا خاص بازار تھا۔ اس وقت مدینہ میں سوتی اور ریشمی کپڑے، رنگین غالیچے اور منقش پردے عام طور پر موجود تھے۔ عطر فروش مختلف قسم کے عطر اور مشک فروخت کرتے تھے۔

اہل مدینہ کی تمدنی زندگی

مدینہ کی تمدنی زندگی میں وہاں کے باشندوں کی خوش ذوقی کے سبب خاصی ترقی ہوگئی تھی۔ وہاں دو منزلہ مکان بننے لگے تھے۔ ہجرت کے موقع پر رسول اللہ ﷺ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے گھر کی دوسری منزل ہی پر ٹھہرے تھے۔

یثرب کی صنعتیں

بعض گھروں کے ساتھ پائیں باغ بھی تھے۔ بیٹھنے کے لیے کرسی کا استعمال بھی ہوتا تھا۔ شیشے اور پتھر کے پیالے اور آبخورے بھی مستعمل تھے۔ گھر اور کھیت کے کاموں کے لیے چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں اور زنبیلیں کام میں لائی جاتی تھیں۔ مالداروں، خصوصاً یہودیوں کے گھروں میں اچھا خاصا فرنیچر پایا جاتا تھا۔ عورتوں میں بُننے اور کاتنے کا عام رواج تھا۔ سلائی، رنگائی، معماری، خشت سازی اور سنگ تراشی کی صنعتیں ہجرت سے پہلے ہی مدینہ میں معروف و مروج تھیں۔[1]

دفاعی قوت

یثرب شہر حربی اعتبار سے اتنا طاقتور تھا کہ اپنی حفاظت خود کر سکے اور دشمن قبائل کو دندان شکن جواب دے سکے۔ اوس و خزرج کے مردوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں، البتہ ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وہ جن معرکوں میں شریک ہوئے، ان سے ان کی حربی قوت کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر جبکہ تمام اہل مدینہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے، ان کے جنگجوؤں کی تعداد چار ہزار تھی۔ اسی طرح یہودیوں کے چھوٹے بڑے قبائل کی تعداد دو

---

[1] دیکھیے: السیرة لابن هشام :2/499,498، المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 4/131، مكة والمدينة في الجاهلية و عهد الرسول ﷺ، ص:294,295.

ہزار کے لگ بھگ تھی۔ گویا یثرب شہر ضرورت کے وقت چھ ہزار جنگجو میدان کارزار میں اتار سکتا تھا۔

مدینہ شہر میں اسلحہ سازی کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہود زرہیں بنانے میں مشہور تھے۔ وہ اپنے اس کام کو حضرت داود علیہ السلام کی وراثت بتاتے تھے۔ شمشیر سازی میں بھی یہودیوں کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ مدینہ میں تیر بنانے کی صنعت بھی موجود تھی بلکہ مدینہ کے تیر سب سے اچھے ہوتے تھے۔ بنوقریظہ جو یہودیوں کا سب سے کمزور قبیلہ تھا، ان سے مال غنیمت کے طور پر مسلمانوں نے جو اسلحہ حاصل کیا، اس میں پندرہ سو تلواریں، دو ہزار نیزے، پندرہ سو چھوٹی بڑی ڈھالیں اور تین سو زرہیں شامل تھیں۔[1]

پیچیدہ اور ترقی یافتہ معاشرہ

شہر نبی ﷺ کے اس تعارف سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ مکہ مکرمہ اور یثرب کے احوال و ظروف ایک دوسرے سے خاصے مختلف تھے۔ رسول اللہ ﷺ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر یثرب پہنچے تو انھوں نے اپنے شہر مکہ کے مقابلے میں یثرب کی مقامی زندگی کا رنگ ڈھنگ خاصا مختلف پایا۔ یہ شہر مکہ سے چھوٹا تھا۔ مکہ کی زندگی یک رنگ تھی۔ مدینہ کی زندگی رنگا رنگ تھی۔ مکہ مکرمہ کے برعکس یہاں خاصی قبائلی پیچیدگیاں موجود تھیں۔ یہاں کئی طرح کے مذاہب، جداگانہ معاشرے اور مختلف ثقافتیں تھیں۔ اس بوقلموں فضا کو ایک عقیدے اور ایک دین کے رنگ میں رنگنے اور ایک دوسرے کو بھائی بھائی بنا دینے کا کام تائید الٰہی سے بہرہ ور اللہ کا مکرم رسول ہی کر سکتا تھا جسے اللہ نے حکمت و بصیرت، قوت فیصلہ اور متحارب قوتوں اور نظریوں کو رشد و ہدایت اور تعمیر انسانیت کے کام میں لانے اور ایک دوسرے کا مددگار بنانے کی غیر معمولی صلاحیت سے نوازا تھا اور ایک دل رُبا شخصیت اور نہایت پُرکشش پاکیزہ کردار عطا کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے پاکیزہ کلام میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۚ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ (الأنفال 8:62,63)

”وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے آپ کی تائید کی اور اس نے ان (مومنوں) کے دلوں میں الفت ڈال دی۔ اگر آپ دنیا بھر کے سب خزانے خرچ کر دیتے تو بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے لیکن اللہ ہی نے ان میں الفت ڈالی۔ بے شک وہ زبردست، خوب حکمت والا ہے۔“[2]

[1] مكة والمدينة في الجاهلية و عهد الرسول ﷺ، ص: 287,286. [2] نبی رحمت ﷺ، ص: 250,249.

www.KitaboSunnat.com
باب
4
سیرت انسائیکلوپیڈیا
فضائلِ مدینہ
شہرِ مدینہ کے نام، حرم مدینہ کی حدود، بہ زبان رسالت مدینہ کی
عظمت وحرمت، مدینہ نہ چھوڑنے کی نصیحت، وادیِ عقیق
اور اُحد وبقیع کی حسنات وبرکات
محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

''اور جن لوگوں نے ظلم وستم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، البتہ ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے، اور یقیناً آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔'' (النحل 41:16)

اس باب میں

آپ ﷺ مشرکین مکہ کے مظالم کی وجہ سے ایسی جائے امن کے متمنی تھے جہاں پورے اطمینان سے اسلام کی دعوت وتبلیغ کا فرض انجام دیا جا سکے اور اسلامی تعلیمات کی تدریس وتنفیذ کا ایسا مؤثر نظام قائم ہو جائے کہ آفتاب اسلام کی کرنیں ساری دنیا میں توحید کا اُجالا پھیلاتی چلی جائیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مدینہ ہجرت کا حکم دیا۔ اسلامی تحریک کے لیے مدینہ بہترین جگہ تھی۔ اس کا محل وقوع نہایت اہم تھا۔ وہ شاہراہِ تجارت جو مشرکین مکہ کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتی تھی، مدینہ کے قریب ہی سے گزرتی تھی۔ آپ ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر یثرب تشریف لائے تو آپ ﷺ نے سب سے پہلے مسجد قبا اور مسجد نبوی تعمیر کرائی۔ یوں یثرب رسول اللہ ﷺ کی جلوہ آرائی سے مدینۃ النبی کے نام سے سرفراز ہوا۔ آپ ﷺ نے قرآن کریم کی تدریس اور اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کے لیے جگہ جگہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو روانہ فرمایا۔ اس طرح مدینہ منورہ اسلام کی دینی، سیاسی، سفارتی اور فلاحی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ آپ ﷺ ہی کی مساعی جمیلہ سے مدینہ میں پہلی اسلامی دستوری، شورائی اور فلاحی ریاست قائم ہوئی، پھر آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حضور مدینہ کے لیے مختلف دعائیں فرمائیں۔ بیت اللہ کے بعد مدینہ منورہ دوسرا حرم شریف بن گیا۔ نبی ﷺ کی مدینہ سے محبت، مدینہ کی کھجور کی فضیلت، مدینہ نہ چھوڑنے کی نصیحت، مدینہ میں وفات یافتہ کی شفاعت، بقیع و اُحد، عقیق اور شہرِ رسول کے فضائل سے اپنے دل و دماغ روشن اور ایمان تازہ کیجیے۔

مدینہ منورہ کے فضائل و مکارم

اللہ تعالیٰ نے مدینہ کو عزت عطا کر دی

رسول اللہ ﷺ بدستور ادائے فرض میں مصروف تھے۔ مشرکین مکہ کے جہل و نادانی کی حد تھی کہ وہ کلمہ حق کی تبلیغ و اشاعت روکنے پر تلے ہوئے تھے اور جو سعادت مند شخص دینِ حق قبول کرتا تھا، اُسے تشدد اور تعذیب کا نشانہ بناتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اور ان کے مقدس پیروکاروں کے لیے اپنا گھر، اپنا دیار اور اپنا وطن چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ اب صرف ہجرت گاہ کا انتخاب باقی تھا کہ کس شہر کو رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ہجرت گاہ ہونے کا شرف و اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ پھر ہوا یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے خواب دیکھا، اس خواب میں آپ ﷺ کو ہجرت کی جگہ دکھا دی گئی، اس بارے میں خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«رَأَيْتُ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أُهَاجِرُ مِنْ مَكَّةَ إِلٰى أَرْضٍ بِهَا نَخْلٌ، فَذَهَبَ وَهَلِي إِلٰى أَنَّهَا الْيَمَامَةُ أَوْهَجَرُ، فَإِذَا هِيَ الْمَدِينَةُ يَثْرِبُ»

مدینہ کی خوبصورت تصویر

''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مکہ چھوڑ کر ایسے علاقے کی طرف ہجرت کر رہا ہوں جس میں کھجوروں کے بہت سے درخت ہیں۔ میں نے سمجھا کہ یہ شاید یمامہ یا ہجر کا مقام ہوگا لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ یہ المدینہ، یثرب کی سرزمین ہے۔'' [1]

یہ بات خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ جائے ہجرت کا انتخاب رسول اللہ ﷺ نے از خود نہیں کیا بلکہ یہ سراسر خود اللہ تعالیٰ کی صوابدید کے مطابق منتخب مقام مدینہ منورہ تھا۔ اس لحاظ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُس بلدِ جمال کی عظمت وفضیلت کیا ہوگی جسے خود اللہ رب العزت نے اپنے محبوب ترین نبی کے لیے بطور مقام ہجرت اور بطورِ جائے سکونت پسند فرمایا۔ علامہ اقبال نے اسی قریۂ جمال کو مخاطب کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے ؎

تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی — جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی

آہ یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو — نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے کہ تمام شہر تلوار سے فتح ہوئے لیکن مدینہ قرآن کریم سے فتح ہوا۔ مدینہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت سی فضیلتوں سے نوازا ہے۔ مدینہ اسی طرح محترم ومقدس ہے جس طرح مکہ مکرمہ ہے۔ آپ ﷺ کی ہجرت کے بعد اللہ نے اسے کتنا اوج کمال پر پہنچایا، ذیل میں آپ یہی ملاحظہ فرمائیں گے۔

[1] صحيح البخاري :3622، صحيح مسلم :2272.

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ ہجرت

رسول اللہ ﷺ کے مذکورہ بالا خواب دیکھنے کے کچھ عرصہ بعد ہی ہجرت کا حکم ربانی آپہنچا اور آپ ﷺ اپنے رفیق کار ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ منورہ روانہ ہوگئے۔ تپتے ہوئے صحرا کے نشیب و فراز عبور کرتے اور دشمنوں سے بچتے ہوئے متواتر کئی دنوں کی مسافت کے بعد بالآخر رسول اللہ ﷺ مدینہ پہنچ گئے، سارا شہر آپ کے پرتپاک استقبال کے لیے اُمنڈ آیا حتی کہ معصوم بچیاں بھی آپ کی تشریف آوری کی خوشی میں دف بجا بجا کر آپ کے لیے خیر مقدمی ترانہ پڑھ رہی تھیں۔ اللہ اللہ یہ تو تھا مدینہ کے باسیوں کا حال جو آپ کے ورودِ مسعود پر خوشیاں منا رہے تھے، جب انسانوں کی مسرت کا یہ حال تھا تو اُس خوش نصیب سرزمین کے اوجِ کمال کا کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو آپ ﷺ کے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز ہوگئی۔

اب ہم مدینہ کے ان فضائل کا ذکر کریں گے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے حدیث کی شکل میں ہم تک پہنچے۔

ناموں کی کثرت

کسی بھی خطۂ ارض کے ایک سے زیادہ نام اس سرزمین کے باعزت ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور جتنے نام مدینہ منورہ کے پائے جاتے ہیں کسی اور شہر کے نہیں یہاں تک کہ ان ناموں کا نصف یا چوتھائی حصہ بھی کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ علماء نے مدینہ منورہ کے تقریباً سو نام بیان کیے ہیں۔ [1]

ان ناموں کا تذکرہ امام زرکشی رحمہ اللہ نے إعلام الساجد بأحكام المساجد میں، مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی نے القاموس المحيط میں، نورالدین السمہودی نے وفاء الوفاء بأخبار دار المصطفىٰ میں اور محمد بن یوسف الصالحی نے سبل الهدىٰ والرشاد في سيرة خير العباد میں کیا ہے۔ [2]

مدینہ کے مشہور نام مندرجہ ذیل ہیں:

یثرب: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِذْ قَالَت طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يَٰٓأَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَٱرْجِعُوا۟﴾

''اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا تھا: اے اہل یثرب! (آج) تمھارے لیے (لشکر کے ساتھ) کوئی

[1] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 155. [2] الضوء اللامع للسخاوي: 1/79-86، وفاء الوفا: 1/8-27، سبل الهدىٰ والرشاد: 3/286-295.

قیام گاہ نہیں، لہٰذا تم لوٹ چلو۔"[1]

بکر بن عبداللہ ابوزید کی رائے میں شرعی طور پر مدینہ کو یثرب کہنا درست نہیں، مذکورہ بالا آیت میں صرف منافقین کا قول بیان کیا گیا ہے۔[2]

طابہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ سَمَّى الْمَدِينَةَ يَثْرِبَ فَلْيَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ، هِيَ طَابَةُ هِيَ طَابَةُ»

"جو مدینہ کو یثرب کہتا ہے وہ اللہ سے استغفار کرے۔ وہ تو طابہ (پاکیزہ) ہے۔ وہ طابہ ہے۔"[3]

المدینہ: یہی اس کا مشہور نام ہے۔ جب مطلق طور پر المدینہ کا لفظ استعمال کیا جائے تو صرف اور صرف مدینہ منورہ ہی مراد ہوگا۔ اس نام کے ساتھ بہت سی آیات بھی موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ﴾

"اور تمھارے آس پاس جو دیہاتی ہیں، ان میں بعض منافق ہیں اور بعض اہل مدینہ بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔"[4]

مدینہ کو عموماً المبارکۃ (برکت والا)، المنورہ (روشن)، المشرفہ (عزت والا) جیسے اوصاف حمیدہ سے متصف کیا جاتا ہے۔[5]

---

[1] الأحزاب 13:33. [2] دیکھیے: معجم المناهي اللفظية، ص: 586. [3] مسند أحمد: 285/4. یہ حدیث ضعیف ہے، دیکھیے: تفسیر ابن کثیر، الأحزاب 13:33، فتح القدير: 268/4، السلسلة الضعيفة: 121/10، حدیث: 4607. [4] التوبة 9: 101. [5] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 156.

مسجد نبوی اور اس کے کشادہ صحن کے حرکی سائبان

مدینہ کو حرم قرار دینا

نبی ﷺ نے مدینہ کو حرم قرار دیا ہے۔ حرمت کی وضاحت کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَا يُخْتَلٰى خَلَاهَا، وَلَا يُنَفَّرُ صَيْدُهَا وَ لَا تُلْتَقَطُ لُقَطَتُهَا إِلَّا لِمَنْ أَشَارَ بِهَا، وَ لَا تُقْطَعُ مِنْهَا شَجَرَةٌ إِلَّا أَنْ يَعْلِفَ رَجُلٌ بَعِيرَهُ، وَ لَا يُحْمَلُ فِيهَا السِّلَاحُ لِقِتَالٍ»

''اس کی تر گھاس نہ اکھاڑی جائے، اس کا شکار نہ بھگایا جائے اور اس کی گری پڑی چیز کوئی نہ اٹھائے سوائے اعلان کرنے والے کے اور اونٹ کو چارہ ڈالنے والے کے سوا کوئی اس کا درخت نہ کاٹے اور نہ اس میں کسی سے لڑائی کے لیے ہتھیار اٹھایا جائے۔'' [1]

یہ سب امور ادب و احترام کے لازمی تقاضے ہیں۔ مذکورہ بالا امور کے علاوہ بھی کچھ امور احترام مدینہ میں شامل ہیں جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَ دَعَا لَهَا، وَ حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ كَمَا حَرَّمَ إِبْرَاهِيمُ مَكَّةَ وَ دَعَوْتُ لَهَا فِي مُدِّهَا وَ صَاعِهَا مِثْلَ مَا دَعَا إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِمَكَّةَ»

''بے شک ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا اور اس کے لیے دعا کی اور میں نے مدینہ کو حرم قرار دیا جیسے ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا اور میں نے اس کے صاع اور مد میں برکت کی دعا اسی طرح کی جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے دعا فرمائی تھی۔'' [2]

حرمِ مدینہ کی تحدید کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلْمَدِينَةُ حَرَمٌ مَّا بَيْنَ عَيْرٍ إِلٰى ثَوْرٍ، فَمَنْ أَحْدَثَ فِيهَا حَدَثًا أَوْ آوٰى مُحْدِثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صَرْفًا وَّلَا عَدْلًا»

''مدینہ عیر پہاڑ سے ثور پہاڑ تک حرم ہے۔ جو شخص اس میں کوئی بدعت ایجاد کرے یا کسی بدعتی کو ٹھکانہ مہیا کرے، اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور سب لوگوں کی طرف سے لعنت ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سے کوئی فرض و نفل عمل قبول نہیں فرمائے گا۔'' [3]

[1] صحيح البخاري: 1349، صحيح مسلم: 1367، مسند أحمد: 119/1، واللفظ له. [2] صحيح البخاري: 2129، صحيح مسلم: 1360. [3] صحيح البخاري: 1870، صحيح مسلم: 1370، واللفظ له.

اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ کو حرم قرار دے کر اسے اتنی بڑی فضیلت عطا کر دی کہ اس میں بسنے والے ہر انسان، حیوان حتی کہ نباتات تک کو امن اور تحفظ کا پروانہ مل گیا۔

مدینہ سے محبت کی دعا

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی محبت کے لیے یوں دعا فرمائی:

«اَللّٰھُمَّ! حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ»

''اے اللہ! ہمارے دلوں میں مدینہ کی محبت مکہ جیسی یا اس سے بھی زیادہ ڈال دے۔''[1]

اب اس عالی مقام کے کیا کہنے! کہ مدینہ اللہ کے محبوب کا پسندیدہ شہر بن گیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر سے واپس تشریف لاتے اور مدینہ طیبہ کے درو دیوار دیکھتے تو اپنی اونٹنی کی رفتار تیز فرما دیتے اور اگر کوئی اور جانور ہوتا تو اسے مدینہ کی محبت کے جوش میں زور زور سے حرکت دیتے۔[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''جب رسول اللہ ﷺ (مدینہ) تشریف لائے تو ابوبکر اور بلال رضی اللہ عنہما دونوں کو بخار آ گیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بخار آیا تو انھوں نے یہ شعر کہے:

كُلُّ امْرِىءٍ مُّصَبَّحٌ فِي أَهْلِهٖ   وَالْمَوْتُ أَدْنٰى مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهٖ

''ہر آدمی کو اپنے اہل میں صبح بخیر کہا جاتا ہے، حالانکہ موت اس کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے۔''

اور جب بلال رضی اللہ عنہ کو بخار آتا تو بلند آواز سے پکارتے۔ ''اے اللہ! شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف پر لعنت برسا جنھوں نے ہمیں سرزمین مکہ سے وبا والی زمین کی طرف دھکیل دیا۔'' پھر اللہ کے رسول ﷺ نے دعا فرمائی:

«اَللّٰھُمَّ! حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ، اَللّٰھُمَّ! بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَ فِي مُدِّنَا وَ صَحِّحْهَا لَنَا وَانْقُلْ حُمَّاهَا إِلَى الْجُحْفَةِ»

[1] صحيح البخاري: 1889. [2] صحيح البخاري: 1802.

''اے اللہ! مدینہ کی محبت ہمارے دلوں میں مکہ کی طرح یا اس سے بھی زیادہ ڈال دے۔ اے اللہ! ہمارے پیمانے صاع اور مُد میں برکت عطا فرما اور مدینہ طیبہ کی فضا ہمارے لیے درست فرما دے۔ اور اس کا بخار جحفہ منتقل کر دے۔''[1]

اہل مدینہ کو خوف زدہ کرنے کی ممانعت

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کو حرم قرار دیا تو اس میں بسنے والے ہر انسان اور حیوان کو امن و سکون نصیب ہوا، اس لیے مدینہ کا امن و امان خراب کرنا اور اس کے باسیوں میں خوف و ہراس پیدا کرنا جرم قرار پایا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ أَخَافَ أَهْلَ الْمَدِينَةِ ظُلْمًا أَخَافَهُ اللّٰهُ، وَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صَرْفًا وَلَا عَدْلًا»

''جس شخص نے ظلم کرتے ہوئے اہل مدینہ کو ڈرایا، اللہ تعالیٰ اسے ڈرائے گا اور اس پر اللہ کی لعنت، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کا کوئی فرض و نفل عمل قبول نہیں فرمائے گا۔''[2]

مدینہ کے لیے دوہری برکت کی دعا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ بِالْمَدِينَةِ ضِعْفَيْ مَا جَعَلْتَ بِمَكَّةَ مِنَ الْبَرَكَةِ»

''اے اللہ! مدینہ میں مکہ مکرمہ سے دوگنی برکت عطا فرما۔''[3]

مدینہ کے پھلوں اور کھیتی میں برکت کی دعا

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَدَعَا لِأَهْلِهَا وَإِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ كَمَا حَرَّمَ إِبْرَاهِيمُ مَكَّةَ وَإِنِّي دَعَوْتُ فِي صَاعِهَا وَمُدِّهَا بِمِثْلَيْ مَا دَعَا بِهِ إِبْرَاهِيمُ لِأَهْلِ مَكَّةَ»

''بے شک ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا اور اس کے رہنے والوں کے لیے برکت کی دعا کی اور میں نے مدینہ کو حرم قرار دیا جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو قرار دیا تھا اور میں نے اس کے صاع اور مد میں اس سے دُگنی

[1] صحيح البخاري: 1889. [2] مسند أحمد: 55/4. [3] صحيح البخاري: 1885، صحيح مسلم: 1369.

برکت کی دعا کی جو اہل مکہ کے لیے ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی۔"[1]

مدینہ والوں کو اسلام کی نعمت سے مالا مال ہونے کے بعد معلوم ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ کی برکات کتنی وسیع اور لامحدود ہیں، لہٰذا جب بھی وہ موسم کا کوئی نیا پھل دیکھتے تو خود نہیں کھاتے تھے بلکہ اسے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے اور آپ ﷺ سے برکت کی دعا کراتے جیسا کہ درج ذیل روایت سے واضح ہے:

كَانَ النَّاسُ إِذَا رَأَوْا أَوَّلَ الثَّمَرِ جَاؤُوا بِهِ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَإِذَا أَخَذَهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: «اَللّٰهُمَّ! بَارِكْ لَنَا فِي ثَمَرِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا، وَبَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِي مُدِّنَا، اَللّٰهُمَّ! إِنَّ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَبْدُكَ وَخَلِيلُكَ وَنَبِيُّكَ، وَإِنِّي عَبْدُكَ وَ نَبِيُّكَ، وَإِنَّهُ دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَ إِنِّي أَدْعُوكَ لِلْمَدِينَةِ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَمِثْلِهِ مَعَهُ»

"جب لوگ پہلا پہلا پھل دیکھتے تو نبی کریم ﷺ کے پاس لے آتے۔ پس جب رسول اللہ ﷺ اسے تھامتے تو فرماتے: اے اللہ! ہمارے پھلوں میں برکت فرما، اور ہمارے مدینے میں برکت فرما اور ہمارے صاع میں برکت فرما، اور ہمارے مُد میں برکت فرما۔ اے اللہ! بے شک ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے، تیرے خلیل اور تیرے نبی تھے۔ میں بھی تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں، انھوں نے تجھ سے مکہ کے لیے برکت کی دعا کی۔ میں تجھ سے مدینہ کے لیے ان کی دعا سے دُگنی برکت کی دعا کرتا ہوں۔"

پھر آپ ﷺ سب سے چھوٹے بچے کو بلاتے اور وہ پھل اسے عنایت فرما دیتے تھے۔[2]

مدینہ کی کھجور کی فضیلت

اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ کے پھلوں کے لیے برکت کی دعا کی تو پھلوں میں کثرت کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی دعا شفاء کا سبب بھی بن گئی جیسا کہ مدینہ کی کھجور (عجوہ) کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ أَكَلَ سَبْعَ تَمَرَاتٍ مِمَّا بَيْنَ لَابَتَيْهَا حِينَ يُصْبِحُ لَمْ يَضُرَّهُ سَمٌّ حَتَّى يُمْسِيَ»

"جس شخص نے دو پتھریلے علاقوں (حرم مدینہ) کے درمیان پائے جانے والی کھجور کے سات دانے صبح کے وقت کھائے، اسے شام تک کوئی زہر نقصان نہیں پہنچائے گا۔"[3]

رسول اللہ ﷺ کا ایک اور ارشاد ہے:

[1] صحیح مسلم: 1360۔ [2] صحیح مسلم: 1373۔ [3] صحیح مسلم: 2047۔

عجوہ: نبی اکرم ﷺ کی پسندیدہ کھجور

«مَنْ تَصَبَّحَ بِسَبْعِ تَمَرَاتٍ عَجْوَةٍ، لَمْ يَضُرَّهُ ذٰلِكَ الْيَوْمَ سُمٌّ وَلَا سِحْرٌ»

”جس شخص نے صبح کے وقت سات عجوہ کھجوریں کھائیں، اسے اس روز زہر نقصان پہنچائے گا نہ جادو۔“ [1]

مدینہ بیماریوں اور دجال سے بھی محفوظ ہے

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے لیے برکت کی دعا کی تو اس کا ایک مبارک اثر یہ ظاہر ہوا کہ یہ مقدس شہر موذی بیماریوں سے محفوظ ہو گیا۔ اس کے علاوہ اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ والوں کو مدینہ کی فضیلت بھی سنا دی کہ اس شہر میں طاعون اور دجال گھسنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ دجال سب سے عظیم فتنہ اور دین کا بڑا دشمن ہے، وہ زمین کے چپے چپے میں گھسے گا اور فتنہ بپا کرے گا۔ اس سے کوئی علاقہ محفوظ نہیں رہے گا مگر وہ مکہ اور مدینہ میں ہرگز نہ داخل ہو سکے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنْ بَلَدٍ إِلَّا سَيَطَؤُهُ الدَّجَّالُ إِلَّا مَكَّةَ وَالْمَدِينَةَ، لَيْسَ لَهُ مِنْ نِقَابِهَا نَقْبٌ إِلَّا عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ صَافِّينَ يَحْرُسُونَهَا»

”عنقریب دجال ہر شہر کو پامال کرے گا سوائے مکہ اور مدینہ کے، کہ ان کے ہر راستے پر صف بستہ فرشتے کھڑے ہوں گے جو ان (راستوں) کی حفاظت کریں گے۔“ [2]

ایک دوسری جگہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

«عَلٰى أَنْقَابِ الْمَدِينَةِ مَلَائِكَةٌ لَا يَدْخُلُهَا الطَّاعُونُ وَلَا الدَّجَّالُ»

”مدینہ کے راستوں پر فرشتے ہیں۔ اس میں طاعون آ سکتا ہے نہ دجال۔“ [3]

دجال کا داخل ہونا تو درکنار اس کا رعب اور دبدبہ بھی داخل نہیں ہو سکتا کہ لوگ اس سے ڈر جائیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا يَدْخُلُ الْمَدِينَةَ رُعْبُ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ، لَهَا يَوْمَئِذٍ سَبْعَةُ أَبْوَابٍ، عَلٰى كُلِّ بَابٍ مَلَكَانِ»

”مدینہ میں دجال کا رعب بھی نہیں پڑ سکے گا۔ اس دور میں مدینہ کے سات دروازے ہوں گے اور ہر دروازے

[1] صحيح مسلم: (155)-2047. [2] صحيح البخاري: 1881. [3] صحيح البخاري: 1880.

پر دو فرشتے تعینات ہوں گے۔" [1]

مدینہ کی سختی پر صبر کرنے کی فضیلت

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی شدت اور تنگیٔ گزران پر صبر کرنے والے کو قیامت کے دن اپنی شفاعت کا مستحق قرار دیا۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اَلْمَدِينَةُ خَيْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ، لَا يَدَعُهَا أَحَدٌ رَغْبَةً عَنْهَا إِلَّا أَبْدَلَ اللّٰهُ فِيهَا مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنْهُ، وَ لَا يَثْبُتُ أَحَدٌ عَلٰى لَأْوَائِهَا وَجَهْدِهَا إِلَّا كُنْتُ لَهُ شَفِيعًا أَوْ شَهِيدًا يَّوْمَ الْقِيَامَةِ»

"مدینہ لوگوں کے لیے بہتر ہے اگر وہ سمجھ سے کام لیں۔ جو آدمی مدینہ سے بے رغبتی کرتے ہوئے اسے چھوڑ کر چلا جائے تو اللہ تعالیٰ مدینہ میں اس سے بہتر اس کا نعم البدل بھیج دیتا ہے اور جو بھی مدینہ کی سختی اور مفلسی پر ثابت قدمی دکھاتا ہے، میں قیامت کے دن اس کا سفارشی یا گواہ ہوں گا۔" [2]

جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو مہاجرین کو یثرب کے مشہور بخار نے آلیا اور اس قدر نڈھال کر دیا کہ وہ بیٹھ کر نماز پڑھنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس بخار سے محفوظ رکھا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس بخار میں مبتلا ہوئے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ان حضرات کی حالت زار بیان کی تو رسول اللہ ﷺ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور بارگاہِ ربانی میں عرض کیا:

«اَللّٰهُمَّ! حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ، وَصَحِّحْهَا وَبَارِكْ لَنَا فِي صَاعِهَا، وَمُدِّهَا، وَانْقُلْ حُمَّاهَا فَاجْعَلْهَا بِالْجُحْفَةِ»

"اے اللہ! ہمارے دلوں میں مدینے کی محبت اس طرح ڈال دے جس طرح مکہ کی محبت ڈالی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اس کی آب و ہوا ٹھیک کر دے اور ہمارے لیے اس کے صاع اور مد میں برکت فرما اور اس کا بخار یہاں سے نکال کر جحفہ پر مسلط فرما دے۔" [3]

رسول اللہ ﷺ کی مبارک دعا کے نتیجے میں مدینۃ الرسول بڑی بڑی بیماریوں سے محفوظ ہوگیا۔ اس کی آب و ہوا اچھی اور صحت بخش ہوگئی۔

[1] صحيح البخاري: 1879 و 7125. [2] صحيح مسلم: 1363. [3] صحيح البخاري: 3926.

مدینہ میل کو دور کر دیتا ہے

مدینہ کو جب اتنے عظیم الشان فضائل نصیب ہو گئے۔ اس کی آب و ہوا صحت افزا ہو گئی، موذی بیماریاں دور ہو گئیں، فتنوں سے تحفظ مل گیا تو بھلا اب مدینہ یہ کس طرح گوارا کر سکتا تھا کہ وہ اپنے اندر کوئی گندگی رہنے دے، چاہے وہ گندگی بیماری کی شکل میں ہو، انسانی شکل میں ہو یا گناہوں کی صورت میں ہو، وہ مدینہ کے لیے بہر حال ناقابل برداشت تھی۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اسے آتشی بھٹی سے تشبیہ دی، جس کی تپش سے چاندی کا میل کچیل دور ہو جاتا ہے، اسی طرح مدینہ بھی اپنے اندر بسنے والوں کا میل کچیل ختم کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«أَلَا! إِنَّ الْمَدِينَةَ كَالْكِيرِ تُخْرِجُ الْخَبِيثَ، لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَنْفِيَ الْمَدِينَةُ شِرَارَهَا كَمَا يَنْفِي الْكِيرُ خَبَثَ الْحَدِيدِ»

''خبردار! بے شک مدینہ بھٹی کے مانند ہے جو اپنا میل کچیل نکال باہر کرتا ہے اور قیامت نہیں آئے گی جب تک کہ مدینہ اپنے برے لوگوں کو اس طرح نکال باہر نہ کرے جس طرح بھٹی لوہے کا میل باہر نکال دیتی ہے۔''[1]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّهَا طَيْبَةُ - يَعْنِي الْمَدِينَةَ - وَ إِنَّهَا تَنْفِي الْخَبَثَ كَمَا تَنْفِي النَّارُ خَبَثَ الْفِضَّةِ»

''مدینہ طیبہ ہے۔ یہ میل کو (یوں) دور کرتا ہے جیسے آگ چاندی کا میل کچیل دور کر دیتی ہے۔''[2]

ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے اسلام پر بیعت کی، وہ دوسرے دن آیا تو اسے بخار چڑھا ہوا تھا، کہنے لگا: أَقِلْنِي ''میری بیعت فسخ کر دیجیے۔'' آپ ﷺ نے اس کے اصرار پر تین مرتبہ انکار کیا، وہ مدینہ چھوڑ کر چلا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«الْمَدِينَةُ كَالْكِيرِ تَنْفِي خَبَثَهَا وَتَنْصَعُ طَيِّبَهَا»

''مدینہ کی مثال بھٹی جیسی ہے۔ یہ میل کچیل دور کر کے خالص جوہر کو نکھار دیتا ہے۔''[3]

ایک وقت ایسا آئے گا کہ مدینہ میں کسی کافر اور منافق کا وجود ہی باقی نہیں رہے گا جیسا کہ درج ذیل روایت میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

[1] صحيح مسلم :1381. [2] صحيح مسلم :1384. [3] صحيح البخاري :1883و7209.

«...... ثُمَّ تَرْجُفُ الْمَدِينَةُ بِأَهْلِهَا ثَلَاثَ رَجَفَاتٍ فَيُخْرِجُ اللّٰهُ كُلَّ كَافِرٍ وَّ مُنَافِقٍ»

''...... پھر مدینہ کی زمین اپنے باسیوں سمیت تین مرتبہ کانپے گی، اس طرح اللہ تعالیٰ ہر کافر اور منافق کو (چن چن کر) نکال باہر کرے گا۔''[1]

نبی ﷺ کی مدینہ نہ چھوڑنے کی نصیحت

رسول اللہ ﷺ نے مستقبل کے حالات کی خبر دیتے ہوئے فرمایا:

«تُفْتَحُ الْيَمَنُ فَيَأْتِي قَوْمٌ يُبِسُّونَ فَيَتَحَمَّلُونَ بِأَهْلِيهِمْ وَمَنْ أَطَاعَهُمْ، وَالْمَدِينَةُ خَيْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ، وَتُفْتَحُ الشَّامُ فَيَأْتِي قَوْمٌ يُبِسُّونَ وَيَتَحَمَّلُونَ بِأَهْلِيهِمْ وَمَنْ أَطَاعَهُمْ، وَالْمَدِينَةُ خَيْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ وَتُفْتَحُ الْعِرَاقُ، فَيَأْتِي قَوْمٌ يُبِسُّونَ، فَيَتَحَمَّلُونَ بِأَهْلِيهِمْ وَمَنْ أَطَاعَهُمْ، وَالْمَدِينَةُ خَيْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ»

''یمن فتح ہوگا تو کچھ لوگ اپنی سواریوں کو دوڑاتے ہوئے لائیں گے اور اپنے گھر والوں کو اور ان کو جو ان کی بات مانیں گے اپنے ساتھ (یمن میں قیام کے لیے) لے جائیں گے۔ کاش انھیں معلوم ہو کہ مدینہ ہی ان کے لیے بہتر ہے، اور شام فتح ہوگا تو کچھ لوگ اپنی سواریوں کو دوڑاتے ہوئے لائیں گے اور اپنے گھر والوں اور ان تمام لوگوں کو جو ان کی بات مان لیں گے، اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ کاش انھیں معلوم ہو کہ مدینہ ہی ان کے لیے بہتر ہے اور عراق فتح ہوگا تو کچھ لوگ اپنی سواریاں دوڑاتے ہوئے لائیں گے اور اپنے گھر والوں کو اور جو ان کی بات مان لیں گے، اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ کاش انھیں معلوم ہو کہ مدینہ ہی ان کے لیے بہتر ہے۔''[2]

مذکورہ بالا اور دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی اغراض کے لیے اور مدینے سے بے رغبتی اختیار کرتے ہوئے اسے چھوڑنا بہتر نہیں۔

مدینہ کی تکالیف اور مشقتوں پر صبر کرنا

مدینہ میں قیام پذیر رہنے ہی میں بھلائی اور بہتری ہے اگر چہ مدینہ میں رہتے ہوئے کچھ مصائب، مشقتوں اور مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑے۔ مدینہ کی مشقتوں اور مصیبتوں پر صبر کرنے کی جو فضیلت ہے، وہ کسی دوسری جگہ کی

[1] صحيح البخاري: 1881. [2] صحيح البخاري: 1875.

مصیبتیں جھیلنے میں نہیں۔ انسان جہاں بھی رہے کچھ نہ کچھ مشکلات اور تکالیف تو انسان کو بہرحال برداشت کرنی پڑتی ہیں لیکن مدینہ میں رہتے ہوئے جو مشکلات اور آلام برداشت کیے جائیں گے، ان کی بڑی زبردست فضیلت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا يَثْبُتُ أَحَدٌ عَلَى لَأْوَائِهَا وَجَهْدِهَا إِلَّا كُنْتُ لَهُ شَفِيعًا أَوْ شَهِيدًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

''جو شخص مدینہ کی سختیوں اور مشقتوں پر ثابت قدم اور صابر رہا تو قیامت کے دن میں اس کے لیے گواہ اور سفارشی ہوں گا۔''[1]

مدینہ میں بدعت کا موجد ملعون ہے

اللہ تعالیٰ نے مدینہ طیبہ کی ہر برے شخص کی برائی سے حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہر اس آدمی کو جو اس مقدس و مکرم شہر میں بدعت ایجاد کرے یا بدعتی کو پناہ دے یا اہل مدینہ کو ڈرائے، اسے اللہ کی طرف سے لعنت، عذاب اور عاجلانہ ہلاکت کا پیغام سنایا ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَكِيدُ أَهْلَ الْمَدِينَةِ أَحَدٌ إِلَّا انْمَاعَ، كَمَا يَنْمَاعُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ»

''جو شخص اہل مدینہ سے مکر کرے گا، وہ اس طرح پگھل جائے گا جس طرح پانی میں نمک گھل جاتا ہے۔''[2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْمَدِينَةُ حَرَمٌ، فَمَنْ أَحْدَثَ فِيهَا حَدَثًا، أَوْ آوَى مُحْدِثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لَا يُقْبَلُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَدْلٌ وَّلَا صَرْفٌ»

''مدینہ حرمت والا (شہر) ہے، پس جس نے وہاں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی، اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، قیامت والے دن اس کی کوئی فرضی یا نفلی عبادت قبول نہیں کی جائے گی۔''[3]

ترے آنگن میں مرنا زندگی ہے

مدینہ کی سختیوں اور مشقتوں کو جھیلنا فضیلت کا باعث ہے۔ مزید برآں جسے مدینہ میں رہتے ہوئے موت نے آلیا،

[1] صحيح مسلم: 1363. [2] صحيح البخاري: 1877، صحيح مسلم: 1387. [3] صحيح مسلم: 1371.

اس کی زبردست فضیلت کے کیا کہنے! وہاں جینے کی بھی فضیلت ہے وہاں مرنے کی بھی فضیلت ہے۔ کوئی حالت برکات سے خالی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنِ اسْتَطَاعَ أَنْ يَمُوتَ بِالْمَدِينَةِ فَلْيَمُتْ بِهَا، فَإِنِّي أَشْفَعُ لِمَنْ يَمُوتُ بِهَا»

"جو مدینہ میں مرسکتا ہے اسے چاہیے کہ وہ مدینہ ہی میں مرے، بے شک میں مدینہ میں مرنے والے شخص کی قیامت کے دن شفاعت کروں گا۔" [1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دعا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ! ارْزُقْنِي شَهَادَةً فِي سَبِيلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِي فِي بَلَدِ رَسُولِكَ.

"اے اللہ! مجھے اپنے رستے میں شہادت عطا فرما اور اپنے رسول کے شہر میں موت نصیب فرما۔" [2]

اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعا قبول فرمائی، وہ مسجد نبوی میں نماز فجر میں لوگوں کی امامت فرما رہے تھے کہ انھیں ایک شقی القلب نے محراب میں شہید کر دیا۔

ایمان کی پناہ گاہ

مدینہ کی ایک بہت اہم فضیلت یہ بھی ہے کہ "ایمان" جو سب سے قیمتی چیز ہے، جس سے مسلمانوں کو دنیا اور آخرت میں عزت نصیب ہوتی ہے، اس کی آخری جگہ بھی مدینہ ہی ہے، اللہ نہ کرے ایمان دنیا کے ہر خطے میں ناپید ہو جائے لیکن مدینہ میں بہرحال موجود رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ الْإِيمَانَ لَيَأْرِزُ إِلَى الْمَدِينَةِ كَمَا تَأْرِزُ الْحَيَّةُ إِلَى جُحْرِهَا»

"بے شک ایمان مدینہ کی طرف اس طرح سمٹ آئے گا جیسے سانپ اپنے بل میں لوٹ آتا ہے۔" [3]

مدینہ منورہ کے کنووں کا ذکر

یہاں ان کنووں کا ذکر کیا جاتا ہے جن سے نبی ﷺ نے پانی لیا اور ان میں اپنا لعاب دہن ڈالا۔

بَیْرُحاء کا کنواں: ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اپنے باغات کی وجہ سے مدینہ کے انصار میں سب سے زیادہ مالدار تھے، انھیں اپنی تمام جائیداد میں سب سے زیادہ پسندیدہ بَیْرُحاء کا باغ تھا۔ یہ باغ مسجد نبوی کے بالکل سامنے واقع تھا اور رسول اللہ ﷺ اس میں تشریف لے جایا کرتے تھے اور اس کا شیریں پانی بھی نوش فرماتے تھے، انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب

[1] جامع الترمذي: 3917، مسند أحمد: 104/2. [2] صحيح البخاري: 1890. [3] صحيح البخاري: 1876.

یہ آیت نازل ہوئی:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾

''تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنھیں تم عزیز رکھتے ہو۔''[1]

تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ فوراً رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہ! اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''تم اس وقت تک نیکی نہیں پا سکتے جب تک اپنی پسندیدہ چیز نہ خرچ کرو'' مجھے بَیْرُ حاء کی جائیداد سب سے زیادہ پسند ہے، اس لیے وہ اللہ کی راہ میں صدقہ ہے، میں اس کے صلے میں نیکی اور ذخیرۂ آخرت کا امیدوار ہوں، اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ اسے جہاں مناسب سمجھیں استعمال فرمائیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«بَخٍ ذٰلِكَ مَالٌ رَّابِحٌ، ذٰلِكَ مَالٌ رَّابِحٌ، وَقَدْ سَمِعْتُ مَا قُلْتَ، وَإِنِّي أَرٰى أَنْ تَجْعَلَهَا فِي الْأَقْرَبِينَ»

''خوب! یہ تو بڑا ہی مفید مال ہے، بہت فائدہ مند مال ہے، اور جو بات تم نے کہی میں نے سن لی ہے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ تم اسے اپنے عزیز و اقرباء کو دے دو۔''

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بولے: یارسول اللہ! میں ایسا ہی کروں گا، چنانچہ انھوں نے اسے اپنے رشتہ داروں اور چچازاد بھائیوں کو دے دیا۔[2]

یہ باغ اور کنواں اب مسجد نبوی کی توسیع میں شامل ہو گیا ہے۔

اریس کا کنواں: سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انھوں نے ایک دن اپنے گھر میں وضو کیا اور اس ارادے سے نکلے کہ آج دن بھر رسول اللہ ﷺ کی رفاقت میں رہوں گا، انھوں نے بیان کیا کہ پھر میں مسجد نبوی میں حاضر ہوا اور حضور اکرم ﷺ کے متعلق پوچھا تو وہاں موجود لوگوں نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے جا چکے ہیں اور آپ ﷺ اُدھر فلاں سمت تشریف لے گئے ہیں۔ چنانچہ میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق پوچھتا پوچھتا آپ کے پیچھے چل دیا۔ آخر میں نے آپ ﷺ کو پالیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ (قباء کے قریب) بئر اریس والے باغ میں داخل ہو رہے ہیں۔ میں دروازے ہی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دروازہ کھجور کی شاخوں کا بنا ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ ادھر رفعِ حاجت کے لیے تشریف لائے تھے۔ فراغت کے بعد جب آپ ﷺ نے وضو بھی کر لیا تو میں آپ کے پاس گیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ بئر اریس کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ نے پنڈلیاں کھول رکھی ہیں اور کنویں میں پاؤں لٹکا کر

[1] آل عمرٰن3:92. [2] صحیح البخاري:1461.

تشریف فرما ہیں۔ میں نے آپ ﷺ کو سلام کیا اور پھر واپس آ کر باغ کے دروازے پر بیٹھ گیا، میں نے سوچا کہ آج رسول اللہ ﷺ کا دربان بن کر رہوں گا، اتنی دیر میں ابوبکر رضی اللہ عنہ آ گئے۔ انھوں نے دروازہ کھولنا چاہا، تو میں نے پوچھا کہ کون صاحب ہیں؟ انھوں نے فرمایا: ابوبکر، میں نے کہا: تھوڑی دیر ٹھہر جائیے، پھر میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ دروازے پر موجود ہیں اور آپ کی خدمت میں آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اِئْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ» ''انھیں اجازت دو اور جنت کی بشارت بھی دے دو۔'' میں دروازے پر آیا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا اندر تشریف لے جائیے۔ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو جنت کی بشارت دی ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اندر داخل ہوئے اور اس کنویں کی منڈیر پر رسول اللہ ﷺ کے داہنی طرف بیٹھ گئے۔ انھوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کی طرح اپنے دونوں پاؤں کنویں میں لٹکا دیے اور اپنی پنڈلیاں بھی کھول لیں۔ پھر میں واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ میں آتے وقت یہ سوچ رہا تھا کہ میرے بھائی بھی میرے ساتھ آنے والے تھے۔ میں نے اپنے دل میں کہا: کاش اللہ تعالیٰ میرے بھائی کو خبر کر دے اور انھیں کسی طرح یہاں پہنچا دے۔ اتنے میں کسی صاحب نے دستک دی۔ میں نے پوچھا: کون ہے؟ کہا: عمر بن خطاب۔ میں نے کہا: تھوڑی دیر ٹھہر جائیں، چنانچہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کے بعد عرض کیا کہ عمر بن خطاب دروازے پر کھڑے ہیں اور اجازت چاہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اِئْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ» ''اجازت دے دو اور جنت کی بشارت بھی دے دو۔'' میں واپس آیا اور کہا: اندر تشریف لے جائیے۔ آپ کو رسول اللہ ﷺ نے جنت کی بشارت دی ہے۔ وہ داخل ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اسی منڈیر پر بائیں طرف بیٹھ گئے۔ انھوں نے بھی اپنے پاؤں کنویں میں لٹکا دیے، میں پھر دروازے پر آ کر بیٹھ گیا اور سوچتا رہا کہ کاش! اللہ تعالیٰ میرے بھائی کے لیے بھی خیر چاہتے ہوئے انھیں یہاں پہنچا دے۔ اتنے میں ایک صاحب آئے۔ انھوں نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے پوچھا: کون ہے؟ بولے: عثمان بن عفان، میں نے کہا: تھوڑی دیر کے لیے توقف کیجیے۔ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ کو ان کی آمد کی اطلاع دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اِئْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ عَلٰى بَلْوٰى تُصِيبُهُ» ''انھیں اجازت دے دو اور ایک مصیبت انھیں پہنچے گی، اس پر جنت کی بشارت بھی پہنچا دو۔'' میں دروازے پر آیا۔ ان سے کہا: اندر تشریف لے جائیے، ایک مصیبت آپ کو پہنچے گی، اُس پر رسول اللہ ﷺ نے آپ کو جنت کی بشارت دی ہے۔ آپ جب داخل ہوئے تو دیکھا کہ منڈیر پر جگہ نہیں ہے، چنانچہ آپ دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھ گئے۔[1]

[1] صحيح البخاري: 3674.

یہی اریس کنواں تھا جس میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے رسول اللہ ﷺ کی چاندی کی انگوٹھی گر گئی تھی۔ جسے رسول اللہ ﷺ کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ اور پھر عمر رضی اللہ عنہ نے بھی استعمال کیا تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پانی نکال نکال کر اسے تین دن تک تلاش کرایا لیکن وہ انگوٹھی نہیں ملی۔ [1]

بُضَاعَہ کا کنواں: ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ آپ کو بضاعہ کے کنویں کا پانی پلایا جاتا ہے جبکہ اس میں کتے کا گوشت، حیض کی دھجیاں اور گندگی پڑ جاتی ہے، تو اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ الْمَاءَ طَهُورٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ»

''بے شک پانی پاک ہے، اسے کوئی چیز نجس نہیں کرتی۔'' [2]

دوسری روایات میں رسول اللہ ﷺ کا بضاعہ کے کنویں سے وضو کرنے کا ذکر ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ دیکھنے والے نے جب اس کنویں سے رسول اللہ ﷺ کو وضو کرتے دیکھا تو یہی متذکرہ بالا بات کہی۔ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا ''پانی پاک ہے، اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی۔'' [3]

رُومَہ کا کنواں: یہ کنواں ایک یہودی کی ملکیت تھا۔ اس کا پانی میٹھا تھا۔ مسلمان یہاں سے پانی خرید کر استعمال کرتے تھے۔ اس کنویں کو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ اس عمل پر آپ کو رسول اللہ ﷺ نے جنت کی بشارت دی۔ [4]

بخاری کی روایت میں ہے کہ جب عثمان رضی اللہ عنہ محاصرے میں لے لیے گئے تو آپ نے اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر باغیوں سے کہا تھا:

بئر رومہ

أَنْشُدُكُمُ اللّٰهَ وَلَا أَنْشُدُ إِلَّا أَصْحَابَ النَّبِيِّ ﷺ، أَلَسْتُمْ تَعْلَمُونَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ حَفَرَ بِئْرَ رُومَةَ فَلَهُ الْجَنَّةُ» فَحَفَرْتُهَا......

''میں تم سے اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں اور صرف نبی اکرم ﷺ کے اصحاب سے پوچھتا ہوں: کیا آپ لوگوں کو معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص بئر رومہ کھودے (خریدے) گا، اس کے لیے جنت

[1] صحيح البخاري: 5866 و5879. [2] سنن أبي داود: 67. [3] سنن النسائي: 328,327. [4] جامع الترمذي: 3699، 3703.

ہے۔'' پس میں نے اسے کھودا تھا......۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی یہ بات سن کر صحابہ رضی اللہ عنہم نے تصدیق کی کہ آپ سچ فرماتے ہیں۔ [1]

غرس نامی کنواں: یہ کنواں قبا کے علاقے میں تھا جیسا کہ درج ذیل روایت سے وضاحت ہوتی ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ قبا گئے۔ وہاں انھوں نے کنویں کے متعلق پوچھا۔ انھیں کنویں کا پتا بتایا گیا۔ وہ وہاں پہنچے تو کہنے لگے: ہاں! یہی ہے وہ کنواں جس سے آدمی اپنے گدھے کے ذریعے سے پانی نکالا کرتا تھا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کا ڈول نکالنے کا حکم دیا۔ ڈول نکالا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پانی سے وضو کیا یا اس میں اپنا لعاب دہن ڈالا، پھر یہ پانی واپس کنویں میں ڈال دیا گیا۔ اس کے بعد یہ کبھی خشک نہیں ہوا۔ [2]

[1] صحيح البخاري (تعليقًا): 2778. [2] دلائل النبوة للبيهقي: 136/6.

وادیِ عقیق، جبل احد اور بقیع کی فضیلت

فضیلت وادیِ عقیق

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرما رہے تھے:

«أَتَانِي اللَّيْلَةَ آتٍ مِّنْ رَّبِّي، فَقَالَ: صَلِّ فِي هٰذَا الْوَادِي الْمُبَارَكِ، وَقُلْ: عُمْرَةٌ فِي حَجَّةٍ»

''رات میرے پاس میرے رب کا ایک فرستادہ آیا اور کہا کہ اس مبارک وادی میں نماز پڑھو اور اعلان کر دو کہ میں نے حج کے ساتھ عمرے کا احرام بھی باندھ لیا ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کے بعد عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب بھی اس وادی سے گزرتے تو اس مقام پر قیام فرماتے جہاں رسول اللہ ﷺ نے قیام فرمایا تھا۔ یہ جگہ اس مسجد کے زیریں حصے میں واقع ہے جو وادیِ عقیق کے درمیان ہے اور ان کے قیام کی جگہ راستے اور وادی کے بیچ میں ہے۔[2]

فضیلت جبل احد

احد ایک پہاڑ ہے جو مدینہ منورہ کے شمالی جانب واقع ہے۔ یہ مسجد نبوی سے ساڑھے پانچ کلومیٹر دور ہے۔ آج کل مدینہ منورہ کی آبادی اس مقام تک پہنچ چکی ہے بلکہ اس کے اردگرد پھیلی ہوئی ہے۔ احد پہاڑ بالاتفاق حَرم مدنی میں داخل ہے، اِسی وجہ سے اسے حرم کی فضیلت حاصل ہوگئی، اس کا رنگ سرخی مائل ہے۔ اس کی لمبائی مشرق سے مغرب تک تقریباً چھ کلومیٹر ہے۔

ابوحمید الساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ہم نبی ﷺ کے ساتھ غزوۂ تبوک سے واپس مدینہ آ رہے تھے، جب ہم مدینہ کے پاس پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«هٰذِهِ طَابَةُ وَهٰذَا أُحُدٌ جَبَلٌ يُّحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ»

---

1 صحيح البخاري: 1534. 2 صحيح البخاري: 1535.

''یہ مدینہ ہے اور یہ احد ہے، یہ ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔''[1]

اسی طرح جب آپ غزوہ خیبر سے واپس تشریف لا رہے تھے، اُس وقت بھی یہی الفاظ کہے، چنانچہ سوید انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ خیبر سے لوٹ رہے تھے۔ جونہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر احد پہاڑ پر پڑی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَللّٰهُ أَكْبَرُ جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ»

''اللہ سب سے بڑا ہے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر بلند آہنگی سے کہی، پھر فرمایا:) یہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔''[2]

ایک دوسرے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«هٰذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَ نُحِبُّهُ، اَللّٰهُمَّ! إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَ إِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا»

''یہ احد کا پہاڑ ہم سے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ اے اللہ! ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کو حرم قرار دیا اور میں دو حروں کی درمیانی زمین مدینہ کو حرم قرار دیتا ہوں۔''[3]

[1] صحيح البخاري :4422. [2] مسند أحمد :443/3. [3] صحيح البخاري :4084، صحيح مسلم :1362.

محبت کا پہاڑ۔ جبلِ اُحد

حضرت انس بن مالک ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ احد پہاڑ پر چڑھے (آپ کا احد پہاڑ پر چڑھنا ہی اس کے لیے بے مثال فضیلت کا باعث ہے)۔ آپ ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان ؓ بھی تھے، اچانک پہاڑ ہلنے لگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«اُثْبُتْ أُحُدُ! فَإِنَّمَا عَلَيْكَ نَبِيٌّ وَّ صِدِّيقٌ وَّشَهِيدَانِ»

''احد! پرسکون ہو جا، تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔'' [1]

احد پہاڑ ہی کے پاس وہ افسوسناک سانحہ پیش آیا تھا جس میں نبی اکرم ﷺ کے چچا سیدنا حمزہ ؓ اور ستر دوسرے مسلمان شہید ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا رباعی دانت ٹوٹ گیا تھا، آپ کا چہرہ انور زخمی ہوا تھا اور آپ کے لب مبارک پر بھی زخم آیا تھا۔ اس دن کی لڑائی غزوہ احد کے نام سے معروف ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب جنازے کی پیروی کرنے کی فضیلت بیان کی تو اس کے اجر کی بہتات کو احد پہاڑ سے نسبت دی جیسا کہ درج ذیل حدیث میں ہے۔ براء بن عازب ؓ بیان کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ تَبِعَ جَنَازَةً حَتّٰى يُصَلّٰى عَلَيْهَا كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ قِيرَاطٌ، وَمَنْ مَشٰى مَعَ الْجَنَازَةِ حَتّٰى تُدْفَنَ كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ قِيرَاطَانِ، وَالْقِيرَاطُ مِثْلُ أُحُدٍ»

''جو شخص جنازے کے پیچھے چلا حتی کہ اس پر نماز پڑھی گئی، اس کے لیے ایک قیراط اجر ہے اور جو شخص جنازے کے ساتھ چلا حتی کہ اسے دفن کر دیا گیا، اس کے لیے دو قیراط اجر ہے اور قیراط احد پہاڑ کے برابر ہے۔'' [2]

احد پہاڑ

بقیع کی فضیلت

ام المؤمنین عائشہ ؓ بیان کرتی ہیں: جب بھی رسول اللہ ﷺ میری باری والے دن میرے ہاں تشریف لاتے تو رات کے آخری حصے میں بقیع کی طرف تشریف لے جاتے اور یہ دعا مانگتے:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ، وَ أَتَاكُمْ مَّا تُوعَدُونَ غَدًا مُّؤَجَّلُونَ، وَ إِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ

[1] صحيح البخاري: 3675. [2] سنن النسائي: 1942.

لَاحِقُونَ، اَللّٰهُمَّ! اغْفِرْ لِأَهْلِ بَقِيعِ الْغَرْقَدِ»

''اس گھر کے مومن مکینو! تم پر سلامتی ہو، تمھیں کل وہ چیز ضرور مل جائے گی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، (بس) تھوڑی سی دیر ہے اور اگر اللہ نے چاہا، ہم تم سے ضرور ملنے والے ہیں۔ اے اللہ! بقیع غرقد والوں کی مغفرت فرما۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: کیا میں تمھیں اپنی آپ بیتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیتی نہ بتاؤں؟ صحابی کہتے ہیں: ہم نے عرض کیا: ام المؤمنین! ضرور بتائیے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میری باری کی رات تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کروٹ لی، پھر اپنی چادر سنبھالی اور جوتے نکال کر اپنے پائے مبارک کے آگے رکھ دیے، پھر چادر کا کنارہ اپنے بچھونے پر بچھایا اور لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر ٹھہرے رہے حتی کہ آپ نے خیال کیا کہ میں سوگئی ہوں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آہستہ سے چادر لی، آہستہ آہستہ جوتے پہنے، چپکے سے دروازہ کھولا، خاموشی سے باہر نکلے اور آہستہ سے دروازہ بند کر دیا، اِدھر میں نے بھی اپنی چادر سر پر اوڑھی، گھونگھٹ مارا، تہبند پہنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے چل دی یہاں تک کہ آپ بقیع پہنچے۔ وہاں آپ دیر تک کھڑے رہے، پھر تین بار دونوں ہاتھ اٹھائے اور واپس تشریف لانے لگے۔ میں بھی لوٹ آئی۔ آپ جلدی جلدی چلنے لگے۔ میں بھی جلدی جلدی چل پڑی۔ آپ دوڑے، میں بھی دوڑنے لگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر پہنچ گئے۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے

[1] صحیح مسلم: 974.

مدینہ منورہ کا قبرستان ''البقیع''

قدرے پہلے ہی گھر آ پہنچی اور آتے ہی ایک دم لیٹ گئی۔ جب آپ ﷺ تشریف لائے تو مجھ سے پوچھنے لگے: «مَالَكِ يَا عَائِشُ! حَشْيَا رَابِيَةً» ”اے عائشہ! کیا ہوا؟ تمھارا سانس پھول رہا ہے اور پیٹ بھی پھولا ہوا ہے۔“ میں نے عرض کیا: مجھے کچھ نہیں ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «لَتُخْبِرِينِي أَوْ لَيُخْبِرَنِّي اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ» ”تم ہی ٹھیک بتاؤ ورنہ مجھے وہ باریک بین ہر چیز سے آگاہ و آشنا اور خبردار مطلع کر دے گا۔“ میں نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، پھر میں نے آپ ﷺ کو ساری بات بتا دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «فَأَنْتِ السَّوَادُ الَّذِي رَأَيْتُ أَمَامِي» ”(اچھا) وہ سایہ جو میرے آگے نظر آتا تھا، وہ تم ہی تھیں؟“ عرض کیا: جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا جس کی ضرب سے مجھے درد ہوا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «أَظَنَنْتِ أَنْ يَحِيفَ اللّٰهُ عَلَيْكِ وَرَسُولُهُ؟» ”کیا تم نے یہ خیال کیا کہ اللہ اور اس کا رسول تمھارا حق دبا لے گا؟“ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: جی ہاں! لوگ چاہے کتنا ہی چھپائیں اللہ تو سب کچھ جانتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَإِنَّ جِبْرِيلَ أَتَانِي حِينَ رَأَيْتِ فَنَادَانِي فَأَخْفَاهُ مِنْكِ فَأَجَبْتُهُ، فَأَخْفَيْتُهُ مِنْكِ وَلَمْ يَكُنْ يَدْخُلُ عَلَيْكِ وَقَدْ وَضَعْتِ ثِيَابَكِ وَظَنَنْتُ أَنْ قَدْ رَقَدْتِ فَكَرِهْتُ أَنْ أُوقِظَكِ، وَخَشِيتُ أَنْ تَسْتَوْحِشِي، فَقَالَ: إِنَّ رَبَّكَ يَأْمُرُكَ أَنْ تَأْتِيَ أَهْلَ الْبَقِيعِ فَتَسْتَغْفِرَ لَهُمْ»

”میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے جس وقت تم نے دیکھا۔ انھوں نے مجھے پکارا اور تم سے چھپایا، پس میں نے بھی اسے تم سے چھپایا، اور وہ تمھارے پاس نہیں آتے جبکہ تم نے اپنا کپڑا اتار دیا تھا۔ میں سمجھا کہ تم سو گئی ہو۔ مجھے گوارا نہ ہوا کہ تمھیں جگاؤں، مجھے یہ بھی خوف تھا کہ تم گھبرا جاؤ گی، پھر جبریل علیہ السلام نے مجھ سے کہا: آپ کے پروردگار نے آپ کو حکم دیا ہے کہ بقیع جائیے اور خاموش مکینوں کے لیے مغفرت مانگیے۔“

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: میری رہنمائی فرمائیے کہ میں ان قبر والوں کے لیے کیا کہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«قُولِي: اَلسَّلَامُ عَلٰى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ وَ يَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِينَ وَ إِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُونَ»

”تم کہو: اے دیارِ خاموش کے مومن اور مسلمان مکینو! تم پر سلامتی ہو اور بلاشبہ اگر اللہ نے چاہا تو ہم بھی تم سے ضرور ملنے والے ہیں، اللہ پہلے جانے والوں اور بعد میں جانے والوں پر رحم فرمائے۔“[1]

[1] صحیح مسلم: (103)-974.

باب
5
سیرت انسائیکلوپیڈیا
ہجرت مدینہ
رسول اللہ ﷺ اور اہل اسلام کی حکم الٰہی سے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ
کی طرف ہجرت کا ایمان افروز تذکرہ اور انصار کی
مہاجرین کے لیے ایثار کی بے مثل سرگزشت

”پھر جن لوگوں نے ہجرت کی اور انھیں ان کے گھروں سے نکال دیا گیا اور انھیں میری راہ
میں تکلیفیں دی گئیں اور انھوں نے جہاد کیا اور وہ قتل ہوئے تو میں ضرور ان کی برائیاں
ان سے دور کردوں گا اور یقیناً انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا
جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔“(آل عمرٰن 195:3)

اس باب میں

ساری دنیا کی قومیں اپنی تاریخ کا آغاز اُس دن سے کرتی ہیں جس دن اور تاریخ کو ان کا سب سے بڑا حکمران یا بادشاہ پیدا ہوا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی ملّی تاریخ کا آغاز دنیا کے سب سے بڑے انسان کی پیدائش سے نہیں بلکہ سب سے بڑے عمل، یعنی اپنا گھر بار، اپنا مال اور اپنا وطن چھوڑ کر اللہ کی راہ میں نکلنے سے ہوا۔ اِس نقل مکانی کو ہجرت کے مقدس عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے حکمران اپنے عروج کی بنیاد دوسرے ملکوں کو فتح کر کے رکھتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے عروج اسلام کی بنیاد خود اپنا وطن چھوڑ کر رکھی۔ آپ ﷺ نے مکہ کے در و بام پر حسرت کی الوداعی نگاہ ڈالی اور غار ثور کی طرف چل دیے۔ تین دن کی پناہ گزینی کے بعد تپتے ہوئے صحرا کے نشیب و فراز عبور کر کے مدینہ پہنچے۔ یوں آپ کو معلوم ہوگا کہ ہجرت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ یہ مقدس نقل و حرکت کس پر فرض ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ہجرت کی اجازت کس پس منظر میں دی گئی؟ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کس دلیری سے علی الاعلان ہجرت کی، محمد رسول اللہ ﷺ کا مدینہ منورہ میں کتنا پُر تپاک تاریخی استقبال ہوا، پھر مہاجرین مکہ مدینہ کی بستی میں کس طرح بسے؟ اور انھوں نے کس تندہی اور جفاکشی سے اپنے وسائل معیشت خود فراہم کر کے کیسی خودداری اور حفظ خودی کا ثبوت دیا۔ اس طرح آپ کو اس باب میں تاریخ کی اِس عظیم ترین ہجرت کے ایمان افروز حالات اور عجائبات کی ولولہ انگیز تفصیلات پوری شرح و بسط سے معلوم ہوں گی۔

ہجرت اور اس کے احکام

ہجرتِ مدینہ تاریخ انسانیت کا انتہائی اہم اور رفیع الشان انقلابی واقعہ ہے۔ قریش مکہ ظلم وتشدد کے ذریعے سے دین و اعتقاد کا فیصلہ کرنا چاہتے تھے مگر رسول اللہ ﷺ نے نہایت محکم اور متین انداز سے بتا دیا کہ دین کی بنیاد علم و بصیرت ہے، آباء و اجداد کی تقلید اور تشدد کے حربے دین کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ مشرکین مکہ کی ستم گری حد سے بڑھ گئی ہے اور وہ اللہ کے دین کے ابلاغ کی راہ میں سنگ گراں کھڑے کر رہے ہیں تو آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے ہجرت کا فیصلہ فرمایا۔ یہ تاریخ عالم کا وہ عظیم الشان فیصلہ تھا جس نے انسانی تاریخ کا دھارا بدل ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرکین کی اسلام دشمنی اور نبیِ اکرم ﷺ اور آپ کے اصحابِ گرامی پر ظلم وستم اور انسانیت کی پامالی کے علاوہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کی ترویج و اشاعت اور ان کی بجا آوری میں مزاحمت ہی ہجرت کا باعث بنی اور ہجرت سارے نظام عالم کی تبدیلی کا سبب بن گئی۔

مسجد نبوی کا ایک خوبصورت منظر

ہجرت کے معنی

ہجرت کے لغوی معنی ہیں: چھوڑنا، پھر اس لفظ کا ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں چلے جانے پر اطلاق ہونے لگا، البتہ یہ لفظ اس وقت زیادہ مشہور ہوا جب مسلمان مکہ سے مدینہ منتقل ہوئے۔ شرعی مصادر میں اب اگر ہجرت کا نام لیا جائے تو اس سے عام طور پر ہجرتِ مدینہ ہی مراد ہوتی ہے اور اگر ہجرتین کا ذکر آئے تو اس سے ہجرتِ حبشہ اور ہجرت مدینہ مراد ہے۔

ہجرت کے شرعی معنی ہیں: ''جس کام سے اللہ نے منع کیا ہو، اسے چھوڑ دیا جائے۔''

ہجرت کی اہمیت

ہجرت ایک عظیم الشان عمل ہے، اس سے دین اسلام کی عظمت ورفعت کو چار چاند لگ گئے۔ جہاں اس کی بدولت مسلمانوں کو مصائب والم سے نجات ملی، وہاں انھیں اللہ کی اطاعت و بندگی میں یکسوئی کے ساتھ مکمل حریت اور آزادی نصیب ہوئی۔ ہجرت کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ لوگوں سے جنگ کی جائے، انھیں مال و اسباب سے محروم کیا جائے اور نہ یہ کہ جس طرح کا رویہ دشمنان اسلام نے مکہ میں اپنایا، اس کا بدلہ لینا مقصود تھا بلکہ اس کاوش کا مقصد امن وسکون کے ساتھ بھائی چارے کو قائم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل پیرا ہونا اور اس کے فروغ کے لیے تمام توانائیوں کو بروئے کار لاکر امکانی حد تک جدوجہد کرنا تھا۔

پہلی امتوں کے ہاں ہجرت نبوی کا تذکرہ

اللہ تعالیٰ نے پہلی آسمانی کتابوں میں مدینہ منورہ کا تذکرہ اس لیے کیا تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ اسی قریۂ جمال میں تشریف لائیں گے، چنانچہ پہلی امتوں کو یقین تھا کہ ایک نبی بلدالامین سے طیبہ، طابہ کی طرف ہجرت کرے گا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مجھے سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اپنے قبول اسلام کا واقعہ سنایا کہ وہ کیسے ناز ونعمت اور لاڈ پیار میں پلے بڑھے، اپنے آبائی دین مجوسیت سے کیسے بیزار ہوئے اور اس جویائے حق نے حق کی تلاش میں کتنے کٹھن مراحل طے کیے اور کن کن مشکل گھاٹیوں کو عبور کر کے مختلف پادریوں سے دینِ مسیح کی تعلیم حاصل کی اور آخر کار منزل مقصود تک کیسے پہنچے؟ وہ بیان کرتے ہیں کہ مجوسیوں کے آتش کدے میں آگ جلانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی۔ ایک دن میں اپنی جاگیر کی طرف جانے کے لیے گھر سے نکلا تو میرا گزر

عموریہ (ترکی) کے قدیم اور جدید مناظر

عیسائیوں کے ایک گرجے کے پاس سے ہوا۔ ان کی عبادت میں مجھے کشش محسوس ہوئی۔ میں نے ان کے دین کی تعلیم حاصل کرنے کے متعلق آگہی حاصل کی۔ میرے گھر والوں کو پتہ چلا تو مجھے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ ایک دن میں کسی نہ کسی طریقے آہنی گرفت سے چھٹکارا حاصل کر کے شام کی طرف جانے والے قافلے سے جا ملا، شام میں دین مسیح کے سب سے بڑے پادری کے پاس پہنچا۔ اس کی رفاقت میں شب و روز گزرنے لگے۔ میں اس کے علم سے فیض یاب ہونے لگا۔ کچھ عرصے بعد وہ فوت ہوگیا، پھر اس کی جگہ دوسرے پادری سے مستفید ہوتا رہا۔ تھوڑی ہی مدت بعد وہ فوت ہوگیا۔ اس کی وصیت کے مطابق میں تحصیل علم کے لیے موصل چلا گیا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ وہاں کے پادری کو اللہ کا بلاوا آ گیا۔ اس نے مجھے نصیبین میں دین مسیح کے بڑے عالم کے پاس جانے کی وصیت کی۔ وہاں سے علم حاصل کیا۔ لیکن اللہ کی قسم! کچھ ہی دنوں بعد اس پر بھی عالم نزع طاری ہوگیا۔ اس پادری نے مجھے روم (موجودہ ترکی) میں عموریہ کے علاقے میں بھیج دیا۔ کچھ دنوں بعد اس کی وفات کا وقت بھی آ پہنچا تو اس نے مرتے وقت مجھے یہ وصیت کی:

أَيْ بُنَيَّ! وَاللّٰهِ! مَا أَعْلَمُهُ أَصْبَحَ عَلٰى مَا كُنَّا عَلَيْهِ أَحَدٌ مِّنَ النَّاسِ آمُرُكَ أَنْ تَأْتِيَهُ قَدْ أَظَلَّكَ زَمَانُ نَبِيٍّ هُوَ مَبْعُوثٌ بِدِينِ إِبْرَاهِيمَ، يَخْرُجُ بِأَرْضِ الْعَرَبِ مُهَاجِرًا إِلٰى أَرْضٍ بَيْنَ حَرَّتَيْنِ، بَيْنَهُمَا نَخْلٌ، بِهِ عَلَامَاتٌ لَا تَخْفٰى، يَأْكُلُ الْهَدِيَّةَ وَلَا يَأْكُلُ الصَّدَقَةَ، بَيْنَ كَتِفَيْهِ خَاتَمُ النُّبُوَّةِ، فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَلْحَقَ بِتِلْكَ الْبِلَادِ فَافْعَلْ .

”اے میرے بچے! اللہ کی قسم! میں کسی شخص کو نہیں جانتا جو اس دین (عیسائیت) پر ہو جس پر ہم ہیں تا کہ میں تجھے اس کے پاس جانے کا حکم دوں۔ لیکن اب تم پر اس نبی کے دور کا سایہ پڑنے لگا ہے جو ابراہیمی دین کے ساتھ مبعوث ہوگا۔ وہ سرزمین عرب سے ایسی جگہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلے گا جو دو حروں کے درمیان ہوگی۔ ان دو حروں کے درمیان نخلستان ہوگا۔ اس کی صفات واضح ہوں گی۔ وہ ہدیہ قبول کرے گا، صدقہ نہیں کھائے گا۔ اس کے کندھوں کے درمیان نبوت کی مہر ہوگی۔ اگر تمھیں اس علاقے کی طرف جانے کی ہمت و قدرت ہو تو (ان کے پاس) ضرور جانا۔“ [1]

[1] مسند أحمد: 443,442/5 .
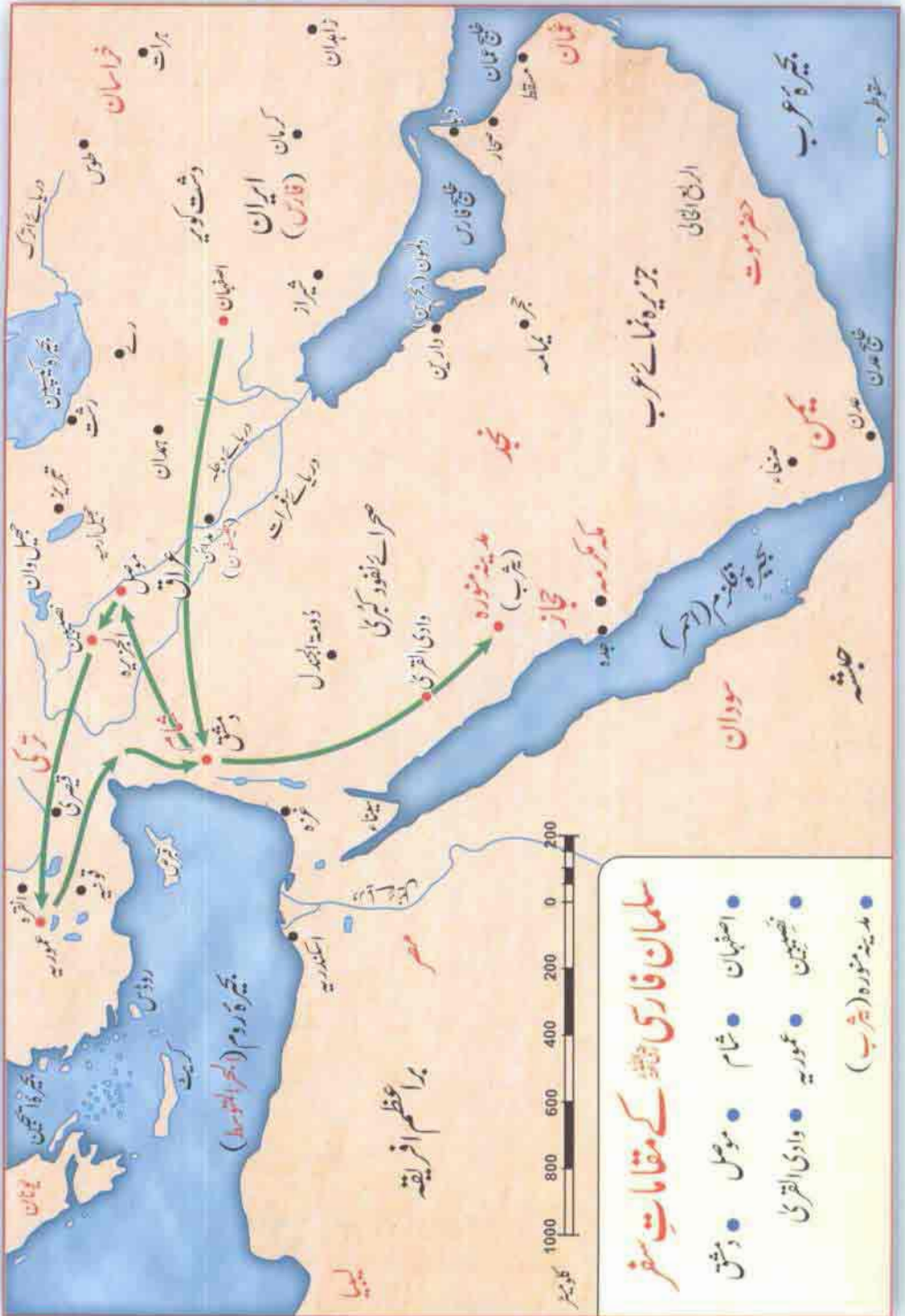
تورات کی تفسیر ''ترجوم'' کا عبرانی نسخہ (عراق)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہی فرماتے ہیں: میں نے کعب احبار سے پوچھا: کیا تورات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ موجود ہے؟ کعب فرمانے لگے: ہاں! تورات میں ان کا تذکرہ اس طرح ہے:

مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ يُوْلَدُ بِمَكَّةَ، وَيُهَاجِرُ إِلٰى طَابَةَ، وَيَكُونُ مُلْكُهُ بِالشَّامِ، وَلَيْسَ بِفَحَّاشٍ، وَلَا صَخَّابٍ فِي الْأَسْوَاقِ، وَلَا يُكَافِئُ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ، وَلٰكِنْ يَعْفُو وَيَغْفِرُ، أُمَّتُهُ الْحَمَّادُونَ يَحْمَدُونَ اللّٰهَ فِي كُلِّ سَرَّاءٍ وَضَرَّاءٍ، وَيُكَبِّرُونَ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ نَجْدٍ، يُوَضِّئُونَ أَطْرَافَهُمْ، وَيَأْتَزِرُونَ فِي أَوْسَاطِهِمْ، يَصُفُّونَ فِي صَلَاتِهِمْ كَمَا يَصُفُّونَ فِي قِتَالِهِمْ، دَوِيُّهُمْ فِي مَسَاجِدِهِمْ كَدَوِيِّ النَّحْلِ، يُسْمَعُ مُنَادِيهِمْ فِي جَوِّ السَّمَاءِ.

''محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ میں پیدا ہوں گے، طابہ (مدینہ) کی طرف ہجرت کریں گے، ان کی حکومت شام میں ہوگی، وہ بدگوئی نہیں کریں گے، بازاروں میں شوروغوغا بھی نہیں کریں گے، برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیں گے، معافی اور درگزر سے کام لیں گے، ان کی امت اللہ تعالیٰ کی بہت زیادہ حمد کرنے والی ہوگی۔ وہ ہر خوشی اور ہر غمی میں اللہ کی تعریف کریں گے، ہر بلندی پر چڑھتے ہوئے اللہ کی بڑائی کریں گے، (نماز کے لیے) اعضاء دھویا کریں گے، کمر پر تہبند باندھیں گے۔ نماز پڑھتے ہوئے اس طرح صف بندی کریں گے جس طرح وہ میدانِ جہاد میں صف بندی کریں گے، ان کی آوازیں مساجد میں شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ کی طرح ہوں گی اور ان کی اذانیں آسمان کی فضا میں گونجیں گی۔''[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات پہلی کتب سماویہ میں موجود تھیں جیسا کہ دوسری جلد کے آخری باب میں گزر چکا ہے، اسی وجہ سے وہ اس نبی کی آمد کے منتظر رہے۔ وہ مختلف طریقوں سے کوشش کرتے رہے کہ اس نبی کی آمد کا پتہ چل جائے، اسی بنا پر کچھ یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دارالہجرت مدینہ طیبہ میں آبسے تھے۔

دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کا حکم

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں دارالحرب، یعنی مکہ مکرمہ سے دارالاسلام کی طرف ہجرت فرض تھی۔ فتح مکہ

[1] سنن الدارمي :7/1. مزید دیکھیے: تفسير ابن كثير، الأحزاب 13:33.

کے بعد ہجرت کی فرضیت ختم ہوگئی، البتہ حالات کی رفتار کی مناسبت سے دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کی فرضیت قیامت تک برقرار رہے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ○ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ○ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ○﴾

’’بے شک فرشتے جن لوگوں کی اس حالت میں جان قبض کرتے ہیں کہ وہ (جان بوجھ کر کافروں میں رہ کر) اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہوں تو فرشتے پوچھتے ہیں: تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں: ہم زمین میں کمزور تھے۔ تب فرشتے کہتے ہیں: کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ چنانچہ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ مگر وہ مرد، عورتیں اور بچے جو واقعی بے بس ہوں اور وہ اس جگہ سے نکلنے کا کوئی وسیلہ اور کوئی راستہ نہیں پاتے۔ ان لوگوں کے بارے میں امید ہے کہ اللہ انھیں معاف کر دے گا اور اللہ بہت معاف کرنے والا، نہایت بخشنے والا ہے۔‘‘[1]

یہ حکم اگرچہ ہجرتِ مدینہ ہی کے پس منظر میں ہے مگر اس کا حکم عام ہے اور اس کا اطلاق ہر اس شخص پر ہوتا ہے جو قدرت رکھنے کے باوجود ہجرت نہ کرے اور اقامت دین کے لیے جدوجہد نہ کرے، ایسا شخص ظالم ہے اور وہ اپنی جان پر خود ظلم کرتا ہے۔ اجماعِ امت سے ثابت ہے کہ وہ ایک حرام کام کا ارتکاب کر رہا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ﴾ ان آیات کی روشنی میں دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنا ہر قدرت رکھنے والے شخص پر واجب ہے۔[2]

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ جَامَعَ الْمُشْرِكَ وَسَكَنَ مَعَهُ فَإِنَّهُ مِثْلُهُ»

’’جو کسی مشرک سے صحبت اختیار کرے اور اس کے ساتھ رہائش رکھے تو وہ بھی اُسی جیسا ہے۔‘‘[3]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

«لَا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ حَتّٰى تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ، وَلَا تَنْقَطِعُ التَّوْبَةُ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا»

[1] النسآء 4:97-99. [2] تفسير القاسمي، النسآء 4:97. [3] سنن أبي داود: 2787.

’’ہجرت ختم نہیں ہوگی حتی کہ توبہ ختم ہو اور توبہ ختم نہیں ہوسکتی یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو جائے۔‘‘ [1]

ایک دوسری جگہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ مَا قُوتِلَ الْكُفَّارُ»

’’جب تک کفار سے قتال باقی ہے، اس وقت تک ہجرت کا سلسلہ باقی رہے گا۔‘‘ [2]

لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ کے معنی

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا هِجْرَةَ بَعْدَالْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَّ نِيَّةٌ»

’’مکہ فتح ہوجانے کے بعد فرضیتِ ہجرت کا حکم لاگو نہیں رہا لیکن جہاد اور خیر کی نیت (بدستور) برقرار ہے۔‘‘ [3]

مطلب یہ کہ اب فتح مکہ ہونے کے بعد وہ بجائے خود دارالاسلام ہوگیا ہے، اس لیے اب یہاں سے ہجرت کر کے مدینہ آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خود نفسِ ہجرت کا سلسلہ ہی سرے سے ختم ہوگیا ہے۔ جہاں تک اقدامِ ہجرت کا عام تعلق ہے، یعنی دنیا کے کسی بھی دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنا تو اس کا حکم اب بھی باقی ہے مگر اس کے لیے چند شرائط ہیں جن کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ [4]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ امام بخاری کے قائم کردہ باب لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ کے سلسلے میں لکھتے ہیں: ’’فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں‘‘ اِس سے مراد یہ ہے: ایسے کسی بھی علاقے کی طرف ہجرت کا اطلاق نہیں ہوتا جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے مفتوح و مسخر کر دیا ہو کیونکہ جب مسلمان کوئی علاقہ فتح کر لیں تو وہاں سے مسلمانوں کے لیے ہجرت کا حکم نہیں۔

ہجرت کی فرضیت

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں کہ فتح سے پہلے دارالکفر میں رہنے والے مسلمانوں کی تین حالتیں ہوسکتی ہیں:

1. وہاں کے رہنے والے مسلمان ہجرت کرنے پر قدرت رکھتے ہوں اور دارالکفر میں اسلامی شعائر کے اظہار و اعلان اور ادائے فرائض و واجبات سے قاصر ہوں۔ اس حالت میں ہجرت فرض ہے۔

[1] سنن أبي داود :2479. [2] سنن النسائي :4178,4177 مزید دیکھیے: ذخيرة العقبٰى شرح سنن النسائي :32/347-353، هجرة الرسول و صحابته في القرآن والسنة، ص :267-270. [3] صحيح البخاري :2783. [4] صحیح بخاری، ترجمہ وتشریح از داود راز :4/257.

2 ہجرت کرنے پر قدرت رکھتے ہوں اور شعائر اسلامی کے اظہار و اعلان اور ادائے واجبات پر بھی قادر ہوں۔ اس حالت میں ہجرت مستحب ہے تا کہ وہ دیگر مسلمانوں کے ساتھ مل کر ان کی قوت میں اضافے کا سبب بنیں، ان سے تعاون کریں اور کفار سے جہاد کریں۔

3 ایسا معذور مسلمان جو کسی وجہ سے ہجرت کرنے سے عاجز ہو، بیمار ہو، قید ہو یا کوئی اور مجبوری درپیش ہو تو اُس کے لیے دارالکفر میں رہنا جائز ہے، تاہم اگر اِس قسم کے مسلمان کمر ہمت باندھ کر درپیش رکاوٹوں اور تکلیفوں کا دلیری سے مقابلہ کر کے ہجرت کر جائیں تو اجر عظیم کے مستحق ٹھہریں گے۔ [1]

اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ۝﴾

''مگر وہ مرد، عورتیں اور بچے جو واقعی بے بس ہوں اور اس جگہ سے نکلنے کا کوئی وسیلہ اور کوئی راستہ نہیں پاتے۔'' [2]

یعنی ایسی خواتین اور بچے جو درپیش حالات سے نجات پانے کی قدرت نہیں رکھتے، ان پر ہجرت فرض نہیں لیکن ایسا شخص جو بیمار ہو یا اُس پر اس قدر فقر طاری ہو جس کی بنا پر وہ دارالکفر سے بھاگنے کی استطاعت سے محروم ہو تو اس طرح کی کیفیت کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اسے معاف فرما دے گا۔ [3]

ہجرت کب کی جائے؟

جب کفار مسلمانوں کو ان کے علاقوں میں ستائیں، انھیں اسلامی احکام پر عمل کرنے سے روکیں، ان سے لڑائی کریں اور ان کی عزت و ناموس کے درپے ہو جائیں تو مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ کفار کا ملک چھوڑ کر کسی ایسی جگہ جا بسیں جہاں انھیں اپنے دین پر عمل کرنے کی سہولت میسر ہو اور ان کی جان، مال اور عزت و آبرو محفوظ رہے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کفار قریش کی ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر پہلے دو مرتبہ حبشہ ہجرت کی اور پھر مدینہ کی طرف ہجرت کر کے اسے اپنا مستقل وطن بنا لیا۔

آج بھی جن علاقوں میں مسلمانوں پر قدغن ہے اور وہ اپنے دینی احکام پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے، انھیں اپنا وطن چھوڑ کر کسی پر امن علاقے کی طرف ہجرت کر جانی چاہیے۔ ماضی قریب میں متحدہ ہندوستان سے مسلمان بہت بڑی

[1] فتح الباري: 228/6. [2] النسآء 98:4. [3] تفسير المنار للشيخ محمد رشيد رضا، النسآء 98:4.

پاکستان کی طرف ہجرت (1947ء) کا ایک منظر

تعداد میں ہجرت کر کے پاکستان آئے اور اس سلسلے میں انھیں بے شمار ناقابل برداشت صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تاریخ میں یہ ایک بڑی ہجرت تھی جس میں ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف بے شمار لوگوں کا ایاب و ذہاب جاری رہا۔

اسلام کی دو ہجرتیں

اسلام کے ابتدائی دور میں دو طرح کی ہجرتیں ہوئیں:

1. اولین ہجرت دارالخوف سے دارالامن کی طرف ہوئی اور مشرکین مکہ کی ایذا رسانیوں سے عاجز آکر بہت سے مسلمان ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے۔
2. دوسری مرتبہ دارالکفر سے دارالایمان کی طرف ہجرت کی گئی۔ یہ ہجرت اس وقت شروع ہوئی جب نبی اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے۔ مکہ سے مدینہ کی طرف یہ ہجرت فتح مکہ تک جاری رہی۔ جب مکہ فتح ہوگیا تو نبی ﷺ کا یہ فرمان مکہ سے مدینہ کی ہجرت کے لیے خاص ہوگیا: «لَا هِجْرَةَ

اکسوم (حبشہ) کا کلیسائے مریم (St. Mary of Zion)

بَعْدَ الْفَتْحِ" "فتح (مکہ) کے بعد ہجرت نہیں۔"

اس حکم کی روشنی میں مکہ سے مدینہ کی ہجرت کی خصوصیت ختم ہوگئی لیکن دارالکفر سے دارالامن کی طرف ہجرت کا عمل باقی رہا اور قیامت تک باقی رہے گا۔

ہجرت مدینہ کے اسباب

نبی معظم ﷺ کو مکہ مکرمہ سے شدید محبت تھی۔ آپ یہاں پیدا ہوئے، یہیں بچپن گزرا، یہیں جوانی کے ایام بسر فرمائے۔ اسی سرزمین پر آپ کے آباؤ اجداد کی پوری تاریخ رقم تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ کو ہر وقت اللہ جل شانہ کے بابرکت گھر خانۂ کعبہ کی روح پرور اور ایمان افروز قربت نصیب تھی، جسے ان کے جد امجد سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام نے تعمیر کیا تھا، جس کی دیکھ بھال اور نگرانی کا فریضہ آپ ﷺ کے بزرگ انجام دیتے رہے اور جس مقدس گھر کی بدولت پورے جزیرہ نمائے عرب میں آپ ﷺ کے قبیلہ قریش کی عزت کی جاتی تھی۔ بھلا اتنی مقدس نسبتوں اور مؤثر مالوفات کو چھوڑ کر کسی اجنبی جگہ چلے جانا رسول اللہ ﷺ کے لیے کس طرح پسندیدہ ہوسکتا تھا۔ ہجرت مدینہ کے چار اسباب تھے جن کے زیر اثر آپ کو اپنا گھر اور اپنا محبوب ترین شہر چھوڑنا پڑا اور آپ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمانے پر مجبور ہوگئے:

1 اہل اسلام کو دارالکفر اور دارالتعذیب سے بچا کر ایسے علاقے کی طرف منتقل کرنا جہاں اسلام کی چھتری تلے اطمینان سے قیام کیا جاسکے اور دین اسلام کے شعائر کی پابندی میں کوئی چیز مانع نہ ہو۔

2 رسول اللہ ﷺ کفر اور شرک کو مٹانے اور اللہ رب العزت کی عظمت و کبریائی کا پرچم بلند کرنے کے لیے شام و سحر جو عظیم الشان جد و جہد کر رہے تھے، اُس میں بیرونی طور پر جناب ابوطالب اور خانگی زندگی میں ام المؤمنین سیدہ خدیجہ آپ ﷺ کا سب سے بڑا سہارا تھیں۔ جب ابوطالب اور سیدہ خدیجہ کا انتقال ہوگیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی جدائی کا غم بڑی شدت سے محسوس فرمایا۔ ان جاں گسل اور المناک حالات و حوادث میں شقی القلب کفار و مشرکین نے بے روک ہوکر آپ ﷺ پر اپنی مشق ستم میں اس قدر اضافہ کر دیا کہ وہ آپ ﷺ کی جان لینے کے درپے ہوگئے۔ ان حالات میں رسول اللہ ﷺ کے لیے نقلِ مکانی اور ہجرت ناگزیر ہوگئی۔

3 انصار مدینہ کی جانب سے اہل اسلام اور رسول اللہ ﷺ کو مدینہ آنے کی مسلسل دعوتیں دی گئیں۔ اسلام پر بیعت کی گئی اور امن و سکون کے ساتھ شعائر اسلام کی ادائیگی میں تعاون کی آپ کو یقین دہانیاں کرائی گئیں،

پس اس فضا میں مدینہ کی طرف ہجرت کا دروازہ کھل گیا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خواب میں آپ کی ہجرت گاہ دکھا دی اور آپ کو ہجرت کی اجازت بھی عطا فرما دی۔

مہاجرین کے قافلے

ہجرت مدینہ

مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو بہت ستایا۔ انھیں جسمانی و روحانی اذیتوں کا ہدف بنایا۔ اس عالم میں نادار اور کمزور مسلمان مشرکین کی چیرہ دستیوں سے بلبلا اٹھے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے مشرکین کے ظلم وستم کے پیشِ نظر مسلمانوں کو ہجرت حبشہ کی اجازت مرحمت فرمائی تھی، چنانچہ ابتدا میں چند مسلمان حبشہ ہجرت کر گئے۔

موسمِ حج میں نبیِ اکرم ﷺ سے اہل یثرب کی ملاقات ہوئی۔ بیعات عقبہ میں ان سے اسلام اور اہل اسلام کے لیے حمایت، تعاون اور جاں نثاری کی شرائط پر معاہدے ہوئے۔

بیعات عقبہ کی برکات اتنی سریع الاثر ثابت ہوئیں کہ مدینہ میں بڑی تیزی سے اسلام پھیلنے لگا۔ مشرکین مکہ کو فروغِ اسلام کی ہرگز کوئی توقع نہیں تھی۔ مدینے میں اسلام کی روز افزوں ترقی اہل مکہ کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ انھوں نے مسلمانوں کو اور زیادہ ستانا شروع کر دیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب دوسری بیعتِ عقبہ ہوئی اور ستر انصارِ مدینہ واپس روانہ ہوئے تو نبی ﷺ کو بہت اطمینان اور مسرت نصیب ہوئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کے لیے ایسی قوم پیدا فرما دی تھی جس کے جوان جنگجو بھی تھے اور آپ کے لیے بوقت ضرورت کمک بھی فراہم کر سکتے تھے۔ مشرکین مکہ کو اس معاملے کا علم ہوا تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر سختیاں بڑھ گئیں۔

خواب میں سرزمین ہجرت کی جھلک

اصحاب رسول ﷺ نے جب مشرکوں کے مظالم کی شکایت کی اور ہجرت کی اجازت چاہی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«قَدْ أُرِيتُ دَارَ هِجْرَتِكُمْ، رَأَيْتُ سَبْخَةً ذَاتَ نَخْلٍ بَيْنَ لَابَتَيْنِ»

سقیفہ بنی ساعدہ میں کھجوریں (مدینہ منورہ)

’’مجھے تمھارا دارِ ہجرت دکھایا گیا ہے، وہ ایک شور زدہ کھجوروں والی زمین ہے جو دو سیاہ پتھریلی زمینوں کے مابین واقع ہے۔‘‘ [1]

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«رَأَيْتُ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أُهَاجِرُ مِنْ مَكَّةَ إِلٰى أَرْضٍ بِهَا نَخْلٌ، فَذَهَبَ وَهَلِي إِلٰى أَنَّهَا الْيَمَامَةُ أَوْ هَجَرُ، فَإِذَا هِيَ الْمَدِينَةُ يَثْرِبُ»

’’میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مکہ سے کھجوروں والی زمین کی طرف ہجرت کر رہا ہوں، میرا خیال تھا کہ وہ یمامہ یا ہجر کا علاقہ ہوگا، لیکن وہ مدینہ یثرب ہے۔‘‘ [2]

جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ أَوْحٰى إِلَيَّ: أَيَّ هٰؤُلَاءِ الْبِلَادِ الثَّلَاثِ نَزَلْتَ فَهِيَ دَارُ هِجْرَتِكَ: اَلْمَدِينَةُ أَوِ الْبَحْرَيْنِ أَوْ قِنَّسْرِينَ»

مسجد الفتح (بحرین)

’’اللہ تبارک و تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ ان تین شہروں میں سے ایک شہر جس میں بھی آپ قیام پذیر ہوں گے، وہ آپ کی جائے ہجرت ہے، یعنی مدینہ، بحرین یا قنسرین۔‘‘ اہل علم کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے لیے عزم صمیم فرما لیا اور اپنے اصحاب کو مدینے کی طرف ہجرت کا حکم دے دیا۔ [3]

[1] صحيح البخاري: 2297. [2] صحيح البخاري، قبل الحديث: 3897، صحيح مسلم: 2272. [3] المستدرك للحاكم: 3/2،3، دلائل النبوة للبيهقي: 2/458.

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس روایت کا پایۂ ثبوت کو پہنچنا محل نظر ہے کیونکہ یہ صحیح روایت کے مخالف ہے جس میں یمامہ کا تذکرہ ہے۔ ہاں! ان میں اس طرح تطبیق ممکن ہے کہ انھیں اختلافِ مأخذ (خواب اور وحی) پر محمول کیا جائے۔ پہلی روایت میں خواب کا تذکرہ ہے کہ آپ کو خواب میں آپ کی ہجرت گاہ دکھائی گئی اور دوسری روایت میں آپ کو بذریعہ وحی ہجرت گاہ کا اختیار دیا گیا تو آپ نے مدینہ منورہ کو منتخب فرمایا۔ [1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ہجرت کی اجازت

﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وٰسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ۝﴾

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے!

''اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! بے شک میری زمین وسیع ہے، سو تم میری ہی عبادت کرو۔'' [2]

ابن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں: جب انصارِ مدینہ نے اسلام، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروکاروں کی اعانت پر بیعت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں رہائش پذیر مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ مدینہ ہجرت کریں اور اپنے انصاری بھائیوں سے مل جائیں، پھر فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ جَعَلَ لَكُمْ إِخْوَانًا وَّدَارًا تَأْمَنُوْنَ بِهَا»

''اللہ عزوجل نے تمھارے لیے ایسے بھائی اور گھر بنا دیے ہیں جہاں تمھیں امن اور سکون نصیب ہوگا۔''

یہ حکم پا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یکے بعد دیگرے ہجرت کرنے لگے اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہجرت مدینہ کے لیے اپنے پروردگار کی اجازت کا انتظار کرنے لگے۔ [3] صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہجرت کے لیے آپس میں مشورہ کرتے، ایک دوسرے کی ڈھارس بندھاتے اور پوشیدہ طور پر عازم سفر ہو جاتے۔ [4] یہاں اس قافلے کا ذکر کرنا ضروری ہے جنھوں نے دوسری بیعت عقبہ میں شرکت کی اور جب مہاجرین قباء پہنچنے شروع ہوئے تو وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مکہ پہنچ گئے اور مہاجرین صحابہ کے ساتھ مل کر عازم سفر ہوئے۔ اس لحاظ سے وہ بیک وقت مہاجرین بھی ٹھہرے اور انصاری بھی کہلائے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ذکوان بن عبد قیس، عقبہ بن وہب بن کلدہ، عباس بن عبادہ بن نضلہ اور زیاد بن لبید رضی اللہ عنہم۔ [5]

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم ہجرت پر بیشتر اصحاب مدینہ چلے گئے۔ ہجرت سے صرف وہی مسلمان پیچھے رہے جنھیں مشرکین نے روکے رکھا اور ان کو آزمائش میں ڈال دیا۔ لیکن علی بن ابی طالب اور ابوبکر بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہما

---

[1] فتح الباري: 284/7. [2] العنكبوت 56:29. [3] السيرة لابن هشام: 468/2، السيرة لابن كثير، ص: 200. [4] السيرة النبوية للصلابي: 439,438/1. [5] الطبقات لابن سعد: 226/1.

نبیِ اکرم ﷺ کی مصاحبت کے لیے بدستور مکہ ہی میں ٹھہرے رہے۔[1]

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے علی الاعلان ہجرت کی۔ ان میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ، ابوسلمہ بن عبدالاسد المخزومی اور ان کے ساتھی شامل تھے۔ بعض صحابہ کرام چھپ کر مدینہ گئے۔ ان میں صہیب رومی رضی اللہ عنہ جیسے مفلوک الحال افراد شامل تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے جب یہ فرمایا:

«أُرِيتُ دَارَ هِجْرَتِكُمْ ذَاتَ نَخْلٍ بَيْنَ لَابَتَيْنِ»

''مجھے تمھاری جائے ہجرت دکھائی گئی ہے جو دو سیاہ سنگلاخ میدانوں کے درمیان کھجوروں والی جگہ ہے۔''

تو لوگوں نے مدینے کی جانب ہجرت شروع کر دی، پھر مہاجرینِ حبشہ بھی مدینہ پہنچ گئے۔[2]

سب سے پہلے ہجرت کرنے والے

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: سب سے پہلے جو مہاجرین ہمارے پاس آئے، وہ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ تھے، پھر ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ۔ یہ دونوں لوگوں کو دین کی باتیں سکھاتے تھے، پھر ہمارے پاس یکے بعد دیگرے سعد بن ابی وقاص، بلال، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم پہنچے۔ ان کے بعد عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیس افراد پر مشتمل مہاجرین کے گروہ کے ہمراہ پہنچے۔ بعدازاں رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے۔[3]

ابن ہشام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نبیِ اکرم ﷺ کے اصحاب میں سے سب سے پہلے ہجرت کرنے والے ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسد بن ہلال بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم رضی اللہ عنہ تھے۔ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے بیعت عقبہ ثانیہ سے ایک سال پہلے ہجرت کی۔ وہ حبشہ کی سرزمین سے مکہ لوٹے تھے تو مکہ پہنچنے پر انھیں قریش کی طرف سے تکالیف دی گئیں۔ جب انھیں انصار کے اسلام لانے کا پتہ چلا تو وہ مدینہ چلے گئے۔[4]

ابن اسحاق فرماتے ہیں: مدینہ کی طرف سب سے پہلے ہجرت کرنے والے ابوسلمہ بن عبدالاشہل مخزومی رضی اللہ عنہ ہیں جو سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے خاوند تھے، پھر ان کے بعد عامر بن ربیعہ جو بنو عدی کے حلیف تھے، انھوں نے ہجرت کی۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی لیلیٰ بنت ابی حثمہ بن غانم بن عبداللہ بن عوف بن عبید بن عدی بن کعب بھی تھیں۔[5]

موسیٰ بن عقبہ نے بیان کیا ہے کہ ابوسلمہ بن عبدالاسد ہی مطلق طور پر وہ سب سے پہلے فرد ہیں جو ہجرت کر کے مدینہ پہنچے۔ وہ حبشہ سے جب مکہ پہنچے تو مشرکین مکہ نے انھیں ستانا شروع کر دیا۔ اسی دوران انھیں بیعت عقبہ میں

---

[1] السيرة النبوية لابن كثير، ص:205، سيرة النبي المختار، ص:206، الطبقات لابن سعد:226/1. [2] صحيح البخاري، قبل الحديث:3872. [3] صحيح البخاري:3925. [4] السيرة لابن هشام:468/2، فتح الباري:283/7. [5] السيرة لابن هشام:470/2، فتح الباري:283/7.

بارہ انصاریوں کے اسلام لانے کی خبر پہنچی تو وہ مدینہ ہجرت کر گئے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ سب سے پہلے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر کے جانے والے صحابی مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ تھے جبکہ ابن اسحاق اور ابن ہشام نے ابوسلمہ مخزومی رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان دونوں باتوں کو اس طرح جمع کیا ہے کہ ابوسلمہ مستقل رہائش کی غرض سے مدینہ نہیں گئے تھے، بلکہ مشرکین سے بچاؤ کی خاطر گئے تھے جبکہ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر انصار کو دینی تعلیم دینے اور مستقل سکونت اختیار کرنے کے لیے مدینہ گئے تھے، لہٰذا یہ دونوں حضرات اپنی اپنی جگہ اولین مہاجرین میں سے ہیں۔

مسجد قباء کا ایک منظر

اولین مہاجرین میں سالم مولی ابی حذیفہ بن عتبہ بھی شامل ہیں۔ وہ قبا میں مہاجرین کو نماز پڑھانے کے شرف سے بھی فیض یاب ہیں۔[1]

خاندانِ ابوسلمہ کی ہجرت

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا اپنی اور اپنے خاوند کی ہجرت کے سلسلے میں اپنے ایمانی جذبے اور یقین محکم کا تذکرہ یوں فرماتی ہیں: ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے ہجرت مدینہ کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے اونٹ پر سوار کیا۔ میری گود میں سلمہ بن ابی سلمہ بھی تھا۔ ہم نے تن بہ تقدیر سفر شروع کر دیا۔ اسی دوران میں ہمیں بنومغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم کے آدمیوں نے دیکھ لیا۔ وہ فوراً ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے: جہاں تک تمھاری ذات کا تعلق ہے، ہم تمھارے معاملے میں بے بس ہیں لیکن یہ جو تمھاری بیوی ہے، یہ ہماری لڑکی ہے، ہم اسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں کہ تم اسے مختلف علاقوں میں ادھر اُدھر گھماتے پھرو، چنانچہ انھوں نے ابوسلمہ سے اونٹ کی مہار چھین لی اور مجھے پکڑ لیا۔ اس پر ابوسلمہ کے قبیلے بنوعبدالاسد کو طیش آ گیا۔ وہ کہنے لگے: اللہ کی قسم! جب تم لوگوں نے اس عورت کو ہمارے آدمی سے چھین لیا تو ہم اپنا بیٹا اس کے پاس نہیں رہنے دیں گے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: فریقین نے میرے بیٹے سلمہ پر کھینچا تانی شروع کر دی جس کی وجہ سے اس کا ہاتھ اکھڑ گیا۔ بنوعبدالاسد سلمہ کو لے کر چلے گئے اور مجھے بنومغیرہ نے اپنے پاس روک لیا، چنانچہ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ اکیلے ہی مدینہ چلے گئے۔ اس طرح مشرکین مکہ نے میرے، میرے خاوند اور بیٹے کے

[1] فتح الباري: 326/7.

درمیان جدائی پیدا کر کے ہمیں الگ الگ کر دیا۔

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میری دنیا اندھیر ہوگئی، میں روز صبح کے وقت ابطح نامی جگہ پر جاتی اور دن بھر وہاں روتی رہتی یہاں تک کہ تقریباً ایک سال گزر گیا، پھر اچانک ایک دن میرے خاندان کا ایک آدمی وہاں سے گزرا تو اسے مجھ پر رحم آ گیا۔ اس نے بنومغیرہ سے کہا کہ تم اس بیچاری دکھی عورت کو جانے کیوں نہیں دیتے؟ تم لوگوں نے خوامخواہ اسے ستا رکھا ہے۔ اسے اس کے شوہر اور بیٹے سے جدا کر رکھا ہے۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ تب ان لوگوں کا دل پسیجا اور انھوں نے مجھ سے کہا: اگر تو اپنے خاوند کے پاس جانا چاہے تو جا سکتی ہے۔

اس موقع پر بنوعبدالاسد نے بھی میرا بیٹا مجھے واپس دے دیا، چنانچہ میں اپنے اونٹ پر سوار ہوئی، بیٹے کو بھی اپنے ساتھ سوار کرلیا اور اپنے خاوند کے پاس جانے کے لیے مدینہ کی طرف چل پڑی۔

ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: مدینہ روانگی کے وقت میں تن تنہا تھی۔ ایک میں تھی یا اللہ کی ذات تھی۔ اللہ کی مخلوق میں سے میرا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا۔ میں نے طے کرلیا کہ اگر کوئی مجھے سرراہے ملا تو میں اس سے گزارش کروں گی کہ مجھے میرے شوہر تک پہنچا دے۔ جب میں مقام تنعیم پہنچی تو عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بنوعبدالدار سے تعلق رکھتا تھا، وہ بولا: اے بنت ابوامیہ! تم کہاں جارہی ہو؟ میں نے کہا: اپنے خاوند کے پاس مدینہ جارہی ہوں۔ اس نے پوچھا: کیا تمھارے ساتھ کوئی ہے؟ میں نے کہا: نہیں، میرے ساتھ میرے بیٹے اور اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ اس پر عثمان نے کہا: اللہ کی قسم! میں تمھیں اس طرح اکیلا نہیں چھوڑ سکتا، پھر اس نے اونٹ کی نکیل پکڑی اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

مسجد عائشہ (تنعیم، مکہ مکرمہ)

ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اللہ کی قسم! میں نے پورے عرب میں عثمان سے زیادہ صاحب حیا آدمی نہیں دیکھا۔ وہ راستے میں جب بھی کسی جگہ پڑاؤ ڈالتا، اونٹ کو بٹھا دیتا اور خود دور چلا جاتا، جب میں نیچے اترتی تو اونٹ کو ایک طرف لے جاتا، سامان نیچے اتارتا اور درخت سے اسے باندھ دیتا، پھر مجھ سے دور جا کر کسی درخت کے نیچے لیٹ جاتا۔ جب کوچ کا وقت آتا، اونٹ لے کر میرے پاس آجاتا، اسے میرے پاس بٹھا دیتا اور خود دور جا کر صدا لگاتا: سوار ہو جاؤ۔ میں سوار ہو جاتی تو وہ اونٹ کی نکیل پکڑ کر آگے چل دیتا۔ وہ اسی طریقے سے مجھے مدینہ تک لے آیا۔

جب ہم قباء میں بنوعمرو بن عوف کے محلے میں پہنچے تو اس نے کہا: تمھارا خاوند اس بستی میں ہے۔ جاؤ اللہ تمھیں برکت دے! یہ الفاظ کہہ کر وہ واپس مکہ روانہ ہوگیا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اکثر فرمایا کرتی تھیں: میرے علم کے مطابق ہجرت کے سلسلے میں سب سے زیادہ تکلیف ابوسلمہ کے گھرانے کو پیش آئی اور عثمان بن طلحہ جیسا نیک سیرت انسان میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ [1]

عامر بن ربیعہ اور ان کی بیوی کی ہجرت

خاندان ابوسلمہ کے بعد عامر بن ربیعہ نے اپنی زوجہ سیدہ لیلیٰ بنت ابی حثمہ کے ساتھ مدینہ منورہ ہجرت کی۔ عامر بن ربیعہ بنوعدی بن کعب کے حلیف تھے۔ امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں: لیلیٰ بنت ابی حثمہ پہلی خاتون ہیں جو اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ پہنچیں۔ امام موسیٰ بن عقبہ اس حوالے سے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا نام لیتے ہیں۔

ڈاکٹر ابوشہبہ کہتے ہیں کہ دونوں باتیں ٹھیک ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا پہلی خاتون ہیں جو ہجرت کی غرض سے مکہ سے نکلیں اور لیلیٰ بنت ابی حثمہ پہلی خاتون ہیں جو ہجرت کرکے مدینہ پہنچیں۔ اگر سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو مکہ میں نہ روکا جاتا تو مدینہ پہنچنے والی وہی پہلی خاتون ہوتیں۔ [2]

بنوجحش کی ہجرت

عامر بن ربیعہ کے بعد بنوجحش عازمِ مدینہ ہوئے۔ عبداللہ بن جحش بن رئاب بن یعمر بن صبرۃ بن مرۃ بن کثیر بن غنم بن دُودان بن اسد بن خزیمہ رضی اللہ عنہ بنوامیہ بن عبدشمس کے حلیف تھے۔ عبداللہ بن جحش اپنی بیوی، اپنے بھائی ابواحمد عبد بن جحش اور خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ مدینہ منورہ ہجرت کر گئے۔

عبد بن جحش نابینا تھے۔ وہ مکہ کے بالائی اور نشیبی حصوں میں کسی کا سہارا لیے بغیر بلاتکلف آجا سکتے تھے۔ بڑے فصیح و بلیغ شاعر تھے۔ ان کی بیوی ابوسفیان بن حرب کی بیٹی تھی جس کا نام الفارعہ تھا۔ ان کی والدہ امیمہ بنت عبدالمطلب بن ہاشم تھیں۔

اتنے بڑے نانا کا دوہتا، ابوسفیان جیسے رئیس مکہ کا داماد اور قادر الکلام شاعر کا قافلۂ ہجرت بیس مردوں اور آٹھ خواتین پر مشتمل تھا۔ ان کے نام حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے گنوائے ہیں۔

وہ اسماء یہ ہیں: 1 عبداللہ بن جحش 2 ابواحمد عبد بن جحش 3 عکاشہ بن محصن 4 شجاع بن وہب 5 عقبہ بن وہب 6 اربد بن حُمیرہ 7 منقذ بن نباتہ 8 سعید بن رقیش 9 زید بن رقیش 10 محرز بن نضلہ 11 قیس بن جابر

---

[1] السيرة لابن هشام :470,469/2، السيرة النبوية لابن كثير، ص :202,201. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة :462,461/1.

12 عمرو بن محصن 13 مالک بن عمرو 14 صفوان بن عمرو 15 ثقف بن عمرو 16 ربیعہ بن اکثم 17 زبیر بن عبیدہ 18 تمام بن عبیدہ 19 سخبرہ بن عبیدہ 20 محمد بن عبداللہ بن جحش...... خواتین کے نام یہ ہیں: 1 ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا جن کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: ﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا﴾ (الاحزاب 37) ''پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے اس کا نکاح آپ (محمد ﷺ) سے کر دیا۔'' 2 حمنہ بنت جحش، جو مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھیں 3 ام حبیب بنت جحش جو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھیں 4 جذامہ بنت جندل 5 ام قیس بنت محصن 6 ام حبیب بنت ثمامہ 7 آمنہ بنت رقیش 8 سخبرہ بنت تمیم۔ یہ پورا قافلہ قباء میں مبشر بن عبدالمنذر کے ہاں رہائش پذیر ہوا۔

بنو جحش جب مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گئے تو ان کا گھر مقفل ہوگیا۔ ایک دفعہ عتبہ بن ربیعہ، عباس بن عبدالمطلب اور ابوجہل بن ہشام کا مکہ کے بالائی حصہ میں گزر ہوا تو عتبہ بن ربیعہ نے ان کے بے آباد گھر کے دروازے کھٹکھٹائے۔ وہاں کوئی متنفس نہ پا کر انھوں نے بڑی حسرت سے سرد آہ بھری اور کہا:

وَكُلُّ دَارٍ وَّإِنْ طَالَتْ سَلَامَتُهَا   يَوْمًا سَتُدْرِكُهَا النَّكْبَاءُ وَالْحُوبُ

''اور ہر گھر، چاہے وہ کتنا ہی عرصہ سلامت رہے، ایک نہ ایک دن اس پر بربادی چھا جائے گی اور وہ اجاڑ ہو جائے گا۔''

پھر عتبہ بن ربیعہ کہنے لگا: آہ! بنو جحش کا گھر اپنے مکینوں سے خالی ہوگیا! یہ سن کر ابوجہل بولا: تمھیں اس بات پر کیوں رونا آ رہا ہے؟ پھر ابوجہل عباس بن عبدالمطلب سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا: یہ ہے تمھارے بھتیجے کا عمل۔ اسی عمل نے ہماری اجتماعیت بکھیر دی ہے، ہمارے معاملات بگاڑ دیے ہیں اور ہمارے مابین دوریاں ڈال دی ہیں۔[1]

عبد بن جحش رضی اللہ عنہ کے ہجرت کے موقع پر اشعار

وَلَوْ حَلَفَتْ بَيْنَ الصَّفَا أُمُّ أَحْمَدَ   وَمَرْوَتِهَا بِاللّٰهِ بَرَّتْ يَمِينُهَا

''اگر ام احمد صفا اور مروہ کے درمیان قسم کھا لے تو اللہ کی قسم! اس کی قسم پوری ہو کر رہے گی۔''

لَنَحْنُ الْأُولٰى كُنَّا بِهَا، ثُمَّ لَمْ نَزَلْ   بِمَكَّةَ حَتّٰى عَادَ غَثًّا سَمِينُهَا

''ہم ہی وہاں کے اولین آباد کار تھے۔ ہم ہمیشہ مکہ میں رہے یہاں تک کہ نوبت یہ آ گئی کہ وہاں کی موٹی تازی چیز لاغر ہوگئی۔''

[1] السيرة لابن هشام: 472,470/2. السيرة النبوية لابن كثير، ص: 203,202.

بِهَا خَيَّمَتْ غَنْمُ بْنُ دُودَانَ وَابْتَنَتْ   وَمَا إِنْ غَدَتْ غَنْمٌ وَخَفَّ قَطِينُهَا

''اسی میں غنم بن دودان نے خیمے لگائے اور مکان تعمیر کیے۔ پھر غنم بن دودان اللہ کے رستے پر چل پڑے اور ان کے آباد کاروں پر سفر آسان ہو گیا۔''

إِلَى اللّٰهِ تَغْدُو بَيْنَ مَثْنٰى وَ وَاحِدٍ   وَدِينُ رَسُولِ اللّٰهِ بِالْحَقِّ دِينُهَا

''وہ ایک ایک اور دو دو کر کے اللہ کی راہ پر چل پڑے اور اللہ کے سچے رسول ﷺ کا سچا دین ہی ان کا دین ہے۔''

ابو احمد عبد بن جحش رضی اللہ عنہ نے ہجرت مدینہ کے وقت یہ اشعار بھی کہے:

لَمَّا رَأَتْنِي أُمُّ أَحْمَدَ غَادِيًا   بِذِمَّةِ مَنْ أَخْشٰى بِغَيْبٍ وَّ أَرْهَبُ

''جب ام احمد نے مجھے صبح سویرے سفر پر آمادہ دیکھا کہ میں اس ذات کے بھروسے پر آمادۂ سفر ہوا ہوں جس سے میں غائبانہ طور پر ڈرتا ہوں اور خائف رہتا ہوں۔''

تَقُولُ: فَإِمَّا كُنْتَ لَابُدَّ فَاعِلًا   فَيَمِّمْ بِنَا الْبُلْدَانَ وَلْتَنْأَ يَثْرِبَ

''تو وہ کہنے لگی: اگر تم نے سفر کرنے کا پختہ ارادہ کر ہی لیا ہے تو کسی اچھے شہر کا رخ کرنا اور یثرب سے دور رہنا۔''

فَقُلْتُ لَهَا: بَلْ يَثْرِبُ الْيَوْمَ وَجْهُنَا   وَمَا يَشَإِ الرَّحْمٰنُ فَالْعَبْدُ يَرْكَبُ

''تو میں نے اس سے کہا: آج کے دن تو ہمارا رخ یثرب ہی کی طرف ہے۔ اور جو رحمٰن چاہتا ہے بندہ اسی کی چاہت کے مرکب پر سوار ہو جاتا ہے۔''

إِلَى اللّٰهِ وَجْهِي وَالرَّسُولِ وَمَنْ يُقِمْ   إِلَى اللّٰهِ يَوْمًا وَّجْهَهُ لَا يُخَيَّبُ

''میرا چہرہ اللہ اور اس کے رسول ہی کی طرف ہے اور جو شخص اللہ کی طرف توجہ کر لیتا ہے، وہ کبھی نامراد نہیں رہتا۔''

فَكَمْ قَدْ تَرَكْنَا مِنْ حَمِيمٍ مُنَاصِحٍ   وَنَاصِحَةٍ تَبْكِي بِدَمْعٍ وَتَنْدُبُ

''اور کتنے ہی گہرے اور نصیحت کرنے والے دوست ہم نے چھوڑ دیے اور کتنی خون کے آنسو رونے والیوں، آہ و فغاں کرنے والیوں اور نصیحت کرنے والیوں کو بھی ہم نے چھوڑ دیا۔''[1]

[1] السيرة لابن هشام: 2/473,472.

مندرجہ بالا اشعار سے عبد بن جحش کی شخصیت بہت روشن ہو کر سامنے آتی ہے۔ ان اشعار میں اسلام کے ساتھ وابستگی، اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ وارفتگی کا بڑا والہانہ اظہار ہے۔ ہجرت مدینہ کے لیے ایک واضح پیغام اور حائل رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لانے کا اعلان بڑے شاندار طریقے سے کیا گیا ہے۔ ان اشعار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف توجہ کر لیتا ہے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے احکام کے مقابلے میں ہر چیز ہیچ اور ناقابلِ توجہ ہو جاتی ہے حتی کہ اگر اس کے بیوی بچے بھی اللہ کی راہ میں حائل ہوتے ہیں تو وہ انھیں بھی کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

عبداللہ بن جحش کے گھر پر قبضہ

جب بنو جحش مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے تو ابوسفیان بن حرب نے بنو جحش کے گھر پر قبضہ کر لیا۔ جب یہ اطلاع عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو ملی تو انھیں بہت ملال ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عبداللہ بن جحش کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَلَا تَرْضٰى يَا عَبْدَاللّٰهِ! أَنْ يُّعْطِيَكَ اللّٰهُ دَارًا فِي الْجَنَّةِ خَيْرًا مِّنْهَا»

''اے عبداللہ! کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں جنت میں ایک ایسا گھر دے جو اس سے بہت بہتر ہو۔''

عبداللہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَذٰلِكَ لَكَ» ''پس وہ جنت والا گھر تمھارے لیے ہے۔''[1]

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ہجرت

براء بن عازب رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیس ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ تشریف لائے تھے۔[2]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اپنی ہجرت کے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میں، عیاش بن ربیعہ اور ہشام بن عاص بن وائل سہمی نے جب ہجرت مدینہ کا فیصلہ کیا تو ہم نے مقام سرف سے آگے اَضاءۃ بنی غفار میں تناضب نامی جگہ پر جمع ہونے پر اتفاق کیا۔ طے پایا کہ جو شخص بھی مقررہ وقت تک وہاں نہیں پہنچے گا، اس کی نسبت سمجھا جائے گا کہ اُسے مکہ والوں نے قید کر لیا ہے، لہٰذا باقی دونوں عازم سفر ہو جائیں گے۔

[1] السيرة لابن هشام: 499/2، السيرة النبوية لأبي شهبة: 463/1. [2] صحيح البخاري: 3925.

مسجد عمر بن خطاب (دومۃ الجندل)

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور عیاش تو مقرر جگہ پر پہنچ گئے لیکن ہشام کو مکہ والوں نے پکڑ لیا اور قید کر کے تکلیفیں دینا شروع کر دیں اور ہم مدینہ روانہ ہو گئے۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: مہاجرین نے مدینہ ہجرت کے وقت اپنے سفر کو پوشیدہ رکھا لیکن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے علی الاعلان ہجرت فرمائی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو انھوں نے گلے میں تلوار حمائل کی، کمان کندھے پر رکھی، ترکش سے تیر نکال کر ہتھیلی میں تھام لیے، پھر اپنی کمر سے نیزہ باندھا اور اس حالت میں بڑے جلال کے ساتھ بیت اللہ کی طرف چل دیے۔

قریشی سردار بیت اللہ کے گرد اپنی اپنی مجلسوں میں بڑے کروفر سے بیٹھے تھے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جاتے ہی بیت اللہ کے سات چکر لگائے۔ طواف کرنے کے بعد مقام ابراہیم کے پاس آئے، دو رکعتیں پڑھیں۔ اس کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ قریشیوں کی مجلسوں کے آگے گزرنے لگے۔ وہ قدم بڑھاتے جاتے تھے اور نہایت بلند آہنگی سے یہ اعلان کرتے جاتے تھے:
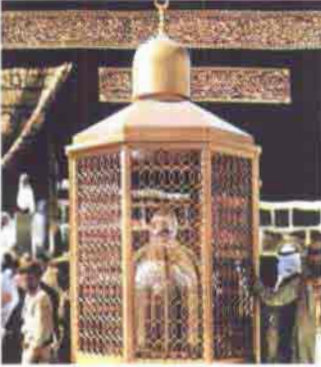
مقام ابراہیم (مسجد الحرام، مکہ مکرمہ)

شَاهَتِ الْوُجُوهُ، لَا يُرْغِمُ اللّٰهُ إِلَّا هٰذِهِ الْمَعَاطِسَ، مَنْ أَرَادَ أَنْ تَثْكَلَهُ أُمُّهُ، وَيُوْتِمَ وَلَدَهُ، وَيُرْمِلَ زَوْجَتَهُ، فَلْيَلْقَنِي وَرَاءَ هٰذَا الْوَادِي.

”چہرے بگڑ جائیں۔ اللہ تعالیٰ ان ناکوں کو خاک آلود کرے۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی ماں اسے گم پائے، اس کی اولاد یتیم ہو اور اس کی بیوی بیوہ ہو جائے تو وہ میرے مقابلے کے لیے اس وادی کی دوسری جانب چلا آئے۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد پر کسی شخص کو بھی انھیں جواب دینے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ ہجرت کے لیے چل دیے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی قوم اور خاندان کے افراد کو بھی لے گئے۔ اسی طرح بعض کمزور لوگوں نے بھی آپ کی معیت میں ہجرت کی۔[2]

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیس افراد نے ہجرت کی۔ ابن اسحاق نے ان میں سے تیرہ افراد کے اسمائے گرامی

[1] أسد الغابة: 284/4. [2] أسد الغابة: 324/3.

ذکر کیے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی زید بن خطاب تھے جو ان سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے۔ وہ بدر میں شریک ہوئے اور جنگ یمامہ میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔ عیاش بن ابی ربیعہ، عمرو بن سراقہ بن معتمر عدوی اور ان کا بھائی عبداللہ رضی اللہ عنہما، یہ حضرت عمر کا چچیرا بھائی اور ان کی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا کا خاوند تھا۔ سعید بن زید بن عمرو بن نفیل، واقد بن عبداللہ تمیمی جو عمر رضی اللہ عنہ کا حلیف تھا، خولی بن ابی خولی اور ان کا بھائی مالک بن ابی خولی یہ دونوں بھی ان کے حلیف تھے۔ بُکیر کے چار بیٹے: ایاس، عاقل، عامر اور خالد رضی اللہ عنہم۔ خالد رضی اللہ عنہ حضرت عمر کے داماد اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پہلے خاوند تھے۔ خنیس بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ۔

ابن اسحاق نے ان تیرہ افراد کے علاوہ باقی سات افراد کے نام ذکر نہیں کیے۔ یہ تمام افراد رفاعہ بن عبدالمنذر بن زنبر کے ہاں قباء میں ٹھہرے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: شاید ان کے علاوہ بقیہ اصحاب ان کے بعد قباء میں ان سے جا ملے ہوں۔ بہرحال انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی معیت میں ہجرت نہیں کی۔

ابن عائذ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ عمر، زبیر، طلحہ، عثمان اور عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہم اکٹھے مکہ سے نکلے۔ عثمان اور طلحہ رضی اللہ عنہما تو شام چلے گئے اور باقی حضرات مدینہ پہنچ گئے۔[1]

عیاش بن ابی ربیعہ کا قصہ

ابوجہل بن ہشام اور حارث بن ہشام دونوں عیاش رضی اللہ عنہ کے چچا زاد تھے۔ عیاش رضی اللہ عنہ ان کے اخیافی (ماں جائے) بھائی بھی تھے۔ عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے۔ یہ ابھی قباء ہی میں رہائش پذیر تھے کہ انھی دنوں ابوجہل اور حارث نے ایک منصوبہ تیار کیا کہ عیاش کو واپس لایا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ابوجہل اور حارث، عیاش رضی اللہ عنہ کو واپس لانے کے لیے مکہ سے نکلے اور ہمارے پاس پہنچ گئے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ ہی میں تھے۔ ابوجہل اور حارث نے آتے ہی عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ سے کہا: تیری ماں نے نذر مان رکھی ہے کہ تجھے دیکھے بغیر سر میں کنگھی نہیں کرے گی اور نہ سائے میں بیٹھے گی۔ یہ بات سن کر عیاش رضی اللہ عنہ کا دل نرم پڑ گیا۔ میں نے عیاش کو خبردار کیا: ”دیکھو! یہ لوگ تمھیں تمھارے دین کے بارے میں آزمائش میں ڈالنا چاہتے ہیں، لہٰذا محتاط رہو۔ اللہ کی قسم! تمھاری ماں جوؤں کی تکلیف سے عاجز آ کر کنگھی بھی کرے گی اور مکہ کی گرمی سے تنگ آ کر سائے میں بیٹھنے پر بھی مجبور ہو جائے گی۔“

[1] السیرۃ لابن ہشام :2/477,476، فتح الباري : 326/7.

عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ نے میری بات نہیں مانی۔ انھوں نے کہا: ''نہیں نہیں! میں اپنی ماں کی قسم پوری کروں گا۔ علاوہ ازیں میرا کچھ مال مکہ میں رہ گیا ہے، وہ بھی حاصل کروں گا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عیاش سے کہا: ''اللہ کی قسم! تم جانتے ہو میں ایک مالدار قریشی ہوں۔ تم میرا آدھا مال لے لومگر واپس مت جاؤ۔'' لیکن عیاش رضی اللہ عنہ نہ مانے تو میں نے انھیں پیش کش کی: اگر تم نے واپسی کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو پھر یوں کرو کہ میری سواری لے جاؤ کیونکہ یہ ایک عمدہ اور تجربہ کار اونٹنی ہے۔ اس پر سوار رہنا اور اگر کوئی خطرہ محسوس ہو تو فوراً نکل بھاگنا۔ عیاش رضی اللہ عنہ ان دونوں کے ساتھ واپس چلے گئے۔ راستے میں ابوجہل نے اُن سے کہا: میرا یہ اونٹ تو بہت اکھڑ ہے، تم مجھے اپنی اونٹنی کے پیچھے بٹھا لو۔

عیاش رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے اپنی اونٹنی بٹھائی۔ ان دونوں نے بھی اپنی اپنی سواریاں بٹھائیں، پھر اچانک ابوجہل اور حارث، عیاش رضی اللہ عنہ پر ٹوٹ پڑے اور انھیں رسیوں سے باندھ دیا اور یوں وہ آزمائشوں میں پھنس گئے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں: مجھے آل عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ میں سے بعض نے بتایا کہ جب ابوجہل اور حارث، عیاش کو لے کر مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت سورج بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ داخل ہوتے وقت انھوں نے کہا: اے اہل مکہ! جو سلوک ہم نے اپنے اس بیوقوف ساتھی سے کیا ہے، تم بھی اپنے بیوقوف لوگوں سے وہی برتاؤ کرو۔ [1]

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ہم اپنے دل میں کہا کرتے تھے کہ ایسے لوگ جنھوں نے اللہ کی معرفت حاصل کر لی اور دوبارہ مکہ چلے گئے، ان سے اللہ تعالیٰ کبھی فدیہ قبول نہیں کرے گا، نہ ان کی توبہ قبول کرے گا۔ پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝﴾

(الزمر 39:53-55)

''آپ کہہ دیجیے: (اللہ فرماتا ہے:) اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم و زیادتی کی ہے! تم اللہ

[1] السيرة لابن هشام :475,474/2.

کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ سب گناہ معاف کر دیتا ہے، یقیناً وہی بڑا بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے اور تم اپنے رب کی طرف رجوع کرو، اور اس کے فرماں بردار ہو جاؤ، اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے، پھر تمھاری مدد نہیں کی جائے گی۔ اور تم اس بہترین چیز کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی طرف سے تمھاری طرف نازل کی گئی ہے، اس سے پہلے کہ تم پر اچانک عذاب آجائے جبکہ تمھیں اس کی خبر تک نہ ہو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے اپنے ہاتھوں سے یہ آیات لکھیں اور ہشام بن عاص کو بھیج دیں۔ ہشام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب یہ آیات میرے پاس آئیں تو اس وقت میں ذی طویٰ میں ایک پہاڑ پر چڑھ رہا تھا اور انھیں صحیح طریقے سے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں ان آیات کا مطلب نہیں سمجھ سکا، پھر میں نے دعا کی: اَللّٰھُمَّ! فَھِّمْنِیھَا ''اے اللہ! مجھے ان کا مطلب سمجھا دے۔'' تب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ یہ آیات تو ہمارے ہی بارے میں نازل ہوئی ہیں، پھر میں جلدی سے اپنی سواری کے قریب پہنچا اور اس پر بیٹھ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ جا پہنچا۔[1]

ابن ہشام رحمہ اللہ کی ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لے گئے تو انھوں نے فرمایا:

«مَنْ لِّي بِعَيَّاشِ بْنِ أَبِي رَبِيْعَةَ، وَهِشَامِ بْنِ الْعَاصِ»

''کون ہے جو عیاش بن ابی ربیعہ اور ہشام بن عاص کو میرے پاس لے کر آئے؟''

ولید بن ولید بن مغیرہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! میں انھیں آپ کی خدمت میں پیش کروں گا، چنانچہ ولید مکہ چل دیے۔ انھوں نے اپنے آپ کو چھپائے رکھا۔ اس اثنا میں ایک عورت سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کھانا اٹھا رکھا تھا۔ ولید نے کہا: اے اللہ کی بندی! تم کہاں جا رہی ہو؟ وہ کہنے لگی: میں دو قیدیوں کی طرف جا رہی ہوں۔ ولید سمجھ گئے کہ وہ ہشام بن عاص اور عیاش بن ابی ربیعہ کی طرف جا رہی ہے۔

ولید رضی اللہ عنہ نے اس کا تعاقب کیا یہاں تک کہ انھیں پتہ چل گیا کہ وہ کس جگہ موجود ہیں۔ وہ دونوں ایسے گھر میں تھے جس کی چھت نہیں تھی۔ جب رات کے سائے گہرے ہوئے تو ولید اس مکان کی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو گئے۔ پھر ولید نے ایک پتھر پکڑا، اسے ان کی ہتھکڑیوں کے نیچے رکھا، پھر اس پر تلوار کا وار کیا اور ہتھکڑیوں کو کاٹ دیا۔ اسی وجہ سے ان کی تلوار کو ''ذو المروہ'' کہا جاتا تھا، پھر انھوں نے ان دونوں کو اپنے اونٹ پر بٹھایا اور مدینہ چل

[1] السيرة لابن هشام: 2/476,475.

دیے۔ اسی مرحلے میں ان کی ایک انگلی زخمی ہوگئی جس پر انھوں نے یہ شعر کہا:

هَلْ أَنْتِ إِلَّا إِصْبَعٌ دَمِيتِ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ مَا لَقِيتِ

''تجھے کیا ہوگیا ہے تو ایک انگلی ہی تو ہے جو خون آلود ہوئی ہے اور تجھے جو تکلیف پہنچی ہے، یہ اللہ کے راستے کی تکلیف ہے۔''

اس کے بعد ولید رضی اللہ عنہ ان دونوں کو لے کر مدینہ میں بارگاہ نبوی میں حاضر ہوگئے۔[1]

صہیب رضی اللہ عنہ کی ہجرت

سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے ساتھ اسلام لائے۔ ان کا شمار اولین مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ صہیب رضی اللہ عنہ نے مکہ ہی میں کاروبار شروع کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انھیں برکت اور مال و دولت سے نوازا۔

صہیب رضی اللہ عنہ کی ایمان افروز ہجرت کے واقعے کے متعلق حضرت ابوعثمان نہدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو اہل مکہ نے کہا:

أَتَيْتَنَا صُعْلُوكًا حَقِيرًا، فَكَثُرَ مَالُكَ عِنْدَنَا، وَبَلَغْتَ الَّذِي بَلَغْتَ، ثُمَّ تُرِيدُ أَنْ تَخْرُجَ بِمَالِكَ وَنَفْسِكَ، وَاللّٰهِ! لَا يَكُونُ ذٰلِكَ.

''اے صہیب! جب تم یہاں آئے تھے تو بڑے مفلس، قلاش اور حقیر انسان تھے۔ یہاں رہ کر تم نے بے شمار دولت کمائی ہے اور معاشرے میں بلند مقام حاصل کیا ہے۔ اب تم یہاں سے نکلنا چاہتے ہو اور اپنا مال و متاع بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو، اللہ کی قسم! ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔''

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلْتُ لَكُمْ مَالِي أَتُخَلُّونَ سَبِيلِي؟

''مجھے بتلاؤ: اگر میں اپنا سارا مال تمھارے حوالے کر دوں تو کیا پھر تم مجھے جانے دو گے؟''

انھوں نے کہا: ہاں! چنانچہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا مال ان کے سپرد کر دیا اور خود ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «رَبِحَ صُهَيْبٌ! رَبِحَ صُهَيْبٌ!» ''صہیب نے نفع کا سودا کیا، صہیب نے بڑا نفع کمایا۔''[2]

[1] السيرة لابن هشام: 476/2. [2] صحيح ابن حبان، حديث: 7082، السيرة لابن هشام: 477/2.

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ حضرت صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں: صہیب رضی اللہ عنہ بغرض ہجرت روانہ ہوئے۔ اہل مکہ ان کے پیچھے ہو لیے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے اپنے ترکش سے چالیس تیر نکالے اور مکہ والوں سے کہا: تم مجھ تک اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک میرے یہ تیر تم لوگوں کے بدن میں پیوست نہ ہو جائیں، جب تیر ختم ہو جائیں گے تو میں تلوار سے تمھارا مقابلہ کروں گا۔ تم میری مردانگی کو خوب جانتے ہو۔ اگر تم میرا رستہ چھوڑ دو تو میں اپنی دو لونڈیاں مکہ میں چھوڑ رہا ہوں، وہ تم لے لو۔ عکرمہ فرماتے ہیں: اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے یہی آیت صہیب رضی اللہ عنہ کو پڑھ کر سنائی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾

''اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو (اس کے ہاتھ) بیچ ڈالتا ہے۔''

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اپنی ہجرت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ ہجرت مدینہ کے لیے روانہ ہوئے۔ میری کوشش تھی کہ ہجرت کے وقت مَیں بھی نبیِ اکرم ﷺ کی رفاقت حاصل کروں۔ مگر مجھے قریش کے دو لونڈوں نے روک دیا۔ میں نے دو راتیں مسلسل مسہل کا بہانہ بنایا۔ میں بار بار حاجت کے لیے چکر لگاتا تھا۔ وہ لونڈے کہنے لگے: اللہ تعالیٰ نے اسے پیٹ کی بیماری میں ڈال دیا ہے، حالانکہ میں تندرست تھا۔ ایک رات میں خاموشی سے نکل کھڑا ہوا۔ انھوں نے میرا پیچھا کیا اور مجھے آ لیا۔ میں نے ان سے کہا: اگر میں تمھیں سونے کے اوقیے دے دوں تو کیا تم میرا راستہ چھوڑ دو گے۔ انھوں نے میرے ساتھ اتفاق کیا، چنانچہ میں ان کے ساتھ مکہ واپس چلا آیا اور اُن سے کہا: اس دروازے کی چوکھٹ کے نیچے زمین کھودو۔ اس کے نیچے اوقیے ہیں، پھر فلاں عورت کے پاس جاؤ۔ اس کے پاس میرے لباس کے دو عمدہ جوڑے ہیں۔ اس کے بعد میں نے وہاں سے ہجرت کی اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے جونہی مجھے دیکھا تو تین مرتبہ یہ فرمایا:

«يَا أَبَا يَحْيٰى! رَبِحَ الْبَيْعُ، يَا أَبَا يَحْيٰى! رَبِحَ الْبَيْعُ، يَا أَبَا يَحْيٰى! رَبِحَ الْبَيْعُ»

''اے ابویحییٰ! تیری تجارت فائدہ مند ہے۔ اے ابویحییٰ! تیری تجارت فائدہ مند ہے، اے ابویحییٰ! تیری تجارت فائدہ مند ہے۔''[1]

[1] المستدرك للحاكم: 3/398-400، تفسير ابن أبي حاتم: 2/368، 369.

واقدی کی سند سے یہ بات منقول ہے کہ ہجرت میں سب سے آخر میں مدینہ پہنچنے والے حضرت علی اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہما تھے۔ یہ دونوں حضرات نصف ماہِ ربیع الاول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قباء پہنچے۔ [1]

دیگر مہاجرین رضی اللہ عنہم

بعدازاں ہجرت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا، طلحہ بن عبیداللہ، صہیب بن سنان، حمزہ بن عبدالمطلب، زید بن حارثہ، ابومرثد کناز بن حصن، انسہ، ابوکبشہ، عبیدہ بن حارث اور ان کے دونوں بھائی طُفیل بن حارث اور حصین بن حارث، مسطح بن اثاثہ، سویبط بن سعد، طلیب بن عمیر، خباب بن ارت، عبدالرحمٰن بن عوف، زبیر بن عوام، ابوسبرہ بن ابی رہم، مصعب بن عمیر، ابو حذیفہ بن عتبہ، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، عتبہ بن غزوان اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم ہجرت کر کے مدینہ پہنچے۔ رفتہ رفتہ اسی طرح تمام صحابہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں جمع ہو گئے۔ [2]

انصار کا والہانہ استقبال

مہاجرین رضی اللہ عنہم جب مدینہ منورہ پہنچے تو انھیں وہاں قیام کے سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ان کے انصاری بھائی خود آرزومند تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم تشریف لے آئیں، چنانچہ انصار مدینہ طیبہ میں مہاجرین کا والہانہ استقبال کرنے لگے۔ انھوں نے مہاجرین کے لیے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیے اور انھیں اپنے اموال میں برابر کا حق دے دیا۔

ابتدائی طور پر مہاجرین کی تعداد مسلمان انصاریوں سے زیادہ تھی۔ اس وجہ سے ایک انصاری ایک مہاجر کی یا مہاجرین کی ایک جماعت کی ضیافت کا اہتمام کرتا رہا۔ مہاجرین کے پاس نہ مال و زر تھا، نہ دنیاوی ضروریات پوری کرنے کا کوئی سامان، بعض مہاجرین تن تنہا اکیلے آئے تھے۔ بعض اپنے اہل وعیال کے ساتھ مدینہ پہنچے تھے۔ چنانچہ مہاجرین کے قیام کا تسلی بخش اہتمام کرنا، انھیں مقامی زندگی کے دھارے میں شامل کرنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے عزیز واقارب کو چھوڑ کر مدینہ پہنچنے والوں پر اپنے خلوص اور محبت کی متاع چھڑکنا ان کی زندگی کا سب سے زیادہ مسرت بخش کام بن گیا۔ اسلامی اخوت کے عقیدے نے مہاجرین اور انصار کو دینی وحدت و یگانگت کی ایک لڑی میں پرو دیا۔

انصار کی مہاجرین کے ساتھ ایثار کی بہت سی مثالیں ہیں۔ یہاں اس سلسلے میں ایک مثال پیش کی جاتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دین اسلام میں اخوت اور وحدتِ ملت کا کتنا عظیم الشان تصور پایا جاتا ہے۔ سعد بن

[1] المستدرك للحاكم: 3/397. [2] السيرة لابن هشام: 477-480.

ربیع رضی اللہ عنہ نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو اپنے ہاں قیام کی دعوت دی تو سعد رضی اللہ عنہ اصرار کرنے لگے کہ میں اپنا مال دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوں اور اپنی بیویوں میں سے ایک کو طلاق دے دیتا ہوں تاکہ میرا آدھا مال بھی آپ لے لیں اور میری ایک بیوی سے شادی بھی کر لیں۔ لیکن عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے نہایت احترام کے ساتھ اس پیشکش کو ان الفاظ سے رد کر دیا:

بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِي أَهْلِكَ وَمَالِكَ، دُلَّنِي عَلَى السُّوقِ.

''اللہ تبارک وتعالیٰ تمھارے اہل وعیال اور مال میں برکت عطا فرمائے۔ مجھے صرف بازار کا رستہ بتا دیجیے۔''

وہ بازار گئے اور محنت مزدوری کی۔ اس کے صلے میں انھیں گھی اور پنیر ملا۔ [1]

[1] صحيح البخاري: 3937.

مہاجرین کی قیام گاہیں

اسلام کا پہلا سفیر

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مدینہ پہنچے تو حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں قیام پذیر ہوئے۔ انھوں نے وہیں رہ کر اسلام کی تبلیغ کا فرض اتنے خلوص اور جاں فشانی سے انجام دیا کہ بنی امیہ بن زید اور خطمہ اور وائل کے گھرانوں کے علاوہ باقی تمام انصار کے ہاں دور تک اسلام کا اُجالا پھیل گیا۔ ان کا کوئی ایسا گھرانہ باقی نہ بچا جس میں چند مرد اور عورتیں مسلمان نہ ہو چکی ہوں۔ [1]

بنو خطاب کا قافلہ

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور ان کی قوم کے دیگر افراد میں سے ان کا بھائی زید بن خطاب، عمرو اور عبداللہ، سراقہ بن معتمر کے بیٹے، ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا پہلا خاوند خنیس بن حذافہ سہمی، سعید بن زید بن عمرو بن نفیل، واقد بن عبداللہ تمیمی، خولی بن ابی خولی، مالک بن ابی خولی، ایاس بن بکیر، عاقل بن بکیر، عامر بن بکیر، خالد بن بکیر اور عیاش بن ابی ربیعہ پر مشتمل جب یہ قافلہ مدینہ منورہ پہنچا تو قباء میں رفاعہ بن عبدالمنذر بن زنبر رضی اللہ عنہ کے ہاں قیام پذیر ہوا۔ دوسرا قول یہ بھی ہے کہ: عمر بن خطاب، زید بن خطاب، عمرو بن سراقہ، عبداللہ بن سراقہ، خنیس بن حذافہ، سعید بن زید، ایاس بن بکیر، عامر بن بکیر، عاقل بن بکیر اور خالد بن بکیر سمیت یہ تمام افراد مبشر بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔

ڈاکٹر احمد رجب نے اس قافلۂ مہاجرین کی مزید تفصیل بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ابوسلمہ بن عبدالاسد، عامر بن ربیعہ، ابواحمد بن جحش جن کے ساتھ ام المؤمنین زینب بنت جحش، ام حبیبہ بنت جحش، حمنہ بنت جحش تھیں، یہ سب رفاعہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ کے بھائی مبشر بن عبدالمنذر بن زنبر رضی اللہ عنہ کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ اسی گھر میں دیگر مہاجرین عکاشہ بن محصن، شجاع بن وہب، عقبہ بن وہب اور اربد بن حمیر رضی اللہ عنہم بھی قیام پذیر ہوئے۔ حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کے بارے میں ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ اپنے خاوند مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے

[1] الرحیق المختوم، ص: 209.

گھر قیام پذیر ہوئیں۔

ام المؤمنین حفصہ رضی اللہ عنہا بھی اسی جمعیت کے ساتھ اپنے والد محترم اور خاوند کے ساتھ مبشر رضی اللہ عنہ کے ہاں مقیم رہیں۔

خبیب بن اساف (یساف) انصاری رضی اللہ عنہ کا گھرانہ

خبیب بن اساف رضی اللہ عنہ کے ہاں طلحہ بن عبیداللہ بن عثمان، ان کی والدہ ماجدہ اور صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ رہائش پذیر ہوئے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ اسعد بن زرارہ کے ہاں ٹھہرے تھے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ

حمزہ بن عبدالمطلب، زید بن حارثہ، ابومرثد کنّاز بن حصن، انسۃ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ابوکبشہ یہ تمام قباء میں کلثوم بن ہدم کے ہاں رہائش پذیر ہوئے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ حمزہ رضی اللہ عنہ بنونجار کے اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے ہاں ٹھہرے۔ ایک قول کے مطابق حمزہ، زید بن حارثہ اور ابومرثد رضی اللہ عنہم، سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔

سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ کا گھرانہ

سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ کا گھرانہ بیت العزاب، یعنی کنواروں کا گھر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس گھر میں غیر شادی شدہ مہاجرین مقیم ہوئے۔

عبداللہ بن سلمہ رضی اللہ عنہ

عبیدہ بن حارث بن المطلب ان کی والدہ سُخَیلہ، ان کے بھائی طفیل بن حارث، حصین بن حارث، مسطح بن اثاثہ بن عباد بن المطلب، سویط بن سعد بن حریملہ، طلیب بن عمیر اور خباب رضی اللہ عنہم قباء میں عبداللہ بن سلمہ رضی اللہ عنہ کے ہاں ٹھہرے۔

بنو جحجبی کا گھرانہ

زبیر بن عوام اور ان کی زوجہ اسماء بنت ابی بکر، ابوسبرہ بن ابی رہم بن عبدالعزیٰ اور ان کی زوجہ ام کلثوم بنت سہیل رضی اللہ عنہم منذر بن محمد بن عقبہ بن احیحہ بن الجلاح کے گھر تشریف فرما ہوئے۔

ابوحذیفہ اور ان کے مولی سالم رضی اللہ عنہما کی قیام گاہ

ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ اور ان کے آزاد کردہ غلام سالم رضی اللہ عنہما، سلمہ رضی اللہ عنہ کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ اموی کہتے

ہیں: ان دونوں نے خبیب بن اساف رضی اللہ عنہ کے گھر رہائش اختیار کی۔

بنوعبدالاشہل کا گھرانہ

بنوعبدالدار کے بھائی بند مصعب بن عمیر بن ہاشم رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا سعد بن معاذ بن نعمان کے گھر ٹھہرے۔ ان کا تعلق بنوعبدالاشہل سے تھا۔

رقیہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خاوند عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی جائے قیام

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ محترمہ رقیہ رضی اللہ عنہا بنونجار میں اوس بن ثابت بن منذر کے ہاں قیام فرما ہوئیں۔

عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ کا ٹھکانا

عتبہ بن غزوان بن جابر رضی اللہ عنہ جب ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو انھوں نے دارعبدالاشہل میں عباد بن بشر بن وقش کے ہاں قیام کیا۔[1]

مہاجرین مسلمانوں کی آباد کاری کے لیے انصاریوں نے بڑے خلوص اور محبت سے انتھک کام کیا۔ مہاجرین کی بڑی جماعت کا بڑی خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور ان کی مطلوبہ ضروریات پوری کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ انصار کرام نے مہاجرین کو اپنے ہاں ٹھہرانے کے لیے جس ایثار اور حُسن انتظام کا مظاہرہ کیا، وہ تاریخ کا ایک یگانہ اور یادگار واقعہ ہے۔ دینی اخوت، باہمی محبت، جذبۂ ایثار اور فراخدلانہ تعاون کی بدولت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ آنے والے یا بعد میں آنے والے مہاجر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کرنے کے لیے بہت اچھی اور پُر امن جگہ مل گئی اور انصار و مہاجرین صحابۂ کرام کی باہمی محبت و اخوت نے مدینہ منورہ کو قریۂ جمال بنا دیا۔

[1] السيرة لابن هشام: 2/477-479، السيرة النبوية لأبي شهبة: 1/469,468، السيرة النبوية للصلابي: 1/449، القدوة في السيرة النبوية، ص: 199.

نبی ﷺ کی ہجرت مدینہ

اونچی اونچی عمارتوں کی خوبصورتی اور بلندی دیکھ کر سبھی خوش ہوتے ہیں مگر اس حقیقت کی طرف کسی کی نظر نہیں جاتی کہ ان عمارتوں کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے نہ جانے کتنے معماروں اور مزدوروں نے اپنا کتنا خون جگر صرف کیا ہوگا، تب جا کر یہ عمارتیں استوار ہوئیں اور نگاہوں کا مرکز بن گئیں۔

ایوان تاریخ کے سیاح آج بھی مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے نشان دیکھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں۔ انھیں اسلامی حکومت کا جلال، خلفائے راشدین کی عظیم الشان فتوحات اور ہندوستان سمیت دنیا کے بہت بڑے حصے پر ایک ہزار سال تک مسلمانوں کے پرچم کی فاتحانہ اُڑانیں ہکا بکا کر دیتی ہیں۔ انھیں مسلمانوں کے مدنی دور کی رفعتیں تو نظر آتی ہیں مگر مکی دور کی وہ مظلومانہ حالت دکھائی نہیں دیتی جب محمد رسول اللہ ﷺ غار حراء کی بلندیوں سے وحی الٰہی کا نور لے کر اترے تھے اور کفر و شرک کی ظلمتوں میں ڈوبی ہوئی انسانیت کو یہی نور دکھا کر توحید کے اُجالے میں لے آنے کی جدوجہد فرما رہے تھے۔ اِس راہِ صداقت ہی میں آپ ﷺ کے مٹھی بھر پیروکاروں کو کفار مکہ کا کتنا خوفناک ظلم و ستم جھیلنا پڑا۔ کیسی کیسی سنگ زنی برداشت کرنی پڑی، کتنا سفاکانہ سماجی بائیکاٹ گوارا کرنا پڑا، کیسا کیسا طوفان بدتمیزی سہنا پڑا، تب جا کر کامیابی کا رُخ روشن نظر آیا۔

غار حراء (جبل حراء، مکہ مکرمہ)

مسلمانوں کے خلیفہ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی تو قادسیہ کی فتح کے بعد مجاہدین اسلام کے گھوڑوں کی ٹاپیں دمشق کے کوچہ و بازار تک جا پہنچیں۔ عالم یہ تھا کہ مسلمانوں کے لشکر جہاں جہاں جاتے تھے، مجاہدین اسلام مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کو نہایت محبت اور مہربانی سے اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ جو لوگ اسلام قبول کر لیتے تھے، انھیں سینے سے لگا لیتے تھے اور جو لوگ اسلام قبول نہیں کرتے تھے، ان پر انھی کی حفاظت و پاسبانی کے لیے جزیے کے عنوان سے ایک معمولی سا ٹیکس عائد کر دیتے تھے۔ یہ زور اور زبردستی کا معاملہ نہیں تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فتوحات کا تانتا بندھ گیا۔

اطراف و اکناف سے خُمس کا مال آنے لگا۔ لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ جن غیر مسلموں نے اسلام قبول نہ کیا، ان سے جزیہ وصول کیا جانے لگا۔ خُمس، جزیہ، زکاۃ اور عُشر کی مد میں دولت کی ایسی ریل پیل ہوئی کہ سب کی نظریں چکا چوند ہوگئیں۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محصولات کا دستاویزی ریکارڈ رکھنے کے لیے رجسٹروں میں آمدنی کے اندراجات کی ضرورت محسوس کی۔ جونہی یہ ضرورت محسوس ہوئی، اُسی وقت ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہوگیا، یعنی رقوم کی آمد و خرچ کا حساب لکھا جائے تو سن کون سا لکھا جائے؟ اِس وقت تک مسلمانوں کا اپنا کوئی سن نہیں تھا۔ اُس دور میں بابلی، یہودی، عیسوی، ہندوستانی اور ایرانی سنین مروج تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غیور طبیعت کو کسی طور گوارا نہ ہوا کہ اسلامی مملکت کے حساب کتاب اور جملہ معاملات کے لیے غیر مسلموں کے سن بروئے کار لائے جائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ مسئلہ اکابر صحابہ کے روبرو پیش کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور جملہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم خوب جانتے تھے کہ قومی زندگی کی تقویم کے لیے خود اپنا قومی سن موجود ہونا کتنا ضروری ہے۔ قومی سن درحقیقت کسی قوم کی پیدائش اور عروج کی تاریخ کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے سے قومیں اپنی تاریخ کے سب سے اہم اور بنیادی واقعے کی یاد تازہ رکھنا چاہتی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے قومی سن کے تقرر کے لیے بہت سے اہم واقعات موجود تھے، مثلاً: محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت، نزول وحی کی ابتدا، بدر کی تاریخی فتح، فتح مکہ، حجۃ الوداع کا عظیم الشان اجتماع جو اسلام کی ظاہری اور معنوی تکمیل کا تاریخی موقع تھا۔ ان اہم ترین واقعات میں سے کوئی بھی واقعہ سن کے تقرر کے لیے بروئے کار لایا جاسکتا تھا۔ لیکن امیر المؤمنین حضرت عمر اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی

ان واقعات کو اسلامی سن کے تقرر کے لیے موزوں نہ سمجھا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بڑھ کر اس حقیقت کا اندازہ شناس اور کون ہوسکتا تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کا دن تاریخ کائنات کا اہم ترین واقعہ ہے لیکن جام توحید سے سرشار صحابہ کرام کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ وہ عالم انسانیت کی سب سے بڑی شخصیت کے یوم پیدائش کو اسلامی سن کی بنیاد قرار دے کر دنیا کی عام قوموں کی طرح شخصیت پرستی (Personality Cult) کا مظاہرہ کریں۔ حضرت عمر اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت نے فیصلہ کیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے اعمالِ رفیعہ میں سب سے بڑا عمل تلاش کیا جائے اور اُسی عمل کی یاد دائم تازہ رکھنے کے لیے اسلامی سن کا تقرر کر دیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ کی مبارک زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک عمل عظیم سے عظیم تر ہے۔ آپ ﷺ کا ادنیٰ سے ادنیٰ عمل بھی حسن کا مرقع اور عظمت کی معراج ہے۔ اب اسلامی سن کے تقرر کے لیے حضرت عمر اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کے اعمالِ جلیلہ کی کہکشاں پر نظر ڈالی تو بلاتأمل فیصلہ کر دیا کہ آپ ﷺ کا سب سے بڑا عمل اُس شب ظہور میں آیا جب آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ کے بام و در پر حسرت بار الوداعی نگاہ ڈالی اور انتہائی بے چارگی کے عالم میں اپنے وطن، اپنے گھر اور اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ کر انتہائی دشوار گزار راستے کے نشیب و فراز عبور کرتے ہوئے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ حضرت عمر اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خوب معلوم تھا کہ دنیا کی دوسری قوموں نے اپنے فتح و اقبال کے واقعات پر یا شخصیت پرستی کی بنیاد پر اپنے سن شروع کیے مگر ان قوموں کے بالکل برعکس مسلمانوں کے خلیفہ دوم اور ان کے ساتھ کبار صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کی مظلومیت، بے چارگی اور اللہ کے دین کی دعوت آگے بڑھانے کے لیے ہجرت کے واقعے کو سن ہجری کی بنیاد بنا کر قیامت تک کے لیے یادگار بنا دیا۔ درحقیقت یہی وہ دن تھا جب آفتاب اسلام مدینہ سے طلوع ہو کر ساری دنیا میں چمکنے والا تھا اور قضا و قدر نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ مسلمان فاتح عالم بنیں تاکہ وہ توحید کا پیغام لے کر ساری دنیا میں پہنچیں اور بنی نوع انسان کو کفر اور شرک کی ہلاکت سے بچائیں۔

آئیے ماضی کے جھروکوں سے تاریخ عالم کے اس سب سے بڑے انقلاب انگیز واقعے کے مناظر دیکھیے:

محمد رسول اللہ ﷺ 13 سال تک اللہ تعالیٰ کا پیغام اہلِ مکہ کو پہنچاتے رہے۔ اہل مکہ کو حق شناسائی کی دعوت دیتے رہے۔ اہلِ مکہ نے رسول اللہ کی دعوت کو یکسر نظر انداز کر دیا بلکہ دینِ الٰہی کی مخالفت میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ انھوں نے اخلاقی حدود کو پامال کیا۔ اہلِ ایمان پر ظلم و استبداد کی انتہا کر دی۔ انھیں سخت ترین جسمانی ایذائیں دیتے رہے۔ ان کٹھن حالات میں بھی اہلِ ایمان کے عزم و استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ان تیرہ برسوں میں کفارِ مکہ نے مختلف ابلیسی ہتھکنڈوں سے محمد رسول اللہ ﷺ کو ستایا۔ آپ ﷺ سے بدکلامی کی گئی، جادوگر، پاگل اور شاعر جیسے القابات سے متہم کیا گیا۔ پتھروں سے مارا گیا۔ مسجد الحرام کے پاس تشدد کیا گیا، گلا دبایا گیا، سجدے کی حالت میں پشت پر بھاری پتھر رکھ دیا گیا، نماز پڑھتے ہوئے آپ ﷺ کے کندھوں پر جھلی (آنول، جیر) ڈال دی گئی۔ پورے خاندان کا سماجی اور معاشی بائیکاٹ کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کوہ حلم تھے۔ ان تمام تکالیف کو آپ ﷺ نے نہایت پامردی، ہمت اور صبر و استقامت سے جھیلا۔ جب دعوتِ حق دینے کی پاداش میں آپ ﷺ کی شمع زندگی گُل کرنے کے منصوبے بنے تو ہجرت مدینہ کی راہ باز ہوگئی۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی نقل مکانی

نقل مکانی اور ہجرت انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر امام الانبیاء ﷺ تک تمام نبیوں نے ہجرت کی۔ وہ دھرتی ماتا کی پوجا نہیں کرتے کیونکہ وہ ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست کے قائل تھے۔ قرآن حکیم میں ہے:

﴿إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾

”بے شک زمین تو اللہ ہی کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور اچھا انجام تو پرہیزگاروں ہی کے لیے ہے۔“[1]

نبی ﷺ نے ہجرت کر کے وطن اور وطنیت کی نفی کر دی کیونکہ ملت کی اساس وطن نہیں بلکہ کلمۂ طیبہ ہے اور ملتِ اسلامیہ کلمہ طیبہ کے ساتھ مربوط ہے۔ یہ قیدِ مقام و وطن سے آزاد ہے جو کسی وطن کی پابند نہیں، کسی نسل میں منحصر نہیں، کسی خاص قوم کے ساتھ متعلق نہیں، نہ کسی گروہ ہی سے وابستہ ہے۔

ہجرتِ نبوی اور کفارِ مکہ کا گھناؤنا کردار

نبی ﷺ قریش مکہ کے ظلم و ستم پر بڑے کبیدہ خاطر تھے۔ جب خالق کائنات نے آپ کو مدینہ ہجرت کا حکم دیا، اس وقت باطل کے پرستار اور طاغوتی قوتوں کے علمبردار رسول اللہ ﷺ کو صفحۂ ہستی سے ختم کرنے کی مذموم اور ناکام سازشیں کر رہے تھے۔ سیرت کے تمام مصادر اس بات پر متفق ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی ہجرتِ مدینہ کے موقع پر مشرکین مکہ نے آپ پر تین قاتلانہ حملے کیے۔

[1] الأعراف 128:7۔

غار ثور (جبل ثور)

پہلی مرتبہ جب مشرکینِ مکہ نے نبی ﷺ کے گھر کا محاصرہ کیا تھا۔ دوسری مرتبہ اس وقت جب مشرکین نبیِ اکرم ﷺ کا پیچھا کرتے ہوئے غارِ ثور کے دہانے تک پہنچ گئے اور تیسری مرتبہ اس وقت جب سراقہ نے آپ ﷺ کے راستے میں آپ کا تعاقب کیا اور آپ تک جا پہنچا۔

یہ تمام حربے اور سازشیں اتنی جزرسی اور باریک بینی سے کی گئی تھیں کہ کفار اور مشرکین کو یقین تھا کہ اب کے محمد (ﷺ) نہیں بچ سکیں گے لیکن تمام مرحلوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے محبوب بندے اور رسول کو بچایا اور دشمنانِ اسلام کو رسوا کیا۔

مکی مسلمان رفتہ رفتہ اکا دکا اور ٹولیوں کی صورت میں ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے۔ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے اجازت ملنے تک مکہ ہی میں مقیم رہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس مکہ میں سوائے سیدنا ابوبکر صدیق، آل ابوبکر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہم کے کوئی باقی نہ رہا، صرف چند بے کس مسلمان تھے جو کفار کے پنجۂ ستم میں پھنسے ہوئے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ نبی ﷺ سے مدینہ ہجرت کی اجازت طلب کی تو نبی ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَعْجَلْ، لَعَلَّ اللّٰهَ يَجْعَلُ لَكَ صَاحِبًا»

''(اے ابوبکر!) جلدی نہ کرو، شاید اللہ تعالیٰ تمھارے لیے کوئی رفیقِ سفر بنا دے۔''[1]

ایک دوسری روایت کے مطابق نبی ﷺ نے فرمایا:

«عَلٰى رِسْلِكَ، فَإِنِّي أَرْجُو أَنْ يُؤْذَنَ لِي»

''رکے رہو! مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ہجرت کی اجازت عنایت فرما دے گا۔''

یہ سن کر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اور رسول اللہ ﷺ اکٹھے ہجرت کریں گے۔[2]

سواری کی تیاری

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہجرت کے موقع پر نبی ﷺ کی مصاحبت کا عندیہ ملا تو انھوں نے اس عظیم مقصد کے لیے دو اونٹنیاں مختص کر دیں اور انھیں وافر تازہ خوراک دے کر خوب تیار کیا۔

[1] المعجم الكبير للطبراني: 178/22. [2] صحيح البخاري: 2297.

کفارِ مکہ دینِ حق کی راہ روکنے میں ناکام ہو گئے۔ وہ اپنی تمام تدبیروں میں فیل ہو گئے۔ انھیں اپنی قیادت و سیادت کی چولیں ہلتی نظر آئیں اور مقام و مرتبہ تباہ ہوتا نظر آیا۔ جب انھیں بیعاتِ عقبہ کے عواقب و نتائج کا اندازہ ہوا کہ اوس و خزرج نے محمد ﷺ کو اپنی مدد و اعانت کا یقین دلا دیا ہے اور اپنے مال و عزت، خاندان اور جانوں سے زیادہ انھیں اہمیت دی ہے جس کی بنا پر محمد (ﷺ) کی پوزیشن بہت مستحکم ہو گئی ہے تو مشرکینِ مکہ کو ان سے شدید خطرہ لاحق ہوا، انھوں نے نبی ﷺ کو جان سے مار دینے کی ٹھان لی۔

دوسری طرف اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی حضرت محمد ﷺ کے لیے کمال مہربانی سے مدینہ طیبہ میں نہایت سازگار ماحول تیار کر رکھا تھا۔ وہاں کے باشندے طبعاً کڑیل، شاہسوار، قوت اور غرور والے تھے۔ وہ ہمیشہ سے آزاد تھے۔ وہ کسی کے مطیع ہوئے نہ کسی قبیلے یا حکومت کو تاوان یا ٹیکس ادا کیا۔ اہلِ یثرب کی بڑی آبادی اوس اور خزرج قبائل پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فدائی، مسلمانوں کے جاں نثار اور دشمنانِ اسلام کے زبردست حریف ثابت ہوئے۔ اہلِ یثرب کو وراثت میں اسلحہ ملا۔ صبر و استقامت، دلیری اور جانفشانی ان کی امتیازی خوبیاں تھیں۔

مکی مسلمان رضی اللہ عنہم عدنانی تھے۔ وہ اپنے اعزہ و اقرباء چھوڑ کر اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرتے ہوئے یثرب پہنچ گئے۔ یوں اللہ تبارک و تعالیٰ گویا عدنانیوں اور قحطانیوں کو اسلام کے جھنڈے تلے جمع کرنا چاہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انصار و مہاجرین کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے:

تہامہ قحطان (صوبہ عسیر، سعودی عرب)

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾

"اور مہاجرین اور انصار میں سے (قبول اسلام میں) سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنھوں نے احسان کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔"[1]

رسول اللہ ﷺ نے جس مضبوط اسلامی مرکز کے قیام کے لیے انتھک محنت کی تھی، آج وہ مدینہ طیبہ کے جدید معاشرے کی شکل اختیار کرنے کے بعد ثمر آور ہو چکا تھا اور روحانی عقیدے اور دینی اخوت کے رنگ میں رنگا جا چکا تھا۔

مشرکینِ مکہ کا خوف

مشرکینِ مکہ نے جب دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب اپنے بچوں اور غلاموں کو اوس وخزرج کی طرف منتقل کر رہے ہیں اور کل کلاں مسلمانوں کو ختم کرنا ان کے بس میں نہیں ہوگا تو ان (قریش) کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے اس قدر حامی و مددگار دیکھ کر انھیں شدید خطرات لاحق ہو گئے۔ انھیں یہ خیال ستانے لگا کہ نبی ﷺ بھی یہاں سے ہجرت کر کے اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے تو عین ممکن ہے کہ کچھ عرصہ بعد وہ مکہ پر دھاوا بول دیں۔ اس سے پہلے کہ حالات ان کے قابو سے باہر ہو جائیں، انھیں کوئی قدم ضرور اٹھانا چاہیے۔

دارالندوہ میں قریشِ مکہ کا اجتماع

طاغوتی ستم گروں نے دارالندوہ میں جمع ہو کر محمد ﷺ کے بارے میں قطعی فیصلہ کرنے کی ٹھانی اور تمام اہل حل وعقد کو تاکید کر دی کہ اس مجلس شوریٰ میں لازماً شرکت کریں۔

نجد کا ایک خوبصورت منظر

ابنِ اسحاق رحمہ اللہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جب لوگ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے وقت مقررہ پر دارالندوہ میں جمع ہوئے، اس دن کو یوم الزحمہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس دن شیطان بھی ایک بارعب اور تجربہ کار بزرگ کی شکل میں قیمتی لباس زیب تن کیے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ وضع قطع سے وہ کسی قبیلے کا سردار معلوم ہوتا تھا۔

کفارِ مکہ کے رؤساء نے اسے دیکھا تو پوچھا: آپ کون بزرگ ہیں؟ اس نے جواب دیا: میں نجد کا رہنے والا

[1] التوبة 9: 100.

ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ لوگوں نے آج کوئی اہم فیصلہ کرنے کے لیے اجلاس طلب کیا ہے۔ میں اس اجلاس کی کارروائی سننا چاہتا ہوں، شاید میں کوئی بہتر رائے دے سکوں۔ انھوں نے کہا: ٹھیک ہے تشریف لائیے، چنانچہ وہ مجلس میں داخل ہو گیا۔

اس مجلس شوریٰ میں قریش کے مختلف قبائل سے درجِ ذیل سردار جمع ہوئے:

بنوعبد شمس سے: عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ابوسفیان بن حرب۔

بنونوفل بن عبد مناف سے: طُعَیمہ بن عدی، جبیر بن مطعم اور حارث بن عامر بن نوفل۔

بنوعبدالدار بن قصی سے: نضر بن حارث۔

بنواسد بن عبدالعزیٰ سے: ابوالبختری بن ہشام، زمعہ بن اسود بن مطلب اور حکیم بن حزام۔

بنومخزوم سے: ابوجہل بن ہشام۔

بنوسہم سے: نبیہ بن حجاج اور منبہ بن حجاج۔

بنوجمح سے: امیہ بن خلف۔

ان افراد کے علاوہ بھی کچھ لوگ تھے جن کا تعلق قریشی قبائل سے نہیں تھا۔

اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی۔ قریش کے سردار ایک دوسرے سے کہنے لگے: محمد (ﷺ) نے جو کچھ کیا ہے، وہ تمھارے سامنے ہے۔ اللہ کی قسم! اس کا ارادہ اغیار سے مل کر ہم پر حملہ کرنے کے علاوہ کچھ نہیں۔ اب پانی سر سے گزر رہا ہے۔ اس کے متعلق حتمی اور آخری فیصلہ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا، اس لیے اپنی اپنی تجاویز پیش کرو کہ آخر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟

چنانچہ ہر ایک نے اپنی اپنی بساط کے مطابق تجاویز دینی شروع کیں۔ ایک شخص بولا: اُسے ہتھکڑی پہنا دو، پیروں میں بیڑیاں ڈال دو اور کال کوٹھری میں بند کر دو، پھر صبر کے ساتھ اس دن کا انتظار کرو جب ان کی زندگی کی شمع گل ہو جائے جس طرح ماضی کے شعراء، زہیر اور نابغہ وغیرہ مر گئے۔

یہ سن کر شیخ نجدی (شیطان) کہنے لگا: لَا وَاللّٰهِ! مَا هٰذَا لَكُمْ بِرَأْيٍ ''نہیں، اللہ کی قسم! یہ رائے تمھارے لیے ٹھیک نہیں۔'' اگر تم اس طرح کرو گے تو اس کے عقیدت مندوں کو خبر ہو جائے گی۔ وہ اپنی جان کی بازی لگا دیں گے، زبردست حملہ کریں گے اور محمد (ﷺ) کو تمھاری قید سے چھڑا کر بھگا لے جائیں گے، پھر وہ تمھارے اوپر حملہ کر کے تمھیں تہس نہس کر دیں گے، اس لیے یہ رائے قابل غور نہیں۔

پھر مزید غور کیا گیا۔ آپس میں مشورہ کیا جانے لگا۔ ایک شخص بولا: بہتر ہے اسے جلا وطن کر دیا جائے۔ اگر وہ ہمارے علاقے سے چلا گیا تو ہماری بلا سے! پھر ہمیں اس سے کیا لینا دینا، ہماری جان چھوٹ جائے گی اور باہمی اختلاف دور کر کے ہم پہلے جیسی امن وسکون کی زندگی گزاریں گے۔

اس سے پہلے کہ کوئی اور اس پر اپنا ردعمل ظاہر کرتا، شیطان سے رہا نہ گیا، فوراً بولا: پہلی رائے کی طرح یہ رائے بھی بالکل لغو، باطل اور لایعنی ہے۔ تم محمد (ﷺ) کی فصاحت و بلاغت سے آشنا ہو۔ اس کی شیریں کلامی سے بخوبی آگاہ ہو۔ وہ اپنی دل موہ لینے والی میٹھی میٹھی باتوں سے لوگوں کو اپنا شیدائی بنا لے گا۔

اگر تم انھیں اپنے ہاں سے نکال دو گے تو وہ کسی دوسرے قبیلے کے پاس جا کر رہائش اختیار کر لیں گے۔ پھر ان کا لشکر جرار لے کر تم پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ کیا اس وقت تم ان کا راستہ روک سکو گے؟ ہرگز نہیں۔ کوئی اور تجویز سوچو جو اس فتنے کا قلع قمع کر دے اور تمھارے شہر کا تقدس اور تمھارے علاقے کا امن ان کی یلغار سے محفوظ رہے۔ سب لوگوں نے ابلیس کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے نیا حل سوچنا شروع کر دیا۔

پھر بڑی بحث کے بعد ابوجہل اٹھا اور کہنے لگا: میرے دماغ میں ایک تجویز آئی ہے جو ابھی تک کسی کے ذہن میں نہیں آئی۔ سب چوکنے ہو گئے اور کہنے لگے: ابوالحکم! کہو، کیا تجویز ہے؟ ابوجہل کہنے لگا: میری رائے یہ ہے کہ ہم ہر قبیلے سے ایک مضبوط جسم والا، ارادے کا پکا اور تلوار کا دھنی نوجوان لیں، پھر ہر ایک کو ایک ایک تیز تلوار دے دی جائے۔ انھیں حکم دیا جائے کہ وہ یکبارگی حملہ کر کے اسے قتل کر دیں۔ اس طرح اس کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا۔ بنوعبد مناف پوری قوم سے لڑ نہیں سکیں گے۔ زیادہ سے زیادہ وہ دیت کا مطالبہ کریں گے جسے ہم آسانی سے ادا کر دیں گے۔

یہ سن کر شیخ نجدی چلا اٹھا، بہت خوب! بس! یہی تجویز سب سے زیادہ معقول ہے، اس کے علاوہ تمھاری مصیبت کا کوئی حل نہیں، چنانچہ اس تجویز پر اتفاق ہو گیا۔ مجلس برخاست ہو گئی اور سب نے اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو آگاہ کر دیا

اِدھر کفار مکہ نے مکروہ عہدو پیمان باندھے اور سازش تیار کی، اُدھر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر محمد ﷺ کی حفاظت کا بندوبست فرما لیا اور بذریعہ جبرائیل امین اس سارے معاملے کی خبر آپ ﷺ کو پہنچا دی۔ قرآن حکیم

[1] السيرة لابن هشام :482,481/2۔

میں اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اس طرح کیا:

﴿وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝﴾

''اور جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، تیرے خلاف خفیہ تدبیریں کر رہے تھے تاکہ تجھے قید کر دیں یا تجھے قتل کر دیں یا تجھے نکال دیں اور وہ خفیہ تدبیر کر رہے تھے اور اللہ بھی خفیہ تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ۝﴾

''کیا وہ (کافر) کہتے ہیں: (یہ نبی) شاعر ہے اور ہم اس کے بارے میں حوادثِ زمانہ (موت) کا انتظار کر رہے ہیں؟ کہہ دیجیے: تم انتظار کرو، یقیناً میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔''[2]

اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی ﷺ کو مدینہ ہجرت کرنے کی اجازت عطا فرمادی اور حکم دیا کہ آج رات آپ اپنے بستر پر نہ سوئیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق اجازت اس آیت کریمہ کے ذریعے سے نازل ہوئی:

﴿وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِىْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِىْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّىْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۝﴾

''اور کہیے: اے میرے رب! داخل کر مجھے سچا داخل کرنا اور نکال مجھے سچا نکالنا اور مجھے اپنے پاس سے مدد دینے والا غلبہ عطا کر۔''[3]

ہجرت کے بارے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اطلاع

جب جبرائیل امین علیہ السلام پیغام ربانی لے کر نبی مکرم محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے اور آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا یہ حکم پہنچایا کہ آپ ہجرت فرما جائیں تو اس موقع پر نبی ﷺ نے دریافت فرمایا:

«مَنْ يُّهَاجِرُ مَعِي ؟»

''میرے ساتھ ہجرت کون کرے گا؟''

جبرائیل علیہ السلام نے کہا: ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔[4]

[1] الأنفال 30:8. [2] الطور 31,30:52. [3] بني إسرآءيل 80:17. [4] المستدرك للحاكم 6/3.

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہجرت کی اجازت ملتے ہی رسول اللہ ﷺ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اطلاع دینے ان کے گھر پہنچے۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ آپ ﷺ کا اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر جانا معمول کے خلاف تھا۔ آپ عموماً صبح یا شام ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ایک دن ہم اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عین دوپہر کا وقت تھا۔ کسی (اسماء رضی اللہ عنہا) نے میرے والد ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: دیکھیے! رسول اللہ ﷺ سر ڈھانپے تشریف لا رہے ہیں۔ آپ ہمارے ہاں اس وقت کبھی تشریف نہیں لائے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، اللہ کی قسم! اس گھڑی آپ کی تشریف آوری ضرور کسی خاص وجہ کے تحت ہے۔

رسول اللہ ﷺ آ گئے تو آپ ﷺ نے اجازت طلب کی۔ اجازت ملنے کے بعد گھر میں داخل ہوئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے خیر مقدم کے لیے اپنی چارپائی پیش کی۔ آپ اس پر استراحت فرما ہوئے۔ بعد ازاں نبی ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''سب کو باہر نکال دو۔'' اس وقت میں اور اسماء رضی اللہ عنہا ہی گھر پر موجود تھیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے: میرا باپ آپ پر قربان ہو! اے اللہ کے رسول! یہاں تو صرف آپ کے اہل خانہ ہی ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

«فَإِنِّي قَدْ أُذِنَ لِي فِي الْخُرُوجِ»

''مجھے اللہ تعالیٰ نے نکلنے (ہجرت مدینہ) کی اجازت دے دی ہے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بصد ادب گزارش کی: اے اللہ کے پیارے رسول! اس نیاز مند کو بھی شرف معیت عطا ہو؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں! تم یقیناً میرے ساتھ چلو گے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: یہ خوشخبری سن کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: واللہ! مجھے آج کے دن سے پہلے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ خوشی کے موقع پر بھی کوئی روتا ہے یہاں تک کہ میں نے اس دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو روتے دیکھا جب انھیں رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے موقع پر اپنی معیت کی خوشخبری سے سرفراز فرمایا۔

سواری کی پیشکش

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے لیے تیار کی گئی دونوں اونٹنیاں نبی ﷺ کی خدمت میں پیش کیں اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! یہ سواریاں میں نے ہجرت کے لیے تیار کی ہیں۔ ان دونوں میں سے آپ جونسی اونٹنی چاہیں

پسند فرمالیں؟ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اگر اونٹنی کی قیمت لو گے تو میں لے لوں گا۔'' [1]

رہبر کا تقرر

بنو دِیل بن بکر کا فرد عبداللہ بن اُرَیقط راستوں کی جان پہچان کا ماہر تھا۔ اس کی والدہ بنوسہم بن عمرو میں سے تھی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے اجرت پر راہ دکھانے پر مامور کیا اور دونوں سواریاں اس کے حوالے کر دیں۔ انھوں نے اسے تاکید کی کہ فلاں دن، فلاں جگہ وقت مقررہ پر پہنچ جانا۔

زادِ راہ اور ذات النِّطاقین

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب ہجرت مدینہ کا فیصلہ ہو چکا تو ہم نے رسول اللہ ﷺ اور اپنے والد گرامی کے سفر کے لیے کھانے پینے کا سامان تیار کیا۔ کھانا ایک تھیلی میں رکھا۔ ایک چھوٹے سے مشکیزے میں پانی بھر دیا، پھر ان دونوں کو باندھنے کے لیے کوئی چیز نہ ملی تو سیدہ اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما نے اپنا نطاق (کمر بند) اتار کر پھاڑ ڈالا۔ اس کے ایک حصے سے تھیلی اور دوسرے حصے سے مشکیزے کا منہ باندھ دیا۔ [2]

عرب میں خواتین ایک کپڑا کمر بند کے طور پر استعمال کرتی تھیں جو نطاق کے نام سے معروف تھا۔ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے اس موقع پر اپنا نطاق استعمال کیا۔ اس وجہ سے ان کا نام ذات النطاق (پٹکا یا پٹی والی)، ایک دوسری روایت کے مطابق ذات النطاقین (دو پٹکوں والی) پڑ گیا۔

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے سامان باندھنے میں جو مستعدی دکھائی، اس پر نبی ﷺ نے سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کو جنت کی خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا:

«إِنَّ لَهَا نِطَاقَيْنِ فِي الْجَنَّةِ»

''یقیناً اسماء کے لیے جنت میں دو نطاق (پٹکے) ہیں۔'' [3]

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہجرت کے سلسلے میں ضروری ہدایات دینے کے بعد نبی ﷺ اپنے گھر تشریف لے آئے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ہجرت مدینہ کی اطلاع

جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام پہنچا دیا تھا کہ آج رات آپ اپنے بستر پر نہ سوئیں، چنانچہ

[1] صحيح البخاري :3905، السيرة لابن هشام :485/2. [2] صحيح البخاري :3905، الطبقات لابن سعد :229/1.
[3] أنساب الأشراف :307/1، سبل الهدى والرشاد :239/3.

نبی ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو اپنے ارادۂ ہجرت کے بارے میں مطلع فرمایا اور تاکید فرمائی کہ میرے بعد تم چند دن مکہ میں ٹھہرنا اور متعلقہ لوگوں کو امانتیں واپس کر دینا۔

سرورِ دو عالم ﷺ ظالموں کے نرغے میں

جب رات کے سائے گہرے ہو گئے تو منتخب قریشی نوجوان اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کے لیے رحمۃ للعالمین ﷺ کے گھر کے گرد تیز دھار برہنہ تلواریں لے کر منڈلانے لگے۔ انھوں نے کسی مزاحمت کے بغیر بہت جلد اس مرکز رشد و ہدایت کو اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ اس لمحے کا انتظار کرنے لگے جب اللہ کے رسول ﷺ اپنے گھر سے باہر نکلیں تو وہ یکبارگی آپ ﷺ پر ٹوٹ پڑیں اور آپ ﷺ کی شمعِ زندگی گُل کر دیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ان کے ان ناپاک عزائم اور اپنی قدرت کاملہ کا تذکرہ کیا ہے:

﴿يُرِيدُونَ لِيُطْفِـُٔوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ○﴾

''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور (دین اسلام) اپنے مونہوں سے بجھا دیں، جبکہ اللہ اپنا نور پورا کرنے والا ہے اگرچہ کافر ناپسند ہی کریں۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے کاشانۂ اقدس کے باہر دشمنانِ اسلام کو دندناتے ہوئے دیکھا تو علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

«نَمْ عَلٰى فِرَاشِي، وَتَسَجَّ بِبُرْدِي هٰذَا الْحَضْرَمِيِّ الْأَخْضَرِ فَنَمْ فِيهِ، فَإِنَّهُ لَنْ يَّخْلُصَ إِلَيْكَ شَيْءٌ تَكْرَهُهُ مِنْهُمْ»

''میرے بستر پر سو جاؤ اور میری یہ سبز حضرمی چادر اوڑھ لو اور اسی میں سو رہو، تمھیں ان لوگوں کی طرف سے کسی ناگوار امر کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

نبی ﷺ یہی سبز حضرمی چادر اوڑھ کر سوتے تھے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل کی۔ انھوں نے تمام خطرات کو بالائے طاق رکھا اور بہت خوش دلی سے آپ ﷺ کے بستر پر دراز ہو گئے۔ ہر چند قریش آپ کے دشمن تھے

ذوالفقار۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار

[1] الصف 8:61.

لیکن وہ پکا یقین رکھتے تھے کہ آپ ﷺ صادق و امین ہیں، اس لیے وہ امانتیں آپ ہی کے پاس رکھتے تھے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے سب لوگوں کی امانتیں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیں اور تاکید فرمائی کہ یہ امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچا دیں۔

قریش مکہ کے جن بدترین لوگوں نے کاشانہ نبوی کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ ان کے نام یہ ہیں:

ابوجہل، حکم بن عاص، عقبہ بن ابی معیط، نضر بن حارث، امیہ بن خلف، ابن عیطلہ، زمعہ بن اسود، طعیمہ بن عدی، ابولہب، ابی بن خلف، نبیہ بن حجاج اور منبہ بن حجاج۔ [1]

ان لوگوں میں ابوجہل سب سے آگے تھا۔ وہ نبی ﷺ سے تمسخر کرتا تھا۔ آپ ﷺ کا مذاق اڑاتا تھا اور بڑی بدتمیزی سے پیش آتا تھا۔ اُس دن وہ آپ ﷺ کے گھر کے باہر کھڑا تھا، ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا اور لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ محمد (ﷺ) کا زعم ہے کہ تم ان کی اتباع کرو گے تو دنیا میں عرب و عجم کے بادشاہ بنو گے اور مرنے کے بعد تمھیں بہشت بریں ملے گی اور ان پر ایمان نہ لاؤ گے تو دنیا میں ان کے پیروکاروں کے ہاتھوں سے قتل ہو جاؤ گے اور مرنے کے بعد جہنم جلو گے۔

اسی دوران میں نبی ﷺ گھر سے ایک مشت خاک لے کر باہر تشریف لائے اور فرمایا:

«أَنَا أَقُولُ ذٰلِكَ أَنْتَ أَحَدُهُمْ»

''(ہاں) میں یہی کہتا ہوں اور تم ان میں سے ایک ہو۔''

اس کے ساتھ ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان لوگوں کی بصارت چھین لی۔ گھیراؤ کرنے والے تمام دشمن وقتی طور پر اندھے ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ سورۂ یٰسٓ کی ان آیات کی تلاوت فرمانے لگے:

﴿ يٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ ﴾ (یٰسٓ 36:1-9)

''یٰسٓ۔ قسم ہے قرآن حکیم کی۔ بلاشبہ آپ یقیناً رسولوں میں سے ہیں۔ راہ راست پر ہیں۔ (یہ قرآن) نہایت غالب، خوب رحم کرنے والے (اللہ) کا اتارا ہوا ہے۔ تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جس کے باپ

[1] السيرة لابن هشام: 483,482/2.

دادا نہیں ڈرائے گئے، لہٰذا وہ (دین سے) غافل ہیں۔ بلاشبہ ان کی اکثریت پر (اللہ کا) قول ثابت ہو گیا ہے، چنانچہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ بے شک ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں اور وہ (ان کی) ٹھوڑیوں تک ہیں، لہٰذا وہ سر اوپر اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور ہم نے ان کے آگے ایک دیوار بنا دی اور ان کے پیچھے بھی ایک دیوار، پھر ہم نے ان (کی آنکھوں) کو ڈھانک دیا، لہٰذا وہ دیکھ نہیں سکتے۔''

ان آیات کی تلاوت کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے مٹھی بھر مٹی ان ظالموں کے سروں پر پھینکی۔ شیطان کے تمام کارندوں کے سروں پر مٹی پڑ گئی۔ آپ ان کے سامنے سے گزر گئے اور کسی کو نظر نہ آئے۔

اس کے بعد آپ ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ چشم براہ بیٹھے تھے۔ انھوں نے نبی ﷺ کو مرحبا کہا، سامان سفر لیا اور دونوں رات کے اندھیرے میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مکان کے عقب میں چھوٹے سے دروازے سے نکل کر غار ثور کی طرف روانہ ہو گئے۔

اِدھر مشرکین مکہ آپ ﷺ کے گھر کا گھیراؤ کیے کھڑے رہے اور انتظار کرتے رہے تاکہ آپ ﷺ نکلیں تو وہ اپنے ناپاک ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ اسی اثنا میں ایک شخص آپ ﷺ کے مکان کے قریب سے گزرا۔ اس نے قریش کی جماعت سے پوچھا: تم لوگ کیوں کھڑے ہو اور کس کے منتظر ہو؟ کہنے لگے: ہم محمد (ﷺ) کے منتظر ہیں کہ وہ برآمد ہوں تو ہم انھیں قتل کریں۔ وہ شخص کہنے لگا: اللہ تمھیں برباد کرے! محمد (ﷺ) تو کب کے تمھیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ تمھیں اپنی حالت کا کوئی ہوش نہیں۔ وہ تم لوگوں کے سروں پر خاک ڈال کر دور نکل گئے ہیں۔

ان لوگوں نے یہ بات سُنی تو فوراً اپنے سروں پر ہاتھ پھیرنے لگے اور مٹی دیکھ کر بڑے پشیمان ہوئے۔ لیکن جب انھوں نے گھر کے اندر جھانکا تو دیکھا کہ وہاں کوئی شخص موجود ہے اور آپ ﷺ کی چادر تانے سو رہا ہے۔ وہ کہنے لگے: اللہ کی قسم! محمد (ﷺ) تو اپنی چادر اوڑھے سو رہے ہیں۔ انھیں یہی گمان رہا۔ یوں انھوں نے ساری رات آپ ﷺ کے کاشانۂ مبارک کا محاصرہ کیے رکھا۔

صبح جب نبی ﷺ کے بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بستر پر پائے گئے تو یہ لوگ ہکا بکا رہ گئے اور ندامت سے کہنے لگے: جس شخص نے ہمیں پہلے مطلع کیا، اس کی بات ٹھیک تھی۔ [1]

ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر سے روانگی

نبی ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی معیت میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر کے عقبی دروازے سے نکلے۔ اس موقع پر ان دونوں کو کسی

[1] السيرة لابن هشام: 483/2.

نے نہیں دیکھا۔ نبی ﷺ نہایت معاملہ فہم، صاحب بصیرت اور بہت بڑے مدبر تھے۔ آپ ﷺ کی خداداد بصیرت نے اندازہ کرلیا تھا کہ طاغوت یہ کبھی برداشت نہیں کرے گا کہ حق کی قوتیں مجتمع ہوں اور حق کو استحکام نصیب ہو کیونکہ حق کے استحکام میں جہالت کی ہلاکت ہے، اس لیے جوں ہی کفار مکہ کو علم ہوگا کہ محمد ﷺ مکہ میں نہیں تو وہ فوراً جان لیں گے کہ محمد ﷺ یثرب روانہ ہو گئے ہیں، پھر وہ ان کے تعاقب میں سرپٹ بھاگ کھڑے ہوں گے۔

سیدنا محمد ﷺ نے کمال دانشمندی سے کام لیا۔ مکہ سے مدینہ کے عام شمالی راستے کے بجائے بالکل الٹ جنوب کی جانب سفر کیا، جو اگرچہ پُرصعوبت اور غیر مستعمل راستہ تھا، تاہم وہ دشمن کی دستبرد سے محفوظ تھا۔

باب الحزورہ (باب الوداع) جسے باب حکیم بن حزام اور باب زبیر بن عوام بھی کہا جاتا تھا

بیت اللہ کی طرف دیکھ کر نبی ﷺ کی دعا

مکہ سے نکلتے ہوئے نبی ﷺ جب سوق حَزْوَرَہ پہنچے تو آپ ﷺ نے اللہ کے گھر پر بڑی حسرت سے الوداعی نگاہ ڈالی اور نہایت تاسف کے ساتھ ارشاد فرمایا:

«وَاللّٰهِ! إِنَّكِ لَخَيْرُ أَرْضِ اللّٰهِ، وَأَحَبُّ أَرْضِ اللّٰهِ إِلَى اللّٰهِ، وَلَوْلَا أَنِّي أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ»

”اللہ کی قسم! بلا شبہ اللہ کی زمین میں تو سب سے اچھی زمین ہے اور اللہ کی زمین میں اللہ کو بھی تو ہی سب سے زیادہ پسند ہے، اگر تیرے رہنے والوں نے مجھے یہاں سے نہ نکالا ہوتا تو میں یہاں سے کبھی نہ نکلتا۔“ [1]

یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ مکہ کو مدینہ پر فضیلت ہے۔ مکہ کی افضلیت کی دیگر کئی وجوہ بھی ہیں۔ مکہ مکرمہ کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہاں بیت اللہ ہے۔ یہ مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ امت محمدیہ اسی کا طواف کرتی ہے۔ حج کے تمام مشاعر اسی مکہ کے علاقے میں ہیں۔ حرم مکہ میں ایک نیکی کی جزا لاکھ نیکیوں کے برابر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ حَجَّ مِنْ مَكَّةَ مَاشِيًا حَتّٰى يَرْجِعَ إِلٰى مَكَّةَ كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ بِكُلِّ خَطْوَةٍ سَبْعَ مِئَةِ حَسَنَةٍ

[1] جامع الترمذي: 3925.

كُلُّ حَسَنَةٍ مِثْلُ حَسَنَاتِ الْحَرَمِ»

''جو شخص مکہ سے پیدل حج کرے یہاں تک کہ وہ پیدل ہی مکہ پلٹ آئے، اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم کے بدلے سات سو نیکیاں عطا فرماتے ہیں (اور) ہر نیکی حرم کی نیکیوں کی مانند ہے۔''

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا: حرم کی نیکیوں سے کیا مراد ہے؟ انھوں نے جواب دیا:

بِكُلِّ حَسَنَةٍ مِئَةُ أَلْفِ حَسَنَةٍ.

''ہر نیکی کے بدلے ایک لاکھ نیکیاں۔''[1]

مسجد الحرام میں ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔ اس بنا پر بھی مکہ کی افضلیت ثابت ہوتی ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ»

''میری مسجد میں ایک نماز پڑھنا دوسری تمام مساجد میں ہزار نمازیں پڑھنے سے افضل ہے۔''[2]

«وَصَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَفْضَلُ مِنْ مِّائَةِ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ»

''اور مسجد الحرام میں ایک نماز پڑھنا دوسری مساجد میں ایک لاکھ نمازیں پڑھنے سے افضل ہے۔''[3]

بیت اللہ کی ملال انگیز جدائی کے بعد غار ثور کی طرف جانے سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَنِي وَلَمْ أَكُ شَيْئًا، اَللّٰهُمَّ! أَعِنِّي عَلٰى هَوْلِ الدُّنْيَا، وَبَوَائِقِ الدَّهْرِ، وَمَصَائِبِ اللَّيَالِي وَالْأَيَّامِ، اَللّٰهُمَّ! اصْحَبْنِي فِي سَفَرِي، وَاخْلُفْنِي فِي أَهْلِي، وَبَارِكْ لِي فِيمَا رَزَقْتَنِي، وَلَكَ فَذَلِّلْنِي، وَعَلٰى صَالِحِ خُلُقِي فَقَوِّمْنِي، وَإِلَيْكَ رَبِّ فَحَبِّبْنِي، وَإِلَى النَّاسِ فَلَا تَكِلْنِي، رَبَّ الْمُسْتَضْعَفِينَ وَأَنْتَ رَبِّي، أَعُوذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِيمِ الَّذِي أَشْرَقَتْ لَهُ السَّمٰوَاتُ وَالْأَرْضُ، وَكُشِفَتْ بِهِ الظُّلُمَاتُ، وَصَلُحَ عَلَيْهِ أَمْرُ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ، أَنْ تُحِلَّ عَلَيَّ غَضَبَكَ، وَتُنْزِلَ بِي سَخَطَكَ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ، وَفُجَاءَةِ نِقْمَتِكَ، وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ وَجَمِيعِ سَخَطِكَ، لَكَ الْعُتْبٰى عِنْدِي خَيْرَ مَا اسْتَطَعْتُ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ»

''سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے مجھے پیدا فرمایا جب کہ میں کچھ بھی نہ تھا، اے اللہ! دنیا کی

[1] السلسلة الضعيفة: 495، ضعيف الترغيب والترهيب: 691. [2] صحيح البخاري: 1190. [3] سنن ابن ماجه: 1406.

سنگینیوں، ادوار کی تباہ کاریوں اور روز وشب کے مصائب میں میری مدد فرما۔ اے اللہ! میرے سفر میں تو میرا شریک کار ہو جا، میرے اہل وعیال میں تو میرا نائب ہو جا اور جو تو نے مجھے رزق دیا ہے، اس میں مجھے برکت عطا فرما اور اپنی جناب میں مجھے انکسار کی توفیق عطا فرما اور بہترین اخلاق پر میری تربیت فرما اور اے میرے پروردگار! مجھے اپنا محبوب بنا لے اور مجھے لوگوں کے حوالے نہ کر۔

اے کمزوروں کے رب! تو میرا بھی پروردگار ہے، میں تیرے انتہائی عزت والے چہرے کی پناہ میں آتا ہوں جس کی روشنی سے آسمان وزمین چمک رہے ہیں، جس کی بدولت اندھیرے چھٹ رہے ہیں، جس کی برکت سے اولین وآخرین کے معاملات درست ہو رہے ہیں، اس بات سے کہ تیرا غضب مجھ پر اترے یا تو مجھ سے ناراض ہو جائے۔

میں تیری پناہ میں آتا ہوں کہ تیری نعمت زائل ہو جائے اور تیرا غضب اچانک آپڑے اور تیری سلامتی کا رخ مجھ سے پھر جائے اور میں تیرے غضب و نافرمانی سے (تیری پناہ میں آتا ہوں)، تیری رضا میرے لیے سب سے بہتر ہے اور تیری مدد کے بغیر نہ کوئی نیکی ہو سکتی ہے اور نہ برائی سے بچا جا سکتا ہے۔'' [1]

مکہ سے نکلتے ہوئے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے الفاظ

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرتِ مدینہ کے لیے مکہ سے نکلے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ اہل مکہ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکال دیا ہے تاکہ انھیں ہلاک کر دیا جائے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس کے بعد یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝﴾ (الحج 22:39)

''جن لوگوں سے لڑائی کی جاتی ہے، انھیں (جہاد کی) اجازت دی گئی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر ضرور قادر ہے۔''

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اس آیت کے نزول سے ابوبکر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ اب جہاد کی اجازت مل گئی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: یہ پہلی آیت ہے جو جہاد کے سلسلے میں نازل ہوئی۔ [2]

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جاں نثاری

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا سے فارغ ہوئے تو غار ثور کی طرف چل دیے۔ اس غار کی مسافت اس وقت کے مکہ سے

[1] [ضعيف] البداية والنهاية (محقق): 441/3. [2] جامع الترمذي: 3171، مسند أحمد: 216/1، واللفظ له.

تقریباً تین میل تھی۔ غار کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کبھی آپ ﷺ کی دائیں جانب ہو جاتے تھے اور کبھی بائیں جانب، کبھی آگے ہو جاتے تھے اور کبھی پیچھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! مجھے تعاقب کرنے والوں کا خطرہ ہوتا ہے تو میں پیچھے ہو جاتا ہوں اور جب محسوس کرتا ہوں کہ آگے خطرہ درپیش ہوگا تو آگے ہو جاتا ہوں۔ اسی طرح دائیں بائیں آپ کے بارے میں خطرات محسوس کرتا ہوں تو اسی طرف کا رُخ اختیار کر لیتا ہوں۔

نبی ﷺ نے فرمایا: ''تم چاہتے ہو کہ اگر کوئی ناگہانی آفت آئے تو میرے بجائے تمھارے اوپر آئے؟''

انھوں نے کہا: جی ہاں، اے اللہ کے رسول! اسی طرح نبی ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ رات کے گہرے اندھیرے میں وحشت ناک صحرا کی وسعت اور سنگ ریز چٹانوں کے نشیب و فراز عبور کرتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے پاؤں زخمی ہو گئے۔ آپ ﷺ کی یہ حالت دیکھ کر ابوبکر رضی اللہ عنہ بہت پریشان اور انتہائی رنجیدہ ہو گئے۔ اُنھوں نے رسول اللہ ﷺ کو فوراً اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور اسی طرح جبل ثور کی چوٹی پر واقع غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ [1]

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت

امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں کچھ لوگوں کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ پر فوقیت دیتے ہیں۔ یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم میں آئی تو فرمانے لگے:

«وَاللّٰهِ! لَلَيْلَةٌ مِّنْ أَبِي بَكْرٍ خَيْرٌ مِّنْ آلِ عُمَرَ، وَلَيَوْمٌ مِّنْ أَبِي بَكْرٍ خَيْرٌ مِّنْ آلِ عُمَرَ»

''اللہ کی قسم! ابوبکر کی ایک رات عمر کی ساری زندگی سے بہتر ہے اور ابوبکر کا ایک دن عمر کی ساری زندگی سے افضل ہے۔''

اس کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کی ہجرت مدینہ کے سلسلے میں مکہ سے غار ثور تک ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فدویت اور آپ ﷺ پر جاں فشانی کا تذکرہ کرنے لگے۔ [2]

غار کے دہانے پر

جب رسول اللہ ﷺ غار کے دہانے پر پہنچ کر اس کے اندر تشریف لے جانے لگے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 477/2. [2] دلائل النبوة للبيهقي: 477،476/2.

کیا: اے اللہ کے رسول انتظار فرمائیے۔ میں اندر سے غار کی صفائی کردوں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ غار کے اندر تشریف لے گئے۔ یہ تاریکی در تاریکی کا معاملہ تھا۔ اندھیری رات اوپر سے غار کا اندھیرا، کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسی حالت میں آپ نے پہلے غار کی صفائی کی، پھر جہاں کہیں سوراخ نظر آیا وہاں اپنی چادر پھاڑ پھاڑ کر اس سوراخ کو بند کیا حتی کہ چادر ختم ہوگئی مگر ایک سوراخ اب بھی باقی رہ گیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس سوراخ کو اپنی ایڑی سے بند کر دیا۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آنسو

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب ہر طرح سے مطمئن ہو گئے تو اُنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی کہ اندر تشریف لے آئیے۔ سید ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم گزشتہ تگ و دو کے باعث تھکان محسوس کر رہے تھے، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر مبارک سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ران پر رکھا اور استراحت فرمانے لگے۔ اسی دوران سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند آ گئی۔ اس اثنا میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اس ایڑی پر ایک سانپ نے ڈس لیا جس ایڑی کو رکھ کر انھوں نے ایک سوراخ بند کیا ہوا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا۔ آپ نے اس خیال سے اپنے پاؤں میں جُنبش تک نہ آنے دی مبادا سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند میں خلل آجائے لیکن اس زہریلے ڈنک کی شدید تکلیف نے انھیں بے قرار کر دیا۔ بے چارگی کے عالم میں ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ یہ آنسو جب امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے رخ انور پر گرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جاگ گئے، دریافت فرمایا:

«مَالَكَ يَا أَبَا بَكْرٍ؟»

''اے ابوبکر! کیا بات ہے؟''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس جگہ جہاں سانپ نے ڈسا تھا، اپنا لعاب دہن لگایا جس سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فوراً شفا دے دی اور ان کی تکلیف دور ہوگئی۔ [1]

ابوبکر رضی اللہ عنہ کا گھرانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ جب اپنے گھر سے نکلے تو انھوں نے اپنے گھرانے کے افراد کو ہجرت کی منصوبہ بندی سے آگاہ کیا۔ انھیں مختلف ہدایات اور احکام دیے۔ ہجرت کے راہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب غار

[1] مشكاة المصابيح: 6034، الرحيق المختوم، ص: 185.

کے اندر پہنچ گئے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ جو نہایت گہری سوجھ بوجھ اور فہم و فراست کے مالک تھے، رات کو غار میں قیام کرتے اور سحر ہوتے ہی منہ اندھیرے مکہ پہنچ جاتے تھے اور قریش مکہ کے درمیان آکر صبح کرتے تھے۔ پھر وہ قریش کی تدبیریں اور خبریں سنتے اور جب رات گہری ہو جاتی تو کفار مکہ کی ساری گفتگو اور ناکام کاوشوں کی خبر لے کر غار میں پہنچ جاتے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ کو ہجرت کے راہیوں کی کوئی خبر ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ابتدا ہی میں مسلمان ہونے والے عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کو طفیل بن عبداللہ سے خرید کر آزاد کیا تھا۔ طفیل انھیں بڑی اذیتیں دیا کرتا تھا۔ سیدنا عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ انھیں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ ذمہ داری سونپی کہ جب شام کا وقت ہو تو بکریاں لے کر غار کے پاس پہنچ جاؤ۔ وہ سرِ شام غار کے پاس پہنچ جاتے۔ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آسودہ ہو کر دودھ پی لیتے۔ پھر عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ صبح تڑکے ہی بکریاں ہانک کر انھی رستوں پر مکہ لوٹ جاتے جن رستوں پر عبداللہ رضی اللہ عنہ چلتے ہوئے آتے تھے۔ اس طرح عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہما کے قدموں کے نشانات مٹ جاتے تھے۔

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا روزانہ رات کو کھانا پکا کر غار میں لے آتی تھیں۔ اس طرح نبی ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تین راتیں غارِ ثور میں بسر فرمائیں۔[1]

قریش مکہ کی حواس باختگی

اب قریش کا حال سنیے۔ اِدھر مکہ میں اجالا ہوا اور نبی ﷺ کے بجائے آپ ﷺ کے بستر پر سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ پائے گئے تو قریش مکہ کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ رسول اللہ ﷺ کے خلاف ان کی سازش بُری طرح ناکام ہوگئی تھی۔ اِس وجہ سے مکہ میں کہرام مچ گیا۔ وہ لوگ شدید غصے کی حالت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر حرم میں لے گئے۔ کچھ دیر انھیں محبوس رکھا، پھر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کفار مکہ نے ان دونوں حضرات کو ڈھونڈنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ مشرکین کی ٹولیاں مختلف اطراف میں پھیل گئیں اور آپ ﷺ کو ڈھونڈنے لگیں۔ ان کا خیال تھا کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کی طرف گئے ہوں گے مگر اس راستے پر ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد وہ خائب و خاسر ہو کر پلٹے۔ ان کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ آپ مکہ کے جنوب میں پہاڑ پر پناہ گزیں ہوں گے۔ انھوں نے اعلان عام کر دیا کہ جو شخص محمد ﷺ کو زندہ یا مردہ پکڑ کر لائے گا، اسے سو اونٹ بطور انعام دیے

[1] صحيح البخاري: 3905، السيرة لابن هشام: 486،485/2، الرحيق المختوم، ص: 165.

جائیں گے۔ مشرکین مکہ پہلے ہی آپ ﷺ کے خون کے پیاسے تھے، اب جو اس گراں قدر انعام کا اعلان سنا تو وہ دیوانہ وار اپنے برق رفتار گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو کر ہر طرف پھیل گئے۔ بعض نے کھوجیوں کو ساتھ لیا اور آپ ﷺ کے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نقش پا کو ڈھونڈنے لگے۔[1]

ابوجہل کی پستی کی آخری حد

ابوجہل اور دیگر چند دشمنان اسلام اسی اثنا میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر گئے۔ ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا گھر سے باہر نکلیں۔ کفار پوچھنے لگے: اے ابوبکر کی بیٹی! تمھارا والد کہاں ہے؟ سیدہ بولیں: مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔ اس جواب پر ابوجہل مشتعل ہوگیا۔ اس خبیث نے سیدہ کے چہرے پر بڑے زور کا طمانچہ رسید کیا۔ اس بنا پر ان کے کانوں کی بالی گر گئی۔ اس اخلاق باختہ دشمنِ اسلام نے عرب کی اخلاقی اقدار کا بھی پاس لحاظ نہ کیا اور ایک بچی پر ہاتھ اٹھا کر ثابت کر دیا کہ وہ انتہائی گھٹیا اور ذلیل آدمی تھا۔[2]

ابوقحافہ کی پریشانی اور سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کی حرارتِ ایمانی

اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میرے والد جاتے جاتے گھر سے سارا نقد روپیہ لے گئے تھے۔ یہ پانچ یا چھ ہزار درہم تھے۔ والد کے جانے کے بعد میرے دادا ابوقحافہ نے کہا: بیٹی! میں سمجھتا ہوں ابوبکر تمھیں دوہری مصیبت میں ڈال گیا ہے۔ وہ خود بھی چلا گیا ہے اور ساری نقدی بھی اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اسماء نے معاً جواب دیا: نہیں نہیں، دادا جان! وہ ہمارے لیے کافی مال چھوڑ گئے ہیں۔

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے کچھ پتھر کے ٹکڑے اُٹھائے اور اس جگہ رکھ دیے جہاں میرے والد اپنا روپیہ پیسہ رکھتے تھے، پھر اس کے اوپر کپڑا ڈال دیا۔ میرے دادا کی بصارت جاتی رہی تھی، چنانچہ میں نے اُن کا ہاتھ پکڑا اور کہا: ذرا اس مال کو ہاتھ لگائیے۔ بوڑھے دادا نے مال ٹٹولا اور کہا:

اگر واقعی یہ معاملہ اسی طرح ہے تو پھر مجھے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ابوبکر نے اچھا کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، وہ تمھارے لیے کافی انتظام کر گیا ہے۔

اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ تدبیر میں نے اپنے بوڑھے دادا کی فکر مندی دیکھ کر ان کے اطمینان قلب کے لیے کی تھی ورنہ والد بزرگوار تو اپنا سارا مال نبی ﷺ کی خدمت کے لیے ساتھ لے گئے تھے۔[3]

---

[1] صحیح البخاري: 3906، السیرة لابن هشام: 489/2. [2] السیرة لابن هشام: 487/2. [3] السیرة لابن هشام: 488/2.

غار میں نصرتِ الٰہی

قریش مکہ کھوجیوں کی وساطت سے نبی ﷺ کو ڈھونڈنے کی سرتوڑ کوششیں کرنے لگے۔ وہ تلاش کرتے کرتے غار ثور پر پہنچ گئے۔ یہاں پہنچنے کے بعد وہ بے بس ہو گئے کیونکہ غار ثور کے قریب رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔

ابو مصعب مکی کہتے ہیں: میں نے زید بن ارقم، انس بن مالک اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا اور ان کی باتیں سُنیں، وہ نبی ﷺ کی ہجرت کے موقع پر غار کی رات کا تذکرہ کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے درخت کو حکم دیا، وہ نبی ﷺ کے چہرے کی طرف اُگ آیا، اس بنا پر آپ ﷺ کو کوئی نہ دیکھ سکا، پھر اللہ نے ایک مکڑی کو حکم دیا، اس نے غار کے منہ پر جالا بُن دیا، پھر جنگلی کبوتروں کے ایک جوڑے کو حکم دیا تو وہ غار کے دہانے پر بیٹھ گیا۔ مسلح مشرکین کے دو نوجوان آپ ﷺ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے آپ سے محض چند ہاتھ کے فاصلے پر رہ گئے۔ ایک نوجوان اس غار کے اندر جھانکنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے وہاں کبوتروں کو دیکھا تو پلٹ گیا۔ اس کے ساتھی نے پوچھا: تم غار کی طرف کیوں نہیں جاتے؟ اس نے کہا: میں نے غار کے منہ پر دو جنگلی کبوتروں کو دیکھا ہے، اس لیے اس میں کسی کا ہونا بعید از گمان ہے۔ یہ بات نبی ﷺ نے سن لی اور آپ ﷺ کو یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان کے شر سے محفوظ کر دیا ہے۔[1]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مشرکین رسول اللہ ﷺ کے نقش پا پر چلتے ہوئے غار ثور تک جا پہنچے۔ وہ جب پہاڑ پر چڑھے تو غار کے قریب سے گزرے۔ غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا تھا۔ وہ جالا دیکھ کر کہنے لگے: اگر کوئی اس غار میں گیا ہوتا تو یہاں مکڑی کا جالا نہ ہوتا۔ ان میں بعض کہنے لگے: یہ جالا تو محمد (ﷺ) کی ولادت سے بھی پہلے کا محسوس ہوتا ہے۔[2]

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب ہم غار میں تھے، مشرکین میں سے ایک آدمی آیا، وہ آپ ﷺ کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنے لگا۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا وہ ہمیں نہیں دیکھ رہا؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَوْ رَآنَا لَمْ يَسْتَقْبِلْنَا بِعَوْرَتِهِ»

”اگر وہ ہمیں دیکھ رہا ہوتا تو ہماری طرف اپنا ستر نہ کھولتا۔“[3]

---

[1] [ضعیف] الطبقات لابن سعد :229/1، أحاديث الهجرة: 138. شیخ البانی رحمہ اللہ نے بجا فرمایا ہے کہ تعاقب کرنے والے کفارِ قریش کے مقابلے میں اصل دفاع ﴿وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا﴾ (التوبة 40:9) کے مصداق دکھائی نہ دینے والے اللہ کے لشکروں نے کیا۔ (السلسلة الضعيفة :263/3) [2] الخصائص الكبرٰى للسيوطي :306,305/1. [3] [ضعیف] مجمع الزوائد: 9906، مسند أبي يعلٰى :42.

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا اسی کے مشابہ ایک روایت میں فرماتی ہیں: ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے اس آدمی کے بارے میں عرض کیا کہ یہ شخص جو اس غار کی طرف پیشاب کر رہا ہے، وہ ہمیں دیکھ رہا ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَوْ كَانَ يَرَانَا مَا فَعَلَ هٰذَا»

''اگر وہ ہمیں دیکھ رہا ہوتا تو اس طرح نہ کرتا۔''[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بعض اہل سیر نے ذکر کیا ہے: ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب مشرکین مکہ کو غار کے قریب دیکھا تو نبی ﷺ کو ان کی آمد سے آگاہ کیا۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَوْ جَاؤُونَا مِنْ هٰهُنَا لَذَهَبْنَا مِنْ هٰهُنَا»

''اگر وہ غار کی اس طرف سے آئے تو ہم اس طرف سے نکل جائیں گے۔''[2]

ایک روایت میں ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو غار میں پیاس لگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''غار کے شروع کے حصے میں جاؤ اور پانی پی آؤ۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غار کی شروع والی جگہ پر گئے اور پانی پیا۔ یہ پانی شہد سے زیادہ میٹھا، دودھ سے زیادہ سفید اور کستوری سے زیادہ خوشبودار تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالی نے جنت کی نہروں پر مقرر فرشتے کو حکم دیا کہ جنت الفردوس سے غار تک نہر کھود دو تاکہ ابوبکر پانی پی لیں۔''[3]

ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ بات سن کر قدرے مطمئن ہو گئے۔ اس دوران میں چند افراد جب غار کے قریب آپہنچے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ پریشان ہوگئے، انھیں خطرہ لاحق ہوگیا۔ انھوں نے اپنے دل ہی دل میں کہا کہ مجھے کوئی نقصان پہنچ جائے تو کوئی بات نہیں لیکن اگر نبی ﷺ کو کچھ ہو گیا تو پورے عالم انسانیت کا خسارہ ہوگا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر ان کفار مکہ میں سے کوئی اپنے قدموں کی طرف دیکھے گا تو وہ ہمیں بھی دیکھ لے گا۔ آپ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فرمایا:

«مَا ظَنُّكَ يَا أَبَا بَكْرٍ بِاثْنَيْنِ، اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا»

''اے ابوبکر! اُن دو آدمیوں کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے۔''[4]

اس موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾

[1] مجمع الزوائد: 9905. [2] البداية والنهاية: 181/3. [3] [ضعيف] الدرالمنثور، التوبة 40:9. [4] صحيح البخاري: 3653.

''اگر تم اس (نبی) کی مدد نہیں کرو گے تو تحقیق اللہ نے اس کی (اس وقت) مدد کی (تھی) جب کافروں نے اس کو (مکہ سے) نکال دیا تھا، (وہ) دو میں دوسرا تھا، جبکہ وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب وہ (نبی) اپنے ساتھی (ابوبکر) سے کہہ رہا تھا: غم نہ کر، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے، پھر اللہ نے اس پر اپنی سکینت نازل کی اور ایسے لشکروں سے اس کی مدد کی جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور اس نے کافروں کی بات کو پست کر دیا اور بات تو اللہ ہی کی بلند ہے اور اللہ بہت زبردست ہے، خوب حکمت والا ہے۔''[1]

اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہجرت کے راہیوں کو تسکین اور تسلی سے نوازا۔ انھیں کامیابی کی خوشخبری سنائی اور کافروں کی نامرادی اور ناکامی والے انجام سے آگاہ فرمایا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ان عظیم الشان فضیلتوں، رفعتوں اور خصوصیات کا تذکرہ فرمایا جن میں سے امت کے کسی فرد کو اس کا عشر عشیر بھی نصیب نہیں ہوا۔ اس آیت مقدسہ کا ایک ایک حرف نبی ﷺ کی عظمت کا آئینہ دار اور آپ ﷺ کے یار غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لازوال صدق اور بے مثال وفا کا شاہد عادل ہے۔

آیت ہجرت میں ذکرِ صدیق کے خلاف زہر افشانی

روافضہ نے محبت اہل بیت کے نام پر قصر اسلام کو منہدم کرنے کی ناپاک کوشش کی۔ ان کے مصنفین نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شخصیت کو دھندلانے کے جنون میں درج بالا آیت کریمہ پر اس طرح طبع آزمائی کی ہے کہ اسلام کی روح بُری طرح مجروح ہو جاتی ہے۔ انھوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رفاقت کے بارے میں یہ زہر افشانیاں کی ہیں:

1. نبی ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے سفر ہجرت میں ساتھ نہیں رکھا تھا بلکہ وہ از خود ہی ساتھ ہو لیے تھے اور نبی ﷺ نے انھیں ساتھ چلنے سے اس لیے نہیں روکا مبادا وہ کفار کو مطلع کریں اور اس طرح آپ ﷺ کو گرفتار کرا دیں۔
2. مان لیا حضور ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے گئے تھے اور انھوں نے راستے کی صعوبتیں بھی برداشت کیں لیکن ہمارے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ ان کی نیت بھی خالص تھی اور جب تک خلوص نیت نہ ہو، ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ان کا یہ عمل قابل قبول تھا، اس لیے ان کا سفر ہجرت میں آپ ﷺ کا ہم رکاب ہونا ان کے لیے ہرگز باعثِ فضیلت نہیں۔

[1] التوبة 40:9.

3 لغت عرب میں صاحب کے معنی ہیں: ساتھی، رفیق اور ہم نشین۔ اس لفظ میں شرف وفضیلت کی کوئی بات نہیں۔ اس لیے کہ کافر اور مومن بھی ایک دوسرے کے ساتھی اور ہم نشین ہو سکتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے ایک مومن اور ایک کافر کی مصاحبت بیان کی ہے: ﴿قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ﴾ (الکهف 18:37) ''اس کے (مومن) ساتھی نے اس سے کہا، جبکہ وہ اسے جواب دے رہا تھا: کیا تو اس (ذات) کے ساتھ کفر کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا۔'' اسی طرح یوسف علیہ السلام نے اپنے کافر ساتھیوں سے کہا تھا: ﴿يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ﴾ (یوسف 12:39) ''اے میرے جیل کے ساتھیو!''

4 کہتے ہیں کہ ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ کے لفظ سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو منع کیا جا رہا ہے۔ یہ طاعت تھی یا معصیت؟ طاعت تو ہو نہیں سکتی ورنہ اس سے منع نہ کیا جاتا۔ اللہ اور اس کے رسول نیک کاموں سے نہیں روکا کرتے۔ لازماً یہ حزن معصیت ہوگا۔ اس آیت سے ابوبکر کا عاصی اور گنہگار ہونا ثابت ہوتا ہے، فضیلت چہ معنی دارد![1]

باطل تاویلوں کا مُسکت جواب

1 کفار ناہنجار جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر تل گئے اور بالاتفاق سب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کا ناپاک ارادہ کر لیا تبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحکم ربانی ہجرت کرنی پڑی اور اللہ تعالیٰ ہی کے حکم پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے ہمراہ لیا۔ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ابوبکر مخلص، صادق اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے دوست نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نازک مرحلے میں حضرت ابوبکر کو ساتھ لے جانے کی ہرگز اجازت نہ دیتا۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر ابوبکر پر شک ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود انھیں ساتھ لے جانا گوارا نہ کرتے۔ نعوذ باللہ کیا اللہ تعالیٰ کو یہ علم نہیں تھا کہ ابوبکر منافق ہیں یا سچے متبع رسول ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ لے جانا اس امر کی محکم دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔ انھیں اپنا جاں نثار اور غم گسار سمجھتے تھے۔ ادھر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اس موقع پر صرف اپنی ہی جان کی بازی نہیں لگائی بلکہ اپنی آل اولاد اور اپنا مال سب کچھ اللہ کے لیے فدا کر دیا۔

اگر روافضہ کی بدباطنی کے مطابق ابوبکر بفرض محال منافق تھے تو ان کا نفاق اللہ سے کیسے مخفی رہا کہ اُس نے اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک منافق کے سپرد کر دیا۔ اس کے علاوہ یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کی اجازت ملی تو اس کی خبر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کس نے دی؟ اس کی خبر یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی، اس صورت میں ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر مکمل اعتماد تھا اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں خبر نہیں دی تو پھر کاشانۂ نبوی میں صرف

[1] الاستغاثة لأبي القاسم الكوفي: 2/38-40، الصوارم المهرقة للتستري: 1/385-387، الطرائف لابن طاووس الحسني: 2/95.

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو اس معاملے کا علم تھا۔ انھی نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بتایا ہوگا، اگر ان کو ابوبکر کے صدق و وفا پر پورا بھروسا نہیں تھا تو پھر خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی وفاداری بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ گویا سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو مشکلات میں مبتلا کر دیا۔ ...... مختصر یہ کہ اس بے فائدہ کلام کو کوئی ایمان دار شخص قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر رسول اللہ ﷺ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مکمل اعتماد تھا، اسی لیے ان کو اس راز سے آگاہ کیا گیا اور انھیں شریک سفر ہونے کی سعادت بھی عطا ہوئی۔ خود اس فرقے کے علماء نے اس زعم باطل کی تردید کی ہے:

علامہ فتح اللہ کاشانی اپنی تفسیر منہج الصادقین میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

پس پیغمبر ﷺ شب پنج شنبہ در شہر مکہ امیر المؤمنین را بر جائے خود میخوابانید، وخود از خانہ ابو بکر در رفاقت او بیرون آمدہ بداں غار توجہ نمود۔

''رسول اللہ ﷺ نے جمعرات کو اپنی جگہ علی رضی اللہ عنہ کو سو جانے کا حکم دیا اور خود ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے، پھر انھیں ساتھ لے کر باہر آئے اور اس غار کا قصد فرمایا۔''

اس سے واضح ہوا کہ آپ ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خود اپنے ساتھ لے کر سفر ہجرت پر روانہ ہوئے۔

ایک جگہ امام حسن عسکری اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں: جب کفار نے نبی ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تو جبرائیل حاضر خدمت ہوئے۔ انھوں نے آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچایا، کفار کی ریشہ دوانیوں کی اطلاع دی اور یہ پیغام دیا: «وَأَمَرَكَ أَنْ تَسْتَصْحِبَ أَبَا بَكْرٍ» ''اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ اس پر خطر سفر میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔'' ان دونوں حوالوں سے ثابت ہوا کہ نبی ﷺ نے خود ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سفر ہجرت سے آگاہ کیا اور اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے انھیں اپنی معیت سے سرفراز فرمایا۔

کفار مکہ آپ ﷺ کے خون کے پیاسے تھے۔ خطرات اور پریشانیاں ہر آن بڑھ رہی تھیں۔ جو شخص ان پر خطر اور سنگین حالات میں جان ہتھیلی پر رکھ کر اللہ کے محبوب پیغمبر کی سنگت اختیار کرتا ہے، اس کے خلوص پر شک کرنا تعصب کے سوا کچھ نہیں۔ مزید یہ کہ غار میں قیام کے دنوں میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پورا کنبہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر کی دن رات خدمت کرتا رہا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بیٹا صبح شام حاضر ہوتا رہا، صاحبزادی اسماء ہر روز کھانا بہم پہنچاتی رہی، غلام عامر بن فہیرہ روزانہ بکریوں کا ریوڑ لے جاتا اور تازہ دودھ فراہم کرتا رہا، غرضیکہ ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی نہیں بلکہ ان کے گھرانے کے تمام افراد حتی کہ زرخرید غلام سمیت سب کے دل میں ایک ہی سودا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ بخیر وعافیت منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔

3 ﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ﴾: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان الفاظ سے یہ واضح کر دیا ہے کہ نبی ﷺ کے بعد مقام ومرتبہ میں فائز ابوبکر ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ﴾ کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ نبی ﷺ کے بعد خلیفہ ابوبکر ہوں گے، اس لیے کہ خلیفہ ہمیشہ ثانی ہی ہوتا ہے۔[1]

4 ﴿إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾: قرآن کریم کے یہ الفاظ سیدنا ابوبکر صدیق کو قیامت تک رسالت مآب ﷺ کا یار غار ثابت کرتے رہیں گے۔ قرآن کریم کے انھی مبارک الفاظ سے اُردو ادب میں ''یار غار'' کا محاورہ مروج ہوا اور ہمیشہ کے لیے ضرب المثل (Proverb) بن گیا۔

5 ﴿لِصَاحِبِهِ﴾: تمام مسلمانوں کا کامل اتفاق ہے کہ اس مقدس لفظ سے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی مراد ہیں۔ اس سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحابیت ثابت ہوئی۔ عربی میں صاحب اور صحابی ہم معنی ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ واحد صحابی ہیں جن کی صحابیت کا تذکرہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا منکر قرآن کی اس آیت کا منکر ہے اور جو قرآن کا منکر ہے، وہ بلا شبہ کافر ہے۔ اگر روافضہ کی یہ بات مان لی جائے کہ یہاں صاحب کے لفظ سے لغت کے اعتبار سے صحابیت ثابت نہیں ہوتی تو اس طرح بہت سے اپنا شرفِ عظمت کھو بیٹھیں گے۔ مثلاً اللہ کا فرمان ہے: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ﴾ (النسآء 51:4) ''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا، (ان کا حال یہ ہے کہ) وہ بتوں اور شیطان پر ایمان رکھتے ہیں۔''

ایمان کے معنی ہیں: تصدیق کرنا اور وہ اللہ پر ایمان اور توحید کی تصدیق بھی ہو سکتی ہے اور طاغوت اور کفر کی بھی جیسا کہ اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ اسی طرح ہجرت کے لغوی معنی ہیں: کسی شہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر میں چلے جانا۔ یہ ترک وطن اللہ کی رضا کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور کسی دنیوی منفعت کے لیے بھی۔ اسی طرح عبادت اللہ کی بھی کی جاتی ہے اور کفار و مشرکین کی جانب سے معبودان باطلہ کی بھی جس طرح اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ﴾ (الفرقان 55:25) ''اور وہ اللہ کے علاوہ ان کی عبادت کرتے ہیں جو انھیں نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔'' حقیقت یہ ہے کہ صاحب کے لفظ میں بجائے خود کوئی فضیلت نہیں بلکہ جس کا وہ صاحب ہے، ساری عظمت وفضیلت کا مرجع وہی ہے، یعنی سیدنا محمد ﷺ کی ذات بابرکات کی نسبت نے اس لفظ کو اوج کمال پر پہنچا دیا ہے اور جو صاحب کے لفظ کا مصداق ہے، یعنی ابوبکر رضی اللہ عنہ، اس کو بھی وہ رفعتیں اور سرفرازیاں بخشی ہیں جن کے سامنے افلاک کی

[1] تفسير القرطبي، التوبة 40:9.

بلندیاں بھی ہیچ ہیں۔

6 ﴿ لَا تَحْزَنْ ﴾: نبی ﷺ نے یہ الفاظ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس وقت فرمائے جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ کفار مکہ نے غار کو گھیر لیا ہے۔ وہ انتہائی غمگین ہوگئے اور پریشانی کے عالم میں رونے لگے۔

روافض کا اس آیت سے استدلال انتہائی غلط اور تعصب پر مبنی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس آیت میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تعریف نہیں بلکہ مذمت کی گئی ہے کیونکہ اگر یہ حزن اطاعت رسول اور محبت رسول پر مبنی ہوتا تو انھیں "لا" کے ساتھ نہ روکا جاتا۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے معصیت کی، اس وجہ سے انھیں روکا گیا۔

درحقیقت ان الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ اے ابوبکر! تم غمگین نہ ہو۔ ابوبکر کا رنجیدہ ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ نبی ﷺ سے بدرجۂ کمال محبت کرتے تھے۔ انھیں اس بات کا قلق ہو رہا تھا کہ پیغمبر خدا ﷺ گھیرے میں آگئے ہیں۔ اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی جان کی فکر ہوتی تو بجائے لفظ حزن کے لفظ خوف استعمال ہوتا، اس لیے کہ عربی زبان میں لفظ حزن کا استعمال غم کی جگہ اور تمنا کی ناکامی کے خدشہ کے پیش نظر ہوتا ہے جب کہ جہاں جان پر بنی ہو اور ہراس کا معاملہ ہو، وہاں لفظ خوف استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں: اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ﴾ (یٰسٓ 76:36) "لہٰذا ان کی باتیں آپ کو غمگین نہ کریں۔" اور اسی طرح فرمایا: ﴿ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ﴾ (آل عمرٰن 176:3) "اور (اے نبی!) جو لوگ کفر میں تیزی دکھاتے ہیں ان کی سرگرمیاں آپ کو غمگین نہ کریں۔" اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: ﴿ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ﴾ (طٰہٰ 21:20) "اسے پکڑ لے اور مت ڈر۔" فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے کہا: ﴿ لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ﴾ (العنکبوت 33:29) "تو مت ڈر اور مت غم کھا۔" اگر روافضہ یہ کہیں کہ جس وقت انبیاء علیہم السلام کو مخاطب کیا گیا تھا، اس وقت معصیت کی حالت میں تھے تو پھر انھوں نے کفر کیا کیونکہ ان کے نزدیک قاعدہ یہ ہے کہ ائمہ معصوم ہوتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام مسلمانوں کے ائمہ عظام ہیں۔ یوں وہ بالاتفاق معصوم ہیں۔ اس صورت میں انھوں نے اپنا قاعدہ خود توڑ دیا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں رسول اللہ ﷺ کا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ﴿ لَا تَحْزَنْ ﴾ کہنا اور اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ کو ﴿ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ ﴾ (المآئدۃ 41:5) "اے رسول! آپ غم نہ کھائیں۔" کہنا اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو اس طرح کے الفاظ کے ساتھ "لا" نہی لگا کر مخاطب کرنا انھیں تسکین دینے کے لیے ہے۔ اسی طرح ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہاں حزن سے منع کرنا دراصل انھیں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے تسکین و تسلی کا پیغام ہے۔

ان آیات کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے اور بھی بہت سے فرمودات ہیں جن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حزن اور خوف

کے معنی جدا جدا ہیں۔ ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں معنوں کو یکجا کر دیا ہے۔ فرمان ربانی ہے: ﴿تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ (حٰمٓ السجدة 41:30) ”ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اترتے ہیں: نہ تم ڈرو اور نہ غم کھاؤ۔“ اگر حزن اور خوف ایک ہی چیز ہوتے تو مکرر کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ صحیح بات یہی ہے کہ غم اور چیز ہے اور خوف اور چیز ہے۔ خوف اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی آنے والی مصیبت کا اندیشہ طاری کر دے اور غم یہ ہے کہ بالفعل دل کی تمنا ہاتھ سے نکل جائے، نیز غم خوشی کے مقابلے میں بولا جاتا ہے اور خوف اطمینان کے مقابلے میں۔ اگر بپاسِ خاطر روافض ﴿لَا تَحْزَنْ﴾ کو بھی ہم ﴿لَا تَخَفْ﴾ ہی سمجھیں، تب بھی معنی یہ ہوں گے: اے ابوبکر! مت ڈر۔ ظاہر ہے کہ ابوبکر خوف زدہ حالت میں ہوں گے اور ان کو جو اپنی جان کا کھٹکا ہوگا تو اسی سبب سے ہوگا کہ کفار کو ان کے ساتھ دشمنی ہوگی اور وہ دشمنی بھی بوجہ اسلام وایمان ہوگی ورنہ رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینے کی کیا ضرورت تھی۔

7 ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾: رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ تم ہرگز پریشان اور مایوس نہ ہو، یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی عنایات ہمارے ساتھ ہیں۔ قرآن کریم کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بے مثال رفعتوں سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تائید صرف مسلمانوں کو حاصل ہوتی ہے۔ مومنین، محسنین اور متقین جیسی صفات کے حامل افراد اللہ کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں: ﴿اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ کا ذکر فرما کر یہ واضح کر دیا ہے کہ کفار مکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی دشمنی رکھتے تھے ورنہ رسول اللہ ﷺ انھیں کیوں تسلی دیتے اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کیوں ہوتا۔ کیا یہ کافی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسی طرح ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا جس طرح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا۔

8 ﴿فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ پر تسکین نازل فرمائی اور پھر آپ کی برکت سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس سے حصہ عطا فرمایا جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سکینت سے مراد طمانیت ہے۔ اس طرح سکینت وطمانیت حاصل ہوجانے کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں نبی ﷺ کے بارے میں کفار مکہ کی طرف سے جو خدشات ابھر رہے تھے، وہ زائل ہو گئے۔

﴿فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ﴾ مشہور یہ ہے کہ ﴿عَلَيْهِ﴾ کی ضمیر نبی ﷺ کی طرف راجع ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ﴿عَلَيْهِ﴾ کی ضمیر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف راجع ہے، اس لیے کہ لفظ ﴿لِصَاحِبِهٖ﴾ قریب ہے اور ضمیر قریب کی طرف راجع کرنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ ﴿فَاَنْزَلَ﴾ کی ضمیر بھی اس پر دلالت کرتی ہے

کہ یہ ﴿ لَا تَحْزَنْ ﴾ پر تفریع ہے اور اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حزین و غمگین ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر سکینت نازل فرمائی تاکہ ان کے قلب کو سکون حاصل ہو جائے اور ان کا غم اور پریشانی دور ہو جائے۔

علامہ سہیلی فرماتے ہیں کہ اکثر اہل تفسیر کے نزدیک ﴿عَلَيْهِ﴾ کی ضمیر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف راجع ہے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کو تو پہلے ہی سے سکون اور اطمینان حاصل تھا اور بعض علماء کے نزدیک ﴿عَلَيْهِ﴾ کی ضمیر نبی ﷺ کی طرف راجع ہے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ بہ تبعیت اس میں شامل ہیں۔

9 ﴿ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا ﴾ اس آیت کریمہ سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے غار ثور پر فرشتوں کا پہرہ لگا دیا تھا جس کی بنا پر مشرکین پر ایسا رعب چھا گیا کہ انھیں غار کے اندر جھانکنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

10 ﴿ وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۗ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کی تدبیر کو ناکام کیا کہ غار کے کنارے ہی سے دشمنوں کو بے نیل و مرام واپس روانہ کر دیا اور تائید غیبی سے آپ کی حفاظت فرمائی۔ غار پر فرشتوں کا پہرا لگا دیا اور ایک مکڑی کے جالے کو آہنی قلعے سے بڑھ کر حفاظت کا ذریعہ بنا دیا اور اللہ کی بات ہمیشہ بلند رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور ان کے یار غار کو مشرکین مکہ کی دستبرد سے محفوظ فرمایا۔ اس طرح سفر ہجرت میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رفاقت کا واقعہ انتہائی شاندار انداز میں بیان فرمایا کہ یہ ان کی فضیلت ہی نہیں، ان کی جان نثاری کی سند اور شہادت بھی ہے جس کا متعصب دشمنوں نے بھی اقرار کیا ہے۔[1]

انھی آیات کی تفسیر میں سید قطب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ایک ظالم قوت کلمہ حق کا مقابلہ نہ کر سکے تو وہ اپنے آپ کو ایسی مشکل حالت میں پاتی ہے کہ نہ اپنا دفاع کر سکتی ہے اور نہ اسے قرار آتا ہے۔ کچھ ایسی ہی حالت قریش کی ہوئی کہ جب ان کے لیے نبی ﷺ کا وجود ناقابل برداشت ہوگیا تو انھوں نے باہم مشورہ کر کے طے کیا کہ اب اس نبی سے نجات حاصل کر لی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس منصوبے کو پیغمبر پر آشکارا فرما دیا اور حکم دیا کہ ابوبکر کو ساتھ لے کر مدینہ ہجرت کر جائیے۔ حالت یہ تھی کہ آپ ﷺ کے پاس کوئی لشکر تھا نہ پیروکاروں کی کوئی قابل ذکر تعداد تھی۔ جبکہ دشمن کی تعداد اور قوت بہت زیادہ تھی۔ ایک طرف ساری مادی قوتیں تھیں اور دوسری طرف تنہا رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے مگر ان دیکھے ربانی لشکر ان کے مددگار تھے، لہٰذا شکست اور ذلت ہی کفار کا مقدر بنی، ارشاد ربانی ہے:

[1] سیرت المصطفیٰ از محمد ادریس کاندھلوی :1/404-416.

﴿وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى﴾

''اور اس نے کافروں کی بات کو پست کر دیا۔''[1]

اور اس کی جگہ اللہ کی بات (توحید) برتر، غالب، قوی اور نافذ ہو کے رہی۔

اس آیت کریمہ میں رسول اللہ ﷺ اور دین اسلامی کی مدد کا تذکرہ ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر لوگ آپ کی نصرت وحمایت سے پہلو تہی کریں تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کا رخ کسی ایسی دوسری قوم کی طرف بھی موڑ سکتا ہے جو مشرکین مکہ کی طرح قبول حق میں سست اور پھسڈی نہ ہو اور فی الواقع لوگ اس بات کا مشاہدہ کر بھی چکے تھے، لہٰذا انھیں کسی ظاہری دلیل کی ضرورت نہیں تھی۔''[2]

تصدیق ربانی کے بعد تصدیق نبوی

ایک روز نبی کریم ﷺ نے سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا: ''کیا تم نے ابوبکر کے بارے میں بھی کچھ اشعار کہے ہیں؟'' وہ عرض کرنے لگے: کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کے یار غار کی بھی مدح سرائی کی ہے، فرمایا: ''سناؤ۔'' حسان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

إِذَا تَذَكَّرْتَ شَجْوًا مِّنْ أَخٍ ثِقَةٍ ... فَاذْكُرْ أَخَاكَ أَبَا بَكْرٍ بِمَا فَعَلَا

اَلتَّالِيَ الثَّانِيَ الْمَحْمُودَ مَشْهَدُهُ ... وَأَوَّلَ النَّاسِ طُرًّا صَدَّقَ الرُّسُلَا

وَالثَّانِيَ اثْنَيْنِ فِي الْغَارِ الْمُنِيفِ، وَقَدْ ... طَافَ الْعَدُوُّ بِهِ إِذْ صَعَّدَ الْجَبَلَا

وَكَانَ حِبَّ رَسُولِ اللّٰهِ، قَدْ عَلِمُوا ... مِنَ الْبَرِيَّةِ، لَمْ يَعْدِلْ بِهِ رَجُلَا

''جب تجھے کسی معتبر شخص کے بارے میں جاننے کا اشتیاق ہو تو اپنے بھائی ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یاد کر کہ انھوں نے اُس وقت کیا کیا جب وہ دوسرے تھے۔ ان کی خصلت اور طرہ امتیاز کی بڑی تعریف کی جاتی ہے، وہی ہیں جنھوں نے تمام لوگوں میں سب سے پہلے اللہ کے رسول ﷺ کی تصدیق کی۔ اور بلند و بالا غار میں وہ دو میں سے دوسرے تھے جب دشمن نے اس ثور پہاڑ پر چڑھ کر چاروں طرف سے اس غار کا گھیراؤ کر لیا۔ اور ابوبکر رسول اللہ ﷺ کے محبوب تھے اور لوگوں کو علم تھا کہ آپ ﷺ کسی دوسرے شخص کو ان کا ہم پلہ نہیں سمجھتے۔''

[1] التوبة 9:40. [2] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 1656/3.

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے حسان! تو نے بالکل صحیح کہا۔'' [1]

غار ثور سے روانگی

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے کفار مکہ کے تمام حربے ناکام کر دیے اور ان کی تمام سازشوں کو تہس نہس کر دیا اور وہ ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو آپ ﷺ کی گرفتاری یا قتل کی مہم تھم گئی۔ اس مرحلے پر رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ غار سے نکلے اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے وہ اس مقام تک پہنچ گئے جہاں عبداللہ بن اریقط (ارقط) کو پہنچنا تھا، جسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے راستہ دکھانے پر مامور فرمایا تھا۔ وہ بھی وقت مقررہ پر آ پہنچا۔ ہر چند وہ مشرک تھا لیکن اس پر اعتبار کیا جا سکتا تھا۔ اس کے پاس دونوں اونٹنیاں بھی تھیں۔ عامر بن فہیرہ بھی ساتھ تھے تاکہ دوران سفر نبی ﷺ کی خدمت کی جا سکے۔ نبی ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ایک اونٹنی خریدی تھی۔ اسی اونٹنی پر آپ ﷺ سوار ہوئے۔ دوسری اونٹنی پر ابوبکر رضی اللہ عنہ سوار ہو گئے اور اپنے پیچھے عامر بن فہیرہ کو سوار کر لیا۔ جس اونٹنی پر نبی ﷺ سوار ہوئے، واقدی کے مطابق اس کا نام القصواء تھا لیکن ابن عساکر، ابن اسحاق اور سہیلی وغیرہ کے مطابق اس اونٹنی کا نام الجدعاء تھا۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ کی ایک اور اونٹنی تھی جس کا نام العضباء تھا، اس دوسری اونٹنی کا ذکر اس حدیث میں ہے جس میں اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا ذکر فرمایا اور بتایا کہ قیامت کے روز اسے بھی زندہ کیا جائے گا، حضرت صالح اس پر سوار ہوں گے۔ الغرض رسول اللہ ﷺ سمیت چار افراد کا یہ مختصر سا قافلہ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ مدینہ منورہ کی طرف چل دیا۔ رسول اللہ ﷺ دشمن سے بچاؤ کی تمام تدابیر اختیار کرنے کے بعد نہایت اطمینان سے جا رہے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی غرض سے چاروں طرف نظر دوڑا رہے تھے اور اس ننھے سے قافلے کے ساتھ رواں دواں تھے۔ [2]

مکہ سے روانگی کی تاریخ

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام حاکم رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ نبی ﷺ کی مکہ سے روانگی بیعت عقبہ سے تقریباً تین مہینے بعد ہوئی۔ ابن اسحاق رحمہ اللہ نے اس کی تاریخ متعین کرتے ہوئے کہا ہے کہ نبی ﷺ ربیع الاول کی پہلی تاریخ کو مکہ سے روانہ ہوئے۔ اس بنا پر آپ ﷺ کی مکہ سے روانگی بیعت کے بعد دو ماہ دس دن سے چند ایام زیادہ ہو سکتی ہے۔ اسی طرح اموی اپنے مغازی میں ابن اسحاق سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ بیعت عقبہ کے دو مہینے اور کچھ راتیں گزرنے کے بعد مکہ سے نکلے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ ربیع الاول کی پہلی تاریخ کو نکلے اور

[1] دیوان حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، ص: 174، سمط النجوم للعصامي: 152/1۔ [2] الرحيق المختوم، ص: 187،186۔

بارہ ربیع الاول کو مدینہ پہنچے۔

امام حاکم فرماتے ہیں کہ متواتر احادیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ پیر کے دن نکلے اور پیر ہی کے دن مدینہ پہنچے۔ لیکن محمد بن موسیٰ خوارزمی نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ مکہ سے جمعرات کو نکلے اور غار ثور سے پیر کی رات سفر پر روانہ ہوئے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ بیعت عقبہ اور ہجرت کے درمیان دو مہینوں اور چند ایام کا فرق ہے۔[1]

سفر کی ابتدا اور شاہراہ عام کی تبدیلی

غار میں ہجرت کے راہیوں کو مسلسل خبریں ملتی رہتی تھیں کہ قریش مکہ نے آپ ﷺ کی تلاش میں مکہ اور اس کے نواحات کا چپہ چپہ چھان مارا ہے اور مدینہ کے راستے پر ان کی نظریں خاص طور پر گڑی ہوئی ہیں۔ ان خبروں کے بعد رسول اللہ ﷺ اور زیادہ محتاط ہوگئے۔ آپ ﷺ پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگے۔ آپ نے عام راستے سے ہٹ کر وہ غیر معروف راستہ اختیار کیا جس طرف لوگوں کی توجہ ہی نہیں تھی اور اس راستے سے قافلے کا رہبر عبداللہ بن اریقط خوب باخبر تھا۔ سفر کی مشقت اور تھکن کی پروا کیے بغیر یہ قافلہ رات بھر محو سفر رہا اور اگلے دن دوپہر تک مسلسل چلتا رہا۔ اللہ کے راستے کے ان مقدس مسافروں کو اللہ تبارک وتعالیٰ پر پورا یقین تھا کہ وہ اس کی نگاہ میں ہیں اور اس کے کرم سے منزل مقصود پر آسانی سے پہنچ جائیں گے لیکن انھوں نے توکل کے ساتھ ساتھ دفاعی تدابیر سے بے نیازی نہیں برتی۔ انھوں نے مروجہ وسائل بروئے کار لا کر اپنی حفاظت کا بھرپور بندوبست بھی کیا۔

اس میں شک نہیں کہ راہِ حق کے یہ عظیم المرتبت مسافر اللہ کے فضل سے غار ثور سے بحفاظت نکل آئے تھے اور اب حجاز کے پست و بلند نشیب و فراز عبور کرتے ہوئے سوئے مدینہ چلے جا رہے تھے مگر وہ قریش کے حربوں سے غافل نہیں تھے۔ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ قریش نے ان کی گرفت کے لیے بیش بہا انعام کا اعلان کر رکھا ہے، اس لیے آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق پوری طرح محتاط ہو کر سفر کر رہے تھے۔ ان میں سے ہر شخص صحرا نشینی کے اثرات کی وجہ سے قتل وخون کا اس قدر شیدائی تھا کہ ان کا مقابل اگر تنہا بھی ہوتا تو ان کی آتش غضب اسے قتل کیے بغیر نہ بجھتی۔ یہ ایسے اسباب تھے جن کی بدولت نبی ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ انتہائی احتیاط سے اور رکھ رکھاؤ سے سفر کر رہے تھے۔[2]

[1] فتح الباري: 283/7، أحاديث الهجرة، ص: 125. [2] الرحيق المختوم، ص: 187,186.

دوپہر کو رسول اللہ ﷺ کو دودھ پلایا

نبی ﷺ کہیں پڑاؤ کیے بغیر مسلسل سفر کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ایک رات اور اگلے دن دوپہر تک لمحہ بھر بھی آرام نہیں فرمایا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: دوپہر کے وقت میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی، کہیں کوئی سایہ نظر آجائے تاکہ تھوڑی دیر سستالیں۔ اسی دوران میں دور ایک سایہ دار چٹان نظر آئی۔ ہم وہاں پہنچے۔ میں نے اپنی اونٹنی سے اُتر کر نبی ﷺ کے لیے جلدی جلدی جگہ صاف کی اور پھر اس جگہ چٹائی بچھادی اور رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ تشریف لائیے اور تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جائیے۔ رسول اللہ ﷺ لیٹ گئے تو میں یہ دیکھنے لگا مبادا کوئی تلاش کرنے والا آرہا ہو۔ میں نے دور ایک گڈریے کو دیکھا۔ وہ اپنی بکریوں کو ہماری ہی طرف ہانک کر لا رہا تھا۔ وہ بھی سائے کی تلاش میں تھا اور چٹان کے سائے میں آرام کرنا چاہتا تھا۔ وہ قریب آیا تو میں نے پوچھا: اے نوجوان! تم کس کے غلام ہو؟ اس نے مکہ میں قریش کے ایک آدمی کا نام لیا۔ میں اُسے جانتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: کیا تمھاری بکریوں میں سے کوئی بکری دودھ بھی دیتی ہے؟ اس نے کہا: ہاں! میں نے کہا: کیا تم ہمارے لیے دودھ دوہ دو گے؟ کہنے لگا: ہاں، دوہ دوں گا۔ میرے کہنے پر اس نے ایک بکری کو اپنی طرف کھسکایا۔ میں نے کہا: پہلے اس کے تھن سے گرد و غبار صاف کر دو۔ جب اس نے تھن صاف کر لیے تو میں نے اس سے کہا: اب اپنے ہاتھ بھی جھاڑ لو۔ اس نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر غبار جھاڑ دیا۔ اس کے بعد اس نے تھوڑا سا دودھ دوہ دیا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت کے لیے اس برتن سے دودھ کے برتن پر ٹھنڈا پانی ڈالا، اس طرح برتن کا نچلا حصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ آرام فرما رہے تھے، میں نے آپ کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ میں دوبارہ آپ کے پاس آیا، اس وقت آپ نیند سے بیدار ہو چکے تھے۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ لیجیے ٹھنڈا دودھ نوش فرمائیے۔ آپ نے سیر ہو کر دودھ پیا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی، پھر میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! اب کوچ کرنے کا وقت ہو چکا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! چلنا چاہیے۔''[1]

سراقہ بن مالک کی رسول اللہ ﷺ سے ملاقات

قریش مکہ نے مکہ کی تمام مجلسوں میں منادی کرا دی تھی کہ جو بھی نبی ﷺ یا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زندہ یا مردہ لائے گا، اسے سو اونٹ انعام دیے جائیں گے۔ بھاری انعام کی یہ خبر مکہ کے مضافات میں بدوی قبائل تک پہنچ چکی تھی۔ سراقہ بن مالک بن جُعْشُم لالچ میں آگیا۔ اُس نے قریش کی طرف سے اونٹوں کی پیشکش پر زبردست بھاگ دوڑ

[1] صحيح البخاري: 3615 و 3652.

شروع کر دی۔ وہ اونٹوں کے عشق میں ثور پہاڑ تک خاک چھان آیا تھا۔ وہاں سے نامراد اور ناکام لوٹنے کے بعد وہ انتہائی قلق کی حالت میں تھا۔ پریشانی کے عالم میں رہ رہ کر پہلو بدل رہا تھا۔ اسے اپنے قبیلے کے پیشرو سرداروں کے عظیم الشان کارنامے رہ رہ کر تڑپا رہے تھے، وہ آرزومند تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف گراں قدر انعام حاصل کرے اور دوسری طرف اپنے حلیفوں اور قبیلے میں ممتاز مقام حاصل کر لے۔ لیکن جو صیاد شکار کرنے آیا تھا، وہ خود ہی شکار ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ نے سراقہ کی اس طرح کایا پلٹ دی کہ وہ نبی ﷺ کو گرفتار یا قتل کرنے کے بجائے خود آپ ﷺ کا مطیع اور محافظ بن کر گیا۔

سراقہ اپنے قبیلے کی مجلس میں نہایت غم زدہ بیٹھا تھا۔ اسی دوران مجلس میں اس کی قوم بنو مدلج کا ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: ''اے سراقہ! میں نے ابھی ابھی ساحل سمندر کے پاس کچھ لوگوں کو جاتے دیکھا ہے۔ ہو نہ ہو، میرا خیال ہے کہ وہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھی ہی ہیں۔'' سراقہ نے کہا: میں نے اس وقت پہچان لیا تھا کہ وہ قریش کے مطلوبہ افراد ہیں۔ اگرچہ قریش نے مکہ کا چپہ چپہ چھان مارا تھا لیکن ابھی تک انھوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ قُدید سے آگے بڑھ سکتے ہیں، اس لیے میں نے کہا: نہیں، تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ تو فلاں اور فلاں ہیں جنھیں ہم نے دیکھا تھا۔ ان کا کوئی سامان گم گیا تھا، وہ اسے تلاش کر رہے تھے۔ سراقہ نبی ﷺ کو پانے اور انعام حاصل کرنے کے لالچ میں بے قرار ہو گیا۔

سراقہ کہتا ہے کہ پھر میں جلد ہی مجلس سے اٹھ کھڑا ہوا اور گھر پہنچا۔ اپنی لونڈی کو حکم دیا کہ ٹیلے کے پیچھے میرا گھوڑا لاؤ اور اسے تیار کرو، پھر خود اپنا نیزہ لے کر میں چھت کے راستے سے کودا۔ میں نے نیزے کو سرنگوں رکھا اتنا سرنگوں کہ اس کی انی زمین سے چھو رہی تھی، پھر میں لپک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اسے سرپٹ دوڑا کر تیزی سے مسافت طے کرنے لگا۔ میرے دل و دماغ میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اب میں سو اونٹوں کا مالک بن جاؤں گا اور رؤسائے مکہ میں سب سے زیادہ ممتاز مقام حاصل کر لوں گا۔

سراقہ کہتا ہے: میں نے انھیں دور سے دیکھ لیا اور پہچان بھی لیا لیکن اچانک نہ جانے کیا ہوا۔ جونہی میں ان کے قریب پہنچا تو میرا گھوڑا پھسلا اور میں زمین پر گر گیا۔ میں فوراً اٹھا۔ فال کا تیر نکالا اور یہ جائزہ لینے لگا کہ کیا میں آپ کے قافلے کو گزند پہنچا سکوں گا یا نہیں؟ تیر میری منشا کے خلاف نکلا لیکن میں نے تیر کی بات نہ مانی۔ میں دوبارہ رسول اللہ ﷺ کا تعاقب کرنے لگا۔ اب پہلے سے بھی زیادہ عجیب تر معاملہ پیش آیا۔ یکایک دیکھتی آنکھوں میرے گھوڑے کے اگلے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ میں گرا، سنبھلا اور گھوڑے کو ڈانٹ پلائی۔ بڑی مشکل سے

اس نے اپنے گڑے ہوئے پاؤں زمین سے نکالے۔ اس کے ساتھ ہی زمین سے دھویں جیسا گرد و غبار بلند ہوا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ ساری صورت حال دیکھ رہے تھے۔ وہ بار بار بے قرار ہوکر پیچھے مڑ کر دیکھتے تھے۔ میں نے دوبارہ تیروں سے فال نکالی مگر فال دوبارہ میری منشا کے خلاف نکلی۔ اب میں نے خود کلامی کی اور اپنے آپ سے کہا: سراقہ! تجھے کیا ہوگیا؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنا آسان سا کام چھوڑ دوں اور اتنے گراں قدر انعام سے محروم ہو جاؤں، چنانچہ میں نے فال کو پھر مسترد کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کا تعاقب کرنے کے لیے اپنے آپ کو پھر کمربستہ کیا۔ میں اپنے گھوڑے پر دوبارہ سوار ہوا اور گھوڑے کو پھر قافلے کے پیچھے ڈال دیا۔ میں پھر قافلے کے قریب جا پہنچا۔ اب مجھے رسول اللہ ﷺ کی قراءت سنائی دی۔

نبی کریم ﷺ مسلسل بغیر مڑے قرآن کریم پڑھتے جا رہے تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلسل میری طرف دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے نبی ﷺ سے عرض کی: اے اللہ کے رسول! دشمن سر پر آ گیا ہے۔ نبی ﷺ نے ادھر ادھر دیکھے اور کوئی جنبش کیے بغیر نہایت اطمینان سے جواب دیا: ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ مڑ مڑ کر مجھے دیکھتے رہے کہ سراقہ قریب سے قریب تر آتا جا رہا ہے۔ انھیں شدید خوف لاحق ہوگیا اور ان کی تڑپ اور فکرمندی بڑھ گئی۔ آپ ﷺ کی ذات کے اس قدر قریب خطرہ پاکر وہ رو پڑے اور نہایت آزردہ ہوکر نبی ﷺ سے عرض کرنے لگے: اے اللہ کے رسول! یہ سراقہ بن مالک ہے۔ ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ اب وہ قریب آ پہنچا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک بلند کیا اور فرمایا: «اَللّٰهُمَّ! اكْفِنَاهُ بِمَا شِئْتَ» ”اے اللہ! جس طرح تو چاہے ہمارے لیے اس سے کافی ہوجا۔“ رسول اللہ ﷺ کی دعا معاً قبول ہوگئی۔

سراقہ کہتے ہیں: پھر اچانک میرے گھوڑے کے اگلے پاؤں دوبارہ گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ میں گرا، سنبھلا اور گھوڑے کو بہت ڈانٹا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے پاؤں زمین سے نکالے۔ اس کے ساتھ ہی زمین سے دھویں جیسا گرد و غبار بھی بلند ہوا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ میں ناکام ہوگیا ہوں اور جن کا پیچھا کر رہا ہوں، انھیں پانا میرے لیے ناممکن ہے۔ میں نے بلند آواز سے قافلے کو آواز دی اور امان طلب کی تو اہل قافلہ ٹھہر گئے۔ اب میں گھوڑے پر سوار ہوا۔ ان کے پاس پہنچا۔ میری حالت یہ تھی کہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ عنقریب رسول اللہ ﷺ کی دعوت کارگر ہوجائے گی۔

میں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: مجھے معلوم ہے، جو مجھے تکلیف پہنچی، وہ آپ کی دعا کی وجہ سے پہنچی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کامیاب ہوکر رہیں گے، پھر میں نے آپ ﷺ کو بتایا کہ آپ کی قوم نے آپ کی گرفتاری پر

سو اونٹ انعام مقرر کیا ہے اور پھر باقی تمام خبریں بھی کہہ سنائیں۔ میں نے اپنا زادِ راہ اور جملہ سامان آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا لیکن آپ نے لینے سے انکار کر دیا۔ نبی ﷺ نے مجھ سے کچھ بھی نہیں مانگا، صرف اتنا فرمایا کہ ہمیں لوگوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرنا، پھر میں نے پروانۂ امن کی درخواست کی جو آپ ﷺ کے حکم پر عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ نے مجھے چمڑے کے ٹکڑے پر لکھ کر دے دیا، بعد ازاں آپ ﷺ وہاں سے رخصت ہو گئے۔[1]

سراقہ بن مالک کے بارے میں وہ باتیں بھی مشہور ہیں جو ابن عبدالبر اور ابن حجر وغیرہ نے حضرت حسن بصری سے مرسلاً بیان فرمائی ہیں۔ چنانچہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سفیان بن عیینہ ابوموسیٰ سے اور وہ حسن بصری سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت حسن بصری نے بتایا: رسول اللہ ﷺ نے سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

«كَيْفَ بِكَ إِذَا لَبِسْتَ سِوَارَيْ كِسْرٰى؟»

''اس وقت تیرا کیا حال ہوگا جب تو کسریٰ کے کنگن پہنے گا؟''

سراقہ کہتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کسریٰ کے کنگن، شاہی پٹکا اور تاج لایا گیا تو انھوں نے مجھے بلایا اور یہ سب زیورات مجھے پہنا دیے۔ میری کلائیوں پر گھنے بال تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے حکم دیا: اپنے دونوں بازو بلند کرو اور پھر نہایت بلند آہنگی سے فرمایا:

اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي سَلَبَهَا كِسْرَى بْنَ هُرْمُزَ الَّذِي يَقُولُ: أَنَا رَبُّ النَّاسِ، وَأَلْبَسَهُمَا سُرَاقَةَ بْنَ مَالِكِ بْنِ جُعْشُمٍ أَعْرَابِيًّا مِّنْ بَنِي مُدْلِجٍ.

''اللہ سب سے بڑا ہے۔ تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے یہ سارا سامان ربوبیت کے دعویدار کسریٰ بن ہُرمز سے چھینا اور بنو مدلج کے ایک اعرابی سراقہ بن مالک بن جعشم کو پہنا دیا۔''

پھر سراقہ کو اونٹ پر سوار کیا گیا اور مدینہ کے گلی کوچوں میں لے جایا گیا۔ ان کے اردگرد لوگوں کا ہجوم تھا اور سراقہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات کو بار بار اونچی آواز سے دہرا رہے تھے کہ اللہ سب سے بڑا ہے اور شکر ہے اللہ تعالیٰ کا جس نے یہ سارا سامان کسریٰ سے چھین لیا اور بنو مدلج کے ایک گنوار سراقہ بن مالک کو پہنا دیا۔[2]

دلوں کو پھیرنے والی ذات پاکیزہ ترین ہے

سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ گھر سے تو اس خیال سے نکلے تھے کہ نبی ﷺ پر دسترس حاصل کر لیں تا کہ آپ ﷺ کو

[1] صحيح البخاري :3652 و3906، صحيح مسلم :(91)-2009. [2] الاستيعاب، ص :303، الإصابة :35/3، الاكتفاء :348/1، الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص :346، السيرة النبوية لأبي شهبة:495/1.

اہل مکہ کے حوالے کر کے سو اونٹ انعام حاصل کر سکیں لیکن اب تمام معاملات یکسر بدل گئے۔ اب وہی سراقہ آپ ﷺ کے سفر کو لوگوں سے مخفی رکھنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ راستے میں جس سے ملاقات ہوتی تو فوراً کہتے: ''اس راستے میں آپ کے مطلوبہ افراد نہیں ہیں۔'' جب سراقہ رضی اللہ عنہ مطمئن ہو گئے کہ اب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ پہنچ چکے ہوں گے تو انھوں نے اپنا سارا ماجرا کہہ سنایا۔ یہ قصہ اتنا مشہور ہوا کہ اہل مکہ کی ہر مجلس میں اس واقعے کا چرچا ہونے لگا۔ سردارانِ قریش کو خوف لاحق ہو گیا کہ کہیں یہ واقعہ اہل مکہ کے لیے اسلام قبول کرنے کا سبب نہ بن جائے کیونکہ سراقہ اپنے قبیلے کے سربراہ تھے، چنانچہ ابوجہل نے بنو مدلج کو لکھا:

بَنِي مُدْلِجٍ إِنِّي أَخَافُ سَفِيهَكُمْ سُرَاقَةَ مُسْتَغْوٍ لِنَصْرِ مُحَمَّدِ

عَلَيْكُمْ بِهِ أَلَّا يُفَرِّقَ جَمْعَكُمْ فَيُصْبِحَ شَتَّى بَعْدَ عِزٍّ وَ سُؤْدَدِ

''اے بنو مدلج! مجھے ڈر ہے کہ تمھارا ایک کم عقل آدمی سراقہ لوگوں کو محمد ﷺ کی مدد پر آمادہ نہ کر دے۔ اس لیے تم اس پر جلدی قابو پالو تاکہ وہ تمھارے اتحاد کو پارہ پارہ نہ کر دے اور یوں عزت و سرداری کے بعد تمھارا شیرازہ بکھر جائے۔''

سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کا جواب ان الفاظ میں لکھا:

أَبَاحَكَمٍ وَاللّٰهِ لَوْ كُنْتَ شَاهِدًا لِأَمْرِ جَوَادِي إِذْ تَسُوخُ قَوَائِمُهُ

عَلِمْتَ وَلَمْ تَشْكُكْ بِأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولٌ بِبُرْهَانٍ فَمَنْ ذَا يُقَاوِمُهُ؟

عَلَيْكَ بِكَفِّ الْقَوْمِ عَنْهُ فَإِنَّنِي أَرٰى أَمْرَهُ يَوْمًا سَتَبْدُو مَعَالِمُهُ

بِأَمْرٍ يَوَدُّ النَّاسُ فِيهِ بِأَسْرِهِمْ بِأَنَّ جَمِيعَ النَّاسِ طُرًّا يُسَالِمُهُ

''اے ابوالحکم! اللہ کی قسم! اگر تم اس وقت موجود ہوتے جب میرے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس رہے تھے، تم یہ منظر دیکھ کر یقین کر لیتے کہ محمد دلیل کے ساتھ اللہ کے رسول ہیں، ان کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ اب یہ تمھارا فرضِ لازم ہے کہ تم اپنی قوم کو محمد (ﷺ) کا مقابلہ کرنے سے روکو۔ مجھے یقین ہے کہ کسی دن ان کا راستہ اہل نظر پر واضح ہو جائے گا، ایسے معاملے کے ساتھ کہ تمام لوگ یہی تمنا کریں گے کہ اے کاش! سب لوگ ان سے دوستی کر لیں۔''[1]

[1] الروض الأنف: 322/2، فتح الباري، شرح الحديث: 3906.

سراقہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پھر میں واپس آ گیا اور اس واقعے کا کسی سے تذکرہ نہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ آٹھ ہجری میں نہایت پُر وقار فاتحانہ شان کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے، بیت اللہ کو تمام بتوں سے پاک کر دیا گیا اور تقریباً تمام لوگ مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد حنین اور طائف کے معرکے برپا ہوئے۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں نے بہت دیر کر دی ہے۔ مجھے فوراً رسول اللہ ﷺ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہونا چاہیے، چنانچہ میں آپ ﷺ کا پروانۂ امن لے کر روانہ ہوا اور پھر آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو گیا۔ اس وقت نبی ﷺ جعرانہ کے مقام پر تشریف فرما تھے اور میں گروہ انصار کے شاہ سواروں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ انصاریوں نے مجھے اجنبی سمجھتے ہوئے میرے بدن میں نیزوں کی انیوں سے کچوکے دینے شروع کر دیے۔ وہ مجھے اِس خیال سے ڈرانے دھمکانے لگے مبادا میں نبی ﷺ کو کوئی نقصان پہنچاؤں۔ وہ مجھ سے بار بار کہہ رہے تھے: جاؤ جاؤ! یہاں سے دور ہٹ جاؤ۔ میں اسی ''ہٹو بچو'' کے شور میں نبی ﷺ کے قریب جا پہنچا۔ نبی مکرم اپنی اونٹنی پر سوار تھے اور پنڈلی مبارک سے چادر ہٹی ہوئی تھی۔ میں نے آپ ﷺ کا نوازش نامہ لے کر ہاتھ بلند کیا۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ کا گرامی نامہ میرے پاس ہے۔ میں سراقہ بن مالک ہوں۔ نبی معظم ﷺ نے ارشاد فرمایا: «يَوْمُ وَفَاءٍ وَّبِرٍّ» ''آج وعدہ پورا کرنے اور احسان کرنے کا دن ہے۔'' پھر اپنے جان نثاروں سے فرمایا: ''انھیں میرے قریب آنے دو۔''

مسجد جعرانہ (مکہ مکرمہ)

سراقہ کہتے ہیں: میں آپ ﷺ کے قریب پہنچا اور حلقہ بگوش اسلام ہو گیا، پھر مجھے خیال آیا کہ اس موقع پر مجھے کچھ آپ ﷺ سے پوچھنا چاہیے۔ میں نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! میں اپنے اونٹوں کو پانی پلانے کی غرض سے پانی کا حوض بھرتا ہوں۔ کئی دوسرے اونٹ بھی یہاں پانی پینے آ جاتے ہیں۔ اگر میں غیروں کے اونٹوں کو بھی اپنے حوض سے پانی پینے دوں تو کیا مجھے اس کا ثواب ملے گا؟ نبی ﷺ نے فرمایا:

«نَعَمْ! فِي كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ حَرَّى أَجْرٌ»

''ہاں، حرارت محسوس کرنے اور جگر رکھنے والے ہر جاندار کو پانی پلانے پر اجر و ثواب ہے۔'' [1]

[1] السيرة لابن هشام: 490/2، فتح الباري: 303/7.

راہ ہجرت میں ام معبد کا خیمہ

وادی قدید

اس سفر میں نبی کریم ﷺ کا گزر ام معبد کے خیمے کے قریب سے ہوا۔ یہ خیمہ علاقہ بنوخزاعہ کے قریب قُدید نامی جگہ پر لگا ہوا تھا۔ ام معبد خنیس بن خالد خزاعی کی بہن تھیں اور خنیس ہی نے یہ قصہ بیان کیا ہے۔ یہی قصہ مختلف راویوں اور سیرت نگاروں نے نقل کیا ہے۔

حضرت امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قصہ مشہور ہے اور کثیر طرق سے مروی ہے جو ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔[1]

خالد بن خنیس بن خالد خزاعی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے بغرض ہجرت روانہ ہوئے تو آپ ﷺ کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے غلام عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ اور راستہ دکھلانے والا عبداللہ بن اریقط لیثی تھا۔ یہ حضرات اثنائے سفر میں ام معبد کے خیمے کے پاس سے گزرے۔ وہ ایک بوڑھی اور سمجھ دار خاتون تھی۔ اس کا تعلق بنوخزاعہ قبیلے سے تھا۔ اس کا نام عاتکہ بنت خلف بن معبد بن ربیعہ تھا اور ام معبد کی کنیت سے مشہور تھی۔ وہ اپنے خیمے میں بیٹھی تھی۔ وہیں کھانے پینے کا انتظام کر رہی تھی۔ جب یہ حضرات وہاں پہنچے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس خاتون سے گوشت اور کھجوروں کے بارے میں پوچھا اور کہا کہ اگر آپ کے پاس یہ چیزیں موجود ہوں تو خریدنے کے خواہشمند ہیں۔ لیکن اس غریب خاتون کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ وہ بہت مسکین اور قحط زدہ قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ تاسف سے کہنے لگی: اگر ہمارے پاس کوئی چیز ہوتی تو ہم آپ حضرات کی ضیافت میں ہرگز کوتاہی نہ کرتے۔

اچانک رسول اللہ ﷺ کی نظر خیمے کے پاس ایک بکری پر پڑی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: «مَا هٰذِهِ الشَّاةُ يَا أُمَّ مَعْبَدٍ؟» ''اے ام معبد! یہ بکری کیسی ہے؟'' ام معبد نے جواب دیا کہ یہ بے حد کمزور ہے۔ کمزوری ہی کی وجہ سے ریوڑ کے ساتھ نہ جا سکی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: «فَهَلْ بِهَا مِنْ لَبَنٍ؟» ''کیا یہ دودھ دے سکتی ہے؟''

ام معبد نے کہا: ''یہ بہت ہی لاغر ہے۔ دودھ نہیں دے سکتی۔'' نبی ﷺ نے پوچھا: «أَتَأْذَنِينَ أَنْ أَحْلُبَهَا؟» ''اگر اجازت ہو تو میں اسے دوہ سکتا ہوں؟''

ام معبد نے کہا: کیوں نہیں! اگر اس میں دودھ ہے تو ضرور دوہ لیجیے۔

---

[1] السيرة النبوية للصلابي: 469,468/1، البداية والنهاية: 188/3.

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بکری قریب لاؤ۔'' پھر اللہ کا نام لیا۔ اس کے تھن کو ہاتھ لگایا اور برکت کی دعا فرمائی۔ بکری اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا کر جگالی کرنے لگی۔ آپ ﷺ نے ایک بڑا برتن منگوایا۔ یہ برتن ایک پوری جماعت کو سیر کرنے کے لیے کافی تھا۔ آپ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے بکری کو دوہا۔ اس کے تھنوں سے اتنی تیز دھار سے دودھ نکلا کہ برتن بہت جلدی بھر گیا اور اوپر کی سطح پر جھاگ نظر آنے لگا۔ آپ ﷺ نے ام معبد کو بھی دودھ مرحمت فرمایا اور اپنے ساتھیوں کو بھی پلایا۔ جب سب اچھی طرح سیر ہوگئے تو پھر خود نوش فرمایا۔ بعدازاں سب نے دوبارہ دودھ پیا۔ آپ نے دوبارہ دودھ دوہا، برتن دوبارہ دودھ سے لبریز ہوگیا۔ یہ برتن آپ ﷺ نے ام معبد کے پاس چھوڑا، پھر آپ ﷺ نے ام معبد کو اللہ حافظ کہا اور آگے چل دیے۔

دوپہر ہوئی تو ام معبد کا خاوند ابومعبد اپنی کمزور اور بوڑھی بکریوں کا ریوڑ ہانکتا ہوا آیا۔ اس کی نظر دودھ پر پڑی تو بہت حیران ہوا۔ پوچھنے لگا: ام معبد! یہ دودھ کہاں سے آیا؟ ہماری بکری تو کمزور تھی، دودھ والی نہیں تھی اور گھر میں دودھ بھی نہ تھا!

ام معبد نے کہا: اللہ کی قسم! ہمارے ہاں ایک بہت بابرکت آدمی آیا تھا۔ یہ دودھ اُسی کی برکت کا نتیجہ ہے۔ پھر اس نے سارا ماجرا سنایا۔ ابومعبد نے کہا: میرے سامنے اس مہمان گرامی کی تمام صفات بیان کرو۔ اِس وقت ام معبد نے حضرت محمد ﷺ کی جو دل آویز تصویر کشی کی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بادیہ نشین عورت کو بڑی حقیقت بین نظر اور بڑی حقیقت شناس فصیح و بلیغ زبان عطا فرمائی تھی۔ وہ کہنے لگی:

رَأَيْتُ رَجُلًا ظَاهِرَ الْوَضَاءَةِ، حَسَنَ الْخُلُقِ، مَلِيحَ الْوَجْهِ، لَمْ تَعِبْهُ ثُجْلَةٌ وَّلَمْ تُزْرِ بِهِ صَعْلَةٌ قَسِيمٌ وَّسِيمٌ، فِي عَيْنَيْهِ دَعَجٌ، وَفِي أَشْفَارِهِ وَطَفٌ، وَفِي صَوْتِهِ صَحَلٌ، أَحْوَرُ أَكْحَلُ أَزَجُّ أَقْرَنُ، فِي عُنُقِهِ سَطَعٌ، وَفِي لِحْيَتِهِ كَثَاثَةٌ إِذَا صَمَتَ فَعَلَيْهِ الْوَقَارُ، وَ إِذَا تَكَلَّمَ سَمَا وَعَلَاهُ الْبَهَاءُ، حُلْوُ الْمَنْطِقِ، فَصْلٌ لَّا نَزْرٌ وَّلَا هَذْرٌ كَأَنَّ مَنْطِقَهُ خَرَزَاتُ نَظْمٍ يَّتَحَدَّرْنَ، أَبْهَى النَّاسِ وَ أَجْمَلُهُ مِنْ بَعِيدٍ، وَأَحْسَنُهُ مِنْ قَرِيبٍ، رَبْعَةٌ، لَا تَشْنَأُهُ عَيْنٌ مِّنْ طُولٍ، وَلَا تَقْتَحِمُهُ عَيْنٌ مِّنْ قِصَرٍ، غُصْنٌ بَيْنَ غُصْنَيْنِ، فَهُوَ أَنْضَرُ الثَّلَاثَةِ مَنْظَرًا، وَأَحْسَنُهُمْ قَدْرًا، لَهُ رُفَقَاءُ يَحُفُّونَ بِهِ، إِنْ قَالَ اسْتَمَعُوا لِقَوْلِهِ، وَإِنْ أَمَرَ تَبَادَرُوا لِأَمْرِهِ، مَحْفُودٌ مَّحْشُودٌ لَّا عَابِسٌ وَّلَا مُفَنِّدٌ.

''میں نے وہ آدمی دیکھا۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا تھا، چہرہ بڑا تابناک اور خوش اندام تھا، مُٹاپے کا عیب نہ

دبلے پن کی خامی، حسنِ بے مثال کے سانچے میں ڈھلا ہوا پیکر، بہت خوبرو، سُرگیں آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، بھاری آواز، بال لمبے اور گھنے، پیوستہ ابرو، لمبی اور چمکدار گردن، گھنی ڈاڑھی، خاموش ہو تو باوقار، گفتگو کرے تو اُٹھی ہوئی گردن اور پُر رونق چہرے کے ساتھ، بڑا میٹھا کلام، واضح الفاظ، گفتگو بہت متوازن، جچی تلی، صاف شفاف، کمی بیشی سے خالی، اس کی باتیں موتیوں کی لڑی کی طرح، دور سے دیکھنے میں سب سے تابناک، قریب سے دیکھنے میں انتہائی حسین، کامل نمونۂ جمال، میانہ قد، نہ لمبا کہ ناگوار لگے، نہ ٹھگنا کہ نگاہ میں نہ جچے، دو شاخوں کے درمیان ایسی شاخ کی طرح جو تینوں میں سب سے زیادہ خوش منظر اور سب سے بڑھ کر شاندار ہو، رفقاء اس کے گرد حلقہ بنائے ہوئے تھے، وہ کوئی بات کہتا تھا تو دھیان سے سنتے تھے۔ وہ کوئی حکم دیتا تھا تو لپک کر تعمیلِ ارشاد کرتے تھے، وہ بڑا محترم، مخدوم و مطاع تھا، ترش رو تھا نہ کوئی فضول بات کرتا تھا۔''

ابومعبد نے کہا: ''اللہ کی قسم! یہ تو وہی قریشی ہے جس کی نبوت کا ذکر مکہ سے ہم تک پہنچتا رہا ہے۔ میرا بہت دل چاہتا ہے کہ اس کی صحبت اختیار کروں۔ موقع ملا تو میں اس کی خدمت میں ضرور جاؤں گا۔'' [1]

ایک روایت میں ہے: ام معبد نے جب پہلی دفعہ آپ ﷺ کی برکات دیکھیں تو وہ آپ کو مبارک کے نام سے یاد کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بکریوں میں بڑی برکت عطا فرمادی۔ اس کی چند بکریاں بڑے ریوڑ میں تبدیل ہوگئیں۔ ایک مرتبہ ام معبد اپنے ریوڑ ہانک کر مدینہ کے قریب آ پہنچی۔ اس کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا۔ ان دونوں کے قریب سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا۔ اس لڑکے نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پہچان لیا۔ اس نے اپنی ماں کو بتایا، کہنے لگا: ماں! یہ وہی شخص ہے جو اس دن مبارک کے ساتھ آیا تھا۔ وہ یک دم کھڑی ہوئی۔ جلدی سے ان کی طرف لپکی اور پوچھا: اے اللہ کے بندے! وہ مبارک کہاں ہے جو اس دن تمھارے ساتھ تھا؟ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تمھیں خبر نہیں، وہ اللہ کے نبی ہیں؟ اس نے عرض کیا: مجھے ان کی خدمت میں لے جایئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس خاتون کو ساتھ لیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس خاتون کو کھانا کھلایا اور تحائف بھی عطا فرمائے۔

ایک روایت میں ہے: وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ گئی۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو پنیر اور دیگر دیہی اشیاء پیش کیں۔ آپ ﷺ نے بھی اسے لباس اور دیگر تحائف عطا فرمائے اور وہ مسلمان ہوگئی۔ [2] ''الوفاء'' کے مؤلف نے لکھا ہے کہ ام معبد رضی اللہ عنہا اور اس کے خاوند نے ہجرت بھی کی۔ اس کا بھائی خنیس (حبیش) بھی مسلمان ہوگیا۔ اس نے فتح مکہ

[1] السيرة النبوية لابن كثير، ص: 213-215، زاد المعاد: 3/55-57. [2] البداية والنهاية: 3/189,190، دلائل النبوة للبيهقي: 2/492.

کے دن شہادت پائی۔ [1]

کچھ عرصہ بعد دونوں میاں بیوی ہجرت کر کے مدینہ پہنچے اور اسلام لے آئے۔ عبدالملک بن وہب کہتے ہیں کہ مجھے روایت پہنچی ہے کہ ابو معبد نے اسلام قبول کیا اور ہجرت کر کے نبی ﷺ کے پاس پہنچ گئے۔ اسی طرح ام معبد نے بھی ہجرت کی اور نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔

ابو نُعیم اور ابن سعد نے ام معبد سے روایت کیا ہے، وہ فرماتی ہیں: وہ بکری جسے نبی ﷺ نے اپنے دست مبارک سے دوہا تھا، وہ رمادہ کے دور میں (اٹھارہ ہجری) خلافت عمر رضی اللہ عنہ تک ہمارے پاس رہی۔ خشک سالی کے زمانے میں بھی ہم اسے صبح و شام دوبار دوہا کرتے تھے جبکہ اس علاقے کی دوسری بکریوں کے تھنوں میں دودھ کا ایک قطرہ تک نہ ہوتا تھا۔

ہشام بن حبیش کہتے ہیں کہ میں نے اس بکری کو دیکھا ہے۔ ام معبد کے ساتھ جتنے لوگ سکونت پذیر ہوتے تھے، وہ سارے اسی بکری کے دودھ سے کھانا کھاتے تھے۔

اب اس واقعے کا دوسرا پہلو ملاحظہ فرمائیے جس وقت رسول اللہ ﷺ ام معبد کے خیمے میں مختصر پڑاؤ کے لیے رُکے، عین اسی وقت مکہ میں ایک بلند آہنگ آواز سنائی دی مگر آواز دینے والا دکھائی نہ دیا۔ اس آواز کے بول یہ ہیں:

جَزَى اللّٰهُ رَبُّ النَّاسِ خَيْرَ جَزَائِهِ ۔۔۔ رَفِيقَيْنِ حَلَّا خَيْمَتَيْ أُمِّ مَعْبَدِ

هُمَا نَزَلَا بِالْبِرِّ وَارْتَحَلَا بِهِ ۔۔۔ فَأَفْلَحَ مَنْ أَمْسٰى رَفِيقَ مُحَمَّدِ

فَيَا لَقُصَيٍّ مَا زَوَى اللّٰهُ عَنْكُمْ ۔۔۔ بِهِ مِنْ فَعَالٍ لَّا تُجَازٰى وَ سُؤْدَدِ

لِيَهْنِ بَنِي كَعْبٍ مَكَانُ فَتَاتِهِمْ ۔۔۔ وَ مَقْعَدُهَا لِلْمُؤْمِنِينَ بِمَرْصَدِ

سَلُوا أُخْتَكُمْ عَنْ شَاتِهَا وَ إِنَائِهَا ۔۔۔ فَإِنَّكُمْ إِنْ تَسْأَلُوا الشَّاةَ تَشْهَدِ

دَعَاهَا بِشَاةٍ حَائِلٍ فَتَحَلَّبَتْ ۔۔۔ عَلَيْهِ صَرِيحًا ضَرَّةُ الشَّاةِ مُزْبِدِ

فَغَادَرَهَا رَهْنًا لَدَيْهَا لِحَالِبٍ ۔۔۔ يُرَدِّدُهَا فِي مَصْدَرٍ ثُمَّ مَوْرِدِ

”اللہ تعالیٰ، جو سب لوگوں کو پالنے والا ہے ان دونوں رفیقوں کو اپنی جناب سے بہترین جزا عطا فرمائے جو

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 490,486/1، الرحيق المختوم، ص: 485.

ام معبد کے خیمے میں بغرض آرام تشریف لائے۔ وہ دونوں خیر کے ساتھ اترے اور خیر ہی کے ساتھ رخصت ہوئے اور کامیاب وہی ہوا جو محمد ﷺ کا رفیق بنا۔ ہائے، بنوقصی! اللہ تعالیٰ نے جو عزتیں اور سرداریاں اس پیغمبر کی بدولت تم سے سمیٹ لی ہیں، ان کا مداوانہیں ہوسکتا۔ بنوکعب کو ان کی خاتون کی قیام گاہ اور مومنین کی نگہداشت کا پڑاؤ مبارک ہو۔ تم اپنی بہن سے اس کی بکری اور برتن کا حال پوچھو اگر تم اس کی بکری سے پوچھو تو وہ بھی گواہی دے گی۔ انھوں نے ام معبد سے ایک غیر حاملہ بکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے دوہنے کی اجازت مانگی تو بکری کے تھن دودھ سے بھر گئے اور اس نے بڑی کثرت سے دودھ دیا۔ انھوں نے وہ بکری ام معبد کے پاس چھوڑی تاکہ دودھ دوہنے والا بار بار اس کا دودھ دوہتا رہے۔''[1]

سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جب یہ اشعار سنے تو اس کا جواب ان اشعار میں دیا:

لَقَدْ خَابَ قَوْمٌ غَابَ عَنْهُمْ نَبِيُّهُمْ ... وَقُدِّسَ مَنْ يَسْرِي إِلَيْهِمْ وَيَغْتَدِي

تَرَحَّلَ عَنْ قَوْمٍ فَضَلَّتْ عُقُولُهُمْ ... وَحَلَّ عَلٰى قَوْمٍ بِنُورٍ مُجَدَّدِ

هَدَاهُمْ بِهٖ بَعْدَ الضَّلَالَةِ رَبُّهُمْ ... وَأَرْشَدَهُمْ، مَنْ يَّتْبَعِ الْحَقَّ يَرْشَدِ

وَهَلْ يَسْتَوِي ضُلَّالُ قَوْمٍ تَسَفَّهُوا ... عَمًى، وَهُدَاةٌ يَّهْتَدُونَ بِمُهْتَدِ؟

لَقَدْ نَزَلَتْ مِنْهُ عَلٰى أَهْلِ يَثْرِبٍ ... رِكَابُ هُدًى، حَلَّتْ عَلَيْهِمْ بِأَسْعَدِ

نَبِيٌّ يَّرٰى مَالَا يَرَى النَّاسُ حَوْلَهٗ ... وَيَتْلُو كِتَابَ اللّٰهِ فِي كُلِّ مَسْجِدِ

وَإِنْ قَالَ فِي يَوْمٍ مَّقَالَةَ غَائِبٍ ... فَتَصْدِيقُهَا فِي الْيَوْمِ أَوْ فِي ضُحَى الْغَدِ

لِيَهْنِ أَبَا بَكْرٍ سَعَادَةُ جَدِّهٖ ... بِصُحْبَتِهٖ، مَنْ يُّسْعِدِ اللّٰهُ يَسْعَدِ

''وہ قوم خائب وخاسر ہے جس کا نبی اسے چھوڑ کر چلا گیا اور وہ لوگ بڑے خوش قسمت ہیں جن کے پاس وہ دن اور رات کا سفر کر کے پہنچا۔ وہ جس قوم کو چھوڑ گیا، اس کی عقل زائل ہوگئی اور جس کے پاس پہنچا، اُسے نئی روشنی ملی۔ اس کے ذریعے اللہ نے انھیں گمراہی کے بعد ہدایت دی اور سیدھی راہ کی ہدایت دی۔ جو حق کے راستے کو اپناتا ہے، وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ کیا کسی قوم کے گمراہ لوگ جنھوں نے اندھے پن سے حماقت کا ثبوت دیا اور وہ لوگ جنھوں نے ہادی کے ذریعے ہدایت پائی، کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟

[1] المستدرك للحاكم: 10/3، شرح السنة: 264/13.

اس کی سیدھی راہ پانے والی سواریاں اہل یثرب کے پاس آ کر رکیں جو بڑا سعادت مند اور بڑا ہی بابرکت سوار لائیں۔ وہ ہادی نبی ہے۔ وہ ایسی چیز دیکھتا ہے جو آس پاس کے لوگ نہیں دیکھ سکتے۔ وہ مسجدوں اور عبادت گاہوں میں اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتا ہے۔ اور اگر وہ کوئی پوشیدہ بات کہتا ہے تو اس کی تصدیق اسی دن یا دوسرے دن ہوجاتی ہے۔ ابوبکر کو اس کی رفاقت کی سعادت مبارک ہو۔ سعادت مند وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ سعادت عطا فرمائے۔'' [1]

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فراست

ام معبد کے خیمے سے گزرنے کے بعد یہ مقدس قافلہ مہاجرین مدینہ کی طرف رواں دواں تھا۔ راستے میں مختلف راہبوں سے ملاقات ہوتی رہی۔ ہر ایک اپنے اپنے اسلوب کے مطابق پیش آتا تھا۔ ان راہبوں سے گفتگو کرنے کے لیے ابوبکر رضی اللہ عنہ پیش پیش ہوتے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ابوبکر رضی اللہ عنہ ان گزرگاہوں سے خوب واقف تھے۔ لوگ انھیں جانتے تھے جبکہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان گزرگاہوں سے واقف نہ تھے۔ مزید برآں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر کے مقابلے میں نوجوان محسوس ہوتے تھے۔ راستے میں ایک آدمی ملا۔ وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا: اے ابوبکر! یہ آپ کے آگے کون شخص ہے؟ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: یہ میرا ہادی ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''دوران سفر مجھے لوگوں کے سوالات سے بچائے رکھنا کیونکہ کسی نبی کے لیے زیبا نہیں کہ جھوٹ بولے۔'' اس لیے جب کوئی شخص حضرت ابوبکر سے پوچھتا کہ آپ کون ہیں؟ وہ جواب دیتے کہ میں متلاشی (حق) ہوں اور جب پوچھا جاتا: یہ تمھارے ساتھ کون صاحب ہیں؟ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ جواب دیتے: یہ میرے رہبر ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے سفر میں کمال احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں جیسا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک سائل کو جواب دیا تھا: ''یہ آدمی مجھے راستہ دکھاتا ہے۔'' سائل نے یہی سمجھا کہ کوئی سفری رہنما ہے لیکن صدیق رضی اللہ عنہ کا مطلب یہی تھا کہ یہ راہ خیر و برکت کے راہنما ہیں۔ [2] ان کی بدولت دنیا اور آخرت کی فلاح ملتی ہے۔

یوں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یک بیک پیش آنے والے مسائل خوش اسلوبی سے حل کیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ [3] سائل کا جواب دینے میں توریہ (ذو معنی) اشارہ بھی تھا اور اس تربیت کا اثر بھی جو انھوں نے حصول امن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی کیونکہ ہجرت کا معاملہ مکمل طور پر پوشیدہ تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] دیوان حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، ص: 53,52. [2] صحیح البخاري: 3911. [3] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 204.

اس جواب پر معترض نہیں ہوئے۔ [1]

بُریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

بلاشبہ ایسا مسلمان جس کے دل میں اسلام پوری طرح راسخ ہو چکا ہو، وہ لوگوں کو اسلامی دعوت پیش کرنے میں ذرہ بھر کوتاہی نہیں کرتا۔ حالات چاہے کتنے ہی ناسازگار اور پریشان کن ہوں، پھر بھی ایک سچا مسلمان اسلامی دعوت پیش کرنے کے مواقع ڈھونڈ لیتا ہے۔ یہ پیغمبری شیوہ ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پھینک دیا گیا لیکن وہ اس اندھیر نگری میں بھی اپنی ذمہ داری نہیں بھولے۔ وہاں بھی جرائم پیشہ قیدیوں کے آگے دعوتِ توحید پیش کرتے رہے۔ شرک، غیر اللہ سے بیزاری اور کسی بھی مخلوق کے سامنے جھکنے کی ممانعت فرماتے رہے۔ [2]

سورۂ یوسف مکہ میں نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد ﷺ کو حکم دیا کہ وہ دعوتی میدان میں سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کی پیروی کریں، اسی لیے آپ ﷺ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے دوران بھی اپنی ذمہ داری کا پورا احساس کرتے رہے، حالانکہ حالات اتنے دگرگوں تھے کہ آپ کو مکہ سے نکال دیا گیا۔ آپ کا خون رائیگاں قرار دے دیا گیا اور جرائم پیشہ لوگوں کو خطیر انعامات کا لالچ دیا گیا کہ آپ کو زندہ یا مردہ پیش کریں۔ راستے میں آپ ﷺ کو ایک شخص بریدہ بن حصیب اسلمی ملا۔ وہ اپنی قوم کے ساتھ ایک قافلے میں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے اور اس کے قافلے والوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو وہ سب مسلمان ہو گئے۔ یہ اسی کے قریب گھرانے تھے۔ ان کے اسلام لانے کا قصہ یوں ہے:

نبی ﷺ سفرِ ہجرت میں جب غَمِیم کے مقام پر پہنچے تو وہاں بریدہ بن حصیب بن عبداللہ بن حارث اسلمی رضی اللہ عنہ سے ملے۔ بریدہ اپنی قوم کے سردار تھے۔ وہ نکلے تو تھے رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تلاش میں تاکہ قریش کا اعلان کردہ انعام حاصل کرسکیں لیکن جب ان کی آپ ﷺ سے ملاقات ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: «مَنْ أَنْتَ؟» ''تم کون ہو؟'' جواب میں بریدہ نے کہا: میں بریدہ ہوں۔ آپ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا: «بَرَدَ أَمْرُنَا وَصَلُحَ» ''اے ابوبکر! ہمارا کام ٹھنڈا اور درست ہو گیا ہے۔'' پھر پوچھا: ''تمھارا تعلق کس قبیلے سے ہے؟'' بریدہ نے کہا: میں قبیلہ اسلم سے ہوں۔ آپ ﷺ نے اس سے نیک فال لیتے ہوئے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «سَلِمْنَا» ''ہم سلامت رہے۔'' پھر آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: «مِنْ بَنِي مَنْ؟» ''قبیلہ اسلم کی کس شاخ

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 292. [2] دیکھیے یوسف 12:37-40.

سے ہو؟'' بریدہ نے کہا: بنی سہم سے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «خَرَجَ سَهْمُكَ (يَا أَبَا بَكْرٍ!)» ''(اے ابوبکر!) تیرا حصہ نکل آیا۔'' یعنی یہ مسلمان ہو کر تیرا ساتھی بنے گا۔ بریدہ نے پوچھا: آپ کون ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ رَسُولُ اللّٰهِ» ''میں محمد، عبداللہ کا بیٹا اور اللہ کا رسول ہوں۔'' بریدہ اسی وقت پکار اٹھے: أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ ''میں گواہی دیتا ہوں اللہ کے سوا کوئی الٰہ برحق نہیں اور یقیناً محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں۔'' اسلام کا نور صداقت ان کے سینے میں اترتا چلا گیا، چنانچہ وہ مسلمان ہو گئے اور ان کے ساتھ ان کی قوم کے ستر یا اسی گھرانے بھی مسلمان ہو گئے۔ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ نے رات رسول اللہ ﷺ ہی کی معیت میں بسر کی۔ صبح ہوئی تو سیدنا بریدہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! آپ جب مدینہ میں داخل ہوں تو آپ کے پاس اپنا جھنڈا ضرور ہونا چاہیے، پھر انھوں نے اپنی پگڑی ایک نیزے سے باندھی اور آپ ﷺ کے آگے آگے چلنا شروع کر دیا۔ جس وقت آپ مدینہ پہنچے، بریدہ رضی اللہ عنہ جھنڈا لیے ہوئے آپ کے آگے آگے چل رہے تھے۔[1]

مسلمان ہونے کے بعد بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ داعیان اسلام میں شامل ہو گئے۔ ان کی قوم پر ہدایت کے راستے کھل گئے۔ وہ پکے مسلمان بنے اور ایسا نبوی منہج اختیار کیا جو ساری انسانیت کے لیے مشعل راہ ہے۔ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ احد کے بعد مدینہ طیبہ منتقل ہو گئے اور انھوں نے تقریباً سولہ غزوات میں شرکت کی۔[2]

اسلم قبیلے کی شان و منقبت کے بارے میں سیدنا ابوہریرہ اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أَسْلَمُ، سَالَمَهَا اللّٰهُ، وَ غِفَارُ غَفَرَ اللّٰهُ لَهَا، أَمَا إِنِّي لَمْ أَقُلْهَا وَ لٰكِنْ قَالَهَا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ»

''قبیلۂ اسلم کو اللہ سلامت رکھے اور قبیلہ غفار کو اللہ بخش دے۔ (یہ دعا کر کے آپ ﷺ نے فرمایا کہ) یہ الفاظ میں نے اپنی مرضی سے نہیں کہے بلکہ اللہ کے حکم سے کہے ہیں۔''[3]

نبی ﷺ کی خدمت میں اوس بن حجر اسلمی کا تحفہ

نبی ﷺ دارالہجرت کی طرف رواں دواں تھے۔ جب یہ مقدس قافلہ جُحْفَہ پہنچا تو کچھ اونٹ چرتے نظر

---

[1] أسد الغابة: 204،203/1، الرحيق المختوم، ص: 190، سبل الهدٰى والرشاد: 252/3، السيرة النبوية للمهدي: 335-333/1. دیگر محدثین نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے، ان سب کی سندیں ضعیف ہیں۔ [2] الإصابة: 418/1، السيرة النبوية للصلابي: 488/1. [3] صحيح البخاري: 3514،3513، صحيح مسلم: 2516،2515.

آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: «لِمَنْ هٰذِهِ الْإِبِلُ؟» ''یہ اونٹ کس کے ہیں؟'' جواب ملا: بنو اسلم کے ایک شخص کے ہیں۔ آپ ﷺ نے نیک فال لیتے ہوئے فرمایا: «سَلِمْتَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ» ''ابوبکر! اللہ نے چاہا تو تم سلامت رہو گے۔'' پھر آپ ﷺ نے چرواہے سے نام دریافت فرمایا۔ وہ کہنے لگا: مسعود (خوش نصیب)۔ آپ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «سَعِدْتَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ» ''ابوبکر! اللہ نے چاہا تو تم خوش بخت رہو گے۔'' [1]

جُحفہ کے مقام پر میقات کا منظر

ایک دوسری روایت ہے کہ اوس بن عبداللہ بن حجر اسلمی رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر کو جُحْفَہ اور ھَرْشٰی کے درمیان مقام حدوات پر ملا تھا، اس وقت رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر دونوں ایک ہی اونٹنی پر سوار مدینہ کی جانب محوِ سفر تھے۔ اس نے آپ ﷺ کو اپنا بہترین اونٹ ''رداء'' سواری کے لیے پیش کیا، آپ ﷺ کے ساتھ اپنے غلام مسعود کو بھیجا اور تاکید کی کہ ان کی راہنمائی کرو، انھیں ٹھیک ٹھیک راستے پر لے جاؤ اور جب تک یہ منزل مقصود پر نہ پہنچیں ان کے ساتھ رہو، چنانچہ وہ غلام آپ کو مدینہ منورہ پہنچا کر ہی واپس گیا۔ واپسی کے وقت رسول اللہ ﷺ نے اسے تاکید کی: ''اپنے آقا سے کہنا کہ اپنے اونٹوں کی گردنوں پر شناختی نشان لگائیں۔'' [2]

دو چور مسلمان ہو گئے

عبداللہ بن امام احمد نقل کرتے ہیں: عبادل کا آزاد کردہ غلام فائد بتاتا ہے کہ میں ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ابی ربیعہ کی معیت میں سفر پر نکلا۔ ابراہیم بن عبدالرحمٰن نے سعد کے بیٹے عبدالرحمٰن کی طرف پیغام بھیجا۔ جب ہم

سفرِ ہجرت میں آنے والی وادی العرج

عَرْج کے مقام پر پہنچے تو سعد کا بیٹا عبدالرحمٰن بھی وہاں پہنچ گیا۔ یہ سعد وہی شخص ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کو ہجرت مدینہ کے دوران ''رکوبہ'' کا راستہ بتایا تھا۔ ابراہیم نے عبدالرحمٰن بن سعد سے کہا کہ آپ کے والد نے آپ کو کیا بات بتائی تھی؟ عبدالرحمٰن نے کہا: میرے والد نے مجھے

بتایا کہ رسول اللہ ﷺ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ میرے پاس آئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک بیٹی رضاعت کے لیے ہمارے پاس تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی طرف مختصر راستے

[1] البداية والنهاية (محقق): 456/3. [2] الاستيعاب، ص: 95، الإصابة: 304/1، السيرة النبوية للمهدي: 334,333/1.

پر سفر کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ سعد نے عرض کی: آپ ثنیۃ الغائر کے راستے سے تشریف لے جائیں جو رکوبہ کے پاس سے گزرتا ہے۔ وہاں بنو اسلم قبیلے کے دو چور رہتے ہیں۔ انھیں المہانان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو ہم آپ کو ان کے پاس لے چلتے ہیں (تاکہ آپ ان کے روبرو اسلام پیش کرسکیں۔) نبی ﷺ نے فرمایا: «خُذْبِنَا عَلَيْهِمَا» ''ہاں، ہمیں ان کے پاس لے چلو۔'' سعد کہتے ہیں: ہم چلے اور ان کے پاس پہنچے۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہنے لگا: یہ یمنی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں بلایا اور اسلام کی دعوت دی تو وہ دونوں مسلمان ہوگئے۔ آپ ﷺ نے ان سے ان کے نام دریافت کیے تو انھوں نے کہا: ''ہمارا نام مہانان، یعنی ذلیل ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «بَلْ أَنْتُمَا الْمُكْرَمَانِ» ''نہیں! بلکہ تمھارا نام مکرمان، یعنی عزت والے ہے۔'' پھر آپ ﷺ نے انھیں مدینہ آنے کی دعوت دی۔ [1]

اس واقعے سے اس زبردست حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ آپ ﷺ کو ہر آن ہر گھڑی دعوتِ حق دینے کی کتنی لگن رہتی تھی۔ آپ ﷺ نے موقع غنیمت جانتے ہی دونوں چوروں کو اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہوگئے۔ چور جیسے لوگوں کا اسلام قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اگر خلوص اور سچائی سے دعوتِ حق دی جائے تو لوگ اسے جلد قبول کر لیتے ہیں۔ ان دونوں کے نام تبدیل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ مسلمانوں کی نیک نامی اور ان کے جذبات و احساسات کا خاص خیال رکھتے تھے تاکہ ان کی عزت افزائی ہو اور ان کا مورال بلند ہو۔ جب کسی فرد کو احساس کمتری سے نجات دلا دی جائے تو اس کی شخصیت مضبوط ہوجاتی ہے اور وہ مزید ترقی کے لیے اپنی ساری قوت خیر وفلاح کے کاموں میں صرف کردیتا ہے۔ [2]

چرواہا بے اختیار مسلمان ہوگیا

قیس بن نعمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: جب نبی ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ چھپ چھپا کر مدینہ جارہے تھے۔ اس موقع پر یہ مختصر سا قافلہ ایک چرواہے کے قریب سے گزرا۔ وہ بکریاں چرارہا تھا۔ اس قافلے نے اس سے دودھ مانگا۔ اس نے کہا: میرے پاس ایسی کوئی بکری نہیں جو دودھ دیتی ہو، البتہ یہ ایک جوان بھیڑ ہے جو سردیوں کے آغاز میں حاملہ ہوئی تھی مگر اس کا بچہ ضائع ہوگیا ہے اور اِس کے تھنوں میں دودھ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسے ہی لے آؤ۔'' وہ لے آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے تھنوں کو ہاتھ لگا کر دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے خشک تھنوں کو دودھ سے لبریز کردیا۔ نبی ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اسے دوہا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک برتن لے

[1] [ضعيف] مسند أحمد: 74/4، البداية والنهاية (محقق): 463/3. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 178/3.

آئے۔ آپ ﷺ نے پہلے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دودھ پلایا۔ جب وہ سیر ہو گئے تو دوبارہ دودھ دوہا۔ اس مرتبہ اس چرواہے کو دودھ پلایا۔ تیسری مرتبہ دوہا تو خود نوش فرمایا۔ چرواہا یہ منظر دیکھ کر ہکا بکا ہو گیا۔ اُس نے ناکارہ بھیڑ کے خشک تھنوں سے اتنا وافر دودھ نکلتے دیکھا تو حیرت میں ڈوب گیا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اللہ کے لیے مجھے یہ بتائیے کہ آپ کون ہیں؟ میں نے آج تک آپ جیسا شخص نہیں دیکھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''پہلے یہ وعدہ کرو کہ ہمارا تذکرہ کسی سے نہیں کرو گے۔'' اس نے کہا: بالکل ایسا ہی ہوگا، میں آپ کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «فَإِنِّي مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ» ''میں اللہ کا رسول محمد ہوں۔'' چرواہا کہنے لگا: اچھا! تو آپ وہی ہیں جن کے بارے میں قریش نے کہا ہے کہ آپ نے اپنا آبائی دین ترک کر دیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! وہ لوگ اسی طرح کی باتیں کرتے ہیں۔'' چرواہا کہنے لگا:

فَأَشْهَدُ أَنَّكَ نَبِيٌّ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مَا جِئْتَ بِهِ حَقٌّ، وَأَنَّهُ لَا يَفْعَلُ مَا فَعَلْتَ إِلَّا نَبِيٌّ، وَأَنَا مُتَّبِعُكَ.

''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نبی ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ جو دین لے کر تشریف لائے ہیں، وہ برحق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح کا عمل آپ نے ابھی کیا ہے، یہ صرف ایک نبی ہی کر سکتا ہے۔ میں بھی آپ کا پیروکار اور اطاعت گزار ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابھی تم صبر کرو، موجودہ حالات و حوادث کا تم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جب تمھیں یہ اطلاع ملے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے غلبہ عطا فرما دیا ہے، اس وقت ہمارے پاس آ جانا۔''[1]

زبیر اور طلحہ رضی اللہ عنہما کی طرف سے بارگاہِ نبوت میں تحائف

امام بخاری رحمہ اللہ نے ہجرت کی حدیث امام زہری سے معلق بیان کرتے ہوئے عروہ بن زبیر رحمہ اللہ سے روایت کی ہے:

أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ لَقِيَ الزُّبَيْرَ فِي رَكْبٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ كَانُوا تِجَارًا قَافِلِينَ مِنَ الشَّامِ، فَكَسَا الزُّبَيْرُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ وَأَبَا بَكْرٍ ثِيَابَ بَيَاضٍ.

''رسول اللہ ﷺ سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ سے ملے جو مسلمانوں کے ایک تجارتی قافلے میں شامل تھے۔ یہ لوگ شام سے واپس آ رہے تھے۔ سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سفید کپڑوں کا تحفہ دیا۔''[2]

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 497/2. [2] صحيح البخاري: 3906.

اسی سیاق میں امام موسیٰ بن عُقبہ رحمہ اللہ نے امام زہری سے یہ روایت ذکر کی تو اس میں یہ اضافہ بھی کیا ہے:

وَيُقَالُ: لَمَّا دَنَا مِنَ الْمَدِينَةِ، كَانَ طَلْحَةُ قَدِمَ مِنَ الشَّامِ، فَخَرَجَ عَائِدًا إِلَى مَكَّةَ إِمَّا مُتَلَقِّيًا وَّ إِمَّا مُعْتَمِرًا، وَمَعَهُ ثِيَابٌ أَهْدَاهَا لِأَبِي بَكْرٍ مِّنْ ثِيَابِ الشَّامِ، فَلَمَّا لَقِيَهُ أَعْطَاهُ، فَلَبِسَ مِنْهَا هُوَ وَأَبُو بَكْرٍ.

''کہا جاتا ہے: جب (رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ) مدینہ منورہ کے قریب پہنچے تو سیدنا طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ شام سے واپس تشریف لائے تھے۔ وہ مکہ مکرمہ جا رہے تھے۔ ان کا ارادہ یا تو رسول اللہ ﷺ کے استقبال کا تھا یا پھر وہ عمرے کے لیے جا رہے تھے۔ ان کے پاس شام کے بنے ہوئے کچھ کپڑے تھے جو وہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تحفہ میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ جب ان کی ملاقات رسول اللہ ﷺ سے ہوئی تو انھوں نے وہ کپڑے آپ ﷺ کو پیش کیے۔ پھر رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وہ کپڑے زیب تن فرما لیے۔''[1]

اس روایت میں سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے بعض سیرت نگاروں نے صحیح بخاری کی روایت کو مرجوح قرار دیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کا رد کرتے ہوئے دونوں روایات میں تطبیق دی ہے، وہ لکھتے ہیں: ''اگر یہ (سیدنا طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کا ذکر) محفوظ ہے تو ممکن ہے کہ طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما دونوں نے کپڑوں کا تحفہ رسولِ اکرم ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا ہو۔ سیرت کی اکثر کتب میں سیدنا طلحہ بن عبیداللہ ہی کا ذکر ہے۔ علامہ دمیاطی چونکہ سیرت کی روایات کو صحیح بخاری کی روایات کے مقابلے میں قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں، اس لیے انھوں نے سیدنا طلحہ بن عبیداللہ کے ذکر کو راجح قرار دیا ہے۔

بہتر یہ ہے کہ دونوں میں تطبیق ہی کی جائے ورنہ جو صحیح بخاری میں ہے، وہی معتبر ہے کیونکہ جس روایت میں طلحہ رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے وہ ابن لهيعة عن أبي الأسود عن عروة کی سند سے مروی ہے جبکہ صحیح بخاری والی روایت عَقِيل عَنِ الزُّهْرِي عَنْ عُرْوَةَ کی سند سے ہے (اور یہ سند معتبر ہے)، پھر مجھے امام ابنِ ابی شیبہ رحمہ اللہ کے ہاں یہی روایت هشام بن عروة عن أبيه کی سند سے بھی مل گئی جو کہ بعینہٖ ابوالاسود کی روایت کی طرح ہے، نیز ابنِ عائذ نے مغازی میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں یہ الفاظ بیان کیے ہیں: عمر، زبیر، عثمان اور عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ کی جانب روانہ ہوئے اور عثمان اور طلحہ رضی اللہ عنہما شام کی طرف گئے۔ اس طریقے سے دونوں

[1] المغازي لموسٰى بن عقبة، ص: 110، دلائل النبوة للبيهقي: 498/2، فتح الباري: 303/7، واللفظ له.

روایات صحیح قرار پاتی ہیں۔“ [1]

بالکل یہی موقف علامہ حلبی اور علامہ صالحی شامی نے اپنایا ہے۔ [2] اگرچہ زیادہ تر سیرت نگاروں نے تاریخی اعتبار سے اس واقعے کو مدینہ منورہ میں تشریف آوری سے متصل پہلے ذکر کیا ہے، البتہ امام ابن حبان ؒ کی رائے میں یہ واقعہ ام معبد سے ملاقات سے پہلے کا ہے۔ [3]

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ آمد اور یہودی کی پکار

جس دن سے قبا کے مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کے مکہ مکرمہ سے نکلنے کے بارے میں سنا تھا، اسی دن سے وہ صبح کی نماز پڑھتے ہی حرّہ کی طرف نکل کر آپ ﷺ کا انتظار کرتے۔ جب دھوپ تمام سائے ختم کر دیتی اور سورج کی گرمی اُن کو ستانے لگتی تو واپس چلے آتے۔ یہ موسم بھی سخت گرمی کا تھا۔ عرب کے صحراؤں کی گرم لُو جسم کو جھلسا کر رکھ دیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عرب لوگ صحراؤں کو عبور کرنے کے لیے رات کے وقت سفر کرتے تھے تاکہ سورج بلند ہونے سے پہلے پہلے اپنی منزل تک پہنچ جائیں۔ اگر ایسا ممکن دکھائی نہ دیتا تو پھر کسی سائے دار درخت کے نیچے دوپہر گزارتے اور دن ڈھلنے کے وقت دوبارہ عازمِ سفر ہوتے۔ اسی صورتِ حال کی وجہ سے مدینہ منورہ کے انصار صبح سویرے استقبال کے لیے جمع ہو جاتے اور آپ ﷺ کی آمد کا متوقع وقت گزر جانے کے بعد گھروں کو واپس چلے جاتے۔ روزانہ کا یہی معمول تھا۔ ایک دن اسی طرح انتظار کرنے کے بعد ابھی مسلمان اپنے گھروں کو لوٹے ہی تھے کہ ایک یہودی اپنے کسی کام سے ایک ٹیلے پر چڑھا۔ اس نے دیکھا کہ دُور دراز سرابِ صحرا کو چیرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی سفید کپڑوں میں ملبوس آ رہے ہیں۔ وہ بے خود ہو گیا۔ اسے اپنے آپ پر ضبط نہ رہا۔ وہ بآوازِ بلند بے ساختہ انداز سے پکار اُٹھا: يَا مَعَاشِرَ الْعَرَبِ! هٰذَا جَدُّكُمُ الَّذِي تَنْتَظِرُونَ. ”اے عرب کی جماعتو! یہ رہا تمھارا نصیب جس کے تم منتظر تھے۔“ مسلمانوں نے فوراً اپنا اسلحہ پکڑا اور آپ ﷺ کے استقبال کے لیے دوڑ پڑے۔ وہ حرّہ کے دامن میں رسول اللہ ﷺ سے جا ملے۔ [4]

مدینہ کے جنوب میں حرہ قباء

ابن اسحاق ؒ کے مطابق صحابہ کرام کا بیان ہے: ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی طرف دوڑ پڑے۔ آپ ﷺ اُس وقت ایک کھجور کے سائے میں بیٹھے تھے۔ ابوبکر ؓ بھی آپ کے ساتھ تھے اور آپ ﷺ کے ہم عمر محسوس

[1] فتح الباري لابن حجر: 7/304,303. [2] السيرة الحلبية: 2/232,231، سبل الهدى والرشاد: 3/250. [3] الثقات لابن حبان التميمي: 1/47. [4] صحيح البخاري: 3906.

ہوتے تھے۔ ہم میں سے اکثر لوگوں نے اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا نہیں تھا۔ لوگ آپ ﷺ کے اردگرد جمع ہو گئے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کون ہیں اور ابوبکر کون؟ یہاں تک کہ درخت کا سایہ آپ کے سر سے ڈھل گیا۔ ابوبکر ؓ اُٹھے اور آپ کے سر پر اپنی چادر سے سایہ کرنے لگے، تب ہم نے آپ ﷺ کو پہچانا۔ [1]

قباء میں قیام

جس بستی میں رسول اللہ ﷺ نے قیام فرمایا، اس کا نام قباء تھا۔ یہ مدینہ منورہ کے قریب ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ یہاں عمرو بن عوف کا قبیلہ آباد تھا۔ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی میزبانی کا شرف انھی لوگوں کو حاصل ہوا۔ قبیلہ عمرو بن عوف کے ایک سردار کلثوم بن ہدم کے گھر میں آپ ﷺ نے قیام فرمایا۔ کلثوم بن ہدم کی کنیت ابوقیس تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے مدینہ پہنچنے کے تھوڑا عرصہ بعد کلثوم بن ہدم ؓ فوت ہو گئے تھے۔ [2] بعض نے کہا ہے کہ آپ ﷺ سعد بن خیثمہ ؓ کے گھر رہائش پذیر رہے۔ کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے رہائش کلثوم بن ہدم ؓ کے گھر میں رکھی اور جب لوگ ملاقات کے لیے جمع ہو جاتے تو سیدنا سعد کے گھر تشریف لے جاتے۔ سعد ؓ کے بیوی بچے نہ تھے، اس لیے ان کے گھر میں بے تکلفی سے سب آجا سکتے تھے۔ ان کے گھر کو بیت العُزّاب کے نام سے بھی جانا جاتا تھا کیونکہ تمام مہاجرین جو اہل و عیال کے بغیر تھے، انھی کے گھر میں قیام پذیر ہوئے۔

حضرت ابوبکر ؓ خبیب بن اساف ؓ کے گھر میں قیام پذیر ہوئے۔ خبیب ؓ، بنو حارث بن خزرج کے خاندان سے تھے۔ ان کی سکونت قبا کے نواح میں ایک بستی السُّنْح میں تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ ابوبکر ؓ خارجہ بن زید بن ابی زہیر کے ہاں قیام پذیر رہے۔ [3]

السنح (مدینہ منورہ) کا ایک قدیم مکان

ابن اسحاق ؒ کہتے ہیں کہ علی بن ابی طالب ؓ نبی کریم ﷺ کے مکہ سے نکلنے کے بعد وہاں تین دن اور تین راتیں رہے۔ سیدنا علی ؓ کے پاس نبی ﷺ کی دی ہوئی لوگوں کی امانتیں تھیں۔ آپ ﷺ نے انھیں اس غرض سے مکہ چھوڑا تھا کہ وہ لوگوں کی تمام امانتیں لوٹا کر آئیں۔ جب انھوں نے تمام امانتیں ان کے مالکوں کو لوٹا دیں تو وہ ہجرت کر کے

[1] السيرة النبوية لابن كثير، ص: 215. [2] الروض الأنف: 331/2. [3] السيرة النبوية لابن كثير، ص: 216,215.

آپ ﷺ سے قباء میں آ ملے۔ انھوں نے بھی کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ کے گھر میں آپ ﷺ کے ساتھ قیام کیا۔[1]

جندب بن ضمرہ رضی اللہ عنہ کی ہجرت اور تنعیم میں وفات

جندب بن ضمرہ لیثی رضی اللہ عنہ صاحب مال اور چار بیٹوں کے باپ تھے۔ انھیں جب خبر ہوئی کہ نبی کریم ﷺ ہجرت کر گئے ہیں تو سوچا کہ اب مکہ میں رُکے رہنے کے لیے میرے پاس کوئی عذر نہیں رہا، حالانکہ وہ اس وقت کمزور تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ وہ انھیں مکہ سے نکال کر دارالہجرت مدینہ کی راہ پر ڈال دیں۔ جب وہ تنعیم پہنچے تو ان کا انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں قرآن نازل فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ ﴾ (النساء 4:100)

''اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے کی خاطر اپنے گھر سے نکلے، پھر اسے راستے میں موت آ جائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا۔''[2]

مکہ میں باقی ماندہ مسلمانوں نے، جو سفر کی طاقت رکھتے تھے، یہ بات سنی تو وہ سب نکل پڑے۔ ابوسفیان مشرکوں کی ایک جماعت کے ساتھ انھیں گرفتار کرنے کے لیے نکلا۔ وہ انھیں پکڑ کر واپس لے آیا اور سب کو پابند سلاسل کر دیا۔ ان میں سے کئی لوگ اس ابتلاء و آزمائش سے مغلوب ہو گئے۔[3]

مسجد قباء کی تعمیر

ابن ابی خیثمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے مسجد قباء کی بنیاد رکھی۔ سب سے پہلے آپ ﷺ نے قبلے کی جانب ایک پتھر رکھا، پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک پتھر لائے اور رسول اللہ ﷺ کے پتھر کے ساتھ رکھ دیا، پھر عمر رضی اللہ عنہ ایک پتھر لائے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پتھر کے پہلو میں رکھ دیا۔ اس کے بعد لوگ تعمیر میں شریک ہو گئے۔[4]

سیدہ شموس بنت نعمان رضی اللہ عنہا مسجد قباء کی تعمیر کے بارے میں فرماتی ہیں: میں نے وہ وقت دیکھا جب نبی ﷺ قباء میں تشریف لائے اور یہاں اقامت فرمائی اور مسجد تعمیر کی۔ جب مسجد تعمیر ہو رہی تھی تو میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ خود پتھر اٹھاتے تھے اور اس پتھر سے گرنے والی مٹی حضور کے چمکتے ہوئے شکم مبارک پر پڑتی تھی۔ نبی ﷺ کی خدمت میں کوئی صحابی حاضر ہوتا اور عرض کرتا: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان! یہ پتھر مجھے عطا

[1] السيرة النبوية لابن كثير، ص: 216. [2] أسد الغابة: 1/346، الإصابة: 1/618. [3] المستدرك للحاكم: 3/10,9. [4] دلائل النبوة للبيهقي: 2/553، الروض الأنف: 2/332، واللفظ له.

فرمائیے، میں آپ کی طرف سے اٹھا کر لے جاؤں۔ آپ ﷺ انھیں فرماتے: «لَا، خُذْ مِثْلَهُ» ''اسے رہنے دو، تم اس جیسا کوئی اور پتھر اٹھا کر لے جاؤ۔'' یہاں تک کہ مسجد پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہ مسجد ایک ایسے میدان میں تعمیر کی گئی جہاں پہلے کھجوریں خشک کی جاتی تھیں اور یہ زمین کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ کی ملکیت تھی۔ انھوں نے زمین کا یہ ٹکڑا مسجد کی تعمیر کے لیے حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔[1]

مسجد قباء کی فضیلت

ہجرت نبوی کے بعد تعمیر ہونے والی یہ سب سے پہلی مسجد تھی جو نبی ﷺ نے تعمیر کرائی اور بنفس نفیس اس کی تعمیر میں شامل ہوئے۔ یہی اسلام کی وہ پہلی مسجد ہے جس میں آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کی نماز میں علانیہ امامت فرمائی۔[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مسجد قباء اسلام کی وہ اولین مسجد تھی جو ملتِ اسلامیہ کے عام لوگوں کے لیے بنائی گئی۔ اسے اولیت کا درجہ دینے سے ہمارا مقصود اسے اس مسجد سے ممیّز کرنا ہے جو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ میں اپنے گھر کے دروازے کے پاس بنائی تھی، جس میں وہ اکیلے نماز پڑھتے اور عبادت کرتے تھے کیونکہ یہ مسجد انھوں نے صرف اپنے لیے بنائی تھی۔ اس کا عام لوگوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ واللہ اعلم۔[3]

[1] الروض الأنف :332/2، سبل الهدٰی والرشاد :268/3. [2] جامع الآثار لابن ناصر الدين الدمشقي :277/5. [3] السيرة النبوية لابن كثير، ص :220.

مسجد قباء

مسجد قباء کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے بڑے فضائل بیان فرمائے ہیں۔ اسے خیر و بھلائی سے تعبیر فرمایا ہے، نیز اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی سورۂ توبہ میں بڑے تعریفی کلمات بیان فرمائے ہیں، ارشاد باری ہے:

﴿ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ﴾

''البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول روز ہی سے تقوے پر رکھی گئی ہے، اس بات کی زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔''[1]

اس سلسلے میں صحیح موقف بھی یہی ہے کہ اس آیت میں مذکورہ مسجد سے مراد مسجدِ قباء ہی ہے۔ اِس آیت کے ظاہری معنی بھی یہی ہیں۔ تاہم اس بارے میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ جب انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے مسجد قباء اور مسجد نبوی کے مدارج فضیلت دریافت کیے تو آپ ﷺ نے فضیلت کے اعتبار سے مسجد نبوی کو افضل قرار دیا۔

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے گھر گیا اور پوچھا: اے اللہ کے رسول! مسجد قباء اور مسجد نبوی میں سے کون سی مسجد کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی؟ رسول اللہ ﷺ نے اپنی مٹھی میں کنکریاں اُٹھائیں اور انھیں زمین پر دے مارا، پھر فرمایا: «هُوَ مَسْجِدُكُمْ هٰذَا» ''وہ تو تمھاری یہی مسجد ہے۔'' اس سے آپ کی مراد مسجد نبوی تھی۔[2]

مسند احمد اور جامع ترمذی کے الفاظ یہ ہیں: دو آدمیوں میں اس امر پر اختلاف ہوگیا کہ وہ مسجد کون سی ہے جس کی بنیاد اول روز ہی سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے؟ ایک صاحب کہنے لگے: وہ مسجدِ قباء ہے جبکہ دوسرے صاحب کا کہنا تھا: وہ رسول اللہ ﷺ کی مسجد ہے، پھر وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کے بارے میں وضاحت چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «هُوَ مَسْجِدِي هٰذَا» ''وہ یہی میری مسجد ہے۔''[3]

امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: یہ سوال ان لوگوں کی طرف سے کیا گیا تھا جنھوں نے مسجد قباء اور مسجد نبوی کے درمیان اس بنا پر مساوات قائم کر دی کہ دونوں مسجدوں کی بنیاد خود نبی مکرم ﷺ نے اپنے دست مبارک ہی سے رکھی ہے، اسی بنا پر آپ سے اس وضاحت کی درخواست کی گئی کہ متذکرہ آیت کریمہ سے مراد کون سی مسجد ہے؟ اس کا آپ نے جواب مرحمت فرمایا کہ ''وہ میری مسجد ہے۔''

جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال کے جواب میں خود نبی ﷺ نے یہ فرما دیا کہ مسجد نبوی ہی وہ مسجد ہے جس کی

[1] التوبة 9:108. [2] صحيح مسلم: 1398. [3] جامع الترمذي: 3099، مسند أحمد: 3/23.

تعمیر مسجد قباء کا پس منظر

بنیاد تقویٰ پر ہے، تو پھر سے مسجد قباء کی خصوصیتِ تقویٰ کے بارے میں جو اشکال پیدا ہوگیا تھا، وہ رفع ہوگیا۔

امام داودی وغیرہ کا کہنا ہے: اس میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ دونوں مسجدیں تقویٰ ہی پر تعمیر ہوئی ہیں۔ امام سہیلی رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے، البتہ دیگر علماء نے یہ اضافہ کیا ہے کہ ﴿مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ﴾ کا قدرتی تقاضا ہے کہ اس سے مراد مسجد قباء ہے کیونکہ اسی مسجد کی بنیاد پہلے ہی دن اس وقت رکھی گئی تھی جب رسول کریم ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تھے۔[1]

مذکورہ آیت کے بقیہ حصے پر غور کیا جائے تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ آیت مقدسہ مسجد قباء اور اہل قباء ہی کے بارے میں نازل ہوئی، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾ (التوبۃ 108:9)

”اس میں ایسے لوگ ہیں جو اچھی طرح پاک ہونا پسند کرتے ہیں۔“

اس حصے سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اس سے مراد مسجد قباء ہے۔ سنن ابی داود میں صحیح سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی مکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”آیت: ﴿فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا﴾ اہل قباء کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔“

حضرت جابر بن عبداللہ، ابوایوب اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں، جب مذکورہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ! إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَثْنٰى عَلَيْكُمْ فِي الطُّهُورِ، فَمَا طُهُورُكُمْ؟»

”اے انصار کی جماعت! تمھاری صفائی کس طریقے کی ہوتی ہے جس کی وجہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمھاری تعریف فرمائی ہے؟“

بنی عمرو کہنے لگے: ہم بول و براز کے بعد مٹی کے ڈھیلے استعمال کرتے ہیں اور اس کے بعد مزید پاکیزگی کے

[1] مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: الروض الأنف:2/333,332، فتح الباري :7/307,306، جامع الآثار لابن ناصرالدين الدمشقي (حاشیہ):5/277.

لیے پانی سے طہارت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «هُوَ ذٰلِكَ، فَعَلَيْكُمُوهُ» ''یہی وجہ ہے (جس کی بنا پر اللہ تمھاری تعریف کر رہا ہے) چنانچہ تم اس پر کاربند رہو۔''[1] جب مسجد قباء پہلے دن سے تقویٰ کی بنیاد پر تعمیر ہوئی تو مسجد نبوی کے کیا کہنے! وہ تو بالاولیٰ تقویٰ ہی پر تعمیر ہوئی ہے۔[2]

مسجد قباء میں نماز پڑھنے کا ثواب عمرے کے برابر ہے

صحیحین میں ہے کہ نبی ﷺ مسجد قباء تشریف لاتے اور اس میں دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: نبی ﷺ سواری پر اور کبھی پیدل مسجد قباء تشریف لاتے تھے اور اس میں دو رکعات نوافل ادا کرتے تھے۔[3]

فضیلت مسجد قباء

سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِ قُبَاءٍ كَعُمْرَةٍ»

''مسجد قباء میں نماز پڑھنا عمرہ ادا کرنے کے مانند ہے۔''[4]

سہل بن حُنَیف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ تَطَهَّرَ فِي بَيْتِهِ ثُمَّ أَتَى مَسْجِدَ قُبَاءٍ فَصَلَّى فِيهِ صَلَاةً كَانَ لَهُ كَأَجْرِ عُمْرَةٍ»

''جس شخص نے اپنے گھر میں وضو کیا، پھر وہ مسجد قباء آیا اور اس نے یہاں نماز پڑھی، اس کو عمرہ ادا کرنے جیسا ثواب ملے گا۔''[5]

قباء میں قیام کی مدت

صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور عروہ بن زبیر رحمہ اللہ سے مروی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ماہِ ربیع الاول میں سوموار کے دن مدینہ کے بالائی علاقے میں بنی عمرو بن عوف کے پاس تشریف فرما ہوئے۔ آپ ﷺ ان کے پاس چودہ راتیں رہے اور وہ مسجد تعمیر کی جس کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ آپ ﷺ نے اس میں نماز پڑھی، پھر اپنی سواری پر سوار ہوئے اور لوگ آپ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے یہاں تک کہ مدینہ آکر مسجد رسول کے پاس اونٹنی بیٹھ گئی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مدینہ منورہ آنے سے پہلے نبی ﷺ عمرو بن عوف کے ہاں ٹھہرے اور یہ قباء کی

[1] جامع الترمذي: 3099، مسند أحمد: 3/91,89,8 و 5/116 و 331، سنن ابن ماجه: 355. [2] الروض الأنف: 2/333,332.
[3] صحيح البخاري: 1191، صحيح مسلم: 1399 [4] سنن ابن ماجه: 1411. [5] سنن ابن ماجه: 1412.

بستی تھی۔ وہاں آپ ﷺ کا قیام بائیس راتیں رہا۔ بعض نے اٹھارہ راتوں اور بعض نے دس راتوں کا ذکر کیا ہے۔ موسیٰ بن عقبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ قباء میں تین راتیں قیام پذیر رہے۔ لیکن سب سے زیادہ مشہور وہی ہے جسے ابن اسحاق رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ نبی ﷺ پیر کے روز سے جمعہ کے روز تک قیام پذیر رہے۔ [1]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھی جب اہلِ مدینہ کے سامنے پہنچے تو تمام اہلِ مدینہ یکبارگی نکل پڑے یہاں تک کہ جوان لڑکیاں چھتوں کے اوپر سے آپ کو دیکھ کر پوچھنے لگیں: ان میں رسول اللہ ﷺ کون ہیں، ہم نے اس سے پہلے ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ [2]

ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ ہجرت میں ہے کہ جب ہم لوگ مدینہ آئے تو لوگ راستوں اور چھتوں پر نکل آئے اور غلام اور نوکر چاکر کہنے لگے: رسول اللہ آ گئے، محمد آ گئے، اللہ اکبر، محمد آ گئے، رسول اللہ آ گئے اور جب صبح ہوئی تو جہاں جانے کا اللہ کی طرف سے حکم تھا، وہاں چلے گئے۔ [3]

امام بیہقی رحمہ اللہ نے عبیداللہ ابن عائشہ سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو عورتیں اور بچے کہنے لگے:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِ
أَيُّهَا الْمَبْعُوثُ فِينَا جِئْتَ بِالْأَمْرِ الْمُطَاعِ

”ہمارے اوپر ثنیۃ الوداع کی اوٹ سے چودھویں کا روشن چاند طلوع ہوا ہے۔ اس احسانِ عظیم پر اللہ کا شکر

[1] السيرة النبوية لابن كثير، ص: 220. [2] البداية والنهاية: 195/3. [3] دلائل النبوة للبيهقي: 506/2، المستدرك للحاكم: 13,12/3، مزید دیکھیے: صحيح البخاري: 3652، صحيح مسلم: 2009، فتح الباري: 326/7.

ثنیۃ الوداع سے منسوب مقام
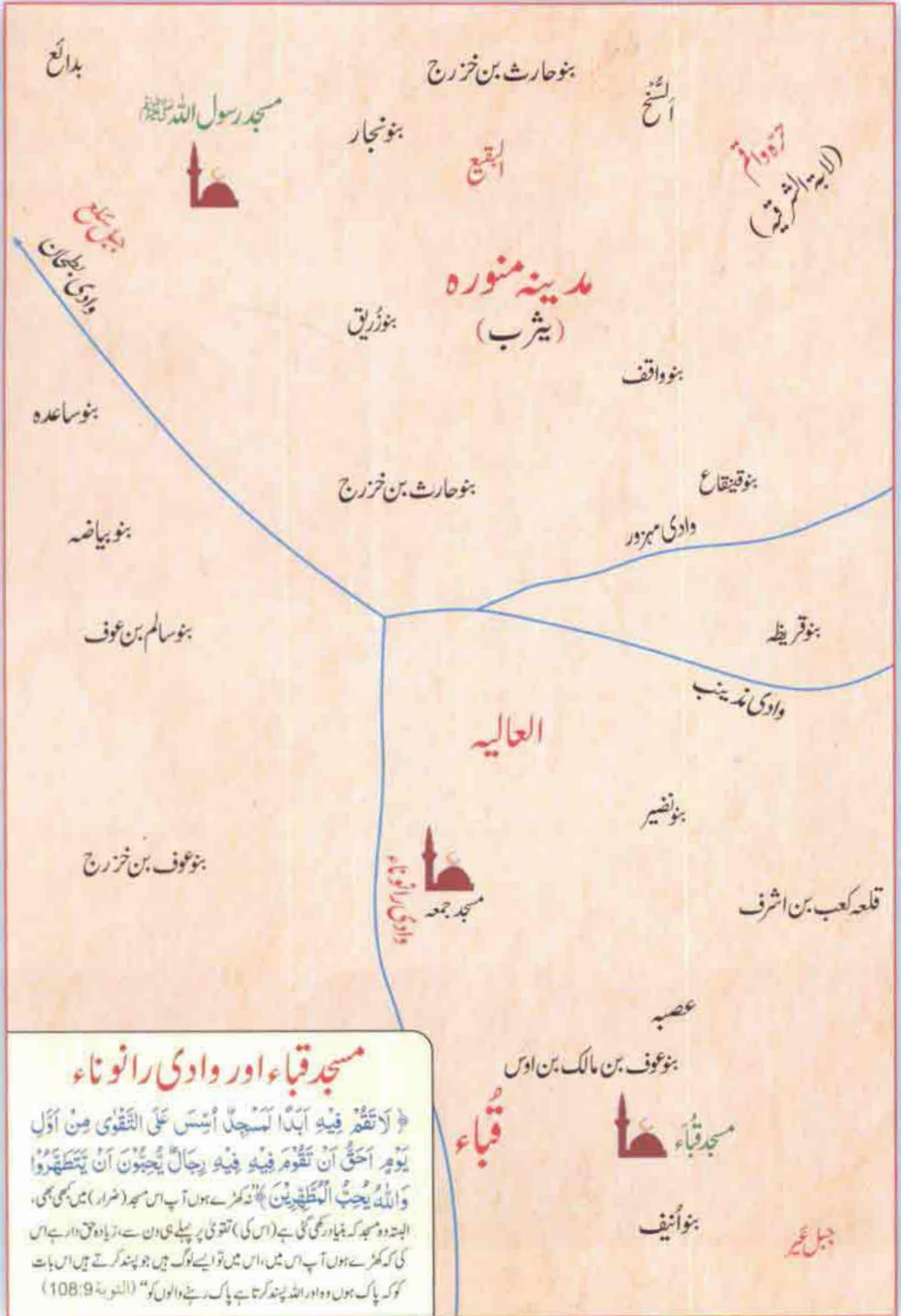
بدائع
بنوحارث بن خزرج
مسجد رسول اللہ ﷺ
بنونجار
البقیع
السنح
جبل سلع
وادی بطحان
مدینہ منورہ
(یثرب)
بنوزریق
بنوواقف
بنوساعدہ
بنوحارث بن خزرج
بنوقینقاع
وادی مہزور
بنوبیاضہ
بنوسالم بن عوف
بنوقریظہ
وادی مذینب
العالیہ
بنونضیر
بنوعوف بن خزرج
وادی رانوناء
مسجد جمعہ
قلعہ کعب بن اشرف
عصبہ
بنوعوف بن مالک بن اوس
قُباء
مسجد قُباء
بنواُنیف
جبل عیر
مسجد قباء اور وادی رانوناء
﴿ لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا لَّمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَن تَقُومَ فِيهِ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ﴾ "نہ کھڑے ہوں آپ اس مسجد (ضرار) میں کبھی بھی، البتہ وہ مسجد کہ بنیاد رکھی گئی ہے (اس کی) تقویٰ پر پہلے ہی دن سے، زیادہ حق دار ہے اس کی کہ کھڑے ہوں آپ اس میں، اس میں تو ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں اس بات کو کہ پاک ہوں وہ اور اللہ پسند کرتا ہے پاک رہنے والوں کو" (التوبۃ 9:108)

کرنا ہم پر واجب ہے اور اس وقت تک واجب ہے جب تک پکارنے والا اللہ کو پکارتا رہے گا۔ اے ذاتِ پاک جنھیں اللہ نے ہمارے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے! آپ ایک ایسا دین لے کر آئے ہیں جس کی اطاعت کی جائے گی۔''[1]

مدینہ میں پہلا جمعہ

دین اسلام میں اجتماعیت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایک جگہ اکٹھے ہو کر ایک امام کے پیچھے اپنے عجز وانکسار کا اظہار اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کا اعلان اسلام میں بہت محبوب ہے۔ اس کی ایک صورت نماز پنجگانہ ہے۔ اس سے بڑی اجتماعی عبادت جمعہ کے روز جمعۃ المبارک کی نماز ہے۔

جمہور علماء کے قول کے مطابق جمعہ مدینہ میں فرض ہوا تھا۔ اس کی فرضیت کے دلائل میں سے ایک دلیل سورۃ الجمعہ کا نزول ہے جس میں ایمان والوں کو حکم دیا گیا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾

''اے ایمان والو! جب تمھیں جمعہ کے دن نماز کے لیے پکار لگائی جائے تو اللہ کے ذکر (یاد) کی طرف جلدی آؤ۔''[2]

اب مسلمان دارالکفر سے ہجرت کر کے دارالامن مدینہ طیبہ پہنچ چکے تھے۔ رسول کریم ﷺ نے اپنا پہلا پڑاؤ قباء بستی میں کیا۔ یہاں آپ ﷺ نے پیر، منگل، بدھ اور جمعرات کو قیام کیا۔ بعض روایات میں چودہ دن قیام کا ذکر ملتا ہے۔ اس مختصر قیام کے بعد جمعۃ المبارک کے دن آپ مدینہ کی طرف عازم سفر ہوئے۔ آپ اپنی اونٹنی القصواء پر سوار تھے۔ مدینہ سے آئے ہوئے آپ کی ننھیال بنونجار اور دیگر قبائل کے جانثار مسلح حالت میں آپ کے ساتھ تھے۔ چلتے چلتے بنو سالم بن عوف کی بستی (موجودہ رانوناء) میں زوال کا وقت شروع ہو گیا تو آپ نے وہیں صحابہ کو جمعہ پڑھایا۔ اس موقع پر آپ ﷺ کے ساتھ سو افراد تھے۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں آپ ﷺ کا یہ پہلا جمعہ تھا۔[3]

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي :507,506/2، بعض محققین ان اشعار کو غزوۂ تبوک سے واپسی کے موقع پر شمار کرتے ہیں۔ (دیکھیے: دلائل النبوة للبيهقي : 266/5، زادالمعاد : 551/3) [2] الجمعة 9:62. [3] الطبقات لابن سعد :236/1، السيرة لابن هشام : 494/2، وفاء الوفا :256/1، فتح الباري لابن حجر :307/7.

نیز نبی ﷺ کا مکہ میں جمعہ ادا کرنا ثابت بھی نہیں۔ آپ ﷺ اس سے قبل ایسے پر امن ٹھکانے میں نہیں تھے کہ وہاں جمعہ کے روز وعظ کیا جاتا۔ مشرکین مکہ آپ کو تکالیف سے دوچار کرتے تھے۔ [1] اسی دن سے یثرب کا نام مدینۃ الرسول رکھ دیا گیا۔ بعد میں یہ نام مختصر ہو کر المدینہ مشہور ہو گیا۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: اسلام میں پہلا جمعہ وہی ہے جو مدینہ میں سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے پڑھایا تھا۔

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ جمعہ ہجرت سے پہلے مکہ میں فرض ہو گیا تھا اور نبی ﷺ ہجرت سے پہلے جمعہ پڑھتے بھی تھے۔ اس کی دلیل میں انھوں نے حضرت معافی بن عمران رحمہ اللہ کی ایک حدیث پیش کی ہے جسے امام نسائی رحمہ اللہ نے کتاب الجمعہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے جمعہ ادا کرنے کے بعد پہلا جمعہ بحرین میں عبدالقیس کی بستی جواثاء میں ادا کیا گیا۔ جبکہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں:

رسول اللہ ﷺ کی مسجد کے بعد پہلا جمعہ بحرین میں عبدالقیس کی بستی جواثی میں پڑھا گیا۔ [2]

امام وکیع رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کی ایک روایت بیان کی ہے۔ اس کے لفظ ہیں: اسلام میں پہلا جمعہ جو مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی مسجد کے بعد ادا کیا گیا، وہ بحرین کی ایک بستی جواثاء میں ادا کیا گیا۔ [3]

ماضی کے بحرین میں مسجد جواثاء (ہجر، سعودی عرب)

بخاری اور ابوداود کی حدیثوں سے پتہ چلا کہ راوی حدیث معافی بن عمران رحمہ اللہ کو وہم ہوا ہے۔ ان کے مقابل اکثریت کی روایت درست ہے۔ [4]

کتب تاریخ و سیرت میں آپ سے اس جمعے کا خطبہ ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے:

«اَلْحَمْدُلِلّٰهِ أَحْمَدُهُ وَأَسْتَعِينُهُ وَأَسْتَغْفِرُهُ وَأَسْتَهْدِيهِ وَأُوْمِنُ بِهِ وَلَا أَكْفُرُهُ وَأُعَادِي مَنْ يَكْفُرُهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، أَرْسَلَهُ بِالْهُدٰى

[1] فتح الباري: 327,326/7، السيرة النبوية لابن كثير، ص: 222,221. [2] صحيح البخاري: 892. [3] سنن أبي داود: 1068. [4] فتح الباري لابن رجب: 329-326/5.

وَالنُّورِ وَالْمَوْعِظَةِ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ وَقِلَّةٍ مِّنَ الْعِلْمِ وَضَلَالَةٍ مِّنَ النَّاسِ، وَانْقِطَاعٍ مِّنَ الزَّمَانِ، وَدُنُوٍّ مِّنَ السَّاعَةِ، وَ قُرْبٍ مِّنَ الْاَجَلِ، مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ رَشَدَ، وَمَنْ يَّعْصِهِمَا فَقَدْ غَوٰى وَفَرَّطَ وَضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا.

أُوصِيكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ، فَإِنَّهٗ خَيْرُمَا أَوْصٰى بِهِ الْمُسْلِمُ الْمُسْلِمَ أَنْ يَّحُضَّهٗ عَلَى الْآخِرَةِ، وَأَنْ يَّأْمُرَهٗ بِتَقْوَى اللّٰهِ، فَاحْذَرُوا مَا حَذَّرَكُمُ اللّٰهُ مِنْ نَّفْسِهٖ، وَلَا أَفْضَلُ مِنْ ذٰلِكَ نَصِيحَةً، وَلَا أَفْضَلُ مِنْ ذٰلِكَ ذِكْرًا، وَ إِنَّ تَقْوَى اللّٰهِ لِمَنْ عَمِلَ بِهٖ عَلٰى وَجَلٍ، وَمَخَافَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ، عَوْنُ صِدْقٍ عَلٰى مَا تَبْغُونَ مِنْ أَمْرِ الْآخِرَةِ. وَمَنْ يُّصْلِحِ الَّذِي بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ مِنْ أَمْرِهٖ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ، لَا يَنْوِي بِذٰلِكَ اِلَّا وَجْهَ اللّٰهِ، يَكُنْ لَّهٗ ذِكْرًا فِي عَاجِلِ أَمْرِهٖ، وَذُخْرًا فِي مَا بَعْدَ الْمَوْتِ، حِينَ يَفْتَقِرُ الْمَرْءُ اِلٰى مَا قَدَّمَ، وَمَا كَانَ مِنْ سِوٰى ذٰلِكَ يَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهٗ أَمَدًا بَعِيدًا وَّيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاللّٰهُ رَؤُوفٌ بِالْعِبَادِ.

وَالَّذِي صَدَّقَ قَوْلَهٗ وَ أَنْجَزَ وَعْدَهٗ لَا خُلْفَ لِذٰلِكَ، فَإِنَّهٗ يَقُولُ عَزَّوَجَلَّ: ﴿مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۝﴾ فَاتَّقُوااللّٰهَ فِي عَاجِلِ أَمْرِكُمْ وَ آجِلِهٖ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ، فَإِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗ أَجْرًا، وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا، وَإِنَّ تَقْوَى اللّٰهِ يُوَقِّي مَقْتَهٗ، وَيُوَقِّي عُقُوبَتَهٗ، وَيُوَقِّي سَخَطَهٗ، وَ إِنَّ تَقْوَى اللّٰهِ يُبَيِّضُ الْوُجُوهَ، وَيُرْضِي الرَّبَّ، وَيَرْفَعُ الدَّرَجَةَ.

خُذُوا بِحَظِّكُمْ وَلَا تُفَرِّطُوا فِي جَنْبِ اللّٰهِ، قَدْ عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ كِتَابَهٗ، وَنَهَجَ لَكُمْ سَبِيلَهٗ، لِيَعْلَمَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَيَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ، فَأَحْسِنُوا كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكُمْ، وَعَادُوا أَعْدَائَهٗ، وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَاجْتَبَاكُمْ وَسَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ، لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ، وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ، وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ، فَأَكْثِرُوا ذِكْرَ اللّٰهِ وَاعْمَلُوا لِمَا بَعْدَ الْيَوْمِ، فَإِنَّهٗ مَنْ يُّصْلِحْ مَا بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ اللّٰهِ، يَكْفِهِ اللّٰهُ مَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّاسِ، ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ يَقْضِي عَلَى النَّاسِ وَلَا يَقْضُونَ عَلَيْهِ، وَيَمْلِكُ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ، اَللّٰهُ

أَكْبَرُ، وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَظِيمِ"

''حمد و ستائش اللہ کے لیے ہے۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں۔ مدد، بخشش اور ہدایت اسی سے چاہتا ہوں۔ میرا ایمان اسی پر ہے۔ میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا اور نافرمانی کرنے والوں سے عداوت رکھتا ہوں۔ میری گواہی یہ ہے کہ اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی بھی نہیں۔ وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمد (ﷺ) اس کا بندہ اور رسول ہے۔ اسی نے محمد (ﷺ) کو ہدایت، نور اور نصیحت کے ساتھ ایسے زمانے میں بھیجا ہے جب کہ مدتوں سے کوئی رسول دنیا پر نہ آیا تھا، علم گھٹ گیا اور گمراہی بڑھ گئی تھی۔ اسے آخری زمانے میں قیامت کے قریب اور موت کی نزدیکی کے وقت بھیجا گیا۔ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، وہی راہ یاب ہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کا حکم نہ مانا، وہ بھٹک گیا، اس نے کوتاہی کی اور سخت گمراہی میں پھنس گیا۔

(مسلمانو!) میں تمھیں اللہ سے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔ بہترین وصیت جو مسلمان، مسلمان کو کرسکتا ہے، یہ ہے کہ اسے آخرت کے لیے آمادہ کرے اور اللہ سے تقویٰ کا حکم دے۔ لوگو! اللہ نے تمھیں جو اپنی ذات سے ڈرایا ہے، اس سے ڈرو۔ اس سے بڑھ کر کوئی نصیحت ہے نہ اس سے بڑھ کر کوئی ذکر ہے۔ یاد رکھو! اس شخص کے لیے جو اللہ سے ڈر کر کام کر رہا ہے، تقویٰ امور آخرت کے بارے میں بہترین مدد ثابت ہوگا۔ اور جب کوئی شخص اپنے اور اللہ کے درمیان کا معاملہ خفیہ و ظاہر میں درست کرے گا اور ایسا کرنے میں اس کی نیت خالص ہوگی تو ایسا کرنا اس کے لیے دنیا میں ذکر اور موت کے بعد، جب انسان کو اعمال کی ضرورت وقدر معلوم ہوگی، ذخیرہ بن جائے گا۔

لیکن اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو (اس کا ذکر اس آیت میں ہے:) ''وہ پسند کرے گا کہ اس کے اور اس کے اعمال کے درمیان دور کا فاصلہ ہوتا۔ اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ تو اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے۔'' اور جس شخص نے اللہ کے حکم کو سچ جانا اور اس کے وعدوں کو پورا کیا تو اس کی بابت یہ ارشادِ الٰہی موجود ہے: ﴿مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ (ق 29:50) ''ہمارے ہاں بات نہیں بدلتی اور ہم اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتے۔''

مسلمانو! اپنے موجودہ اور آیندہ، ظاہر اور خفیہ کاموں میں اللہ سے تقویٰ کو پیش نظر رکھو! کیونکہ جو اللہ سے ڈرے تو وہ اس سے اس کی برائیاں دور کر دیتا ہے اور اسے زیادہ اجر دیتا ہے۔ تقویٰ والے وہ ہیں جو بہت

بڑی مراد کو پہنچ جائیں گے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو اللہ کی بیزاری، عذاب اور غصہ کو دور کر دیتا ہے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو چہرہ کو درخشاں، پروردگار کو خوشنود اور درجہ کو بلند کرتا ہے۔

مسلمانو! اپنا نصیب لے لو مگر حقوق الٰہی میں فروگزاشت نہ کرو۔ خدا نے اسی لیے تم کو اپنی کتاب سکھائی اور اپنا رستہ دکھایا ہے تاکہ وہ راست بازوں اور کاذبوں کو ظاہر کر دے۔ لوگو! اللہ نے تمھارے ساتھ عمدہ برتاؤ کیا ہے، تم بھی لوگوں کے ساتھ ایسا ہی کرو اور جو اللہ کے دشمن ہیں، انھیں دشمن سمجھو اور اللہ کے راستے میں پوری ہمت اور توجہ سے کوشش کرو۔ اسی نے تم کو برگزیدہ بنایا اور تمھارا نام مسلمان رکھا ہے تاکہ ہلاک ہونے والا بھی روشن دلائل پر ہلاک ہو اور زندگی پانے والا بھی روشن دلائل پر زندگی پائے اور سب نیکیاں اللہ کی مدد سے ہیں۔ لوگو! اللہ کا ذکر کرو اور آئندہ زندگی کے لیے عمل کرو، کیونکہ جو شخص اپنے اور اللہ کے درمیان کا معاملہ درست کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے اور لوگوں کے درمیان کے معاملے کو درست کر دیتا ہے۔ ہاں! اللہ بندوں پر حکم چلاتا ہے اور اس پر کسی کا حکم نہیں چلتا۔ اللہ بندوں کا مالک ہے اور بندوں کو اس پر کچھ اختیار نہیں۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور ہم کو (نیکی کرنے کی) طاقت اسی عظمت والے سے ملتی ہے۔‘‘ [1]

اسلام میں علی الاطلاق پہلا جمعہ

رسول اللہ ﷺ کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے مدینہ کے علاقے حرہ بنی بیاضہ کی وادی ہزم نبیت کے محلے نقیع الخضمات میں پہلا جمعہ پڑھا گیا۔ اس کی دلیل کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ وہ جب بھی جمعہ کی اذان سنتے تو اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے لیے مغفرت کی دعا ضرور کرتے۔ ان کے بیٹے نے ان سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا:

كَانَ أَوَّلَ مَنْ صَلّٰى بِنَا صَلَاةَ الْجُمُعَةِ قَبْلَ مَقْدَمِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ مِنْ مَّكَّةَ فِي نَقِيعِ الْخَضِمَاتِ فِي هَزْمِ النَّبِيتِ مِنْ حَرَّةِ بَنِي بَيَاضَةَ......

’’وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ہمیں رسول اللہ ﷺ کی مکہ سے تشریف آوری سے پہلے حرہ بنی بیاضہ میں ہزم نبیت کے اندر نقیع الخضمات (پانی جمع ہونے کے نشیبی میدان) میں جمعہ پڑھایا تھا۔‘‘ [2]

---

[1] تاريخ الطبري: 116,115/2، جامع الآثار في السير و مولد المختار لابن ناصر الدين الدمشقي: 284,283/5.

[2] سنن أبي داود: 1069، سنن ابن ماجه: 1082.

شیخ ابوشہبہ ؒ نے لکھا ہے: نبی ﷺ نے قباء میں پیر، منگل، بدھ اور جمعرات کو قیام کیا، پھر جمعہ کے دن پاکیزہ شہر مدینہ طیبہ کا قصد فرمایا۔ جمعہ کی نماز کا وقت بنی سالم بن عوف کی بستی میں اس مسجد کی جگہ ہو گیا جو آج کل وادی رانوناء کے اندر ہے۔ مدینہ میں یہ پہلا جمعہ تھا جو رسول اللہ ﷺ نے ادا فرمایا۔ بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ مطلقاً جمعہ کی پہلی نماز تھی جو آپ ﷺ نے پڑھائی۔ مکہ میں مشرکین کی طرف سے شدید مخالفت اور آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو ایذائیں دینے کی بنا پر صحابہ کا اس طور مجتمع ہونا کہ ایسا جمعہ پڑھا جائے جس میں خطبہ، اعلان توحید اور وعظ و نصیحت ہو، ممکن نہیں تھا۔

اس جمعہ میں آپ ﷺ نے مسلمانوں کو انتہائی بلیغ اور پر اثر خطبہ ارشاد فرمایا جس سے ایمان و یقین بڑھ جاتا ہے۔ اس خطبے میں آپ ﷺ نے امت کو نصیحتیں فرمائیں، نیز اچھے کاموں کی ترغیب دی اور برے کاموں سے ڈرایا۔[1]

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

ابھی رسول اللہ ﷺ قباء ہی میں قیام فرما تھے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اپنے ساتھ بطور صدقہ کچھ کھجوریں لائے۔ رسول اکرم ﷺ سے عرض کرنے لگے: آپ نیک آدمی ہیں۔ آپ کے ساتھ ضرورت مند لوگ بھی ہیں، لہٰذا یہ صدقہ قبول فرمائیں۔ آپ ﷺ نے وہ کھجوریں خود نہ کھائیں، اپنے ساتھیوں سے فرمایا: کھاؤ۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کہنے لگے: یہ ایک نشانی ہوئی۔ واپس آ گئے۔ اس کے بعد کچھ دن ٹھہر کر انھوں نے پھر کچھ کھجوریں جمع کیں اور رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کرنے لگے: آپ چونکہ صدقہ نہیں کھاتے، اس لیے یہ کھجوریں میں بطور ہدیہ (تحفہ) لایا ہوں۔ اس میں سے آپ ﷺ نے خود بھی کھائیں اور صحابہ کو بھی کھانے کا حکم دیا۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ دوسری نشانی ہوئی۔ سلمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: تیسری بار جب میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تیسری نشانی (مہر نبوت) دیکھنے کے لیے آیا تو آپ بقیع الغرقد قبرستان میں کسی جنازے میں شریک تھے (غالباً یہ سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا جنازہ تھا۔) رسول اللہ ﷺ کے گرد صحابہ بھی تشریف فرما تھے۔ میں نے سلام کیا اور آپ کے ارد گرد گھومنے لگا۔ آپ نے میرا مقصد جان کر اپنی چادر مبارک کندھوں سے سرکا دی۔ میں نے ختم نبوت (مہر نبوت) دیکھی۔ یہ آخری نشانی دیکھ کر میں رونے لگا۔ آپ نے مجھے روتے دیکھا تو اپنے سامنے بٹھا لیا اور میری کہانی سنی۔ اس سے آپ بہت خوش ہوئے۔

[1] السيرة النبوية في ضوء القرآن والسنة: 21/2، تاريخ الطبري: 115/2.

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلمان رضی اللہ عنہ آغاز ہجرت میں مسلمان ہو چکے تھے۔ جنگ بدر اور احد غلامی کی حالت میں گزر گئیں، اس لیے شرکت نہ کر سکے۔ پہلا معرکہ جس میں سلمان رضی اللہ عنہ شریک ہوئے، جنگ خندق ہے جو انھی کے مشورے سے خندق کھود کر لڑی گئی تھی۔ [1]

سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

امام ابن کثیر رحمہ اللہ سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے اسلام کے بارے میں ذکر کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلی ملاقات قباء میں کی۔ امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ کے سیاق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے پہلے جو فرمان سنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، وہ قباء ہی کی بات ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور میں نے آپ کے چہرۂ مبارک کو دیکھا تو پہچان گیا کہ یہ چہرہ ہرگز جھوٹے شخص کا نہیں۔ میں نے سنا، آپ فرما رہے تھے:

«أَفْشُوا السَّلَامَ، وَ أَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصِلُوا الْأَرْحَامَ، وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ»

''تم سلام کو عام کرو، کھانا کھلاؤ، صلہ رحمی کرو اور رات کو نماز پڑھو جب لوگ سو رہے ہوں، تم سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔''

اس سیاق کا بھی تقاضا یہ ہے کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان قباء ہی میں سنا ہو اور وہیں آپ کو پہلی بار دیکھا ہو جبکہ آپ بنی عمرو بن عوف کے ہاں قیام فرما تھے۔

عبدالعزیز بن صہیب رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں جب حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے ہاں پہنچے تو وہاں عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور اسلام قبول کیا۔ اسی موقع پر عبداللہ بن سلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشہور تین سوال کیے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں یہود سے استفسار کیا تھا۔ [2]

اہل مدینہ کا اشتیاق اور ابن اُبَی کی ہٹ دھرمی

موسیٰ بن عقبہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راستے میں عبداللہ بن ابی ابن سلول کے پاس سے

[1] دیکھیے: الاستیعاب، أسد الغابۃ، الإصابۃ۔ [2] دیکھیے: البدایۃ والنہایۃ: 3/198-208.

گزرے۔ وہ اس وقت اپنے ایک گھر میں تھا۔ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے کہ وہ آپ کو گھر کے اندر بلائے۔ ان دنوں وہ خزرج کا سردار تھا۔ عبداللہ بن ابی نے کہا: ان لوگوں کے پاس جاؤ جنھوں نے تمھیں بلایا ہے۔ ان کے پاس جا کر ٹھہرو۔ آپ ﷺ نے یہ بات چند انصاری صحابہ سے کہی تو سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اس کی طرف سے معذرت پیش کرتے ہوئے کہنے لگے: یارسول اللہ! اللہ نے آپ کو بھیج کر ہم پر احسان کیا ہے۔ ہم عنقریب ہی اس کے سر پر تاج رکھ کر اسے اپنا بادشاہ بنانے والے تھے۔[1]

موسیٰ بن عقبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: انصارِ مدینہ رسول اللہ ﷺ کے بنی عمرو بن عوف کے ہاں سے روانہ ہونے سے پہلے جمع ہو چکے تھے۔ سب آپ کی اونٹنی کے گرد چلنے لگے۔ ان میں سے ہر ایک رسول اللہ ﷺ کی تکریم و تعظیم کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اونٹنی کی لگام تھامے۔ آپ ﷺ جب کسی انصاری کے گھر میں پاس سے گزرتے تو وہ آپ کو اپنے گھر کے اندر تشریف لانے کی درخواست کرتا۔ آپ ﷺ فرماتے: ''اونٹنی کو چھوڑ دو، یہ اللہ کے حکم کی پابند ہے۔ میں وہیں ٹھہروں گا، جہاں مجھے اللہ ٹھہرائے گا۔''

رسول اللہ ﷺ کے پاس عتبان بن مالک اور عباس بن عبادہ بن نضلہ رضی اللہ عنہما بنی سالم کے دیگر کچھ لوگوں کے ساتھ آئے اور کہا: یارسول اللہ! آپ ہمارے پاس قیام کیجیے۔ ہم نفری، قوت، اسلحہ اور ساز و سامان والے لوگ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ اونٹنی کا راستہ چھوڑ دو، یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے۔'' تو وہ لوگ ہٹ گئے اور اونٹنی چلتی ہوئی جب بنی بیاضہ کے محلے میں آئی تو بنی بیاضہ کے لوگوں میں سے زیاد بن لبید اور فروی بن عمرو آپ ﷺ سے ملے۔ یہ لوگ بھی کہنے لگے: یارسول اللہ! آپ ہمارے پاس تشریف لائیں۔ ہم نفری، قوت، اسلحہ اور ساز و سامان والے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ اونٹنی کا راستہ چھوڑ دو، یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے۔'' وہ لوگ اس کے راستے سے ہٹ گئے۔

محلہ بنی ساعدہ (ماضی کا منظر)

اونٹنی پھر چل پڑی یہاں تک کہ بنی ساعدہ کے محلے سے گزری۔ یہاں سعد بن عبادہ اور منذر بن عمرو بنوساعدہ کے افراد کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے ملنے آئے۔ لوگ بھی کہنے لگے: یارسول اللہ! آپ ہمارے پاس تشریف لائیں، ہماری تعداد بڑی ہے اور ہم آپ کی حفاظت کی طاقت رکھتے ہیں۔

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 499/2.

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ اس اونٹنی کا راستہ چھوڑ دو، یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے۔'' تو وہ الگ ہٹ گئے۔

اونٹنی آگے چل پڑی یہاں تک کہ بنی حارث بن خزرج کے محلے میں پہنچی۔ بنو حارث بن خزرج کے افراد کے ساتھ سعد بن ربیع، خارجہ بن زید اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم ملاقات کے لیے آئے اور آگے بڑھ کر عرض گزار ہوئے: یارسول اللہ! آپ ہمارے پاس تشریف لائیں۔ ہم تعداد، ہتھیار اور قوتِ دفاع میں زیادہ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کا راستہ چھوڑ دو، یہ اللہ کے حکم کی پابند ہے۔'' لوگوں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا۔

اونٹنی آگے چل پڑی یہاں تک کہ عدی بن نجار کے محلے میں پہنچی۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے ننھیالی لوگ تھے، اس لیے کہ سردار عبدالمطلب کی والدہ سلمٰی بنت عمرو انھی لوگوں کی بیٹی تھی۔ عدی بن نجار کے لوگوں کے ساتھ سلیط بن قیس اور ابوسلیط اُسیرہ بن ابوخارجہ آپ ﷺ سے راستے میں ملے۔ یہ لوگ آگے بڑھ کر پیش کش کرتے ہیں: یارسول اللہ! آپ اپنی ننھیال کے پاس تشریف لائیے۔ ہم لوگ تعداد، اسبابِ جنگ اور دفاعی قوت میں زیادہ ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کا راستہ چھوڑ دو، یہ اللہ کے حکم کی پابند ہے۔'' لوگوں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا۔

اونٹنی چلتی ہوئی جب بنی مالک بن نجار کے محلے میں پہنچی تو آج کی مسجد نبوی کے دروازے کے پاس بیٹھ گئی۔ اُس وقت وہ جگہ کھلیان کے طور پر استعمال ہوتی تھی اور بنی مالک بن نجار کے دو یتیم لڑکوں سہل اور سہیل رضی اللہ عنہما کی ملکیت تھی۔ یہ دونوں معاذ بن عفراء رضی اللہ عنہ کی گود میں پلے بڑھے تھے۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ دونوں اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کی گود میں پلے بڑھے تھے۔ واللہ اعلم۔ [1]

ابوایوب رضی اللہ عنہ کے گھر میں قیام

ابن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں: اونٹنی جب وہاں بیٹھی تو آپ ﷺ اس سے اُترے نہیں، وہ پھر دوبارہ کھڑی ہوگئی اور تھوڑی دور تک گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی تھی۔ اونٹنی پھر پیچھے کی طرف مڑی اور جہاں پہلی بار بیٹھی تھی وہیں لوٹ آئی اور دوبارہ اسی جگہ بیٹھ گئی، پھر اونٹنی نے آواز نکالی اور آرام کے ساتھ وہیں بیٹھ گئی، تب آپ ﷺ اُتر آئے اور ابوایوب خالد بن زید رضی اللہ عنہ نے آپ کا سامانِ سفر اُتار کر اپنے گھر میں رکھا اور رسول اللہ ﷺ وہاں قیام پذیر ہوگئے۔

رسول اللہ ﷺ نے کھلیان کے بارے میں پوچھا: یہ کس کا ہے؟ معاذ بن عفراء رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ عمرو کے بیٹوں سہل اور سہیل رضی اللہ عنہما کا ہے۔ یہ دونوں یتیم میری نگرانی میں ہیں اور میں ان دونوں کو یہ زمین دینے

[1] السيرة النبوية لابن كثير، ص: 217,216، السيرة لابن هشام: 495,494/2، صحيح البخاري: 3906.

کے لیے راضی کرلوں گا، آپ یہاں مسجد بنا لیجیے گا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے تعمیرِ مسجد کا حکم دے دیا۔[1]

امام بیہقی رحمہ اللہ نے دلائل النبوہ میں لکھا ہے: جب اونٹنی ابوایوب رضی اللہ عنہ کے دروازے کے سامنے بیٹھ گئی تو بنی نجار کی کچھ چھوٹی لڑکیاں دف بجاتی ہوئی اور یہ کہتی ہوئی نکلیں:

نَحْنُ جَوَارٍ مِّنْ بَنِي النَّجَّارِ يَاحَبَّذَا مُحَمَّدٌ مِّنْ جَارِ

''ہم بنی نجار کی لڑکیاں ہیں، محمد ہمارے کتنے اچھے پڑوسی بن گئے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ ان کے پاس آئے اور فرمایا: ''کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟'' انھوں نے کہا: ہاں، اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں بھی تم سب سے محبت کرتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے یہ جملہ تین بار دُہرایا۔

صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے انصار کی عورتوں اور بچوں کو کسی شادی سے واپس آتے دیکھا تو رسول اللہ ﷺ ان کے سامنے کھڑے ہوگئے اور فرمایا: «اَللّٰهُمَّ! أَنْتُمْ مِّنْ أَحَبِّ النَّاسِ إِلَيَّ» قَالَهَا ثَلَاثَ مِرَارٍ. ''اللہ گواہ ہے کہ تم لوگ مجھے مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہو۔'' آپ ﷺ نے یہ بات تین بار کہی۔[2]

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے سیدنا ابوایوب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں رہنے لگے تو آپ نیچے ٹھہرے اور میں اور ام ایوب بالائی منزل پر۔ میں نے آپ ﷺ سے گزارش کی: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں! مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں آپ کے اوپر رہوں اور آپ میرے نیچے، اس لیے آپ اوپر تشریف لے چلیں اور ہم نیچے آجاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوایوب! ہمارے لیے اور ہمارے پاس آنے والوں کے لیے مناسب یہی ہے کہ میں نیچے رہوں۔'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نیچے رہنے لگے اور ہم اوپر۔ ایک دن اوپر ہمارے پانی کا ایک مٹکا ٹوٹ گیا۔ میں اور ام ایوب فوراً اپنا ایک کمبل لے کر پانی کو خشک کرنے لگے، ہمارے پاس اس کے سوا کوئی لحاف نہ تھا، تاکہ پانی کا کوئی حصہ آپ کے اوپر ٹپک کر آپ کی تکلیف کا سبب نہ بنے۔

سیدنا ابوایوب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم آپ ﷺ کے لیے رات کا کھانا تیار کرکے آپ کے پاس بھیج دیتے تھے اور جب آپ اس کا باقی ماندہ حصہ واپس کرتے تو میں اور ام ایوب آپ کے ہاتھ کے نشان کی جگہ سے لے کر بطورِ تبرک کھایا کرتے۔ ایک رات ہم نے آپ کو کھانا بھیجا جس میں پیاز یا لہسن ملا تھا۔ آپ ﷺ نے اُسے جب واپس کیا

[1] السيرة لابن هشام: 496/2. [2] صحيح البخاري: 3785.

تو اس میں ہم نے آپ ﷺ کے ہاتھ کا نشان نہیں پایا۔ میں گھبرایا ہوا آپ کے پاس آیا اور پوچھا: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں! آپ نے کھانا واپس کر دیا اور اس میں ہم نے آپ کے ہاتھ کا نشان نہیں دیکھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس کھانے میں اس درخت (پیاز یا لہسن) کی بُو آئی تھی اور میں (جبریل سے) سرگوشی کرتا ہوں۔ اس لیے تم لوگ وہ کھانا کھالو، چنانچہ وہ کھانا ہم لوگوں نے کھا لیا اور پھر اس کے بعد کبھی آپ کے کھانے میں پیاز یا لہسن نہیں ڈالا۔[1]

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے کہا: جب رسول اللہ ﷺ ابوایوب رضی اللہ عنہ کے گھر مہمان بنے تو پہلا ہدیہ جو آپ ﷺ کے لیے آیا، وہ دودھ، گھی اور روٹی سے تیار کردہ ثرید کا پیالہ تھا۔ میں نے آپ ﷺ سے کہا: یہ میری ماں نے بھیجا ہے۔ آپ ﷺ نے برکت کی دعا کی اور اپنے اصحاب کو بلا کر سب کے ساتھ اسے کھایا، پھر دوسرا پیالہ سعد بن عُبادہ رضی اللہ عنہ کے گھر سے آیا جس میں ثرید اور گوشت تھا۔ اِس طرح ہر رات آپ ﷺ کے دروازے پر تین چار آدمی باری باری کھانا لے کر آتے۔ آپ ﷺ کا قیام ابوایوب رضی اللہ عنہ کے گھر میں سات ماہ تک رہا۔[2]

ہجرتِ نبوی کی اِن مذکورہ تفاصیل سے معلوم ہوا کہ مکہ سے نکلنے کے بعد مدینہ پہنچنے تک آپ ﷺ کو پندرہ دن لگے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ مکہ سے سوموار کے دن نکلے تھے اور مدینہ سوموار کے دن بارہ ربیع الاول کو پہنچے تھے اور مدینہ میں آپ ﷺ دس سال رہے۔[3] غار ثور میں تین دن تک چُھپے رہے۔ وہاں سے نکل کر ساحل کے راستے سے جو عام راستے سے طویل ہے، قبا پہنچے تھے۔

ہجرت کی گزرگاہیں

نبیِ مکرم محمد ﷺ جن جن راہوں، وادیوں اور علاقوں سے گزر کر مدینہ منورہ پہنچے، ان علاقوں کا مختصر سا تعارف فائدے سے خالی نہیں تاکہ پتہ چل جائے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے کیسے کیسے نشیب وفراز عبور کیے اور اللہ کی رضا کی خاطر کتنے کٹھن حالات وحوادث کا مقابلہ کیا۔

نبی ﷺ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سلا کر اپنے گھر سے نکلتے ہیں اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر (مسفلہ) کی جانب پہنچتے ہیں۔ ان کے گھر کے عقبی دروازے سے نکل کر جبل ثور پہنچتے ہیں۔ جبل ثور سے نکل

[1] صحیح مسلم: 2053، السیرۃ لابن ہشام 499,498/2، السیرۃ النبویۃ لابن کثیر، ص: 217. [2] السیرۃ النبویۃ لابن کثیر، ص: 218,217. [3] المعجم الکبیر للطبرانی: 173/17، علامہ ہیثمی نے اس کے راویوں کو ثقہ قرار دیا ہے۔ مجمع الزوائد: 63/6.

نبی ﷺ کا سفرِ ہجرت (مکہ تا مدینہ)
﴿ وَ اِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ یُخْرِجُوْكَ وَ یَمْكُرُوْنَ وَ یَمْكُرُ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ﴾ ''اور یاد کیجیے! جب تدبیر کررہے تھے آپ کی بابت وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، تاکہ وہ قید کردیں آپ کو، یا قتل کردیں آپ کو، یا نکال دیں آپ کو اور تدبیریں کررہے تھے وہ اور تدبیر کررہا تھا اللہ بھی، اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔'' (الأنفال 8:30)
﴿ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلَیْهِ وَ اَیَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا ﴾
''اگر نہ مدد کرو گے تم اس کی' تو تحقیق مدد کی اس (پیغمبر) کی اللہ نے' جب کہ نکال دیا تھا اس کو ان لوگوں نے جنھوں نے کفر کیا' (وہ) دوسرا تھا دو میں سے' جب وہ دونوں تھے غار میں' جب کہ وہ کہہ رہا تھا اپنے ساتھی سے' غم نہ کر' بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے' پس نازل کی اللہ نے اپنی سکینت اس پر اور مدد کی اس کی ایسے لشکروں سے کہ نہیں دیکھا تم نے ان کو''
(التوبۃ 9:40)
ہجرتِ نبوی کا راستہ
قافلوں کا راستہ
مدینہ منورہ
قُباء
ذات الجیش
ملل
ذوالحلیفہ
الظہیر
تربان
سیالہ
الروحاء
رویثہ
بطن ریم
ثنیۃ العائر
عرج
منصرف
جبابید (القاحہ)
مدلجہ تعہن
القرع
ذو سلم
جداجد
بطن ذی کشر
مرجح ذی الغضوین
مرجح مجاح
مدلجہ مجاح
مدلجہ لقف
ثنیۃ المرہ
بدر
حجاز
جحفہ
رابغ الاول
رابغ البحر
کُلیہ
مشلل
خیمہ اُمّ معبد
قُدید
خُلیص
امج
الروضہ
کدید
غدیر الاشطاط
عسفان
ثنیۃ الغزال
(مرالظہران) بطن مر
سرف
مکہ مکرمہ
جبل ثور
جدہ
بحیرۂ قلزم (احمر)
40
0
کلومیٹر

کر مدینہ شاہراہ عام سے ہٹ کر وادی عُسفان کے نشیب کی جانب جاتے ہیں جو بنو مصطلق خزاعی کا علاقہ تھا۔ یہاں وافر تعداد میں چشمے اور تالاب تھے۔ اس کو عسفان اس لیے کہا گیا کہ یہاں سیلابی ریلا جمع ہوتا تھا۔ ایک جانب مکہ اور دوسری جانب جحفہ کا بارانی پانی یہاں جمع ہوتا تھا۔ عسفان مکہ سے 80 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

وادی عسفان میں پانی کا اہتمام

نبی ﷺ عسفان کے بعد بنی سُلیم کے علاقے وادی غران کی جانب وادیِ اَمج کے نشیب میں پہنچے۔ وادی اَمج مکہ سے 100 کلومیٹر شمال میں شاہراہ عام پر ایک شاداب وادی ہے۔ آج کل قصبہ اَمج خُلَیص کے نام سے معروف ہے۔ وادی اَمج بنوخزاعہ کا علاقہ شمار ہوتا تھا۔ ان کے ہاں کھجوروں کے باغات، کھیتیاں اور چشمے تھے۔ یہاں بنوسلیم کے لوگ بھی رہتے تھے۔ مکہ کی جانب سے خُلیص کے دو میل بعد وادی اَمج واقع ہے۔ وادی اَمج کے ایک میل بعد وادی غُران ہے۔ یہ دونوں وادیاں (وادی امج اور وادی نخلہ) غران حرہ بنوسلیم سے نکل کر سمندر میں جا گرتی ہیں۔

وادی امج کا نشیب

نبی ﷺ وادی اَمج سے نکل کر وادی قُدید پہنچے جو شارع عام سے بالکل ہٹی ہوئی تھی اور اَمج سے تقریباً ایک منزل کی مسافت پر واقع تھی۔ قُدید وادی کے نام پر ایک چھوٹا قصبہ ہے۔ یہ آج بھی اسی نام سے موسوم ہے اور مکہ سے رابغ شہر جاتے ہوئے راستے ہی میں واقع ہے۔ خُلَیص اور قُدید کے درمیان آٹھ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ علاقہ بھی بنوخزاعہ کا تھا۔ یہاں پانی کا ایک چشمہ تھا اور قدید زرخیز وادی تھی۔ اسی وادی کا بالائی حصہ ستارہ اور زیریں حصہ قُدید کہلاتا ہے۔ یہ وادی مکہ مدینہ شاہراہ کو تقریباً 120 کلومیٹر پر کاٹتی ہوئی قضیمہ کے پاس سمندر میں جا گرتی ہے۔ ابن الکلبی کا کہنا ہے جب تبع یمن اہل مدینہ کے ساتھ لڑائی کرنے کے بعد یہاں پہنچا تو یہاں آ کر خیمہ زن ہوا۔ یہاں سخت آندھی چلی جس نے اس کے ہمراہیوں کے

وادی خُلَیص کا ایک منظر

وادی غران

قریہ وادی قدید

وادی رابغ

وادی الخرار (غدیر خم)

وادی لقف کا ایک منظر

خیموں کو الٹ دیا۔ اسی وجہ سے یہ جگہ قدید کے نام سے مشہور ہوئی۔ نبی ﷺ غزوہ مریسیع کو جاتے ہوئے بھی یہاں قدید سے گزرے تھے۔

وادی قدید کے بعد ہجرت نبوی کا قافلہ الخرار پہنچا۔ قصبہ الخرار رابغ کے مشرق میں تقریباً 25 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ الخَرّار ایک وادی ہے جسے غدیر خم کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ الجُحْفَة اور غَدیر خُم کے مابین دو میل کی مسافت ہے۔[1] وادی غدیر خم میں خزاعہ اور کنانہ کے لوگ آباد ہیں۔ اس کے پاس نبی ﷺ نے یمن کے وفد کو خطاب بھی فرمایا تھا۔

الخرار کے بعد نبی ﷺ ثنیۃ المرۃ کے پاس سے گزرے۔ آج کل یہ غدیر خُم اور الفُرع کے درمیان معروف ہے۔ اس کے بعد نبی ﷺ لَقف کے نزدیک سے گزرے۔ اسے لِفت بھی کہا گیا ہے۔ یاقوت نے کہا ہے کہ لَقف اور لِفت دونوں مکہ اور مدینہ کے درمیان الگ الگ مقامات ہیں۔

اس کے بعد آپ ﷺ مجاح کے بیابان سے گزرے۔ اس کے بعد یہ قافلہ مجاح کے موڑ سے گزرا، پھر ذوالغضوین کے موڑ کے نشیب میں چلا، پھر ذی کَشر وادی میں داخل ہوا۔ اس کے بعد جَداجِد کا رخ کیا۔ یہ جَدجَد کی جمع ہے۔ پرانے کنویں کو جَدجَد کہا جاتا ہے۔ یاقوت کہتے ہیں کہ یہاں پرانے زمانے کے بہت سے کنویں تھے جنھیں جداجد کہا جاتا تھا۔

یہاں سے آپ ﷺ کا قافلہ اَجرد پہنچا۔ آجرد ایک پہاڑ کا نام ہے۔ یہاں قبیلہ بنوجُہینہ آباد تھا۔ یہ مدینہ سے شام کے راستے میں آتا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ وادی ذوسلم سے گزرے، یہ وادی بیابان تعہن کے اطراف میں ہے۔ تِعہن ایک چشمہ تھا۔ یہ السُّقیا سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ السُّقیا، ابواء سے انیس میل کے فاصلے پر ہے۔

یہاں سے آپ ﷺ کا قافلہ العَبابیہ یا العبابیب سے گزرا جو تعہن سے

[1] معجم البلدان، مادۃ: الجحفۃ.

قریب ہے۔ یہ السقیا سے ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کے بعد کاروانِ ہجرت الفاجہ سے گزرا۔ اسے القاحہ بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ مدینہ منورہ سے السقیا کی جانب تین مراحل کی مسافت پر واقع ہے اور السُقیا سے ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ یاقوت نے کہا ہے کہ القاحہ یا الفاجہ ایک پہاڑ کا نام ہے۔ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ عرج پہنچے جہاں اوس بن حجر اسلمی سے ملاقات ہوئی۔ عرج کے بعد آپ ﷺ ثنیۃ الغائر سے گزرے۔ اس کے بعد رئم سے گزرے جو مدینہ کے قریب مزینہ کی وادی تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مدینہ سے تیس میل کے فاصلے پر تھی۔ رئم کے بعد نبی ﷺ قباء پہنچے جو نبی ﷺ کی پہلی جائے قیام تھی۔ [1]

رسول اللہ ﷺ کے اہل خانہ کی ہجرت

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ گئے تو آپ نے اپنے اہل وعیال کو مکہ سے لانے کے لیے حضرت زید بن حارثہ اور ابورافع رضی اللہ عنہم کو بھیجا کہ وہ آپ ﷺ کی بیٹیوں اور زوجۂ مطہرہ سیدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کو لے آئیں۔ آپ نے دو اونٹ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پانچ سو درہم لے کر ان کے سپرد کیے تاکہ واپسی پر ضرورت کے مطابق سواریاں خریدی جاسکیں۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی ان دونوں کے ساتھ ہی عبداللہ بن اریقط دیلی کو دو یا تین اونٹ دے کر روانہ کیا، نیز عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ وہ ان کی اہلیہ ام رومان، بیٹی عائشہ اور اسماء، جو زبیر بن عوام کی زوجہ تھیں، کو بھی ساتھ لے آئیں۔ یہ لوگ صبح صبح مدینہ سے چلے اور مقام قدید پر جا کر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے دیے ہوئے پانچ سو درہموں سے تین سواریاں خریدیں۔ یہ لوگ مکہ داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ طلحہ بن عبیداللہ آل ابوبکر کے ساتھ ہجرت کرنا چاہتے ہیں۔ یوں سب لوگوں نے یکبارگی ہجرت کی۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ ابورافع رضی اللہ عنہ فاطمہ، ام کلثوم اور سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہن کو لے کر آگئے۔ زید رضی اللہ عنہ نے ام ایمن اور اسامہ بن زید کو سوار کرلیا اور عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ام رومان اور اس کی دونوں بہنیں تھیں۔ طلحہ بن عبیداللہ اکیلے تھے، بعد میں سب اکٹھے ہوگئے۔ پھر یہ لوگ چلتے چلتے مدینہ آگئے۔ [2]

مہاجرین کی فضیلت

ہجرت مدینہ اسلامی دعوت کی تاریخ کا نہایت عظیم الشان سنگ میل ہے۔ اس ہجرت سے مسلمانوں کی کایا پلٹ گئی۔ اس سے پہلے مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت واضح نہیں تھی، نہ کوئی ایسا مقام تھا جو مسلمانوں کا تحفظ اور دشمن

[1] ملخص از طریق الهجرة النبویة لعبد القدوس الأنصاري، ص: 62-88. [2] المستدرك للحاكم: 5,4/4، تاریخ الطبري: 119,118/2.

کے مقابلے میں ان کا دفاع کرتا۔

ہجرت کے بعد جب اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو اسلام جزیرہ نمائے عرب کے اندرونی اور بیرونی علاقوں میں تیزی سے پھیلتا چلا گیا۔ داعیانِ اسلام آس پاس کے علاقوں میں جاتے اور دعوتِ دین کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ اس طرح اسلام کو عالمگیر حیثیت نصیب ہوئی اور توحید و رسالت کے نورِ مبین کا ڈنکا پوری دنیا میں بجنے لگا۔

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کی عظمت و شان کو بڑے بلیغ انداز میں سراہا ہے اور انھیں فوقیت و فضیلت سے نوازا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾

”اور مہاجرین اور انصار میں سے (قبول اسلام میں) سب سے پہلے سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنھوں نے (احسان) اچھے طریقے کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس (اللہ) سے راضی ہو گئے اور اس (اللہ) نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔“ [1]

اس آیت کریمہ میں مہاجرین کی فضیلت ان کی سبقت کی بنا پر ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو ایسی منفرد صلاحیتوں سے نوازا تھا جن کی بدولت انھوں نے ہر قسم کے دباؤ، آزمائش، بھوک اور غریب الوطنی جیسی تکالیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا یہاں تک کہ موت کو بھی گلے لگا لیا۔ یوں مدینہ میں اسلام کو نہایت ٹھوس بنیادیں فراہم ہوئیں۔ عام انصار اگرچہ مہاجرین کے بعد دائرہ اسلام میں آئے تھے لیکن ان کی بیعت عقبہ میں شمولیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعتیں بھی خالص اور کھری تھیں جو اس دین کے مزاج سے ہم آہنگ تھیں۔

مہاجرین و انصار کے باہمی تعلق و ارتباط سے اسلامی معاشرے کے لیے ایسی ٹھوس بنیاد تشکیل پائی جس کے قوام میں عربی معاشرے کے مضبوط اور مستحکم ترین اصول شامل تھے۔ دین اسلام کا معاملہ کھلی کتاب کے مانند تھا۔ جاہلیت سے نکل کر دائرۂ اسلام میں آنے اور اس دشوار گزار راستے کو طے کرنے کی ہمت وہی جاں نثار کرتے تھے جو غیر معمولی مضبوط مزاج اور مصمم ارادے کے مالک ہوتے تھے۔ [2]

قرآن کریم میں مہاجرین کا ایک وصف یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کے ایمان میں بڑی سچائی تھی اور جن حضرات

[1] التوبة 9:100. [2] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 1703/3.

نے انھیں ٹھکانا دیا، وہ بھی سچے مومن تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے (مہاجرین کو) ٹھکانہ دیا اور (ان کی) مدد کی، وہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لیے بخشش اور باعزت روزی ہے۔''[1]

یہ اللہ علیم و خبیر کی شہادت ہے کہ مہاجرین سچے مومن تھے جو نبی ﷺ کے بعد ساری امت کے لیے نمونۂ عمل کی حیثیت اختیار کر گئے۔ انھی صفات کی بدولت وہ اللہ تعالیٰ کی مدح کے مستحق ٹھہرے کہ دراصل یہی مومن ہیں۔

یہ صفات مہاجرین کی زندگیوں میں بہت واضح نظر آتی ہیں اور انھی صفات کے حامل لوگ ہی حقیقی اہلِ ایمان ہیں۔

قرآن کریم میں مہاجرین کی دیگر اہم صفات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾

''(مالِ فے) ان فقیر مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کے متلاشی ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی سچے لوگ ہیں۔''[2]

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے مہاجرین کی کئی صفات کا ذکر کر دیا ہے۔ اس میں مہاجرین کو مالِ فے سے حصہ دینے کے ساتھ ساتھ ان کے اخلاص اور سچائی کی تصدیق کی گئی ہے، نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مددگار ہیں۔ ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کی صفت صبر کا تذکرہ کیا ہے اور دنیا میں عزت کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی اجرِ عظیم کی نوید سنائی ہے، پھر یہ بھی بتایا ہے کہ وہ اللہ پر توکل کرنے والے ہیں اور دنیاوی جاہ و منزلت سے بہت بے پروا اور قطعی بے نیاز ہیں، فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝﴾

''اور جن لوگوں نے ظلم و ستم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا (ٹھکانا) دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر تو اس سے بھی بہت بڑا ہے۔ کاش! وہ (لوگ) علم رکھتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں

[1] الأنفال 74:8. [2] الحشر 8:59.

نے صبر کیا اور (یہی لوگ) اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔“ [1]

مہاجرین کی ایک نمایاں صفت، جس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کی ستائش کی ہے، رحمتِ الٰہی کا امیدوار ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾

”بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہی لوگ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔“ [2]

دنیا میں کوئی انسان اطاعت و فرماں برداری کی کتنی ہی منزلیں طے کرے، اسے جنتی ہونے کا یقین نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ معاملہ علم غیب سے تعلق رکھتا ہے اور جنت عطا فرمانا صرف اللہ ہی کے فضل و کرم پر موقوف ہے۔ مہاجرین کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشش سے نواز دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ شام و سحر اللہ کی رحمت کے طلبگار رہتے تھے۔ یہ ان کے بڑے محکم ایمان کی نشانی ہے۔ [3]

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَن يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ وَمَن يَخْرُجْ مِن بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا﴾

”اور جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے، وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور گنجائش پائے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے کی خاطر اپنے گھر سے نکلے، پھر اسے موت آ جائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہو گیا اور اللہ بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔“ [4]

دنیا میں ان کا رزق یوں فراخ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے فَے اور غنیمت کا مال ان کے لیے جہاد کرنے کی وجہ سے خاص کر دیا۔ رزق میں فراخی اس طرح بھی کی گئی کہ انصار کے سینے مہاجرین کے لیے کشادہ کر دیے گئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾

[1] النحل 16:41، 42. [2] البقرة 2:218. [3] تفسير القرطبي، تفسير أبي السعود، البقرة 2:218. [4] النسآء 4:100.

’’اور (مالِ فے ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنالیا تھا اور ان (مہاجرین کی مدینہ تشریف آوری) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچالیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔‘‘ [1]

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین سے دنیا میں رزق کی فراخی کا وعدہ فرمایا۔ یہ وعدہ پورا ہوا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کرنے والوں کو واضح طور پر تمام ممکنہ خطرات سے آگاہ کیا اور راہ ہجرت میں پیش آنے والے تمام مصائب حتی کہ موت کا ذکر بھی کر دیا۔ اس کے ساتھ چند ایسے حقائق بھی سامنے رکھ دیے جن سے اطمینان قلب اور ہجرت کے سلسلے میں اللہ کی طرف سے ضمانت حاصل ہوتی ہے۔ ضمانت کا مطلب یہ ہے کہ ہجرت اللہ کے راستے میں ہوگی۔ اسلام میں یہی ہجرت معتبر ہے، نہ کہ وہ ہجرت جو حصولِ مال، دکھوں سے نجات، لذتوں کے حصول یا دنیاوی ساز وسامان اکٹھا کرنے کی غرض سے ہو۔ اللہ کے لیے کی گئی ہجرت ہی اللہ کے ہاں مقبول ہے اور اللہ ہی کے لیے ہجرت کرنے والا مہاجر زمین میں کشادگی، نجات اور رزق پائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ اسی کا مددگار ہوگا اور اسی کی راہنمائی کرے گا۔ [2]

گناہوں کی مغفرت بھی مہاجرین کے لیے خصوصی انعام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ ﴾

’’پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور انھیں ان کے گھروں سے نکال دیا گیا اور میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں اور انھوں نے جہاد کیا اور وہ قتل ہوئے تو میں ضرور ان کی برائیاں ان سے ختم کردوں گا اور یقیناً انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے معاوضہ ہوگا اور اللہ ہی کے پاس بہترین ثواب ہے۔‘‘ [3]

رسول اللہ ﷺ کے متعدد فرامین اس امر کے شاہد ہیں کہ ہجرت گناہوں کی مغفرت کا اہم ذریعہ ہے۔ سیدنا عمرو

[1] الحشر 9:59. [2] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 745/2. [3] آل عمرٰن 195:3.

بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَمَا عَلِمْتَ يَا عَمْرُو! أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟ وَ أَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا وَ أَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟»

''اے عمرو! کیا آپ کو علم نہیں کہ اسلام کی قبولیت پچھلے گناہوں کو مٹا دیتی ہے؟ ہجرت اور حج بھی سابقہ تمام گناہوں کا خاتمہ کر دیتا ہے۔'' [1]

قرآن کریم میں مہاجرین کے لیے انعامات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے جنت کے استحقاق اور اس میں ہمیشہ کے قیام کا ذکر بھی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ○﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں (وہ) سب سے بڑھ کر ہیں اور وہی مراد پانے والے ہیں، ان کا رب انھیں اپنی طرف سے رحمت اور رضامندی اور ایسے باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ابد تک۔ بے شک اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔'' [2]

امام رازی لکھتے ہیں: ''آیت کریمہ میں جن افراد کو چار صفات سے متصف بتایا گیا ہے، وہ عظمت کے مینار ہیں۔ انسان کے پاس بنیادی طور پر تین ہی چیزیں ہیں: روح، بدن اور مال و متاع۔ مہاجرین کی روح اسلام لانے کے بعد اوج کمال تک جا پہنچی۔ بدن اور مال انھوں نے ہجرت اور جہاد پر قربان کر دیے، حالانکہ یہ دونوں چیزیں انسان کی محبوب ترین چیزیں ہیں۔ وہ انھیں اِسی صورت میں چھوڑ سکتا ہے جب ان سے زیادہ محبوب شے پالے۔ مہاجرین کے نزدیک اللہ کی رضا جان و مال سے زیادہ محبوب نہ ہوتی تو وہ آخرت کو دنیا پر کبھی ترجیح نہ دیتے، نہ جان و مال کی قربانی پیش کرتے، لہٰذا ثابت ہوا کہ ان چار صفات سے متصف انسان انسانیت کے اعلیٰ معیار تک پہنچ جاتا ہے۔ یوں مہاجرین مطلق طور پر ساری انسانیت پر فائق تھے۔ جو صفات ان میں پائی جاتی تھیں، انھوں نے انھیں سعادت و فضیلت کے اعلیٰ درجے پر پہنچا دیا۔'' [3]

[1] صحيح مسلم :121. [2] التوبة 9:20-22. [3] تفسير الرازي، التوبة 9:20-22.

مہاجرین نے ایمانِ راسخ اور یقینِ محکم کی بدولت اسلامی دعوت کو جو ابھی ابتدائی مراحل میں تھی، جاہلیت کے ہاتھوں زندہ درگور ہونے سے بچا لیا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی وحی کی تعلیمات پر مستقل مزاجی سے عمل کیا۔ قریش کی شدید مخالفت نے ان کی استقامت میں اضافہ ہی کیا۔ مشرکین کے ظلم و ستم حد سے بڑھ گئے تو اللہ تعالیٰ نے صابر مومنین کو ہجرت کی اجازت دے دی۔ انھوں نے گھربار، مال و متاع کو خیر باد کہا اور مدینہ روانہ ہو گئے۔ یہ ہجرت کفر کے ڈر سے نہیں تھی، نہ اس میں دنیاوی اغراض کا کوئی شائبہ تھا۔ مسلمان اس ہجرت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے طلبگار اور اس کی رضا کے متلاشی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس دنیا میں فضلِ الٰہی کے مستحق ٹھہرے اور قیامت کے دن ثوابِ عظیم سے بہرہ مند ہوں گے۔ [1]

مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی سازش

ایک مرتبہ ایک بوڑھا یہودی شاس بن قیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے پاس سے گزرا۔ یہ شخص انتہائی کینہ پرور تھا اور مسلمانوں سے شدید حسد رکھتا تھا۔ صحابہ کرام کی جماعت میں اوس وخزرج اکٹھے بیٹھے لطف و محبت کی باتیں کر رہے تھے۔ شاس بن قیس صحابہ کی الفت و محبت اور اسلامی بھائی چارے کا یہ خوبصورت منظر برداشت نہ کر سکا۔ اس نے ایک یہودی جوان کو، جس کے انصار سے تعلقات تھے، اُکسایا کہ وہ اس مجلس میں شریک ہو جائے اور کسی حوالے سے جنگ بعاث اور اس سے پہلے کی جنگوں کا ذکر چھیڑ دے اور ان موقعوں پر کہے ہوئے اشعار بھی پڑھے تاکہ دونوں قبیلوں کے پُرانے زخم ہرے ہو جائیں اور جاہلی حمیت اپنا رنگ دکھائے۔

یہ سازش بے نتیجہ نہیں رہی۔ ان دونوں قبیلوں کی رگِ رقابت پھڑک اٹھی۔ قریب تھا کہ تلواریں میانوں سے نکل آتیں، اتنے میں رسول اللہ ﷺ مہاجرین کے ساتھ تشریف لے آئے۔ آپ ﷺ نے اپنے ارشادات کی برکت سے ان کے ایمان کا شعلہ فروزاں اور ان کا دینی جذبہ بیدار کر دیا۔ آپ ﷺ نے انھیں اللہ تعالیٰ سے ڈرایا اور فرمایا: ''میرے ہوتے ہوئے بھی تم جاہلیت کی پکار لگا رہے ہو، حالانکہ اللہ نے تمھیں اسلام کی ہدایت عطا کر دی ہے اور اسلام کی بدولت تمھیں معزز بنا دیا ہے۔ تمھیں جاہلیت سے چھٹکارا دلایا، تمھیں کفر کی ضلالت سے نکالا اور بھائی بھائی بنا دیا۔'' یہ ارشادِ عالی سن کر انھیں احساس ہوا کہ وہ دشمن کی سازش کا شکار ہو گئے تھے۔ پھر ان کی آنکھوں سے اشک رواں کی جھڑی لگ گئی۔ اوس وخزرج یوں بغل گیر ہو گئے جیسے کوئی ناگوار بات ظہور ہی میں نہیں آئی تھی۔ [2]

---

[1] هجرة الرسول و صحابته في القرآن و السنة لأحمد عبدالغني، ص:333,332. [2] تفسير الطبري، تفسير البغوي، آل عمرٰن 3:98,99.

شاس بن قیس کی اس گھناوئی سازش کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿ قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ○ قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ ﴾ (آل عمرٰن 3:98,99)

''(اے نبی!) کہہ دیجیے! اے اہل کتاب! تم اللہ کی آیتوں کا انکار کیوں کرتے ہو؟ اللہ اس پر گواہ ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! تم اس شخص کو اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو جو ایمان لے آیا؟ تم چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھے راستے پر چلے، حالانکہ تم خود (اس کے) گواہ ہو اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں۔'' [1]

رسول اللہ ﷺ کو درپیش نت نئے مسائل

مکہ میں دعوتِ اسلام کو روکنے والے صرف قریش تھے جبکہ مدینہ میں مشرکین، یہود اور نصاریٰ سب مخالف تھے۔ یہاں مشرکین اور یہودیوں کی اکثریت تھی۔ عیسائی قلیل تعداد میں تھے۔ مدینہ کے آس پاس کے قبائل بھی اسلامی دعوت کے سخت مخالف تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سب سے بیک وقت معاملہ فہمی کا ایسا برتاؤ فرمایا کہ تاریخ عالم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

سب سے پہلے آپ ﷺ نے مہاجرین و انصار کے درمیان مؤاخات (اسلامی بھائی چارہ) کا رشتہ قائم کیا، پھر یہود اور مسلمانوں کے درمیان معاہدہ تحریر کیا جو تاریخ میں پہلا دستاویزی معاہدہ کہلاتا ہے۔ اسی طرح مدینہ کے آس پاس کے قبائل سے بھی آپ ﷺ نے معاہدے کیے۔ ان سب معاہدوں کی تفصیل آیندہ صفحات میں آئے گی۔

[1] السيرة لابن هشام: 556,555/2، نبی رحمت ﷺ، ص: 235-237.

ہجرت کے بعد مرض و شفا، اولین پیدائش اور وفات

ابوبکر، عامر بن فہیرہ اور بلال رضی اللہ عنہم کی بیماری اور دعائے نبوی

جب مہاجرین نے مدینہ میں سکونت اختیار کر لی تو ان پر مدینہ کا وبائی بخار مسلط ہوگیا۔ مدینہ کی یہ وبا جاہلیت کے زمانے میں سب کے ہاں معروف تھی۔ کوئی بھی انسان جب مدینہ میں داخل ہوتا اور یہ چاہتا کہ وہ مدینہ کی وبائی بیماری سے محفوظ رہے تو اس سے کہا جاتا تھا کہ وہ گدھے کی طرح رینکے۔ [1]

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو آپ کے صحابہ کو مدینہ کے بخار نے آلیا اور انھیں سخت مشقت و تکلیف میں مبتلا کر دیا حتی کہ وہ نماز بھی بیٹھ کر ادا کرنے لگے۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے نکلے۔ اس وقت صحابہ بیٹھ کر ہی نماز ادا کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جان لو! بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کا اجر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کے اجر کا نصف ہے۔“ مسلمان اپنے ضعف اور بیماری کے باوجود کھڑے ہوگئے تاکہ وہ فضیلت حاصل کر سکیں۔ [2]

بیماری میں مبتلا ہونے والے حضرات

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو وہاں بخار کی وبا پھیلی ہوئی تھی جس کی زد میں آکر بہت سے صحابہ بھی بیماری اور شدید اذیت میں مبتلا ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بخار سے محفوظ رکھا۔ سیدہ فرماتی ہیں: ایک ہی گھر میں ابوبکر، بلال اور عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہم رہتے تھے۔ بلال اور عامر رضی اللہ عنہما ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان سب کو بخار نے آلیا۔ یہ حجاب کی پابندی سے پہلے کی بات ہے۔

وبا میں مبتلا شخصیات کے منظوم تاثرات

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں اپنے والد کے قریب پہنچی اور پوچھا: اباجان آپ کیسے ہیں؟ اس پر انھوں نے یہ

[1] فتح الباري: 328,327/7. [2] السيرة لابن هشام: 590/2.

شعر کہا:

كُلُّ امْرِئٍ مُّصَبَّحٌ فِي أَهْلِهِ   وَالْمَوْتُ أَدْنٰى مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ

"ہر شخص اپنے گھر والوں کے ساتھ صبح کرتا ہے اور موت تو اس کی چپل کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے (دل میں) کہا: پتہ نہیں والد گرامی کیا کہہ رہے ہیں۔ پھر میں عامر بن فہیرہ کے پاس گئی۔ میں نے پوچھا: اے عامر! تمھارا کیا حال ہے؟ انھوں نے جواب میں یہ اشعار کہے۔

لَقَدْ وَجَدْتُ الْمَوْتَ قَبْلَ ذَوْقِهِ   إِنَّ الْجَبَانَ حَتْفُهُ مِنْ فَوْقِهِ

كُلُّ امْرِئٍ مُّجَاهِدٌ بِطَوْقِهِ   كَالثَّوْرِ يَحْمِي جِلْدَهُ بِرَوْقِهِ

"میں نے موت کا ذائقہ اس کے چکھنے سے پہلے ہی محسوس کر لیا ہے۔ بے شک بزدل کی موت اس کے سر پر سوار رہتی ہے۔ ہر آدمی اپنی طاقت کے مطابق کوشش کرتا ہے جیسے بیل اپنے آپ کو سینگوں کے ذریعے بچاتا ہے۔"

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے کہا: اللہ کی قسم! معلوم نہیں عامر کیا کہہ رہا ہے۔ بلال رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ جب بخار میں تھوڑی تخفیف ہوتی تو گھر کے صحن میں لیٹ جاتے اور بلند آواز میں یہ اشعار دہراتے:

أَلَا لَيْتَ شِعْرِي هَلْ أَبِيتَنَّ لَيْلَةً   بِوَادٍ وَّحَوْلِي إِذْخِرٌ وَّجَلِيلُ

وَهَلْ أَرِدَنَّ يَوْمًا مِيَاهَ مَجَنَّةٍ   وَهَلْ يَبْدُوَنْ لِي شَامَةٌ وَّطَفِيلُ

"کاش! مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ میں ایک رات بھی وادی مکہ میں گزار سکوں گا جبکہ میرے اردگرد (خوشبودار گھاس) اذخر اور جلیل ہوں گی، اور کیا ایک دن بھی مجھے ایسا ملے گا جب میں مقام مجنہ کے پانی پر جاؤں گا اور کیا میں شامہ اور طفیل کی پہاڑیاں ایک نظر دیکھ سکوں گا۔"

بیماری کی جحفہ منتقلی

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور کہا: بخار کی شدت اتنی ہے کہ یہ لوگ حواس باختہ ہو گئے ہیں اور اپنی ہی کہی ہوئی باتوں کو سمجھ نہیں پا رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ! حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ، وَصَحِّحْهَا وَبَارِكْ لَنَا فِي صَاعِهَا وَمُدِّهَا، وَانْقُلْ حُمَّاهَا فَاجْعَلْهَا بِالْجُحْفَةِ»

''اے اللہ! مدینہ کو ہمارے لیے ویسا ہی محبوب بنا دے جیسا محبوب مکہ تھا یا اس سے بھی زیادہ اور اسے

اذخر گھاس

درست فرما دے اور اس کے مُد اور صَاع میں برکت فرما اور اس کی وبا کو جُحْفَه کی طرف منتقل فرما۔''[1]

صحابہ میں سے جن کی بیماری کا ذکر ملتا ہے، ان میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی وجہ سے یہ بیماری مَهْيَعَهْ کی طرف منتقل ہوگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے خواب دیکھا کہ ایک بکھرے بالوں والی کالی عورت مدینہ سے نکل گئی اور مَهْيَعَهْ میں جا بسی۔ میں نے اس کی تاویل یہ کی کہ مدینہ کی وبا مھیعہ منتقل کر دی گئی ہے۔''[3] مَهْيَعَهْ اور جُحْفَه ایک ہی مقام کے دو نام ہیں۔

ہشام بن عروۃ کہتے ہیں: جُحْفَه (مھیعہ) میں پیدا ہونے والے بچے کو بیماری بلوغت سے پہلے ہی قتل کر دیتی ہے۔[4]

مہاجرین میں سے پہلے فوت ہونے والے فرد

سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سابقین الاولین میں سے ہیں۔ ان کے احوال جلد سوم میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں بعد از ہجرت صرف ان کی وفات کا تذکرہ ہے۔ یہ ہجرت کے 22 ماہ بعد، سن دو ہجری میں غزوۂ بدر میں شرکت کے بعد فوت ہوئے۔ مہاجرین میں یہ پہلے فرد ہیں جو مدینہ میں فوت ہوئے اور بقیع میں دفن ہوئے۔[5]

[1] صحيح البخاري: 3926، السيرة لابن هشام: 589,588/2. [2] صحيح البخاري: 3918. [3] صحيح البخاري: 7039,7038. [4] دلائل النبوة للبيهقي: 568/2. [5] الاستيعاب، ص: 512,511، أسد الغابة: 227,226/3، الإصابة: 382,381/4.

انصار میں سے پہلے فوت ہونے والے صحابی

انصار میں سب سے پہلے فوت ہونے والے صحابی اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے واقدی کی سند سے لکھا ہے کہ سیدنا اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ ہجرت کے چھ ماہ بعد شوال میں فوت ہوئے۔ یہ بدر سے پہلے کی بات ہے۔ اس موقع پر مسجد نبوی کی تعمیر جاری تھی۔[1]

سنن ابن ماجہ اور اسد الغابہ وغیرہ میں ہے: اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ شوال یکم ہجری میں جنگِ بدر سے پہلے فوت ہوگئے۔ ان کی موت دل کے مرض (Angina) یا خناق سے ہوئی تھی۔ عربی میں اسے الذُّبحة کہتے ہیں۔ جب یہ فوت ہوئے، اس وقت مسجد نبوی کی تعمیر جاری تھی۔[2]

سیدنا اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے واقدی کے حوالے سے یہ دوسرا قول بھی لکھا ہے: اسعد رضی اللہ عنہ ہجرت کے نو ماہ بعد فوت ہوئے۔ انھوں نے ابن اسحاق رحمہ اللہ کے واسطے سے لکھا ہے کہ یہ شوال کا مہینہ تھا۔ امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ اسعد رضی اللہ عنہ ہجرت کے بعد فوت ہونے والے پہلے صحابی ہیں اور یہی وہ پہلے شخص ہیں جن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازہ پڑھا۔

واقدی نے عبداللہ بن ابی بکر بن حزم کی سند سے روایت کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ انصار کہتے ہیں: بقیع میں سب سے پہلے اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ دفن ہوئے اور مہاجرین کہتے ہیں کہ وہاں اولین مدفون عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ ہیں۔[3]

انصار صحابہ میں سے پہلے فوت ہونے والوں میں ایک نام سیدنا کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا ہے: کلثوم رضی اللہ عنہ جنگِ بدر سے تھوڑی مدت پہلے فوت ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے فوت ہونے والوں میں سے ہیں۔ امام طبری، ابن قتیبہ اور سہیلی رحمہم اللہ نے کہا ہے: حضرت کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ انصار میں سب سے پہلے فوت ہوئے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ تشریف آوری کے تقریباً ایک ماہ بعد فوت ہوگئے تھے جبکہ مسجد نبوی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر ابھی زیرِ تعمیر تھے۔ ان کی وفات ابوامامہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ سے پہلے ہوئی تھی۔[4]

ہجرت سے پہلے فوت ہونے والے صحابی

کتب احادیث و تاریخ میں ایک اور صحابی کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ ہجرت کرنے سے

[1] الاستیعاب، ص: 79. [2] سنن ابن ماجه: 3492، أسد الغابة: 84/1، واللفظ له. [3] الإصابة: 209,208/1، المستدرك للحاكم: 187,186/3، شرح سنن أبي داود للعيني: 272/5. [4] الاستیعاب، ص: 633، أسد الغابة: 543/3، الإصابة: 462/5، الروض الأنف: 377/1، 331/2.

پہلے ماہ صفر میں فوت ہوئے۔ ان کا اسم گرامی سیدنا براء بن معرور رضی اللہ عنہ ہے۔ یہ بنوسلمہ کے نقیب تھے اور عقبہ اولیٰ میں شامل تھے۔ نقیبوں میں سے انھی نے پہلے بات شروع کی تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے قبلہ (کعبۃ اللہ) کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی تھی۔ جب ستر انصاریوں نے بیعت کی تھی تو یہی تھے جنھوں نے سب پہلے اپنا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں دیا تھا۔ یہ پہلے صحابی ہیں جنھوں نے قبر میں اپنا چہرہ بیت اللہ (کعبہ) کی طرف کرنے کی وصیت کی۔ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو ان کی قبر پر گئے اور ان کی نمازِ جنازہ پڑھی۔[1]

ہجرت کے بعد مسلمانوں کے ہاں پہلے بچے کی پیدائش

اس دنیا کا تسلسل نسل آدم کے تسلسل کے ساتھ ہے۔ آدم کی اولاد میں سے جو صراط مستقیم پر گامزن ہیں، وہ یقیناً خوش قسمت ہیں۔ مسلمان مکہ چھوڑ کر مدینہ آئے تو مشرکوں اور یہودیوں نے یہ پراپیگنڈا کیا کہ مسلمانوں کی نسل منقطع ہوگئی ہے۔ یہودی کہنے لگے: ہم نے ان پر جادو کر دیا ہے، لہٰذا اب ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوگا۔ مگر جب مہاجرین کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ پہلا خوش قسمت بچہ سیدنا عبداللہ بن زبیر بن عوام قرشی تھا (رضی اللہ عنہ)۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دندانِ مبارک سے کھجور چبا کر ان کے منہ میں ڈالی۔ ان کا نام عبداللہ رکھا۔ یہ بچہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کا بیٹا ہے۔

علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ہجرت کے وقت اسماء رضی اللہ عنہا حاملہ تھیں مگر بچے کی پیدائش دو ہجری میں ہوئی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہجرت کے پہلے سال ان کی پیدائش ہوئی اور یہ ہجرت کے بعد مسلمانوں میں پیدا ہونے والا پہلا بچہ تھا۔

ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے ہشام بن عروہ کے حوالے سے لکھا ہے: سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: مکہ ہی میں میرے پیٹ میں عبداللہ کا حمل تھا، پھر میں ہجرت کر کے مدینہ آ گئی، ابھی قباء ہی میں تھی کہ بچے کی ولادت ہوگئی، پھر میں بچے کو لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ نے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔ پھر آپ ﷺ نے ایک کھجور منگوا کر چبائی اور نرم کر کے بچے کے منہ میں ڈال دی۔ پہلی شے جو اِس بچے کے پیٹ میں گئی، وہ آپ ﷺ کا لعاب مبارک تھا۔ آپ ﷺ نے اسے کھجور کی گھٹی دی، پھر دعا کی اور مبارک باد دی۔[2]

---

[1] المستدرك للحاكم: 199/3، أسد الغابة: 202,201/1. [2] الاستيعاب، ص: 452، أسد الغابة: 598,597/2، البداية والنهاية: 229,228/3، تاريخ الطبري: 119/2.

تکمیل نماز

نماز کو دین اسلام میں اساسی حیثیت حاصل ہے اور نماز ہی تمام عبادات کی اصل ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں خاص خاص احکام بڑے اہتمام سے نازل ہوتے رہے۔ مکہ میں نماز کا آغاز ہوا تو اُس وقت صرف دو نمازیں تھیں۔ ایک صبح کے وقت، دوسری دن کے آخری پہر۔ ان نمازوں کی رکعات کی تعداد دو دو تھی۔ ایک قول کے مطابق صرف رات کی نماز تھی جس کی رکعات کی تعداد معین نہ تھی۔

کچھ عرصہ اسی پر عمل رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو شرفِ معراج سے نوازا تو اس موقع پر آپ ﷺ اور آپ کی امت کو جو خاص تحفہ عنایت فرمایا، وہ دن اور رات کی پانچ نمازیں ہیں۔ جب رسولِ کریم ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو نمازوں کی رکعات میں اضافہ کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، فرماتی ہیں:

فَرَضَ اللّٰهُ الصَّلَاةَ حِينَ فَرَضَهَا رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ فِي الْحَضَرِ وَالسَّفَرِ، فَأُقِرَّتْ صَلَاةُ السَّفَرِ، وَزِيدَ فِي صَلَاةِ الْحَضَرِ.

''اللہ تعالیٰ نے جب نماز فرض کی تو حضر وسفر کی نماز دو دو رکعتیں فرض کیں، پھر سفر کی نماز تو وہی رہی، البتہ حضر (مقیم) کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا۔''[1]

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ذکر ہے کہ نماز میں اضافہ ہجرت کے بعد ہوا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

فُرِضَتِ الصَّلَاةُ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ هَاجَرَ النَّبِيُّ ﷺ فَفُرِضَتْ أَرْبَعًا، وَتُرِكَتْ صَلَاةُ السَّفَرِ عَلَى الْأُولٰى.

''نماز کی دو رکعتیں فرض ہوئی تھیں، پھر نبی کریم ﷺ نے مدینہ ہجرت کی تو نماز کی چار رکعتیں فرض ہوگئیں جبکہ سفر کی نماز اپنی پہلی حالت ہی پر چھوڑ دی گئی۔''[2]

بعض روایات میں یہ الفاظ آئے ہیں:

[1] صحيح البخاري: 350، صحيح مسلم: 685. [2] صحيح البخاري: 3935.

وَتُرِكَتْ صَلَاةُ السَّفَرِ عَلَى الْفَرِيضَةِ الْأُولٰى.

"اور سفر کی نماز اولین فرضیت والی حالت پر چھوڑ دی گئی۔" [1]

بعض دیگر روایات میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے:

إِنَّ أَوَّلَ مَا فُرِضَتِ الصَّلَاةُ رَكْعَتَيْنِ، فَلَمَّا قَدِمَ نَبِيُّ اللّٰهِ ﷺ الْمَدِينَةَ وَاطْمَأَنَّ زَادَ رَكْعَتَيْنِ غَيْرَ الْمَغْرِبِ لِأَنَّهَا وِتْرٌ، وَصَلَاةِ الْغَدَاةِ لِطُولِ قِرَاءَتِهَا ......

"پہلے پہل دو رکعت نماز فرض ہوئی، پھر جب نبیِ کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے اور یہاں اطمینان حاصل ہوگیا تو آپ نے دو رکعتوں کا اضافہ کر دیا سوائے مغرب کی نماز کے کیونکہ وہ وتر (طاق) ہے اور فجر کی نماز کے، کیونکہ اس میں قراءت زیادہ لمبی کی جاتی ہے۔" [2]

صحیح ابن حبان اور صحیح ابن خزیمہ وغیرہ کے الفاظ ہیں: وِتْرَ النَّهَارِ یعنی "دن کے وتر۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ پہلے پہل نماز دو دو رکعتیں تھی سوائے مغرب کے کیونکہ وہ دن کے وتر ہیں۔ بعد میں اس میں دو دو رکعت کا اضافہ کیا گیا تو نماز چار چار رکعات والی ہوگئی سوائے نماز فجر کے کہ اس میں قراءت لمبی ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت کے الفاظ ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ الصَّلَاةَ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّكُمْ ﷺ عَلَى الْمُسَافِرِ رَكْعَتَيْنِ وَعَلَى الْمُقِيمِ أَرْبَعًا وَفِي الْخَوْفِ رَكْعَةً.

"بے شک اللہ تعالیٰ نے تمھارے نبی (ﷺ) کی زبانی مسافر کے لیے دو رکعتیں، مقیم کے لیے چار رکعتیں اور خوف کی حالت میں ایک رکعت نماز فرض کی ہے۔" [3]

یہ حدیث بظاہر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مخالف معلوم ہوتی ہے مگر اس میں مخالفت والی کوئی بات نہیں کیونکہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ایک ایسے معاملے کی خبر دے رہے ہیں جس پر بعد میں عمل ہوتا رہا۔ [4]

شیخ البانی رحمہ اللہ نے السلسلة الصحيحة میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مخالف اقوال و آراء کا مفصل جواب دیا ہے۔ [5]

---

[1] صحيح مسلم: 685، سنن النسائي: 455، السنن الكبرٰى للبيهقي: 363/1. [2] السنن الكبرٰى للبيهقي: 363/1، صحيح ابن حبان: 447/6، صحيح ابن خزيمة: 157/1. [3] صحيح مسلم: 687، مسند أحمد: 237/1. [4] الثمر المستطاب، ص: 51. [5] دیکھیے: السلسلة الصحيحة: 6(2)/744-764، حديث: 2814.

نماز کی تکمیل کب ہوئی؟

سابقہ روایات سے معلوم ہوا کہ مکہ میں دو دو رکعت نماز فرض ہوگئی تھی، البتہ اس کی تکمیل (چار رکعت) کب ہوئی؟ اس کے بارے میں علامہ عینی رحمہ اللہ نے صحیح بخاری کی شرح ''عمدۃ القاری'' میں لکھا ہے: امام دولابی رحمہ اللہ نے کہا ہے: مقیم کی نماز کی تکمیل کا حکم بروز منگل بارہ ربیع الآخر کم ہجری کو نماز ظہر کے وقت اترا، یعنی رسول اللہ ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے ایک ماہ بعد۔ عیون الاثر میں علامہ ابن سید الناس رحمہ اللہ نے بھی ایک ماہ کا وقت لکھا ہے۔ [1]

ایک قول یہ بھی ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ تشریف لائے تو وہ فرض نمازوں کے بعد نفل پڑھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ انھیں ہدایت فرماتے تھے کہ اپنے رب کی تخفیف قبول کرو (اور زائد نماز ادا نہ کرو) مگر صحابہ پڑھتے رہے حتی کہ ہجرت کے ایک ماہ بعد بارہ ربیع الآخر کو رسول اللہ ﷺ نے انھیں ظہر کی نماز چار رکعت پڑھائی، پھر یہی تعداد فرض ٹھہری۔ [2]

امام سہیلی رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی سابقہ روایت بیان کر کے اس کے متعلق ائمہ کے اقوال بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد حدیث عائشہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: فُرِضَتِ الصَّلَاةُ کے معنی ہوں گے: معراج کی رات جب پانچ نمازیں فرض ہوئیں، اس وقت دو دو رکعت نماز فرض ہوئی۔ حضر (مقیم) کی نماز میں اضافہ اس کے بعد کیا گیا۔ یہ بات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرنے والوں میں سے بعض سے مروی ہے۔ امام حسن بصری اور امام شعبی رحمہما اللہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ حضر کی نماز میں اضافہ ہجرت کے ایک سال بعد یا اس کے قریب زمانے میں ہوا۔ [3]

---

[1] عمدة القاري: 192/7. [2] البدء والتاريخ: 274/1. [3] الروض الأنف: 424،423/1.

مسجد نبوی کی تعمیر

تعمیر و توسیع، روضہ شریف کی زیارت اور سلام کے آداب،
محراب و منبر نبوی، اور تکمیل نماز

”اور یہ کہ مسجدیں اللہ ہی کے لیے ہیں، لہٰذا اللہ کے ساتھ
کسی کو بھی نہ پکارو۔“ (الجن 72:18)

اس باب میں

مسجد مسلمانوں کا دینی، تعلیمی، سیاسی، فلاحی اور دفاعی مرکز ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے سب سے پہلے مسجد کی تعمیر پر توجہ فرمائی۔ اولاً مسجد قبا تعمیر کرائی اور پھر مسجد نبوی بنوائی۔ مسجد کی تعمیر کے کام میں دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ آپ ﷺ بھی بہ نفسِ نفیس پوری طرح شریک رہے اور اپنے شانۂ مبارک پر پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے رہے۔ آپ ﷺ مسلمانوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے کس قدر آرزومند تھے؟ اِس کا ثبوت مسجد نبوی ہی میں اس اقامتی درسگاہ سے ملتا ہے جو آپ ﷺ نے اصحابِ صفہ کے لیے بنوائی۔ یہاں آپ مفلوک الحال اور بے خانماں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن کریم اور دینی مبادیات کی تعلیم دیتے تھے۔ مسجد نبوی پتھر کی دیواروں اور کھجور کے تنوں والی چھت پر مشتمل تھی۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور زمانے اور زندگی کی ضروریات کے پیش نظر مسجد نبوی کی توسیع ہوتی رہی۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ مسجد نبوی توسیع، تعمیر اور تزئین کے کن کن مراحل سے گزری؟ اس بارے میں آپ کو اس باب میں اسلافِ کرام کے زمانے سے لے کر عصرِ حاضر تک کے تمام ارتقائی حالات کی مکمل تفصیلات ملیں گی۔

مسجد نبوی

مسجد دینی زندگی کا مرکز ہے

مسجد روئے زمین کا سب سے زیادہ اچھا، محترم اور مقدس مقام ہے۔ مسجد کی اِس سے بڑی فضیلت اور کیا ہوگی کہ یہ رب ذوالجلال کے حضور سجدہ کرنے کی جگہ ہے۔ رسالت مآب ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ مسجد متقی کا گھر ہے۔[1] جو مسلمان مسجد میں آتا ہے، وہ اللہ رب العزت کا مہمان ہوتا ہے۔ میزبان پر مہمان کی میزبانی لازم ہوجاتی ہے۔[2] رسول اللہ ﷺ نے جن خوش قسمت افراد کی نسبت فرمایا ہے کہ انھیں قیامت کے دن عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی، اُن میں ایک وہ شخص بھی ہوگا جس کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہے۔[3] اللہ تعالیٰ کو [illegible] ہیں۔[4] جس مسلمان کی حرارتِ ایمانی جس قدر تیز ہوگی، وہ اسی نسبت سے مسجد کا دلدادہ ہوگا اور مسلمانوں کی

[1] المعجم الكبير للطبراني :255,254/6، حديث : 6143، السلسلة الصحيحة : 716. [2] المعجم الكبير للطبراني : 254,253/6، حديث : 6139، السلسلة الصحيحة : 1169. [3] صحيح البخاري : 1423، صحيح مسلم : 1031. [4] سنن ابن ماجه : 800.

جماعت سے اس کا ربط و ضبط اتنا ہی گہرا ہوگا۔ ایک مسلمان جب مسجد میں پانچ مرتبہ حاضری دیتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ سے اس کے تعلق کی بڑی معتبر نشانی ہوتی ہے۔ مسجد میں حاضری کا التزام رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مقدسہ کی پیروی کی علامت ہے۔

مکہ میں رسول اللہ ﷺ مسجد الحرام میں نماز ادا کرتے تھے اور یہی لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی۔ اس کے چاروں طرف بت تھے۔ ہر طرف شرکیہ امور جاری تھے۔ امور حج میں بھی شرک داخل ہو چکا تھا۔ لوگ ننگے طواف

طواف کعبہ کا منظر

کرتے تھے۔ طواف میں سیٹیاں اور تالیاں بجائی جاتی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں مسجد کا معنی و مفہوم اور تقدس ہی ختم ہو چکا تھا۔ بس نام کی حد تک حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی یاد باقی تھی۔

مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری ہوئی تو لوگوں کے ایک جگہ مل کر عبادت کرنے اور دوسرے ضروری معاملات انجام دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے مسجد کے لیے وہ جگہ پسند فرمائی جہاں آپ ﷺ کی اونٹنی بیٹھ گئی تھی۔ یہ جگہ سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے سامنے تھی۔

مسجد و مدرسہ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ

مسجد صرف جائے نماز ہی نہ تھی بلکہ یہ ایک یونیورسٹی

تھی جہاں مسلمان دین و دنیا کی تعلیم پاتے تھے، اعلیٰ اخلاقیات اور اقتصادیات کے علوم حاصل کرتے تھے۔ یہیں سے بگڑے ہوئے لوگوں کو راہِ ہدایت پر لانے کے لیے لشکر روانہ کیے جاتے تھے۔ یہیں پر آپس کے جھگڑے چکائے جاتے تھے اور یہی وہ مقام تھا کہ جب بھی مسلمانوں کو کوئی اہم معاملہ پیش آتا تو وہ اسی مقامِ مقدس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔

مسجد دل و دماغ کو پاکیزہ بنانے کی جگہ ہے۔ مسجد میں مسلمان کو اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ مسجد مسلمان کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو حیثیت پانی مچھلی کے لیے رکھتا ہے۔ یہ ظاہری و باطنی طہارت کا مقام ہے۔ یہاں جسمانی اور روحانی نظافت حاصل ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«أَرَأَيْتُمْ لَوْ أَنَّ نَهْرًا بِبَابِ أَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ فِيهِ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسًا، مَا تَقُولُ ذٰلِكَ يُبْقِي مِنْ دَرَنِهِ؟» قَالُوا: لَا يُبْقِي مِنْ دَرَنِهِ شَيْئًا، قَالَ: «فَذٰلِكَ مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ يَمْحُوا اللّٰهُ بِهِ الْخَطَايَا»

''اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر کوئی نہر ہو جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو، کیا تم کہہ سکتے ہو کہ اُس پر پھر بھی کوئی میل کچیل باقی رہے گا؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: ایسا کرنے سے تو ذرا سا بھی میل کچیل باقی نہیں رہے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بس پانچوں نمازوں کی مثال ایسی ہی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔''[1]

مسجد کی تعمیر

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے پہلے سیدنا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مہاجرین و انصار کو موجودہ مسجد نبوی کی جگہ پر نماز پڑھایا کرتے اور جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ دراصل یہ جگہ صرف چار دیواری تھی۔ اس پر چھت نہیں تھی۔ اس کا قبلہ بیت المقدس کی طرف تھا۔ اسے سیدنا اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے بنایا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسی جگہ نماز ادا کرتے تھے اور جمعہ پڑھاتے تھے۔ جب سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ اسلامی تعلیمات کے معلم و مبلغ کی حیثیت سے مدینہ آئے تو وہ نماز اور جمعہ پڑھانے لگے، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ واپس مکہ آ گئے تاکہ نبی ﷺ کے ساتھ ہجرت کریں تو ان کی جگہ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نماز پڑھاتے اور خطبہ دیتے رہے اور جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے تو آپ ﷺ بھی اسی جگہ نماز ادا کرتے رہے۔ بعد ازاں آپ ﷺ نے اسی مقام کو مسجد بنا دیا۔[2]

[1] صحيح البخاري: 528، صحيح مسلم: 667، نیز دیکھیے: من معين السيرة، ص: 175-177. [2] الطبقات لابن سعد: 1/239 و 3/609.

مسجد نبوی کے لیے زمین کی خریداری

امام بخاری رحمہ اللہ نے امام زہری رحمہ اللہ سے معلق بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی چلتی رہی حتی کہ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی مسجد کی جگہ جا کر بیٹھ گئی۔ اس جگہ ان دنوں چند مسلمان اکٹھے ہو کر نماز پڑھا کرتے تھے اور یہ جگہ سیدنا اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے زیرِ پرورش دو یتیم بچوں سہیل اور سہل رضی اللہ عنہما کی تھی۔ جب اس جگہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی بیٹھ گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«هٰذَا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ الْمَنْزِلُ»

''ان شاء اللہ یہی ہماری منزل (ٹھہرنے کی جگہ) ہوگی۔''

پھر رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں لڑکوں کو بلایا اور ان سے کھلیان کی قیمت دریافت کی تا کہ یہاں مسجد بنائی جائے۔ ان دونوں نے کہا: ''اللہ کے رسول! ہم یہ زمین آپ کو ہبہ کرتے ہیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے یہ زمین بطور ہبہ قبول نہیں فرمائی بلکہ اسے آپ نے خرید لیا۔ مسجد کی تعمیر شروع ہوئی تو رسول اللہ ﷺ بھی صحابہ کے ساتھ شامل ہو گئے اور بہ نفسِ نفیس اینٹیں اور پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے رہے۔[1]

ابن عیینہ رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بچوں کے چچا سے بات کی کہ وہ ان سے یہ زمین خرید کر دے دیں۔ انھوں نے دونوں بچوں سے بات کی تو انھوں نے پوچھا: ''آپ اس زمین کا کیا کریں گے؟'' انھوں نے بچوں کو اصل حقیقت بتا دی کہ اس جگہ مسجد تعمیر ہوگی۔

چنانچہ اس جگہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ یہاں مسجد تعمیر کی جائے۔ مسجد اور گھروں کی تعمیر مکمل ہونے تک آپ ﷺ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ ہی کے ہاں مقیم رہے۔

ابن سعد کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے گھر سات مہینے تک مقیم رہے۔[2]

صحیح بخاری میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کی ابتدائی باتیں بتاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ بات پسند فرماتے تھے کہ جہاں بھی نماز کا وقت ہو وہیں پڑھ لی جائے، اسی بنا پر آپ ﷺ بکریوں کے باڑے میں بھی نماز پڑھ لیتے تھے۔ جب آپ ﷺ نے مسجد بنانے کا حکم دیا تو بنو نجار کے سرکردہ افراد کو بلا بھیجا۔ وہ حاضر ہو گئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:

«يَا بَنِي النَّجَّارِ! ثَامِنُونِي بِحَائِطِكُمْ هٰذَا»

[1] صحيح البخاري: 424 و 3906. [2] الطبقات لابن سعد: 237/1.

مسجد نبوی کا محل وقوع
الغابہ
زغابہ
بساتین
(باغات)
جبل احد
عین الشہداء
وادی قناۃ
ثنیۃ الوداع
بئر رومہ
بستی بنو حارثہ
احد کاراستہ
حرہ واقم
بئر ابی ایوب
باب شامی
مسجد نبوی
بستی بنو معاویہ
ینبع کاراستہ
بئر السقیا
باب عوالی
باب قباء
مدینہ منورہ
بستی بنو قینقاع
بستی بنو ظفر
بستی بنو قریظہ
بئر اریس
مسجد قباء
قباء
باغات
دار سعد بن خیثمہ
دار کلثوم بن ہدم
بستی بنو نضیر
قلعہ کعب بن اشرف
حرہ
جبل عیر
ذوالحلیفہ
بئر عروہ
العالیہ

''اے آلِ نجار! تم مجھے اپنے اس کھلیان (احاطے) کی قیمت بتاؤ۔''
بنونجار کہنے لگے: ''ہم آپ سے کوئی قیمت نہیں لیں گے، اللہ کی قسم! ہم اس کی قیمت اپنے اللہ سے مانگتے ہیں۔'' [1]
مگر رسول اللہ ﷺ نے بغیر قیمت کے زمین قبول نہیں فرمائی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا: اس کی قیمت ادا کر دو تو اُنھوں رضی اللہ عنہ نے دس دینار اپنی جیب سے ادا کر دیے۔ [2]

مسجد کی تعمیر کا آغاز

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ شہر کے وسط میں ربیع الاول یکم ہجری بمطابق 622ء میں مسجد نبوی کی بنیاد بہ نفسِ نفیس اپنے دستِ مبارک سے رکھی۔ مسجد کی تکمیل ماہ شوال یکم ہجری بمطابق اپریل 623ء کو ہوئی۔
سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''مسجد کی جگہ پر مشرکوں کی قبریں تھیں، کچھ کھنڈر تھے اور چند کھجور کے درخت تھے، مزید برآں پانی کا رِستا ہوا ایک چشمہ بھی تھا جو پانی کی بکثرت نکاسی کی وجہ سے خشک ہوگیا۔ نبی ﷺ نے مشرکین کی قبریں اُکھاڑنے، کھنڈر ہموار کرنے اور کھجور کے درخت کاٹنے کا حکم دیا۔ کھجور کے تنے مسجد کے قبلے کی طرف ایک صف میں لگا دیے گئے، مسجد کے دروازے کے دائیں بائیں دو پتھر رکھ دیے گئے۔
مسجد کے قبلے کی دیوار 70 ہاتھ (تقریباً 35 میٹر) لمبی تھی۔ اس کی چوڑائی 60 ہاتھ، یعنی تقریباً 30 میٹر تھی۔ اس کی بنیاد میں پتھر چنے گئے اور اس کے اوپر کچی اینٹیں لگائی گئیں۔ چھت کی اونچائی 5 ہاتھ تھی۔ مسجد کی تعمیر کے لیے صحابہ کرام دور دور سے پتھر ڈھو ڈھو کر لا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ خود نبی کریم ﷺ بھی پتھر اُٹھا کر لا رہے تھے۔ اس موقع پر آپ فرماتے جاتے تھے:

اَللّٰهُمَّ! لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُ الْآخِرَهْ فَاغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَهْ

''اے اللہ! اصل بھلائی تو آخرت ہی کی بھلائی ہے، تو انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرما۔'' [3]
مسجد کا اولین قبلہ بیت المقدس (مدینہ سے شمال کی جانب) تھا۔ شروع میں مسجد کے تین دروازے بنائے گئے۔ دو دروازے شرقی اور غربی اطراف میں تھے۔ ایک دروازہ پیچھے جنوب کی جانب تھا۔ مسجد کے ان دروازوں پر کواڑ نہیں تھے۔ یہ ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ بس یوں کہیے کہ یہ مسجد میں داخلے کے راستے تھے۔
حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق ان دروازوں کے اطراف میں پتھروں سے بنے ہوئے ستون کھڑے کر دیے گئے تھے۔ [4]

---

[1] صحيح البخاري: 428، صحيح مسلم: 524. [2] الطبقات لابن سعد: 239/1. [3] صحيح البخاري: 428، 3932، تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص: 41. [4] صحيح البخاري: 428.

مشرقی دروازہ باب النبی (ﷺ) کہلاتا تھا۔ اس دروازے کی طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا گھر تھا، اس لیے اس دروازے کو ''باب آل عثمان'' بھی کہا جاتا تھا۔ بعد میں یہ دروازہ ''باب جبریل'' کے نام سے مشہور ہوا۔ مغربی دروازہ ''باب الرحمۃ'' کے نام سے معروف ہے۔ ایک دروازہ مسجد کی پچھلی جانب تھا۔ دیواریں قد آدم کے برابر تھیں۔ کھجوروں کے تنوں کے ستون بنائے گئے اور کھجور کی شاخیں بچھا کر چھت ڈالی گئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: کیا آپ اس پر مٹی کے گارے کا پلستر نہیں کریں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«عَرِيشٌ كَعَرِيشِ مُوسٰى، خُشَيْبَاتٌ وَّ ثُمَامٌ، اَلشَّأْنُ أَعْجَلُ مِنْ ذٰلِكَ»

''بس یہ موسیٰ علیہ السلام کے چھپر جیسا ہی ایک چھپر ہے۔ اس میں چند لکڑیاں اور کچھ ٹہنیاں ہیں جبکہ موت اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔''[1]

مسجد نبوی کی فضیلت

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ»

''میری اس مسجد میں ایک نماز دوسری مسجدوں میں ایک ہزار نمازیں ادا کرنے سے بہتر ہے سوائے مسجد الحرام کے (وہاں ایک لاکھ نماز ادا کرنے کا ثواب ہے۔)''[2]

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی کی فضیلت میں فرمایا:

«لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ مَسْجِدِ الرَّسُولِ ﷺ وَ مَسْجِدِ الْأَقْصٰى»

''تین مسجدوں کے سوا کسی اور مسجد کی طرف (حصولِ ثواب کی نیت سے جانے کے لیے) کجاوے نہ کسے جائیں، وہ تین مسجدیں یہ ہیں: مسجد الحرام، رسول اللہ ﷺ کی مسجد اور مسجد اقصیٰ۔''[3]

مسجد اقصیٰ

صحیح مسلم میں ہے کہ ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن اور عبداللہ الاغر

[1] الطبقات لابن سعد: 240,239/1. [2] صحيح البخاري: 1190، صحيح مسلم: 1394. [3] صحيح البخاري: 1189، صحيح مسلم: 1397.

نے جو بنوجُہینہ کا غلام اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا شاگرد تھا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ فرمار ہے تھے:

مسجد الحرام

«صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ مِنَ الْمَسَاجِدِ، إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ، فَإِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ آخِرُ الْأَنْبِيَاءِ وَ إِنَّ مَسْجِدَهُ آخِرُ الْمَسَاجِدِ»

''رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں ایک نماز ادا کرنا دوسری مسجدوں کے مقابلے میں ایک ہزار نماز ادا کرنے سے افضل ہے سوائے مسجد الحرام کے۔ اللہ کے رسول ﷺ یقیناً آخری نبی ہیں اور آپ کی مسجد آخری مسجد ہے۔'' [1]

مسجد نبوی

یہی حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان کے شاگرد عبداللہ بن ابراہیم بن قارظ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: میں حلفاً کہتا ہوں، میں نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا ہے، وہ کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«فَإِنِّي آخِرُ الْأَنْبِيَاءِ وَ إِنَّ مَسْجِدِي آخِرُ الْمَسَاجِدِ»

''میں یقیناً آخری نبی ہوں اور بے شک میری مسجد آخری مسجد ہے۔'' [2]

علمائے کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں پڑھی جانے والی نماز کی فضیلت کا تعلق ثواب کی بہتات سے ہے۔ اس عظیم المرتبت مسجد میں نماز پڑھنے کا مطلب یہ نہیں کہ کسی کی فوت شدہ نمازیں بھی اسی فضیلت میں شمار کر لی جائیں گی۔ یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ مسجد الحرام یا مسجد نبوی میں پڑھی گئی ایک نماز عدد کے لحاظ سے صرف ایک نماز ہی شمار ہوگی اور صرف ایک ہی نماز کے لیے کفایت کرے گی۔ [3]

آج کل بہت سے نادان لوگ جو نماز سے جی چراتے اور جان چھڑاتے ہیں، وہ حج یا عمرہ کرنے کے بعد کہتے ہیں: ہم نے مسجد الحرام اور مسجد نبوی میں جو نمازیں ادا کی ہیں، وہ ہماری زندگی بھر کی یا اتنے اتنے دنوں کی نمازوں

[1] صحیح مسلم :(507)-1394. [2] صحیح مسلم :(507)-1394. [3] عمدة القاري :374/7، شرح الزرقاني على الموطأ للإمام مالك :5/2، فيض القدير :3783/7.

کے لیے کافی ہیں۔ ان کا یہ خیال صحیح نہیں بلکہ صریحاً قرآن وسنت کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ کسی عالم نے اس طرح کا فتویٰ کبھی نہیں دیا۔

مذکورہ حدیث سے مسجد نبوی کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب آپ ﷺ کی مسجد کے بعد سرے سے کوئی مسجد ہی نہیں بنے گی بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے جیسا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: اس حدیث کے دوسرے ٹکڑے میں ''فا'' ہے۔ یہ کلام کے ربط کے لیے ہوتی ہے۔ گویا آپ ﷺ کی مسجد دوسری مساجد پر اس لیے فضیلت رکھتی ہے کہ یہ دوسری مساجد (جو انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب ہیں) سے متأخر ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ آخری نبی ہیں۔[1]

جنت کا باغیچہ (رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ)

جنت کے باغیچے یا روضہ شریفہ سے مراد مسجد نبوی میں وہ مقام ہے جو رسول کریم ﷺ کے منبر سے لے کر آپ ﷺ کے حجرہ مبارک تک ہے۔ احادیث میں اس جگہ کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے

[1] فتح الباري: 88/3، عمدة القاري: 374/7، تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص: 10.

ریاض الجنۃ کا ایک خوبصورت منظر

منبرِ رسول ﷺ

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَا بَيْنَ بَيْتِي وَمِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ، وَمِنْبَرِي عَلٰى حَوْضِي»

''میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان کی جگہ جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہوگا۔'' [1]

اس حدیث کی شرح میں ابن نجار رحمہ اللہ نے لکھا ہے: بعض نے کہا ہے: آپ ﷺ کے منبر

[1] صحيح البخاري: 1888,1196، صحيح مسلم: 1391.

روضۂ رسول

اور گھر کے درمیان کا حصہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغیچے کے بالمقابل (زمین پر) ایک ٹکڑا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں: یہ فی الواقع حقیقی جنت کا باغیچہ ہے۔ آخرت میں اسی جگہ کو جنت میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ بعض کا کہنا ہے: یہ ٹکڑا رحمت کے نزول کی جگہ ہے اور یہاں ذکر کے حلقے قائم کرنے سے سعادت نصیب ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچے کی طرح ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

- اس سے مراد ہے: جنت کے باغوں کی طرح کا ایک باغ جس میں ذکر کے حلقوں میں شامل ہونے کی طرح رحمتیں نازل ہوتی اور سعادتیں نصیب ہوتی ہیں، خصوصاً اُسی طرح جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں رحمتوں کا نزول اور سعادتوں کا حصول ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے حدیث کے الفاظ میں حرف تشبیہ کے بغیر تشبیہ موجود ہے۔
- یا اس کے معنی ہیں: اس میں عبادت کرنا جنت میں داخلے کی ضمانت ہے۔ اس لحاظ سے جملے میں مجاز ہے۔
- یا یہ جملہ اپنے ظاہری معنوں پر دلالت کرتا ہے اور اس سے حقیقی باغ مراد ہے کہ یہ جگہ آخرت میں بعینہٖ جنت میں لے جائی جائے گی۔ یہ اس حدیث کے بارے میں علمائے کرام کے اقوال کا ماحصل ہے۔

امام سمہودی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ آخری بات میرے ہاں زیادہ قوی ہے اور ابن نجار رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے بھی اسے ظاہر پر محمول کیا ہے کہ یہ "جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور اسے جنت ہی کی طرف منتقل کر دیا جائے گا۔ یہ ٹکڑا باقی عام زمین کی طرح نہیں کہ فنا ہو کر ختم ہو جائے گا۔ امام مالک رحمہ اللہ کی اس بات پر علماء کی ایک جماعت نے موافقت کی ہے۔[1]

حدیث کے دوسرے حصے "میرا منبر میرے حوض پر ہوگا۔" کا مفہوم یہ ہے کہ اسی منبر کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور حوض کوثر پر نصب کر دیا جائے گا۔ اکثر علماء کا کہنا ہے کہ حوض کوثر کا منبر یہی منبر ہوگا۔

اس کی تائید حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے:

«مِنْبَرِي عَلٰى تُرْعَةٍ مِّنْ تُرَعِ الْجَنَّةِ»

"میرا منبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ میں ہوگا۔"[2]

امام طبرانی نے ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث بیان کی ہے:

---

[1] فتح الباري : 130/4، وفاء الوفا :430,429/2. [2] المعجم الأوسط : 96/4. ترعہ کے معنی بلند جگہ پر باغ کے ہیں، مزید برآں اس کے ایک معنی حوض کے بھی ہیں۔ (النهاية لابن الأثير، مادة: ترع)

«إِنَّ قَوَائِمَ مِنْبَرِي رَوَاتِبُ فِي الْجَنَّةِ»

''بے شک میرے منبر کے پائے جنت میں نصب ہوں گے۔'' [1]

بعض نے کہا ہے: اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص نبی ﷺ کے منبر مبارک کا قصد کر کے جائے اور اس کے پاس عبادت کرے تو اس کا یہ عمل اسے حوض کوثر پر پہنچا کر اس مقدس حوض کا پانی پینے کا مستحق بنادے گا۔ [2]

اس حدیث سے بعض علماء نے استدلال کیا ہے کہ مدینہ مکہ سے افضل ہے کیونکہ اس میں ''گھر سے منبر تک'' کا ٹکڑا جنت میں سے ہے۔ جنت کے متعلق ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَقَابُ قَوْسِ أَحَدِكُمْ فِي الْجَنَّةِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا»

''جنت میں تمھاری کمان برابر جگہ دنیا اور اس میں جو کچھ ہے، اس سے بہتر ہے۔'' [3]

ابن حزم ؒ نے فرمایا ہے: یہ کہنا کہ یہ ''جنت سے ہے'' مجاز ہے۔ اگر اسے حقیقی معنی پر رکھا جائے تو پھر اس کا وصف یوں ہونا چاہیے تھا جیسا کہ حقیقی جنت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ○﴾

''بے شک تیرے لیے (یہاں یہ اہتمام) ہے کہ تو اس میں نہ بھوکا ہوگا اور نہ ننگا۔'' [4]

بلکہ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے گھر سے منبر تک کے اِس حصے میں نماز پڑھنا جنت میں جانے کا ذریعہ ہے۔ جس طرح خوشگوار دن کو جنت کے دن سے تعبیر کرتے ہیں۔ [5] یہ اسی نوعیت کی تشبیہ ہے جیسا کہ ایک اور حدیث میں ہے:

«إِنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوفِ»

''بے شک جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔'' [6]

چنانچہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حدیث کے معنی حقیقت پر محمول ہیں تو تب بھی یہ فضیلت اسی خاص ٹکڑے کی ہوگی۔ [7] مسجد نبوی کا یہ حصہ نہ صرف مسجد میں بہت مبارک جگہ ہے بلکہ تمام روئے زمین پر بالکل یکتا اور منفرد مقام ہے۔

---

[1] المعجم الكبير :245/3. [2] فتح الباري :130/4. [3] صحيح البخاري :2793، جامع الترمذي :1651، شعب الإيمان للبيهقي :31/6، حديث :7414 واللفظ له. [4] طٰهٰ 118:20. [5] یہ مثال عربوں کے ہاں عام ہے۔ ہمارے ہاں کی مثالوں میں ایک عام مثال خوشگوار ہوا کے بارے میں ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے: یہ بہشت کی ہوا چل رہی ہے یا کسی اچھے پھل کے متعلق کہتے ہیں: یہ جنتی میوہ ہے۔ [6] صحيح البخاري :3025، صحيح مسلم :1742. [7] فتح الباري :130/4.

اس کی نظیر دنیا میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ اس جگہ نماز و نوافل ادا کرنے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ آج بھی مسجد نبوی کا یہ حصہ مومن کے قلب کی طمانیت اور کشش کا باعث ہے۔ مسجد نبوی کے ہر زائر کو چاہیے کہ وہ مدینہ میں قیام کے دوران میں مسجد کے اس حصے میں ضرور ذکر و عبادت کا اہتمام کرے۔

روضۂ شریفہ کی پیائش

ابن زبالہ رحمہ اللہ پہلے مؤرخ ہیں جنھوں نے حجرۂ مطہرہ اور منبر شریف کے درمیانی فاصلے کی پیائش کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ فاصلہ 53 ہاتھ، یعنی تقریباً 26.5 میٹر ہے۔ بعد کی توسیعات اور ترمیمات سے مسجد نبوی کا خاصہ حصہ مقصورہ شریفہ کے اندر آ چکا ہے۔ روضہ شریفہ کی موجودہ پیائش لمبائی کے لحاظ سے 22 میٹر اور چوڑائی کے اعتبار سے 15 میٹر ہے۔

علمائے کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ وہ تمام حصہ جو حجرۂ مطہرہ کے مغربی جانب منبر تک ہے۔ ''ریاض الجنۃ'' ہی کا باقی ماندہ حصہ ہے۔ یہ مبارک حصہ آسانی سے نمازیوں کی دسترس میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ نقطۂ نظر مسئلے کا جزوی حل ہے، یعنی یہ شرقاً غرباً وہ حصہ ہے جو روضۂ مبارک کی تعمیر کے بعد بچ سکا ہے۔ اب شمالاً جنوباً اس کا تعین کیسے کیا جائے۔ اس بارے میں حدیث مبارکہ میں اس بات کی صراحت موجود ہے:

«مَا بَيْنَ بَيْتِي وَ مِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ»

''جو جگہ میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان ہے، وہ جنت کے باغوں ہی میں سے ایک باغ ہے۔''

اس حدیث کی رو سے بہت سے علماء کی رائے ہے کہ بیت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شمالاً جنوباً تحدید کو رہنما مان لیا جائے اور اسی کے تحت رقبے کا تعین کر لیا جائے، تاہم بعض علمائے کرام اس پورے حصے کو جو منبر شریف سے مشرقی جانب تھا، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں مسجد نبوی ہوا کرتی تھی اور جو سیدۃ النساء، فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حجرے تک چلا گیا تھا، اسے ''ریاض الجنۃ'' ہی میں شمار کرتے ہیں۔ ''روضہ شریفہ'' کا موجودہ رقبہ 330 مربع میٹر (15X22 میٹر) ہے۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ اصل رقبہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی تعمیر پنج گوشہ سے لے کر موجودہ مقصورہ شریف کی عمارت میں اس کا بہت سا حصہ ضم ہو گیا ہے۔ [1]

امہات المؤمنین کے گھروں کی تعمیر

مسجد کے اطراف میں امہات المؤمنین کے لیے کچی اینٹوں سے گھر تعمیر کیے گئے۔ ان کی چھتیں کھجور کے تنوں پر

[1] تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص: 116.

شاخوں سے ڈالی گئیں۔ جب رسول اللہ ﷺ مسجد اور گھروں کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دلہن بنا کر گھر لے آئے۔ آپ ﷺ نے انھیں اس گھر میں رکھا جس کا دروازہ مسجد میں کھلتا تھا۔ ام المؤمنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کو دوسرا گھر دیا گیا جو ''باب جبریل'' یعنی آل عثمان کے دروازے کے قریب تھا۔

مسجد نبوی کی توسیع

عہد نبوی میں مسجد نبوی کی توسیع

مسجد نبوی کی مختلف ادوار میں توسیع ہوتی رہی ہے۔ ان توسیعات کے بارے میں یہاں مختصر احوال پیش کیے جاتے ہیں۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد پہلے پہل سن چار ہجری میں اس کی توسیع کا ذکر ملتا ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں بیان کیا ہے۔[1] لیکن دیگر مؤرخین یا سیرت نگاروں نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔

مکحول رحمہ اللہ کا بیان ہے: جب رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی تعداد بڑھ گئی تو انھوں نے عرض کی: اللہ کے رسول! ہمارے لیے ایک مسجد بنا دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«خَشَبَاتٌ وَ ثُمَامَاتٌ، عَرِيشٌ كَعَرِيشِ أَخِي مُوسٰى صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِ، الْأَمْرُ أَعْجَلُ مِنْ ذٰلِكَ»

''یہ چند لکڑیاں اور گھاس پھوس ہے، اور میرے بھائی موسیٰ علیہ السلام کے چھپر کے مانند ایک چھپر ہے جبکہ موت اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔''[2]

سات ہجری میں مسجد کی توسیع و تعمیر

علامہ سمہودی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ فتح خیبر کے بعد مسجد نبوی میں توسیع کی گئی۔ فتح خیبر سے پہلے مسجد نبوی میں کچھ مرمت کا کام یا چند ضروری تبدیلیاں کی گئی تھیں، مثلاً: شروع میں مسجد کی چھت نہیں تھی، بعد میں ڈالی گئی۔

[1] فتح الباري: 308/7. [2] وفاء الوفا: 333/1.

خیبر کے کھنڈر

تحویل قبلہ کے وقت بھی تبدیلی ہوئی، اور مصلا شمال سے جنوب کی سمت بنا دیا گیا۔ اسی طرح جنوب کی طرف سے مسجد میں داخلے کا دروازہ تھا، وہ شمال کی طرف منتقل کیا گیا۔ وقت کے ساتھ جوں جوں فرزندانِ توحید کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، مسجد نمازیوں کے جم غفیر کے لیے ناکافی ثابت ہونے لگی۔ محرم 7 ھ، بمطابق جون 628ء میں غزوۂ خیبر کی فتح کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مسجد مبارک کی توسیع کا حکم دیا۔ شروع میں مسجد کی لمبائی اور چوڑائی سو ہاتھ سے کم تھی۔ اب اس میں اضافہ کیا گیا تو اس کی لمبائی اور چوڑائی سو ہاتھ کے قریب ہوگئی۔ [1] اس موقع پر بھی نبی کریم ﷺ اپنے جاں نثار صحابہ رضی اللہ عنہم کے شانہ بشانہ رہ کر مسجد کی تعمیر میں عملی طور پر شریک رہے۔

مسجد نبوی کی توسیع میں شامل کیا گیا زمین کا یہ وہی ٹکڑا تھا جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے ذاتی مال سے خریدا تھا اور جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے بشارت دی تھی:

«مَنْ يَشْتَرِي بُقْعَةَ آلِ فُلَانٍ فَيَزِيدُهَا فِي الْمَسْجِدِ بِخَيْرٍ لَهُ مِنْهَا فِي الْجَنَّةِ»

''آل فلاں کی زمین کون خرید کر مسجد میں شامل کرے گا تاکہ اسے جنت میں اس سے بہتر بدلہ ملے۔'' [2]

مسجد نبوی کی یہ توسیع وتعمیر سات ہجری میں ہوئی، اس کے کئی دلائل ہیں:

صحیح بخاری میں سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اپنے بارے میں بیان کرتے ہیں: مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت ہم ایک ایک اینٹ اٹھا کر لا رہے تھے مگر عمار رضی اللہ عنہ دو دو اینٹیں لا رہے تھے۔ نبی ﷺ نے انھیں دیکھا تو ان کے سر سے مٹی جھاڑی اور فرمایا:

«وَيْحَ عَمَّارٍ! تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ، يَدْعُوهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيَدْعُونَهُ إِلَى النَّارِ»

''اللہ عمار پر رحم فرمائے! اسے باغیوں کا ایک گروہ قتل کرے گا، یہ لوگوں کو جنت کی طرف بلا رہا ہوگا جبکہ لوگ اسے آگ کی طرف دعوت دے رہے ہوں گے۔''

اس موقع پر عمار رضی اللہ عنہ نے کہا: میں فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ [3]

یہ حدیث نبوت کے دلائل میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عمار کے بارے میں جس طرح پیش گوئی فرمائی تھی، وہ ٹھیک اسی طرح پوری ہوئی۔ اس سے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی فضیلت بھی ثابت ہوتی ہے۔

عہد نبوی میں مسجد نبوی کی توسیع کی یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ مندرجہ بالا حدیث کے راوی حضرت ابوسعید

[1] وفاء الوفا: 338/1، تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص: 42. [2] جامع الترمذي: 3703. [3] صحيح البخاري: 447 و 2812.

خدری رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ ''ہم اینٹیں اٹھا کر لاتے تھے'' اس سے استدلال کیا جاتا ہے کہ یہ بعد کی توسیع ہے، پہلی تعمیر نہیں کیونکہ جنگ احد کے موقع پر ابوسعید رضی اللہ عنہ کی عمر تیرہ سال تھی جس کی بنا پر وہ جنگ میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ مسجد نبوی کی پہلی تعمیر کے وقت تو ان کی عمر دس سال یا اس سے بھی کم تھی، لہٰذا ایک بچے کا مٹی کی بڑی بڑی اینٹیں اٹھا کر لانا محال ہے، اس لیے وہ تعمیر میں کیسے شریک ہوسکتا ہے۔

ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ زمین کا یہ ٹکڑا، جو توسیع میں شامل کیا گیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے ذاتی سرمائے سے خرید کر وقف کیا تھا جبکہ پہلی تعمیر کے لیے زمین کی قیمت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ادا کی تھی۔

اس امر کی ایک اور دلیل کہ مسجد نبوی کی توسیع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہوئی تھی، یہ ہے: بنوحنیفہ کا وفد جب مدینہ آیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد تعمیر کر رہے تھے۔ یہ ایک معلوم بات ہے کہ عرب کے وفود ہجرت کے فوراً بعد پہلی ہجری میں نہیں آئے تھے۔ سیرت کا مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ وفود کی آمد کا سلسلہ اسلام کے پھیلنے اور غالب ہو جانے کے بعد شروع ہوا تھا۔[1]

طلق بن علی کا قصہ

بنوحنیفہ کے وفد کی آمد کے متعلق کہ وہ مسجد نبوی کی تعمیر کے موقع پر آیا تھا، ایک حدیث موجود ہے جو صحیح ابن حبان میں قیس بن طلق اپنے والد حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں: وہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کی مسجد بنانے میں شریک تھا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«قَدِّمُوا الْيَمَامِيَّ مِنَ الطِّينِ، فَإِنَّهُ مِنْ أَحْسَنِكُمْ لَهُ مَسًّا»

''یمامی (یمامہ کے رہنے والے) کو مٹی (گارے) کے قریب کردو کیونکہ یہ تمھاری نسبت اسے اچھی طرح گوندھ سکتا ہے۔''[2]

سنن دارقطنی وغیرہ میں قیس بن طلق اپنے والد طلق رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت صحابۂ کرام مدینہ کی مسجد تعمیر کر رہے تھے اور پتھر اور اینٹیں ڈھو رہے تھے۔ میں نے کہا: اللہ کے رسول! کیا ہم بھی اسی طرح پتھر اُٹھا کر لائیں جس طرح دوسرے صحابہ لا رہے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا، وَلٰكِنْ أَخْلِطْ لَهُمُ الطِّينَ يَا أَخَا الْيَمَامَةِ! فَأَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ»

[1] فتح الباري لابن رجب: 2/485-489. [2] صحيح ابن حبان (ابن بلبان): 3/404، حديث: 1122.

"نہیں، لیکن اے یمامہ کے رہنے والے بھائی! تم انھیں مٹی گوندھ کردو کیونکہ تمھیں اس کام کا زیادہ علم ہے۔"

طلق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پھر میں انھیں گارا بنا بنا کر دیتا رہا اور وہ اینٹیں لاتے رہے۔ [1]

امام احمد رحمہ اللہ نے قیس بن طلق کے حوالے سے بیان کیا ہے، وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے فرمایا: میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم مسجد تعمیر کر رہے تھے۔ طلق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نبی ﷺ کو صحابہ کا کام زیادہ معیاری نہیں لگا۔ چنانچہ میں نے کَسّی پکڑی اور گارا بنانے لگا۔ نبی ﷺ کو میرا کَسّی پکڑنے کا سلیقہ اور گارا بنانے کا طریقہ بہت اچھا لگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«دَعُوا الْحَنَفِيَّ وَالطِّينَ، فَإِنَّهُ أَضْبَطُكُمْ لِلطِّينِ»

"مٹی کا کام حَنَفی (بنوحنیفہ کے ساتھی) کے لیے چھوڑ دو کیونکہ انھیں تمھاری نسبت اس کام میں زیادہ مہارت ہے۔" [2]

مختلف روایات میں اسی مفہوم کے دیگر الفاظ بھی آئے ہیں۔

مسجد نبوی کی توسیع کے کام میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی شمولیت کا ذکر بھی ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سات ہجری میں فتح خیبر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن حنطب کے بیٹے کے حوالے سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور رسول اللہ ﷺ مسجد کی تعمیر کے لیے اینٹیں اٹھا کر لا رہے تھے۔ میں رسول اللہ ﷺ سے راستے ہی میں ملا۔ اس وقت آپ ﷺ نے اینٹ اپنے بطن مبارک سے لگا رکھی تھی۔ میں سمجھا شاید یہ بھاری ہے اور اس کی وجہ سے آپ کو مشقت اٹھانی پڑ رہی ہے۔ میں نے عرض کی! اللہ کے رسول! یہ اینٹ مجھے پکڑا دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«خُذْ غَيْرَهَا يَا أَبَا هُرَيْرَةَ! فَإِنَّهُ لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشُ الْآخِرَةِ»

"ابوہریرہ! تم دوسری لے لو، بے شک آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔" [3]

مسجد کی طرزِ تعمیر اور چھت

مسجد نبوی کی پوری عمارت انتہائی سادگی اور کفایت شعاری کا مظہر تھی۔ زیب و زینت اور آرائش کا کوئی اہتمام نہیں تھا۔ اس وقت کے لحاظ سے تعمیر کا جو طریقہ اختیار کیا گیا، عرب اسے السَّمِيط کہتے تھے، یعنی اینٹ کے اوپر اینٹ رکھنا۔ دوسری بار تقریباً چار ہجری کے موقع پر تعمیر کا جو طریقہ مروج تھا، اسے السعیدہ کہتے تھے، یعنی پوری اینٹ اور

[1] سنن الدارقطني: 154/1، حديث: 533. [2] غاية المقصد في زوائد المسند: 774/1. [3] مسند أحمد: 381/2.

آدھی اینٹ جوڑ کر دیوار بنانا، پھر تیسری بار فتح خیبر کے بعد مسجد کی توسیع و تعمیر ہوئی اور اس وقت جو طریقۂ تعمیر اختیار کیا گیا، عرب اسے مؤنث، مذکر طرز تعمیر کہتے ہیں، یعنی دو دو اینٹیں جوڑ کر دیوار بنانا۔[1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کی ایک معلق روایت بیان کی ہے، وہ فرماتے ہیں: مسجد نبوی کی چھت کھجور کی ٹہنیاں بچھا کر ڈالی گئی تھی۔

حضرت نافع رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مجھے بتایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجد کچی اینٹوں سے بنائی گئی تھی۔ اس کی چھت کھجور کی ٹہنیوں سے تیار کی گئی تھی جبکہ ستون کھجور کے تنے گاڑ کر بنائے گئے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے (اپنے دورِ خلافت میں) اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد کی تعمیر کی تو اس میں اضافہ کیا لیکن سامانِ تعمیر وہی استعمال کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں استعمال ہوتا تھا۔ البتہ انھوں نے ستون لکڑی کے بنوائے تھے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں مسجد نبوی کی ازسرِ نو تعمیر کی تو اس میں اچھا خاصا اضافہ کیا اور کئی تبدیلیاں بھی کیں، مثلاً: دیواریں منقش پتھر اور چونے کی بنائیں اور ستون بھی منقش پتھروں کے بنائے اور چھت ساگوان کی لکڑی کی ڈالی۔[2]

[1] وفاء الوفا: 335/1. [2] صحيح البخاري: 446، فتح الباري: 699/1.

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں مسجد کے احوال

مسجد مسلمانوں کی اجتماعیت کا ایک منفرد ادارہ ہے۔ اجتماعی زندگی کی مختلف ضروریات ہیں جن میں سے کچھ مسجد سے وابستہ ہیں۔ ان ضروریات میں مسجد میں سونا، آرام کرنا اور ڈیرہ لگانا بھی ہے۔

1 امام نافع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بتایا

أَنَّهُ كَانَ يَنَامُ، وَهُوَ شَابٌّ أَعْزَبُ لَا أَهْلَ لَهُ، فِي مَسْجِدِ النَّبِيِّ ﷺ.

"بے شک وہ (عبداللہ) جب جوان اور غیر شادی شدہ تھا اور اس کی کوئی بیوی اور بچہ نہ تھا، تب وہ مسجد نبوی میں سویا کرتا تھا۔"

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جمہور کے موقف کے مطابق مسجد میں سونا جائز قرار دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مسجد میں سونے کی کراہت منقول ہے، سوائے اس شخص کے جو نماز کے انتظار میں ہو۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد میں سونا مطلقاً مکروہ سمجھتے ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کچھ فرق کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس کا گھر بار ہو، اس کے لیے مسجد میں سونا مکروہ ہے اور جس کا گھر بار نہ ہو، اس کے لیے جائز ہے۔[1]

2 حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں: ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے تو دیکھا کہ علی رضی اللہ عنہ گھر میں موجود نہیں۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا:

«أَيْنَ ابْنُ عَمِّكِ؟» "تمھارا چچا زاد کہاں ہے؟"

فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: میرے اور ان کے مابین تھوڑی سی شکر رنجی ہوگئی تھی۔ انھوں نے مجھ سے غصے میں باتیں کیں اور باہر نکل گئے، میرے ہاں قیلولہ بھی نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے کسی آدمی (غالباً راوی حدیث سہل رضی اللہ عنہ) سے فرمایا: «أُنْظُرْ أَيْنَ هُوَ؟» "ذرا دیکھنا وہ کہاں ہیں؟" اس شخص نے واپس آکر اطلاع دی: اللہ کے رسول! وہ مسجد میں سو رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ لیٹے ہوئے ہیں اور ان کے جسم کے ایک حصے سے چادر اتری ہوئی ہے اور اس جگہ مٹی لگی ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی گرد جھاڑی اور

[1] فتح الباري: 693/1.

فرمایا: «قُمْ أَبَا تُرَابٍ! قُمْ أَبَا تُرَابٍ!» ''ابوتراب! اٹھو، ابوتراب! اٹھو'' [1]

اس حدیث کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا: اس روایت میں باب کے عنوان کا مقصود پایا جاتا ہے، یعنی مرد مسجد میں سو سکتے ہیں، نیز اس روایت سے ان اصحابِ علم کا اشکال بھی دور ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں جس کا گھر ہو، اس کے لیے مسجد میں سونا مکروہ ہے۔ ویسے بھی اس روایت میں عموم ہے کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے اس شخص کے لیے مسجد میں سونے کا جواز معلوم ہوتا ہے جس کا گھر نہ ہو۔ [2]

علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے نیل الاوطار میں اس حدیث کی وضاحت میں جمہور کا موقف یہی بیان کیا ہے کہ مسجد میں سونا جائز ہے۔ [3]

3 اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم جن کی تعداد عموماً ستر تھی، وہ مسجد ہی میں سویا کرتے تھے۔ [4]

علامہ ابن رجب رحمہ اللہ نے فتح الباری میں مسجد میں سو جانے کے موضوع پر مختلف علماء کے مختلف اقوال نقل کیے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہی ہے کہ آدمی ضرورت کے تحت مسجد میں سو سکتا ہے تاہم بغیر ضرورت کے سونا مکروہ ہے۔ [5]

رسول اللہ ﷺ بھی مسجد میں استراحت فرماتے تھے

رسول اللہ ﷺ خود بھی مسجد نبوی میں آرام فرما لیا کرتے تھے۔ آپ رمضان المبارک میں اعتکاف کی حالت میں مسجد ہی میں سوتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ کو اونگھ آئی جس سے علماء نے مسجد میں سونے کا استدلال کیا ہے۔ صحیح مسلم وغیرہ میں ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

بَيْنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ بَيْنَ أَظْهُرِنَا إِذْ أَغْفَى إِغْفَاءَةً، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ مُتَبَسِّمًا، فَقُلْنَا: مَا أَضْحَكَكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ: «أُنْزِلَتْ عَلَيَّ آنِفًا سُورَةٌ» فَقَرَأَ: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ○ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ○ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ○﴾

''ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے کہ آپ کو ہلکی سی اُونگھ آ گئی، پھر آپ ﷺ نے سر مبارک اٹھایا اور تبسم فرمایا۔ ہم نے کہا: اللہ کے رسول! آپ کس چیز پر تبسم فرما رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابھی ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی ہے'' پھر آپ نے بسم اللہ پڑھی اور سورۃ الکوثر کی تلاوت فرمائی۔'' [6]

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کے مختلف فوائد کے بیان میں فرماتے ہیں: اس حدیث سے مسجد میں سونے کا جواز

[1] صحيح البخاري: 441. [2] فتح الباري: 693/1. [3] نيل الأوطار: 458/1. [4] صحيح البخاري: 442، فتح الباري لابن رجب: 455/2. [5] فتح الباري لابن رجب: 2/450-458. [6] صحيح مسلم: 400، سنن النسائي: 905.

معلوم ہوتا ہے۔[1]

عورتوں کا مسجد میں سونا

جس طرح مرد حضرات کا مسجد میں سونا جائز ہے، اسی طرح عورتوں کے مسجد میں سونے کے دلائل بھی ملتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں باب قائم کیا ہے: نَوْمُ الْمَرْأَةِ فِي الْمَسْجِدِ ''مسجد میں عورت کے سونے کا بیان'' اس کے تحت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے ایک سیاہ فام لونڈی کا قصہ بیان کیا ہے۔ آخر میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

فَكَانَتْ لَهَا خِبَاءٌ فِي الْمَسْجِدِ أَوْ حِفْشٌ

''اس لونڈی کے لیے مسجد میں ایک اونی یا ریشمی کپڑے کا خیمہ یا چھوٹا سا حجرہ بنا ہوا تھا۔''[2]

حافظ ابن حجر اور ابن رجب رحمہما اللہ نے اس حدیث کی تشریح میں لکھا ہے: عورت مسجد میں ٹھہر سکتی ہے اور سو بھی سکتی ہے۔ اسی طرح امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے متعلق احادیث میں مذکور ہے کہ وہ اعتکاف کرتی تھیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی ان کا مسجد میں اعتکاف کرنا ثابت ہے۔[3]

مسجد میں نمازِ جنازہ ادا کرنے کا جواز

مسجد نبوی میں نماز جنازہ ادا کرنے کے بارے میں بعض روایات منقول ہیں جن سے علماء وفقہاء نے یہی استدلال کیا ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ ادا کی جا سکتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے باب قائم کیا ہے: بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَائِزِ بِالْمُصَلّٰى وَالْمَسْجِدِ ''عیدگاہ اور مسجد میں نماز جنازہ پڑھنے کا بیان'' اس باب کے تحت تین روایتیں بیان کی ہیں۔ پہلی دو روایتیں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں جن میں نجاشی کی وفات اور اس کی نماز جنازہ پڑھنے کا تذکرہ ہے۔ یہ درحقیقت ایک ہی واقعے کی دو سندیں ہیں۔ تیسری روایت سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جس میں ایک یہودی مرد اور عورت کو بدکاری کے بعد عیدگاہ میں سنگسار کرنے کا بیان ہے۔

پہلی روایت میں نجاشی کے جنازے کا ذکر ہے۔ اس کے حوالے سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن رُشید کا قول بیان کیا ہے جس میں انھوں نے امام بخاری رحمہ اللہ کے استدلال کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ ہر چند یہاں میت سامنے موجود نہیں تھی مگر امام بخاری رحمہ اللہ نے مُصَلّٰی (عیدگاہ) کو مسجد شمار کیا ہے۔

---

[1] شرح النووي على صحيح مسلم: 150/4. [2] صحيح البخاري: 439. [3] دیکھیے: صحيح البخاري: 2026، صحيح مسلم: 1173,1172، سنن أبي داود: 2462، فتح الباري لابن رجب: 448/2، فتح الباري لابن حجر: 692/1.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھانا جائز ہے، نیز جمہور کا بھی یہی موقف بتایا ہے اور اس کی تائید کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا حوالہ دیا ہے جسے مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے:

مَا صَلَّى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عَلَى سُهَيْلِ بْنِ بَيْضَاءَ إِلَّا فِي الْمَسْجِدِ

''رسول اللہ ﷺ نے بیضاء (دعد نامی عورت) کے بیٹے سہیل کی نماز جنازہ مسجد ہی میں پڑھائی تھی۔''
صحیح مسلم ہی کی ایک اور روایت میں بیضاء کے دو بیٹوں (سہیل اور ان کے بھائی) کے جنازوں کا ذکر ہے۔[1]
صحیح مسلم کی مذکورہ دونوں روایتوں کا حوالہ دیتے ہوئے شیخ محمد شمس الحق العظیم آبادی رحمہ اللہ نے مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا جائز قرار دیا ہے۔[2]
شیخ ابن بطال رحمہ اللہ نے مسجد میں نمازِ جنازہ کے جواز کے قائلین میں امام شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کو شمار کیا ہے، نیز اسماعیل بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے: اگر کسی خاص ضرورت کے تحت نماز جنازہ مسجد میں پڑھی جائے تو کوئی حرج نہیں۔[3]

مسجد نبوی کی زیارت اور رسول اللہ ﷺ پر سلام بھیجنے کے آداب

مسجد نبوی کی زیارت کے چند مخصوص آداب ہیں جیسے رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام اور صاحبین پر سلام کہنا اور رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں دھیمی دھیمی آواز سے گفتگو کرنا۔ اس کے علاوہ یہاں ملحوظ رکھے جانے والے آداب دیگر مساجد کے آداب ہی کی طرح ہیں۔

مسجد نبوی میں داخل ہونے والے ہر مسلمان زائر کو چاہیے کہ وہ مسجد نبوی کے عام اور خاص دونوں طرح کے آداب ملحوظ رکھے، مثلاً: مسواک کرکے باوضو ہوکر اور صاف ستھرا پاکیزہ لباس پہن کر سکون اور وقار سے مسجد میں داخل ہو۔ داخل ہوتے ہوئے دایاں پاؤں پہلے اندر رکھے اور بِسْمِ اللّٰهِ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُولِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ! افْتَحْ لِي أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ پڑھے، پھر تحیۃ المسجد پڑھے اور اپنی اور تمام مسلمانوں کی بھلائی کے لیے دعا کرے، پھر مواجہہ شریفہ کے پاس آئے اور رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام کہے اور آپ ﷺ کے دونوں دوستوں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو بھی سلام کہے۔ اس سارے عمل کے دوران میں نہایت مؤدب رہے۔ اس طریقے سے مسجد نبوی کی

[1] صحيح مسلم: 973، [2] فتح الباري: 254/3، عون المعبود: 332،331/8، [3] شرح صحيح البخاري لابن بطال: 310/3.

مواجہہ شریفہ

زیارت مکمل ہوجائے گی۔ اب یہ اس کی مرضی پر موقوف ہے کہ واپس آجائے یا وہیں رہے اور جتنی نمازیں میسر آجائیں ادا کرے۔ مسجد نبوی اور دیگر مساجد کے آداب کی تفصیل یہ ہے:

مسجد کے لیے زینت اختیار کرنا: اللہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ نے مسجد میں حاضر ہوتے وقت زینت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، خصوصاً جمعہ اور عیدین کی نماز میں حاضر ہونے کے لیے اہتمام تجمل کی تاکید فرمائی ہے۔ یہاں زینت سے مراد عام اور سادہ سی زینت ہے۔ یہ صاف ستھرے پاکیزہ لباس، خوشبو، تیل اور دیگر مباح اشیاء ہی سے ہوسکتی ہے۔ زینت میں اسراف سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝﴾

''اے آدم کے بیٹو! تم ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کرو اور کھاؤ اور پیو اور بے جا نہ اڑاؤ (اسراف نہ کرو) بے شک وہ بے جا اڑانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''[1]

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، نبی ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَغْتَسِلُ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَيَتَطَهَّرُ مَا اسْتَطَاعَ مِنَ الطُّهْرِ وَيَدَّهِنُ مِنْ دُهْنِهِ أَوْ يَمَسُّ مِنْ طِيبِ بَيْتِهِ، ثُمَّ يَخْرُجُ فَلَا يُفَرِّقُ بَيْنَ اثْنَيْنِ، ثُمَّ يُصَلِّي مَا كُتِبَ لَهُ، ثُمَّ يُنْصِتُ إِذَا تَكَلَّمَ الْإِمَامُ إِلَّا غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرٰى»

''جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے اور اپنی وسعت کے مطابق اچھی طرح طہارت حاصل کرے، تیل لگائے

[1] الأعراف 31:7.

یا گھر کی خوشبو میں سے استعمال کرے، پھر وہ مسجد میں آئے اور دو آدمیوں کے درمیان جدائی نہ ڈالے (درمیان میں نہ بیٹھے)، پھر نماز پڑھے جتنی اس کے مقدر میں ہو، پھر جب امام خطبہ دے تو وہ خاموش رہے تو اس کے اس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک سارے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔'' [1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے گناہوں کی بخشش مذکورہ تمام شرائط کے ساتھ مشروط ہے، یعنی غسل کرے، صفائی ستھرائی کرے، خوشبو اور تیل لگائے، اچھے کپڑے پہنے، باوقار طور پر پیدل چل کر مسجد جائے، گردنیں نہ پھلانگے، دو آدمیوں کے درمیان نہ بیٹھے، کسی کو تکلیف نہ دے، نفل نماز (خطبہ شروع ہونے سے پہلے پہلے) جتنی چاہے پڑھے، خاموشی اختیار کرے اور بے ہودہ حرکات سے پرہیز کرے۔ [2]

مسجد میں بدبو کے ساتھ داخل ہونے کی ممانعت: مسجد میں ایسی شے کھا کر یا استعمال کر کے آنا منع ہے جس سے دوسرے لوگوں کو اذیت ہو اور فرشتے جو مسجد میں حاضر ہوتے ہیں، تکلیف محسوس کریں۔ اس حکم میں صرف مسجد نبوی ہی نہیں بلکہ تمام مساجد شامل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ أَكَلَ ثُومًا أَوْ بَصَلًا فَلْيَعْتَزِلْنَا أَوْ فَلْيَعْتَزِلْ مَسْجِدَنَا أَوْ لِيَقْعُدْ فِي بَيْتِهِ»

''جس نے لہسن یا پیاز کھائی ہو، وہ ہم سے دور رہے یا ہماری مسجد سے جدا رہے یا اپنے گھر بیٹھے۔'' [3]

صحیح مسلم کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ أَكَلَ الْبَصَلَ وَالثُّومَ وَالْكُرَّاثَ فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا، فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَتَأَذَّى مِمَّا يَتَأَذَّى مِنْهُ بَنُو آدَمَ»

''جس نے پیاز، لہسن اور گندنا کھایا ہو، وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ جس چیز سے انسانوں کو تکلیف ہوتی ہے، اس سے فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔'' [4]

مندرجہ بالا احادیث میں لہسن، پیاز اور گندنا (لہسن کے مشابہ ایک ترکاری) کھا کر مسجد میں آنے سے روکا گیا ہے۔ اس ممانعت کا مقصد فرشتوں اور مسلمانوں کو تکلیف سے محفوظ رکھنا ہے۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ ممانعت ہر اُس شخص پر لاگو ہوگی جس نے کوئی بھی بدبودار شے استعمال کی ہو حتی کہ مولی بھی اسی حکم میں شامل ہے۔ [5]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جمہور کی رائے یہی ہے کہ مذکورہ حدیث میں پیاز وغیرہ کھا کر مسجد میں آنے کی نہی

---

[1] صحيح البخاري: 883. [2] فتح الباري: 479/2. [3] صحيح البخاري: 855، 7359، صحيح مسلم: 564. [4] صحيح مسلم: 564. [5] تفصیل کے لیے دیکھیے: فتح الباري: 712/9، شرح النووي على صحيح مسلم: 67/5.

(ممانعت) عام ہے اور تمام مساجد اور اکٹھے مل کر نماز پڑھنے کی جگہوں کے لیے ہے، یعنی کوئی شخص کوئی بدبودار چیز کھا کر کسی بھی مسجد میں داخل نہیں ہوسکتا۔ اس کی دلیل حدیث کے یہ الفاظ ہیں: «فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسَاجِدَنَا» (وہ ہماری مساجد کے قریب نہ پھٹکے)۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ ممانعت صرف مسجد نبوی کے لیے ہے۔ [1]

جب مسجد کے احترام کے پیش نظر بدبودار حلال شے کھا کر مسجد میں آنا منع ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ چیز جو سرے سے حلال ہی نہیں اور صحت کے لیے مضر بھی ہے، اسے استعمال کر کے مسجد میں آنا کس طرح جائز ہوگا؟

مسجد میں آواز بلند کرنے کی ممانعت: مسجد نبوی یا قبر مبارک کے پاس درود و سلام، تلاوتِ قرآن یا اللہ کا ذکر کرتے وقت آواز بلند کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح نبی ﷺ پر درود و سلام پڑھتے وقت جہاں آپ ﷺ کا اسم گرامی آئے وہاں بھی آواز بلند نہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○﴾

''اے ایمان والو! تم اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو، اور آپ سے اونچی آواز میں بات نہ کرو، جیسے تم ایک دوسرے سے اونچی آواز میں (بات) کرتے ہو، مبادا تمھارے عمل برباد ہوجائیں اور تمھیں خبر تک نہ ہو۔ بلاشبہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس اپنی آوازیں نیچی (پست) رکھتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے۔ ان کے لیے بخشش اور بہت بڑا اجر ہے۔ بلاشبہ جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔'' [2]

رسول اللہ ﷺ کو بلند آواز سے مخاطب کرنے کی ممانعت کی علت اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ﴾ ہے، یعنی آپ ﷺ کے سامنے بلند آواز سے بات کرنا بھی منع ہے مبادا تمھارے اعمال برباد ہوجائیں اور تمھیں خبر تک نہ ہو، نیز جو لوگ رسول اللہ ﷺ کو بلند آواز سے پکارتے ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ کم عقل کہتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○﴾

''بلاشبہ جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔'' [3]

سلف صالحین سے منقول نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات اور وفات کے بعد بھی آپ ﷺ

[1] صحيح مسلم: 561، شرح النووي على صحيح مسلم: 5/66-68. [2] الحجرٰت 49: 2-4. [3] الحجرٰت 49: 4.

کا ادب ملحوظ رکھنا دائماً ضروری ہے۔ خلیفۂ راشد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''نبی ﷺ کے پاس آواز بلند کرنا جس طرح آپ کی زندگی میں نامناسب تھا، اُسی طرح آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی نامناسب ہے۔'' [1]

امام مالک رحمہ اللہ رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں آواز بلند نہیں کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا احترام جس طرح آپ ﷺ کی زندگی میں لازم تھا، اُسی طرح آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی دائماً لازم ہے۔ [2]

علمائے کرام کا کہنا ہے: نبی ﷺ کی قبر کے پاس آواز بلند کرنا مکروہ ہے جیسا کہ آپ ﷺ کی زندگی میں آواز بلند کرنا مکروہ تھا کیونکہ آپ ﷺ زندگی میں بھی، وفات کے بعد بھی اور اب قبر مبارک میں بھی ابداً واجب الاحترام ہیں۔ [3]

سیدنا سائب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں مسجد نبوی میں کھڑا تھا کہ کسی نے مجھے کنکر مارا۔ میں نے دیکھا تو وہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے فرمایا:

اِذْهَبْ فَأْتِنِي بِهٰذَيْنِ

''جاؤ ان دونوں آدمیوں کو میرے پاس بلا لاؤ۔''

میں انھیں عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بلا لایا تو انھوں نے پوچھا: ''تم دونوں کون ہو؟'' یا فرمایا: ''تم دونوں کہاں سے آئے ہو؟'' انھوں نے جواب دیا: ''ہم طائف سے آئے ہیں۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

لَوْ كُنْتُمَا مِنْ أَهْلِ الْبَلَدِ لَأَوْجَعْتُكُمَا، تَرْفَعَانِ أَصْوَاتَكُمَا فِي مَسْجِدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ؟

''اگر تم یہاں کے رہنے والے ہوتے تو میں تمھیں سزا دیتا، تم رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں اپنی آوازیں بلند کر رہے ہو؟'' [4]

ایک سوال یہ ہے کہ کیا مسجد میں مطلقاً آواز بلند کرنا ممنوع ہے یا اس میں کچھ استثناء بھی ہے؟

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام مالک رحمہ اللہ نے مساجد میں آواز بلند کرنا مطلقاً مکروہ جانا ہے، چاہے علمی گفتگو ہو یا کسی اور نوعیت کی، اونچی آواز کسی صورت مناسب نہیں۔ بعض علمائے کرام نے دینی ضرورت کے تحت گفتگو اور دنیاوی باتوں اور ایسی گفتگو کے مابین جس کا فائدہ نہ ہو، فرق روا رکھا ہے۔ محمد بن مسلمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں نمازیوں کے قریب اتنی بلند آواز سے باتیں کرنا جس سے ان کی نماز خلط ملط ہو، مکروہ ہے۔ [5]

تحیۃ المسجد: مسجد نبوی کی زیارت کی غرض سے آنے والے کو چاہیے کہ وہ رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ میں دو رکعت

---

[1] وفاء الوفا: 559/2. [2] دیکھیے: خلاصة الوفا بأخبار دار المصطفٰی: 51/1، الشفا للقاضي عياض: 596/2. [3] تفسیر ابن کثیر، الحجرٰت 3:49. [4] صحیح البخاري: 470. [5] فتح الباري: 725/1، الشفا للقاضي عياض: 680/2.

نماز ادا کرے۔ اگر وہاں گنجائش نہ ہو تو مسجد کے جس حصے میں جگہ ملے تحیۃ المسجد ادا کرے۔ اس نعمت عظمیٰ پر اللہ کا شکر ادا کرے۔ اپنے لیے اور دوسرے مسلمان بھائیوں کے لیے دعا کرے اور امید رکھے کہ اللہ تعالیٰ اس کی یہ زیارت قبول فرمالے گا۔ یہ نماز مکروہ اوقات کے علاوہ اوقات میں ادا کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يَجْلِسَ»

''جب تم میں سے کوئی مسجد میں آئے تو اُسے بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھنی چاہیے۔'' [1]

نمازِ تحیۃ المسجد کے حکم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جمہور کے نزدیک یہ نوافل مسنون ہیں۔ بعض امر کے صیغے سے وجوب کا استدلال کرتے ہیں جبکہ عمومی دلائل سے استحباب کی دلیل لی جاتی ہے۔ [2]

درود و سلام: مسجد نبوی کے خاص آداب میں سے ایک ادب رسول کریم ﷺ اور آپ کے دونوں دوستوں کو سلام کہنا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ زائر حجرہ شریفہ کے مقابل آ کر ادب و وقار سے کھڑا ہو جائے اور درود و سلام پڑھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم قرآنِ کریم میں دیا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾

''بلاشبہ اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی اس پر درود بھیجو اور خوب سلام بھیجو۔'' [3]

قاضی ابوبکر بن بکیر کہتے ہیں: یہ آیت نبی ﷺ پر نازل ہوئی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ وہ آپ ﷺ پر سلام بھیجیں۔ اسی طرح صحابہ کے بعد آنے والوں کو حکم ہے کہ وہ نبی ﷺ کی قبر مبارک پر حاضری کے وقت بھی اور جب بھی اور جہاں بھی آپ کا نام نامی آئے، درود و سلام بھیجیں۔ [4]

نبی کریم ﷺ پر سلام کہہ کر تھوڑا سا دائیں جانب ہٹ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر سلام کہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سر نبی کریم ﷺ کے مبارک کندھوں کے برابر ہے، پھر ایک ہاتھ (نصف میٹر) مزید دائیں جانب ہٹ کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر سلام کہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اسی طرح کرتے تھے۔ پہلے نبی ﷺ پر سلام کہتے تھے، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور بعد ازاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر سلام کہتے تھے۔ [5]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ سیدنا ابن عمر اور سیدنا انس رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابہ و تابعین کرام نبی ﷺ اور آپ

---

[1] صحيح البخاري: 444، صحيح مسلم: 714. [2] تفصیل کے لیے دیکھیے: الفتح الرباني: 45/5. [3] الأحزاب 56:33.
[4] الشفا للقاضي عياض: 626/2. [5] الشفا للقاضي عياض: 671/2، شعب الإيمان للبيهقي: 487/3، 490.

کے دونوں دوستوں پر سلام کہا کرتے تھے۔ [1]

نبی ﷺ پر درود یا سلام پڑھتے وقت آواز بلند نہ کی جائے بلکہ درمیانی رکھی جائے۔ نبی ﷺ کی موجودگی میں آواز بلند نہ کرنے کے دلائل پچھلے صفحات میں گزر چکے ہیں۔ قبر مبارک کی طرف منہ کر کے صرف درود و سلام کہنا جائز ہے، مگر دعا کرنا ممنوع ہے۔ دعا کے لیے قبلہ رخ ہی ہونا چاہیے۔ کسی نبی یا ولی کی قبر کی طرف منہ کر کے دعا و مناجات نہ کی جائے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے: فقہاء کہتے ہیں کہ جب زائر نبی ﷺ پر سلام کہہ دے اور اس کا اپنے لیے دعا کرنے کا ارادہ ہو تو قبر شریف کی طرف منہ نہ کرے بلکہ قبلہ رو ہو کر دعا مانگے۔ [2]

مسجد نبوی کے آداب میں سے ایک ادب یہ ہے کہ قبر مبارک کے قریب قصداً قبلہ رو کھڑا نہ ہو۔ مسلمانوں کا قبلہ ازروئے قرآن کعبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾

''ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا دیکھ رہے ہیں، چنانچہ ہم ضرور آپ کو اس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں، پھر آپ اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف پھیر لیں اور جہاں کہیں بھی تم ہو اپنے منہ اس کی طرف پھیر لو......۔'' [3]

ضروری نوٹ: مسجد نبوی کی گاہے گاہے مختلف ادوار میں توسیع ہوتی رہی۔ یہ توسیع شمال، جنوب اور مغرب کی سمتوں میں ہوئی کیونکہ مشرق کی طرف امہات المؤمنین کے گھر تھے۔ ان میں سے ایک گھر ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا تھا،

[1] مجموع الفتاوی لابن تیمیة: 26/27. [2] مجموع الفتاوی لابن تیمیة: 31,30/27. [3] البقرة 2:144.

مسجد نبوی

جہاں اب رسول کریم ﷺ کی قبر مبارک ہے۔ بعد میں حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما بھی یہیں مدفون ہوئے۔ اسی بنا پر حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے مشرقی جانب کوئی توسیع نہیں کی۔ ولید بن عبد الملک نے جب مسجد نبوی میں توسیع کی تو اس نے امہات المؤمنین کے گھر بھی مسجد میں شامل کر دیے اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر کے گرد پنج گوشہ دیوار بنادی تاکہ نمازیوں کا رخ قبروں کی طرف نہ ہو۔

مسجد میں قبر ہونے کی ممانعت

مسجد میں قبر بنانا منع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَلَا! فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُورَ مَسَاجِدَ إِنِّي أَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ»

”خبردار! قبروں کو مسجدیں نہ بنانا، بے شک میں تمھیں اس سے منع کرتا ہوں۔“ [1]

ایک اور روایت میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَجْلِسُوا عَلَى الْقُبُورِ وَلَا تُصَلُّوا إِلَيْهَا»

”تم قبروں پر نہ بیٹھو (مجاور نہ بنو) اور نہ ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو۔“ [2]

قبروں کو مسجد بنانے کا مطلب یہ ہے کہ قبر کی طرف منہ کر کے سجدہ کیا جائے یا قبر کے اوپر مسجد بنالی جائے، چاہے اس کی طرف منہ کر کے سجدہ نہ کیا جائے۔ یہ دین میں غلو اور شرک کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہے۔

مسجد میں قبر ہونے کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ مسجد پہلے ہی موجود ہو، بعد میں قبر بنائی جائے۔ دوم یہ کہ قبر پہلے سے موجود ہو، بعد میں اس پر مسجد تعمیر کی جائے۔

پہلی شکل کے بارے میں علماء کا فتویٰ یہی ہے کہ قبر اُدھیڑی جائے اور میت کی ہڈیاں نکال کر مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کر دی جائیں۔ میت کو مسجد میں دفن کرنا ایک برائی ہے جسے بہ زورِ بازو ختم کرنا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ......»

”تم میں سے جو برائی دیکھے، چاہیے کہ وہ اسے ہاتھ سے مٹادے......“ [3]

دوسری شکل کے بارے میں علماء کا فتویٰ یہ ہے کہ مسجد گرادی جائے کیونکہ اس کا گرانا واجب ہے۔ اگر قبر بھی

[1] صحيح مسلم: 532. [2] صحيح مسلم: 972. [3] صحيح مسلم: 49.

برقرار رکھی جائے اور نمازیں بھی ادا کی جاتی رہیں تو یہ اِصْرَار عَلَى الْإِثْمِ "گناہ پر اڑنے والی بات" ہے۔[1]

تنبیہ: مسجد نبوی، نبی کریم ﷺ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا اور تقویٰ کی بنیاد پر تعمیر کی تھی۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کو مسجد میں دفن نہیں کیا گیا تھا۔ آپ کو تو سیدہ عائشہ ؓ کے حجرے میں دفن کیا گیا تھا۔ ابوبکر ؓ فوت ہوئے تو انھیں بھی سیدہ عائشہ ؓ ہی کے گھر میں نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کے پاس دفنایا گیا، پھر عمر ؓ فوت ہوئے تو انھیں بھی وہیں عائشہ ؓ کے گھر میں ابوبکر ؓ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ اس وقت یہ حجرہ (گھر) مسجد کی حدود میں نہیں تھا بلکہ ایک جانب الگ تھلگ تھا۔ یہ حجرہ خلفائے راشدین کے عہد کے بعد ولید بن عبدالملک کے زمانے میں مسجد میں شامل کر دیا گیا۔ اس بنا پر مسجد نبوی میں نماز جائز ہے، بلکہ ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے، سوائے مسجد حرام کے۔ اس کے برخلاف جہاں کسی کی قبر پر مسجد بنائی گئی یا کسی کو مسجد میں دفن کیا گیا ہو تو وہاں نماز نہیں ہوگی۔ اگر پھر بھی وہاں کوئی نماز پڑھے تو وہ ایک حرام کام کا مرتکب قرار پائے گا۔[2]

مسجد نبوی کے مخصوص آداب میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ حجرہ شریفہ، اس کی جالی یا اس کی کوئی بھی چیز چومی جائے نہ سینہ یا پیٹ وغیرہ اس کے ساتھ رگڑا جائے۔ شریعت اسلامیہ اس کی اجازت نہیں دیتی۔ نبی ﷺ کی وصیت ہے:

«لَا تَجْعَلُوا قَبْرِي عِيدًا وَّ صَلُّوا عَلَيَّ فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ تَبْلُغُنِي حَيْثُ كُنْتُمْ»

"میری قبر کو عید (بار بار حاضری دینے کی جگہ) نہ بنانا، مجھ پر درود پڑھا کرو۔ چاہے تم کسی بھی مقام پر ہو، بے شک تمھارا درود مجھ تک پہنچ جاتا ہے۔"[3]

حجر اسود کی طرح قبر مبارک کے کسی گوشے کو چومنے یا جسم کے ساتھ رگڑنے کی مطلق اجازت نہیں۔ امام فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کا ایک قول ہے:

اِتَّبِعْ طُرُقَ الْهُدٰى وَلَا يَغُرُّكَ قِلَّةُ السَّالِكِينَ، وَإِيَّاكَ وَطُرُقَ الضَّلَالَةِ وَلَا تَغْتَرَّ بِكَثْرَةِ الْهَالِكِينَ

"ہدایت کے راستوں پر چلتے رہو۔ خبردار! ہدایت پر چلنے والوں کی تھوڑی تعداد تمھیں بہکانے نہ پائے اور گمراہی کے راستوں سے بچو اور ہلاک ہونے والوں کی کثرت تمھیں فریب میں نہ ڈالے۔"

جو شخص یہ سمجھے کہ جالی وغیرہ کو ہاتھ سے چھونے سے زیادہ برکت حاصل ہوتی ہے تو یہ محض ایک خیالِ خام ہے جو اس کی جہالت اور غفلت پر مبنی ہے۔ برکت تو شریعت کے امور کا اتباع کرنے اور علمائے حق کے اقوال کی موافقت

---

[1] مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: فتاوی إسلامية: 31/1 و33 و80، فتاوی اللجنة الدائمة: 402/1-412. [2] فتاوی إسلامية: 33/1. [3] سنن أبي داود: 2042.

کرنے پر موقوف ہے۔ صحیح احکام کی تعمیل چھوڑ کر من گھڑت طریقوں سے برکت وفضیلت حاصل کرنے کی تمنا دیوانے کا خواب ہے۔[1]

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت کے وقت آپ کے سامنے اُسی طرح کھڑا ہونا چاہیے جیسے زندگی میں آپ کے سامنے کھڑا ہوا جاتا تھا۔ آپ کی قبر کے قریب کھڑے ہوتے وقت اتنا ہی فاصلہ برقرار رکھنا چاہیے جتنا فاصلہ آپ کی زندگی میں آپ کے قریب کھڑے ہوتے وقت رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح اگر آپ خیال کریں کہ عزت قبر مبارک کو نہ چھونے اور نہ چومنے میں ہے تو نہ چھوا جائے اور نہ چوما جائے بلکہ آپ ﷺ کے سامنے ادب کے ساتھ سیدھا کھڑا ہوا جائے۔ چھونا اور چومنا نصاریٰ و یہود کا شیوہ ہے۔[2]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: علماء کا اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ کی قبر یا دیگر انبیاء و صالحین اور اہل بیت کی قبور کی زیارت کرنے والے کو چاہیے کہ وہ قبروں کو چھوئے نہ چومے۔ حجر اسود کے سوا دنیا میں کسی بھی بے جان چیز کو چوما نہیں جاتا۔ صحیحین میں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَاللّٰهِ! إِنِّي لَأُقَبِّلُكَ، وَ إِنِّي أَعْلَمُ أَنَّكَ حَجَرٌ، وَ أَنَّكَ لَا تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ، وَ لَوْلَا أَنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَبَّلَكَ مَا قَبَّلْتُكَ

”اللہ کی قسم! بے شک میں تجھے چوم رہا ہوں جبکہ مجھے خوب علم ہے کہ تو محض ایک پتھر ہے، تو کسی کو کوئی نقصان یا نفع نہیں پہنچا سکتا۔ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے چومتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی نہ چومتا۔“[3]

[1] المجموع للنووي:8/258,257، الأذكار للنووي :1/268. [2] إحياء علوم الدين للغزالي:1/347,346. [3] صحيح البخاري: 1597، صحيح مسلم: 1270، واللفظ له، مجموع الفتاوٰى لابن تيمية :27/79.

حجرہ شریفہ کا طواف نہ کیا جائے

کعبۃ اللہ کے گرد طواف کرنا ایک قسم کی عبادت ہے۔ اسے اللہ نے جاری فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۝ ﴾

''اور وہ قدیم گھر (بیت اللہ) کا طواف کریں۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے کعبہ کے سوا کسی اور گھر کا اس طرح طواف کرنا جائز قرار نہیں دیا جس طرح کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے۔ زمین پر کوئی ایسا گھر نہیں جس کا طواف کیا جاتا ہو۔ جس نے یہ اعتقاد رکھا کہ بیت اللہ کے سوا کسی دوسرے گھر کا طواف بھی جائز ہے تو اس کا یہ عقیدہ غلط اور بے بنیاد ہے۔ یہ عقیدہ کعبہ کے سوا کسی دوسرے قبلے کی طرف منہ کر کے نماز جائز قرار دینے کے مترادف ہے، پس رسول اللہ ﷺ کے حجرہ شریفہ کا طواف بالاتفاق کسی صورت جائز نہیں۔[2]

[1] الحج 29:22. [2] تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص: 35.

خلفائے راشدین کے دور میں مسجد نبوی کی توسیع

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں مسجد نبوی کی صورتحال

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے۔ اس وقت بعض عرب قبائل اسلام سے پھر گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فوراً مرتدوں کی سرکوبی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے، اس وجہ سے آپ مسجد نبوی کی توسیع یا مرمت کا کوئی کام نہ کر سکے۔ مسجد نبوی کے چند ستون بوسیدہ ہو گئے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ نئے ستون بنوا دیے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

إِنَّ مَسْجِدَ النَّبِيِّ ﷺ كَانَتْ سَوَارِيهِ عَلٰى عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ مِنْ جُذُوعِ النَّخْلِ، أَعْلَاهُ مُظَلَّلٌ بِجَرِيدِ النَّخْلِ، ثُمَّ إِنَّهَا نَخِرَتْ فِي خِلَافَةِ أَبِي بَكْرٍ، فَبَنَاهَا بِجُذُوعِ النَّخْلِ وَ بِجَرِيدِ النَّخْلِ

”رسول اللہ ﷺ کے عہد میں مسجد کے ستون کھجوروں کے تنے تھے۔ ان کے اوپر سائے کے لیے کھجوروں کی شاخیں ڈالی گئی تھیں۔ پھر یہ ستون ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بوسیدہ ہو گئے تو انھوں نے ان کی جگہ کھجور کے تنے کے نئے ستون نصب کر دیے اور کھجور ہی کی ٹہنیوں کی چھت ڈال دی۔“ [1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسجد نبوی کی توسیع

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مسلمانوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ لوگوں نے عرض کی: امیر المؤمنین! اب مسجد میں توسیع کرا دیجیے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں نے رسول اللہ ﷺ سے نہ سنا ہوتا تو میں توسیع نہ کرتا۔ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا تھا: ہم اپنی مسجد میں اضافہ کریں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد کی توسیع اور تعمیرِ نو سن 17ھ/638ء میں کرائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد کی بنیادیں قدِ آدم تک پتھر سے اٹھائیں۔ صحیح بخاری کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

[1] سنن أبي داود: 452، دلائل النبوة للبيهقي: 541/2.

أَنَّ الْمَسْجِدَ كَانَ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ مَبْنِيًّا بِاللَّبِنِ وَ سَقْفُهُ الْجَرِيدُ، وَ عُمُدُهُ خَشَبُ النَّخْلِ، فَلَمْ يَزِدْ فِيهِ أَبُوبَكْرٍ شَيْئًا، وَ زَادَ فِيهِ عُمَرُ وَ بَنَاهُ عَلَى بُنْيَانِهِ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ بِاللَّبِنِ وَالْجَرِيدِ، وَ أَعَادَ عُمُدَهُ خَشَبًا

''رسول اللہ ﷺ کے دور مبارک میں مسجد کچی اینٹوں سے بنی تھی، اس کی چھت کھجور کی ٹہنیوں کی تھی اور اس کے ستون بھی کھجور کے تنوں کے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اس کی تعمیرِ نو کرائی تو اس کے رقبے میں بھی اضافہ کیا اور نئی تعمیر اُسی طرح کرائی جس طرح رسول اللہ ﷺ کے دور میں تھی، یعنی کچی اینٹیں اور کھجور کی شاخیں ہی بروئے کار لائی گئیں، البتہ اس کے ستون لکڑی کے بنوائے تھے۔''[1]

مسجد کی توسیع کے حالات

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبلے کی طرف نبی ﷺ کے مصلّے (جائے نماز) سے ایک برآمدہ تقریباً دس ہاتھ (5 میٹر)، شمال کی جانب تیس ہاتھ (15 میٹر تقریباً) اضافہ کیا۔ مغربی جانب بھی دو ستونوں کے بقدر، یعنی بیس ہاتھ (10 میٹر) کی لمبائی تک اضافہ کیا، البتہ مشرقی طرف کوئی اضافہ نہ کیا۔ اس اضافے کے ساتھ مسجد کی شمال سے جنوب تک لمبائی 140 ہاتھ (70 میٹر) اور چوڑائی 120 ہاتھ (60 میٹر) ہوگئی۔ مسجد کی چھت گیارہ ہاتھ بلند کردی اور مغربی دیوار میں جنوب کی طرف ایک دروازے کا اضافہ کیا۔ اس کا نام ''باب السلام'' رکھا، اسی طرح مشرقی دیوار میں ایک دروازہ بنایا۔ اس کا نام ''باب النساء'' رکھا۔ انھوں نے مسجد کے دو صحن بنوائے۔ ایک مسجد کے ساتھ ملحق تھا اور دوسرا قدرے الگ تھا۔ اسی کا نام بُطَیحاء تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وادیِ عقیق سے پتھر کی چھوٹی چھوٹی کنکریاں منگوا کر ان صحنوں میں ڈلوا دی تھیں۔

امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد نبوی کے آداب کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ ان آداب میں سے ایک ادب یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں آواز بلند نہ کی جائے تاکہ مسلمان پورے اطمینان اور سکون سے نماز ادا کریں۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جب عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کی تعمیرِ نو کی اور اسے وسیع کیا تو انھوں نے مسجد سے باہر ایک چبوترہ بنادیا۔ اسے ''بُطَیحاء'' کہا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا کہ جسے شعر کہنے ہوں یا بلند آہنگی سے باتیں کرنی ہوں، وہ ''بُطَیحاء'' چلا جائے۔

[1] صحيح البخاري: 446، سنن أبي داود: 451.

ابن شبہ کی ایک روایت کے مطابق عمر رضی اللہ عنہ جب نماز سے فارغ ہوتے تھے تو ساتھ ہی مسجد میں یہ اعلان فرما دیتے تھے: لوگو! شور وغل سے بچو۔

ابن شبہ رحمہ اللہ نے اپنی روایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ بطیحاء نامی جگہ عمر رضی اللہ عنہ کے بعد مسجد کی توسیع میں شامل ہوگئی تھی۔

ابن شبہ ہی نے ایک اور مقام پر بتایا ہے کہ بطیحاء نامی چبوترہ عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مسجد کے پیچھے مشرقی جانب تھا۔[1]

عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں مسجد نبوی کی توسیع

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مسجد نبوی کی تیسری بار توسیع کی گئی۔ یہ ربیع الاول 29 ھ/649ء کی بات ہے۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے قبلے کی طرف اور شمال اور مغرب کی طرف اضافہ کیا۔ قبلہ کی طرف ایک برآمدے کا اضافہ کیا۔ قبلہ رخ والی موجودہ دیوار عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے زمانے میں چنی ہوئی دیوار کی جگہ پر قائم ہے۔ ان کے بعد قبلے کی طرف کسی نے کوئی اضافہ نہیں کیا۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے مغرب کی طرف بھی ایک برآمدے کا اضافہ کیا۔ راجح قول کے مطابق یہ منبر سے آٹھویں ستون تک تھا۔ شمالی جانب بھی دس ہاتھ تک کا اضافہ کیا تھا۔ اس طرح تینوں اطراف میں دس دس ہاتھ، یعنی پانچ، پانچ میٹر کا اضافہ کیا۔

عثمان رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کی توسیع اور تعمیر نو کے موقع پر منقش پتھر لگوائے، چونے کا گارا استعمال کیا اور چھت ساگوان کی لکڑی کی ڈالی۔ مسجد کے ستون بھی منقش پتھر کے بنائے گئے جن کے اندر لوہا اور سیسہ پگھلا کر بھرا گیا۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی جائے نماز کے لیے اینٹوں کا ایک مقصورہ (امام کے کھڑے ہونے کی باپردہ جگہ) بنایا۔ اس میں ایک کھڑکی بنوائی جہاں سے لوگ امام کو دیکھ سکتے تھے۔ آپ اسی جگہ امامت کراتے تھے۔ آپ کو خطرہ تھا مبادا کوئی عمر رضی اللہ عنہ کی طرح ان پر بھی حملہ کردے۔

دونوں خلفاء حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے مسجد نبوی کی مشرقی جانب کوئی اضافہ نہیں کیا اور امہات المؤمنین کے گھروں کو، جو مشرقی جانب تھے، برقرار رکھا۔ شمالی جانب امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے گھروں کے بارے میں یہ سوال حل طلب ہے کہ اس طرف توسیع کے بعد ان کا کیا بنا۔

اس کے متعلق سمہودی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ امیر المؤمنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جب شمالی جانب توسیع کی تو امہات المؤمنین کے گھروں کو جوں کا توں قائم رکھا اور ان کے اِرد گرد مسجد کا رقبہ بڑھا دیا۔ جب ولید بن عبد الملک کا زمانہ آیا تو اس

[1] وفاء الوفا: 498/2۔

نے بھی مسجد نبوی کی از سرِ نو تعمیر کرائی اور اسے بہت کشادہ کر دیا۔ اس نے مشرق اور شمالی جانب موجود امہات المؤمنین کے گھر گرانے اور انھیں مسجد میں شامل کرنے کا حکم دیا۔ اس وقت تک امہات المؤمنین وفات پا چکی تھیں اور مسلمان ان گھروں میں داخل ہو کر جمعہ کی نماز پڑھتے تھے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ لوگ نبی ﷺ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات کے حجروں میں جمعہ کی نماز پڑھنے آجاتے تھے کیونکہ مسجد میں جگہ نہیں ہوتی تھی۔ [1]

امام زرکشی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن فوت ہوگئیں تو یہ گھر عبدالملک بن مروان کے دور میں بالکل خالی ہوگئے۔ [2]

علی رضی اللہ عنہ کے دور میں مسجد نبوی کی صورتحال

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ مسجد کی تعمیر کے بعد خلعت شہادت سے سرفراز ہوئے۔ انھوں نے مسجد نبوی بڑی مضبوط بنیادوں پر بہت اچھے ساز و سامان سے تعمیر کرائی تھی۔ جب علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو مسجد نبوی میں کسی قسم کی تعمیر یا توسیع کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی، چنانچہ ان کے دور خلافت میں مسجد نبوی عہد عثمانی ہی کی تعمیر پر باقی رہی۔

[1] المدونة الكبرى :233/1، وفاء الوفا :517/2. [2] إعلام الساجد بأحكام المساجد للزركشي، ص :224، نیز دیکھیے: خلاصة الوفاء، ص :131.

ملحقات مسجد نبوی

منبر نبوی

نبی کریم ﷺ مسجد میں کھڑے ہو کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وعظ و ارشاد فرماتے تھے۔ جب آپ ﷺ کو کھڑے ہونے میں مشقت ہونے لگی تو آپ ﷺ کے لیے ایک منبر بنا دیا گیا اور مصلاّ (جائے نماز) کی مغربی جانب رکھا گیا۔ منبر کی یہ جگہ لیل و نہار کی گردشوں اور حالات و حوادث کی کروٹوں کے باوجود آج بھی بدستور قائم ہے۔

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: نبی ﷺ جمعہ کے دن ایک درخت یا کھجور کے تنے کے سہارے کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن کسی انصاری عورت یا مرد نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کی:

أَلَا نَجْعَلُ لَكَ مِنْبَرًا؟ قَالَ: «إِنْ شِئْتُمْ»

''کیا ہم آپ کے لیے ایک منبر نہ بنا دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم چاہو (تو بنا دو)۔''

انصار کے لوگوں نے آپ کے لیے ایک منبر بنا دیا۔[1]

منبر کی تاریخی حیثیت

یہ منبر پہلی بار سن آٹھ ہجری میں جھاؤ جیسی جنگلی لکڑی سے بنایا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس کی آخری سیڑھی پر بیٹھتے تھے اور پاؤں مبارک دوسری سیڑھی پر رکھتے تھے۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو وہ دوسری سیڑھی پر بیٹھتے تھے اور پاؤں نچلی سیڑھی پر رکھتے تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو وہ آخری سیڑھی پر بیٹھتے تھے اور پاؤں زمین پر رکھتے تھے۔ جب سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اپنی خلافت کے پہلے چھ سال تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طریقے کے مطابق بیٹھتے رہے، پھر سب سے اوپر والی سیڑھی پر بیٹھنے لگے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ بیٹھا کرتے تھے۔

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دور امارت میں جب حج کیا تو اس منبر کی سیڑھیوں میں اضافہ کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے دور والے منبر کو سب سے اوپر والی سطح پر رکھا۔ اب اس کے نو زینے ہو گئے تھے۔

[1] صحيح البخاري: 3584.

عہد رسالت والا منبر 654ھ/1256ء تک برقرار رہا حتی کہ مسجد میں آگ لگنے کی وجہ سے یہ منبر بھی جل گیا اور لوگ اس کی برکات سے محروم ہو گئے۔

اس کے بعد ملک مظفر (656ھ/1258ء)، الظاہر رکن الدین بیبرس (666ھ/1268ء)، الملک الظاہر برقوق (797ھ/1395ء) اور امیر شیخ ابوالنصر المؤید (820ھ/1417ء) کی طرف سے لکڑی کے منبر بن کر آتے رہے۔ آخری منبر جو المؤید کی طرف سے آیا تھا وہ بھی 886ھ/1481ء میں جل گیا۔ اس کے بعد اہل مدینہ نے پختہ اینٹوں سے منبر بنا کر اس پر سفید چونا پھیر دیا۔ بعدازاں ملک الاشرف قایتبائی نے 888ھ/1483ء میں سنگ مرمر کا منبر بنوا کر بھیجا۔

ملک الاشرف قایتبائی کا منبر مسجد قباء میں منتقل کر دیا گیا اور اس کی جگہ عثمانی سلطان مراد ثالث کی طرف سے 998ھ/1589ء میں ایک منبر بھیجا گیا جو انتہائی خوبصورت تھا اور بڑی محنت سے تیار کیا گیا تھا۔ یہ منبر سنگ مرمر کا ہے۔ اس کے اوپر زرنگاری کی گئی ہے اور بہت عمدہ نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ اس کے اوپر ایک چھوٹا سا سنگ مرمر کے چار ستونوں والا قبہ بنا ہوا ہے۔ اس کے دروازے کے اوپر چھجے بنے ہوئے ہیں جو حسن تعمیر کا نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔ اس پر سونے کے پانی کی ایک خاص چمک ہے، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کاری گر ابھی ابھی اس کی پالش کر کے فارغ ہوا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حکومت سعودیہ خالص سونے کے پانی سے اس کی پالش کا خصوصی اہتمام کرتی رہتی ہے۔ یہ منبر رسول اللہ ﷺ کے منبر کی جگہ محراب نبوی کی مغربی جانب رکھا ہوا ہے۔ اس کی 12 سیڑھیاں ہیں۔ تین دروازے سے باہر ہیں اور نو دروازے کے اندر ہیں۔ یہی منبر آج تک موجود ہے۔[1]

تنا فراقِ رسول ﷺ پر رو پڑا

مسجد نبوی کی چھت کھجور کے تنوں کے ستونوں پر قائم تھی۔ انھی ستونوں میں سے ایک ستون کے پاس کھڑے ہو کر نبی ﷺ نماز پڑھاتے اور وعظ فرماتے تھے۔ جب آپ ﷺ کا جسم مبارک کچھ بھاری ہو گیا تو آپ ﷺ نے از خود فرمایا یا کسی صحابی نے آپ سے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! ہم آپ کے لیے لکڑی کے منبر کی چند سیڑھیاں بنا دیتے ہیں جس پر کھڑے ہو کر آپ جمعہ کے دن خطبہ ارشاد فرمایا کریں۔ اس طرح لوگ آپ کو بخوبی دیکھ سکیں گے اور آپ کی آوازِ مبارک انھیں اچھی طرح سُنائی دے گی۔ آپ ﷺ نے اس کی اجازت مرحمت فرما دی تو اس صحابی نے آپ کے لیے تین سیڑھیوں والا ایک منبر تیار کر دیا جسے موجودہ منبر کی جگہ پر رکھ دیا گیا۔

[1] فتح الباري: 513/2، تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص: 120,119.

جمعہ کے دن رسول اکرم ﷺ تشریف لائے اور تنے کے پاس سے گزر کر منبر پر تشریف فرما ہوئے تو تنے سے ایسی دردناک آواز نکلی جو آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئی اور دس ماہ کی حاملہ اونٹنی کے درد زہ کے وقت کی آواز کے مشابہہ ہوگئی۔ یہ منظر دیکھ کر رسولِ رحمت ﷺ منبر سے اترے، تنے کو اپنے مبارک سینے سے لگایا اور شفقت سے اس پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اب تنے کو قرار آ گیا اور اس کے رونے کی آواز اس طرح ڈوبتی چلی گئی جیسے روتا ہوا بچہ آہستہ آہستہ خاموش ہوجاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے رونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

«كَانَتْ تَبْكِي عَلَى مَاكَانَتْ تَسْمَعُ مِنَ الذِّكْرِ عِنْدَهَا»

''یہ اس وجہ سے رو رہا ہے کہ اس کے پاس اللہ کا ذکر ہوتا تھا اور یہ اسے سنتا تھا۔''

تنے کا انجام

عہدِ خلفائے راشدین میں جب مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع ہوئی اور مسجد کے ستون تبدیل کیے گئے تو مذکورہ ستون کا کیا بنا؟ اس کے بارے میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ ستون سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ اپنے گھر لے گئے جہاں اسے دیمک نے چاٹ لیا یا اسے منبر کے نیچے دفن کر دیا گیا۔ [1] ممکن ہے پہلی توسیع کے وقت اسے دفن کیا گیا ہو اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کی توسیع کے وقت اسے نکال کر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اپنے گھر لے گئے ہوں جہاں اسے دیمک لگ گئی اور وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ جب تنے کے رونے والا واقعہ روایت کرتے تھے تو خود بھی آبدیدہ ہو جاتے تھے اور فرماتے تھے: اللہ کے بندو! ایک بے جان تنا رسول اللہ ﷺ سے اس قدر محبت رکھتا ہے، تم پر تو بدرجۂ اولیٰ لازم ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے شدید محبت کرو اور آپ ﷺ سے ملاقات کا شوق رکھو۔ [2]

مسجد نبوی کے ستون

روز اول ہی مسجد نبوی میں جب چھت ڈالی گئی تھی، وہ چھت کھجور کے تنوں سے بنے ہوئے ستون کھڑے کر کے ڈالی گئی تھی۔ ان ستونوں کے مقامات کو ایک خاص قسم کی اہمیت و فضیلت حاصل رہی ہے۔ ستون کو عربی میں اُسْطُوَان یا اُسْطُوَانَة کہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ستونوں کا تعلق براہ راست رسول مقبول ﷺ کی مبارک زندگی کے کسی نہ کسی اہم واقعے سے ہے۔ ایسے ستونوں کی تعداد آٹھ ہے مگر ان میں سے صرف پانچ نظر آتے ہیں۔ باقی ماندہ

[1] صحيح البخاري: 3585,3584، سنن ابن ماجه: 1414، وفاء الوفا: 394/2. [2] الشفا بتعريف حقوق المصطفى: 429/1.

باقی ماندہ تین ستون حجرہ شریفہ کی حدود میں آ گئے ہیں۔ آئیے! ان ستونوں کے احوال پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

اسطوانہ مخلّقہ

اسطوانہ مخلّقہ: یہ ستون دیگر ستونوں کے مقابلے میں اس لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے کہ یہ ٹھیک اس جگہ قائم ہے جہاں رسول اللہ ﷺ کے فراق میں رونے والا تنا موجود تھا جس پر رسول اللہ ﷺ منبر بننے سے پہلے ٹیک لگایا کرتے تھے اور اس کی طرف منہ کر کے فرض نماز ادا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ و تابعین رحمہم اللہ اس ستون کے پاس نماز پڑھنا پسند کرتے تھے۔ یہ ستون قبلے کی جانب سے محراب نبوی سے متصل ہے اور اس پر لکھا ہوا ہے: هٰذِهِ أُسْطُوَانَةُ الْمُخَلَّقَةِ.

المخلقة: خَلُوق سے بنا ہے۔ خلوق ایک خاص قسم کی خوشبو ہے جس میں ملی جلی اشیاء ہوتی ہیں، تاہم اس میں زعفران کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔[1]

ابن عجلان سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے مدینہ منورہ کے گورنر کو لکھا کہ صرف قبلہ کی جانب والے ستون پر خلوق (خوشبو) ملی جائے۔[2]

یہ ستون ''اسطوانہ مصحف'' یا ''اسطوانہ مخلّقہ'' کے نام سے معروف ہے۔ مصحف سے مراد قرآن کریم ہے۔ حجاج بن یوسف نے جب قرآن کریم کے چند نسخے تیار کرائے اور مختلف علاقوں میں بھیجے تو ایک نسخہ صندوق میں بند کر کے مسجد نبوی میں اسطوانہ مخلقہ کے پاس رکھوا دیا۔ اس لیے یہ ستون، ستون صندوق بھی کہلاتا ہے۔ اسی ستون کے پاس نبی ﷺ کا مصلیٰ تھا۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس ستون کی طرف منہ کر کے رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے۔

اسطوانہ مخلقہ کی فضیلت

اسطوانہ مخلقہ کے حوالے سے یزید بن ابی عبید کہتے ہیں:

كُنْتُ آتِي مَعَ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ فَيُصَلِّي عِنْدَ الْأُسْطُوَانَةِ الَّتِي عِنْدَ الْمُصْحَفِ، فَقُلْتُ:

1 وفاء الوفا: 2/440،439. 2 خلاصة الوفاء، ص: 394.

يَا أَبَا مُسْلِمٍ! أَرَاكَ تَتَحَرَّى الصَّلَاةَ عِنْدَ هٰذِهِ الْأُسْطُوَانَةِ؟ قَالَ: فَإِنِّي رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَتَحَرَّى الصَّلَاةَ عِنْدَهَا.

''میں سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد میں آتا تو سیدنا سلمہ رضی اللہ عنہ اس ستون کے پاس کھڑے ہو کر نماز پڑھتے جو مصحف کے پاس ہے۔ میں نے کہا: ابومسلم! (سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی کنیت) میں آپ کو دیکھتا ہوں کہ آپ اسی ستون کو تلاش کر کے اس کے پاس نماز ادا کرتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا: بے شک میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ اسی کو تلاش کر کے اس کے پاس نماز پڑھتے تھے۔'' [1]

امام ابن القاسم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں نفل نماز کے لیے بہترین جگہ خوشبو والا ستون (أسطوانہ مخلقہ) ہے اور فرض نماز کے لیے بہترین جگہ صف اول ہے۔ دیگر ائمہ کے اقوال بھی اسی مفہوم کے ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ سے رسول اللہ ﷺ کی مسجد کے متعلق پوچھا گیا۔ ان سے کہا گیا: آپ مسجد میں کس جگہ ترجیحی طور پر نماز پڑھنا پسند کرتے ہیں؟ فرمانے لگے: نفل نماز تو آپ ﷺ کے مصلّے کے مقام پر اور فرض نماز پہلی صف میں۔ یہاں امام مالک رحمہ اللہ نے ''اسطوانہ مخلقہ'' کو نبی ﷺ کا مصلاّ قرار دیا ہے۔ [2]

بعض علماء کا کہنا ہے کہ ''اسطوانہ مخلقہ'' خوشبو والا ستون روضہ شریفہ کے اندر کے ستونوں میں سے ایک ہے۔ اس شبہے کا سبب یہ ہے کہ یہ ستون بھی خوشبو والے ستون کے نام سے مشہور ہے جس کی بنا پر یہ خیال پیدا ہوا کہ نبی ﷺ اسی کے پاس نماز پڑھا کرتے تھے اور سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ بھی اسی کی جستجو کرتے تھے۔ جبکہ معاملہ یوں نہیں کیونکہ اسطوانہ مخلقہ (خوشبو والا ستون) متعدد ستونوں کو کہا گیا ہے۔

جب مطلق طور پر ''اسطوانہ مخلقہ'' خوشبو والا ستون کہا جائے تو اس سے وہی ستون مراد ہے جو محراب کے پاس داہنی جانب ہے۔ نیز ابن زبالہ اور ابن نجار رحمہما اللہ کے کلام سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ ستون جس کے پاس صندوق ہوتا تھا، وہی ستونِ عائشہ ہے۔ [3]

مذکورہ بالا احادیث اور آثار جو خوشبو والے ستون کے بارے میں ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ خوشبو والا ستون وہی ہے جو قبلے کی سمت محراب سے ملا ہوا ہے۔

اسطوانہ عائشہ: یہ ستون منبر شریف سے مشرق کی طرف تیسرا ستون ہے۔ قبر مبارک سے مغرب کی طرف بھی یہ تیسرا

---

[1] صحيح البخاري: 502، صحيح مسلم: 509. [2] وفاء الوفا: 1/368-370. [3] تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص: 125.

اسطوانہ عائشہ رضی اللہ عنہا

ہے، نیز قبلے سے شمال کی سمت بھی تیسرا ہے۔ اس پر لکھا ہوا ہے: هٰذِهِ أُسْطُوَانَةُ عَائِشَةَ. اس ستون کا نام "أُسْطُوَانَةُ الْقُرْعَة، أُسْطُوَانَةُ الْمُهَاجِرِين اور أُسْطُوَانَةُ الْمُخَلَّقَة" بھی ہے۔ ان ناموں کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ

- اسے "أُسْطُوَانَةُ الْقُرْعَة" اس لیے کہا گیا ہے کہ حدیث شریف میں اس جگہ کی فضیلت بیان کرنے کے لیے نمازیوں کے ممکنہ طور پر قرعہ ڈالنے کا ذکر ہوا ہے۔
- اسے اسطوانۂ عائشہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس ستون کی نشاندہی فرمائی تھی اور حدیث کا مطلب واضح کیا تھا۔
- اسے اسطوانۂ مہاجرین اس لیے کہا جاتا ہے کہ قریشی مہاجرین اسی کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔
- اسے اسطوانۂ مخلقہ، یعنی خلوق خوشبو والا ستون اس لیے کہتے تھے کہ اس پر بھی خَلُوق خوشبو ملی جاتی تھی جیسا کہ امام سمہودی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے۔[1]

اسطوانہ عائشہ کے بارے میں احادیث و آثار

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ فِي الْمَسْجِدِ لَبُقْعَةً قِبَلَ هٰذِهِ الْأُسْطُوَانَةِ لَوْ يَعْلَمُ النَّاسُ مَا صَلَّوْا فِيهَا إِلَّا أَنْ يُطَيَّرَ لَهُمْ فِيهَا قُرْعَةٌ»

"بے شک اس مسجد میں اس ستون کی جانب ایک جگہ ہے، اگر لوگوں کو اس (جگہ پر نماز کے ثواب) کا علم ہو جائے تو وہ وہاں نماز پڑھنے کے لیے قرعہ ڈالنے لگیں گے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ حدیث سنائی تو اس وقت صحابہ کی ایک جماعت اور مہاجرین کی اولاد میں سے کچھ بچے ان کے پاس موجود تھے۔ صحابہ نے عرض کی: مومنوں کی ماں! وہ ستون کہاں ہے؟ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا خاموش

[1] وفاء الوفا: 370/1.

ہو گئیں۔ صحابہ کچھ دیر آپ کے پاس رہے، پھر گھر سے نکل گئے، البتہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ان کے پاس ہی ٹھہر گئے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کہنے لگے: اب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا عبداللہ کو اس جگہ کا پتہ ضرور بتا دیں گی، لہٰذا جب وہ مسجد میں آ جائیں تو ان کا دھیان رکھنا اور دیکھنا کہ وہ مسجد میں کس جگہ نماز ادا کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما باہر نکلے اور اس ستون کے پاس نماز پڑھنے لگے جس کے پاس ان کے بیٹے عامر بن عبداللہ بن زبیر رحمہ اللہ نے نماز پڑھی ہے، چنانچہ اسے أُسْطُوَانَةُ الْقُرْعَة کہا جانے لگا۔[1]

ابن نجار رحمہ اللہ نے ابن زبیر بن حبیب سے روایت کیا ہے کہ روضہ کی طرف اسطوانۂ توبہ کے بعد منبر اور قبر کی طرف سے تیسرا ستون اسطوانۂ عائشہ رضی اللہ عنہا ہے اور یہ روضہ کے درمیان واقع ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دس سے اوپر چند فرض نمازیں اسی کے پاس پڑھائیں، پھر اپنے مصلے کی طرف بڑھ گئے۔ یہ ستون آپ کے پیچھے ہوتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر، عمر، زبیر، ان کا بیٹا عبداللہ اور عامر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم اس کے پاس نماز پڑھتے رہے۔ قریشی مہاجرین بھی اس کے پاس اکٹھے ہوا کرتے تھے، اس لیے اس ستون کو مجلس المہاجرین (مہاجرین کی بیٹھک بھی) کہا جاتا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس ستون کے بارے میں فرماتی ہیں: اگر لوگ اسے پہچان لیں تو اس کے پاس نماز ادا کرنے کے لیے قرعہ اندازی کریں۔ صحابہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے اس ستون کا ذکر نہیں کیا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے توجہ سے سننے کے لیے اپنا کان عائشہ رضی اللہ عنہا کے قریب کر دیا تو انھوں نے سرگوشی کے انداز میں کچھ ارشاد فرمایا۔ بعد میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اس ستون کے پاس کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے لگے جسے اسطوانۂ عائشہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھے، وہ کہنے لگے: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی مبارک ستون کی خبر دی ہے، اس لیے اس کا نام اسطوانۂ عائشہ پڑ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس کھڑے ہو کر دعا کی جائے تو قبول ہوتی ہے۔[2]

أُسْطُوَانَةُ أَبِي لُبَابَه: یہ اسطوانہ یا ستون منبر شریف سے چوتھا، قبر مبارک سے دوسرا اور قبلے کی طرف سے تیسرا ستون ہے۔ یہ ستون سیدنا ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو اس کے ساتھ اس ارادے سے باندھ لیا تھا کہ یا تو وہ یہیں فوت ہو جائیں یا اللہ ان کی توبہ قبول کر لے۔ اسے اسطوانۂ توبہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اللہ نے ان کی توبہ اس حال میں قبول کی تھی کہ وہ ستون سے بندھے ہوئے تھے۔ ان سے بنو قریظہ کے بارے میں غلطی ہو گئی تھی جس کی بنا پر انھوں نے اپنے آپ کو سزا دیتے ہوئے اِس ستون سے باندھ لیا تھا۔

[1] المعجم الأوسط للطبراني: 476,475/1، حديث: 866. [2] أخبار مدينة الرسول ﷺ، ص: 92,91، تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص: 127,126.

رسول اللہ ﷺ اس ستون کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے جیسا کہ محمد بن کعب سے مروی ہے کہ نبی ﷺ اسطوانۂ توبہ کی طرف منہ کر کے نفل نماز پڑھتے تھے۔ [1] ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور ان کی توبہ کی قبولیت کا قصہ آگے اپنے مقام پر آئے گا۔

اسطوانۂ سریر: یہ ستون ''اسطوانۂ توبہ'' کی مشرقی جانب جالی سے ملا ہوا ہے۔ اس پر لکھا ہوا ہے: ''أُسْطُوَانَةُ السَّرِير'' سریر چارپائی اور تخت وغیرہ کو کہتے ہیں۔ اسے اسطوانۂ سریر اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب نبی ﷺ کو اعتکاف کرنا ہوتا تو آپ کی چارپائی (سریر) اس جگہ رکھ دی جاتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف کرتے تھے۔ نافع رحمہ اللہ نے کہا: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مجھے وہ جگہ دکھائی جہاں رسول اللہ ﷺ اعتکاف کیا کرتے تھے۔ [2]

اسطوانۂ سریر

نافع رحمہ اللہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی، وہ نبی ﷺ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کو جب اعتکاف کرنا ہوتا تو آپ ﷺ کا بستر اسطوانۂ توبہ کے پیچھے لگایا جاتا یا آپ کی چارپائی بچھا دی جاتی تھی۔ [3]

یہ جگہ حجرۂ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے قریب تھی۔ اس کی دلیل سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول ہے: جب رسول اللہ ﷺ اعتکاف میں ہوتے تو آپ اپنا سر مبارک میرے قریب کر دیتے، میں آپ ﷺ کا سر مبارک دھو کر کنگھی کر دیتی تھی، حالانکہ میں اپنے گھر میں ہوتی اور حیض کی حالت میں ہوتی تھی اور آپ ﷺ مسجد میں ہوتے تھے۔ [4]

اس جگہ کے شرف کے باعث امام مالک رحمہ اللہ یہاں بیٹھا کرتے تھے۔ [5]

أُسْطُوَانَةُ الْمُخَرَّس (الحرس): یہ ستون جالی کے ساتھ ملا ہوا ہے اور اسطوانۂ سریر کے پیچھے شمال کی طرف ہے۔ اس پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے: ''هٰذِهِ أُسْطُوَانَةُ الْمَحْرَس'' اس کا نام أُسْطُوَانَةُ الْمَحْرَس اس لیے رکھا گیا کہ

[1] خلاصة الوفاء، ص: 116. [2] سنن ابن ماجه: 1773. [3] صحيح ابن خزيمة: 350/3، حديث: 2236، سنن ابن ماجه: 1774. [4] سنن ابن ماجه: 1778. [5] تاريخ مسجد النبوي الشريف، ص: 130.

اسطوانۃ الحرس اور اسطوانۃ الوفود

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے اسی ستون کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ اسے اسطوانۂ علی رضی اللہ عنہ بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ ان کا مصلا اس رخ ہوتا تھا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی جاتی تھی یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المآئدة 5:67)

''اور اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے بچائے گا۔''

اس آیت کے نزول کے بعد نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبہ سے سر مبارک نکالا اور فرمایا:

«أَيُّهَا النَّاسُ! انْصَرِفُوا فَقَدْ عَصَمَنِي اللّٰهُ»

''لوگو! اپنے اپنے گھر چلے جاؤ، اللہ نے میری حفاظت فرما دی ہے۔''[1]

أُسْطُوَانَةُ الْوُفُود: یہ ستون بھی جالی سے ملا ہوا ہے اور أُسْطُوَانَةُ الْمَحْرَس کے پیچھے شمالی جانب ہے۔ اس پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے: ''هٰذِهٖ أُسْطُوَانَةُ الْوُفُود'' اس کا نام أسطوانة الوفود اس لیے رکھا گیا کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم عربوں کے وفود سے ملاقات کے لیے اس کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ شروع میں اس جگہ پر چھت نہیں تھی، مسجد کا صحن اسی جگہ تک ہوتا تھا۔ یہ ستون ''مجلس القلادہ'' کے نام سے بھی معروف ہے۔ اس کو مجلس القلادۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں بنو ہاشم وغیرہ کے سرکردہ اصحاب اور صاحبِ فضیلت صحابہ بیٹھا کرتے تھے۔

امام برزنجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مذکورہ تینوں ستون: ستونِ سریر، ستون محرس اور ستون وفود، یہ باہر سے جالی کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، اور ادھوری شکل میں نظر

اسطوانۃ الوفود

[1] جامع الترمذي: 3046، المستدرك للحاكم: 313/2، حديث: 3221.

آتے ہیں۔ یہ سلطان اشرف قایتبائی کے زمانے میں اُس وقت بنائے گئے تھے جب حجرۂ عائشہ پر قبہ مبارک کو کشادہ کیا گیا تھا۔ تینوں اصلی ستون جالی کے اندر تھے، چنانچہ ان کے نام پر باہر نظر آنے والے ستونوں کے نام رکھ دیے گئے کیونکہ اندر والے ستون ان کے ساتھ متصل ہیں۔ یہ کیفیت تصویر سے بھی بخوبی واضح ہو رہی ہے۔

اسطوانۂ مربع قبر: یہ ستون حجرے کے اندر ہے۔ اسے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ حجرے کے اندر شمال مغربی کونے کے پاس ہے۔ اسطوانۂ وفود اسی لائن میں ہے۔ اسے اسطوانۂ مربع قبر اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ شمال مغربی مربع کے کنارے واقع ہے۔ اس پر ایک چھوٹا قبہ بنایا گیا ہے جو حجرہ شریفہ اور قبور مبارکہ کو گھیرے ہوئے ہے۔[1]

رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّة کے ستون

سلطان سلیم ثالث بن سلطان عبدالحمید اول عثمانی کے عہد میں روضہ شریفہ کے ستونوں کی نصف اونچائی تک سفید سنگ مرمر لگا دیا گیا۔ مجیدی تعمیر میں جب یہ ستون از سر نو بنائے گئے تو ان پر حسب سابق دوبارہ سنگ مرمر لگا دیا گیا، البتہ ان ستونوں کی چمک دمک اور آرائش میں اضافہ کر دیا گیا۔ اسطوانۂ وفود سے لے کر منبر شریف تک کے تمام ستون جو روضہ شریفہ کے دو برآمدوں اور مواجہہ شریفہ کے سامنے تھے، ان پر آرائش کر کے انھیں خوب مزین کیا گیا۔ امام برزنجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: روضہ شریفہ کے ستونوں پر الگ رنگ کا سنگ مرمر لگانے سے روضہ شریفہ کی شمالی حد کی ایک خاص علامت نمایاں ہوگئی ہے۔

بعد میں اس سنگ مرمر کے بعض ستونوں کی پالش ماند پڑنے لگی تو حکومت سعودیہ نے 1404ھ میں ان کی جگہ سفید رنگ کا نیا سنگ مرمر لگا دیا۔[2]

[1] وفاء الوفا: 450/2، نزهة الناظرين، ص: 57. [2] تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص: 117,116.

مسجد نبوی کا تاریخی پس منظر

بیت المقدس کے رُخ پر رسول اللہ ﷺ کی جائے نماز

ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے سولہ ماہ اور چند دن تک بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھی۔ شمالی جانب مسجد کے آخر میں رسول اللہ ﷺ کی جائے نماز تھی۔ اسطوانۂ عائشہ سے پانچ ستون شمال کی جانب باب جبریل کے بالمقابل رسول اللہ ﷺ کا مصلّٰی تھا۔ یہ سمت اس وقت شمار ہوگی جب باب جبریل زائر کے دائیں جانب اور اس کا رخ شمال کی طرف ہو۔ [1]

محراب نبوی

آغاز ہجرت میں نبی ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا:

[1] خلاصة الوفاء، ص: 108۔

محراب نبوی

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (البقرة2:144)

''آپ اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف پھیر لیں۔''

اِس آیت مبارکہ کی رُو سے قبلہ تبدیل ہوگیا تو چند دن آپ ﷺ اسطوانۂ عائشہ کے پاس نماز پڑھتے رہے، پھر آگے اپنے مصلے کی طرف بڑھ گئے۔ اب اس مصلے کی جگہ ایک محراب بنی ہوئی ہے جو محراب نبوی کہلاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں یہاں جوف دار محراب نہیں تھی۔ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے سن91ھ میں جب مسجد کی از سرِنو تعمیر کرائی تو جہاں رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے تھے، وہاں یا اس کے قریب تر ایک محراب بنادی جو بعد میں محراب نبوی کے نام سے معروف ہوئی۔

رسول اللہ ﷺ کی جائے نماز کے پاس موجودہ محراب کی تعمیر سلطان اشرف قایتبائی (888ھ) کی طرف منسوب ہے۔ محراب کی پشت پر لکھی ہوئی عبارت سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ. أَمَرَ بِعِمَارَةِ هٰذَا الْمِحْرَابِ الشَّرِيفِ النَّبَوِيِّ الْعَبْدُ الْفَقِيرُ الْمُعْتَرِفُ بِالتَّقْصِيرِ مَوْلَانَا السُّلْطَانُ الْمَلِكُ الْأَشْرَفُ أَبُوالنَّصْرِ قَايِتْبَاي، خَلَّدَ اللّٰهُ مُلْكَهُ، بِتَارِيخِ شَهْرِ الْحِجَّةِ الْحَرَامِ سَنَةَ ثَمَانٍ وَّثَمَانِينَ وَثَمَانِمِائَةٍ مِّنَ الْهِجْرَةِ النَّبَوِيَّةِ.

''شروع اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے آقا و سردار حضرت محمد ﷺ پر رحمتیں نازل فرمائے۔ مسجد نبوی شریف کی اس محراب کی تعمیر کا حکم (رحمتِ الٰہی کے) محتاج بندے اور اپنی کوتاہیوں کے معترف ہمارے سردار سلطان ملک الاشرف ابونصر قایتبائی نے حرمت والے مہینے ذوالحجہ 888ھ میں دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بادشاہت تا دیر قائم رکھے۔

پھر خادم الحرمین الشریفین ملک فہد بن عبدالعزیز آل سعود رحمہ اللہ نے اس محراب کی 1404ھ میں مرمت کرائی۔ تختی پر خط ثلث میں لکھی یہ تحریر اس پر دلالت کرتی ہے:

وَبَعْدَ أَنْ حَصَلَ تَفَكُّكٌ وَّتَصَدُّعٌ فِي الْفُسَيْفِسَاءِ وَالرُّخَامِ أَمَرَ بِتَجْدِيدِهٖ جَلَالَةُ الْمَلِكِ فَهْدُ ابْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ آلُ سُعُودٍ أَعَزَّهُ اللّٰهُ وَذٰلِكَ سَنَةَ أَرْبَعٍ وَّ أَرْبَعِمِائَةٍ وَّ أَلْفٍ.

بعدازاں جب اس محراب کی پچی کاری اور سنگ مرمر میں بعض جگہوں پر دراڑیں پڑ گئیں تو جلالۃ الملک فہد بن عبدالعزیز آل سعود رحمہ اللہ نے اس کی تجدید کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں عزت سے نوازے۔ یہ تجدید 1404ھ میں ہوئی۔''

محراب عثمانی

اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ مسجد نبوی کی توسیع کے بعد کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے تھے۔ انھوں نے صرف مقصورہ تعمیر کرایا تھا، اس طرح یہ امام کے کھڑے ہونے کی باپردہ جگہ بن گئی، البتہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے سن 91ھ میں مسجد کی تعمیر نو کے وقت یہاں ایک محراب بنا دی جو محراب عثمانی کے نام سے معروف ہوئی۔

محراب عثمانی

محراب تہجد

مقصورہ شریفہ کے شمال میں ایک محراب بنی ہوئی ہے۔ اسے محراب تہجد کہتے ہیں۔ اس جگہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز تہجد ادا کرتے تھے۔ اس کے گرد آج کل ایک ڈیوڑھی سی بنی ہوئی ہے۔ ہر رات جب لوگ اپنے اپنے گھر چلے جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چٹائی ڈال لیتے تھے، پھر علی رضی اللہ عنہ کے گھر کی طرف ایک نظر دیکھتے تھے اور نماز تہجد ادا کرتے۔

محراب تہجد کا قدیم وجدید منظر

محراب فاطمہ رضی اللہ عنہا

حجرہ نبوی (عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر) کے پیچھے شمالی جانب مقصورہ کے اندر ایک سنگ مرمر کی جوف دار محراب ہے جو محراب فاطمہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔

محراب حنفی

منبر نبوی کے مغربی رُخ پر تیسرے ستون کے پاس، محراب نبوی میں اگر کوئی شخص کھڑا ہو تو اُسے دائیں جانب ایک محراب نظر آئے گی۔ یہ محراب حنفی کے نام سے مشہور ہے۔ اس محراب کے بارے میں گفتگو کرنے سے پہلے یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ مسجد نبوی میں ایک زمانے تک مالکی امام تھے۔ ساتویں صدی ہجری میں کچھ لوگوں نے مصری حکام کی وساطت سے شافعی امام مقرر کر دیا اور نماز کا طریقہ یہ ہو گیا کہ شافعی امام مالکیوں سے پہلے اندھیرے میں نماز فجر پڑھاتا تھا، بعدازاں مالکی نماز پڑھتے تھے۔ بقیہ نمازوں میں مالکی پہلے نماز ادا کرتے، پھر ان کے بعد شافعی نماز پڑھنے آجاتے تھے۔ نویں صدی ہجری کے دوسرے نصف میں طوغان شیخ نے یہ محراب بنوائی اور اس جگہ ایک حنفی امام مقرر کیا۔ اسی نسبت سے یہ محراب حنفی کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ سن 860ھ کی بات ہے۔ سلطان سلیمان خان اول المعروف قانونی نے 938ھ میں اس محراب کی تجدید و تزئین کی اور اس پر سفید اور سیاہ سنگِ مرمر لگایا۔ سلطان سلیمان خان نے اپنے دورِ حکومت میں مسجد نبوی تعمیر کرانے کا آغاز 937ھ میں کیا جبکہ محراب 938ھ میں بنوائی۔ سلطان سلیمان خان نے چونکہ اس محراب کی تجدید کی تھی، چنانچہ یہ محراب اُسی کے نام سے شہرت پا گئی اور لوگ اسے محراب سلیمانی کہنے لگے۔[1]

صفہ کے بارے میں ضروری وضاحت: حجرہ شریفہ کی شمالی جانب آج کل جو چبوترا موجود ہے، وہ نبی ﷺ کے دور کا صفہ نہیں۔ صفہ درحقیقت رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک کی مسجد کے شمال میں ایک تھوڑی سی چھتی ہوئی جگہ کا نام ہے۔ یہ جگہ مسجد کے اندر ہی تھی۔ آج کل کا موجودہ چبوترا اس دور کی مسجد سے باہر واقع ہے اور یہ صفہ کا چبوترا نہیں۔

مسجد نبوی ولید بن عبدالملک اموی رحمہ اللہ کے دور میں

اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک رحمہ اللہ نے مدینہ کے گورنر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو حکم دیا کہ مسجد نبوی کی

[1] تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص: 104-111.

از سرِ نو تعمیر اور توسیع کی جائے۔ انھوں نے ربیع الاول 88ھ / 707ء میں تعمیری کام کا آغاز کرایا۔ اس کام کی 91ھ/710ء میں تکمیل ہوئی۔ تعمیری کام کی نگرانی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے خود کی۔ انھوں نے مغرب کی طرف دو ستونوں، یعنی بیس ہاتھ تقریباً 10 میٹر کا اضافہ کیا۔ مغرب کی طرف انھی کا اضافہ برقرار رہا۔ ان کے بعد کسی اور نے اس طرف کوئی اضافہ نہیں کرایا۔ انھوں نے امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے گھر بھی مسجد میں شامل کر دیے۔ مشرق کی طرف تین ستونوں، یعنی تیس ہاتھ تقریباً 15 میٹر تک توسیع کی گئی۔ اسی طرح شمال کی طرف بھی توسیع ہوئی۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے مسجد کی تعمیر میں دیواروں میں منقش پتھر لگوائے اور ستون اندر سے کریدے ہوئے پتھروں سے بنوائے جن میں لوہا اور سیسہ پگھلا کر ڈالا گیا۔ انھوں نے مسجد کی دو چھتیں بنوائیں۔ ایک بالائی چھت تھی، دوسری زیریں۔ زیریں چھت ساگوان کی لکڑی کی ڈالی۔ اس کی بلندی 25 ہاتھ، یعنی ساڑھے بارہ میٹر کے قریب تھی۔

اس تعمیر کی امتیازی خوبی یہ تھی کہ مسجد کی جوف دار محراب اور چار مینار بنائے گئے۔ مسجد کی اندرونی دیواروں پر سنگ مرمر لگوا کر پچی کاری کی گئی اور خالص سونے سے آرائشی کام کیا گیا۔ اسی طرح چھت، ستونوں کے بالائی حصوں اور دروازوں کی دہلیزوں پر طلائی کام کیا گیا تھا۔ مسجد نبوی کی یہ تعمیر مشرقی جانب توسیع، دو مضبوط چھتوں اور بیس خوبصورت دروازوں کے ساتھ ممتاز تھی۔[1]

عباسی دور میں مسجد نبوی کی دیکھ بھال

عباسی خلفاء نے بھی مسجد نبوی کی دیکھ بھال کی۔ وہ وقتاً فوقتاً اصلاح و مرمت کا کام کراتے رہے۔ انھوں نے مسجد کی بعض دیواریں نئے سرے سے تعمیر کرائیں، چھت کی مضبوطی کا اہتمام کیا اور خوبصورت فرش بنوایا۔ وہ مسجد کی تزئین و آرائش کا خاص خیال رکھتے تھے۔

عباسی خلیفہ محمد مہدی بن ابوجعفر 160ھ میں حج کے لیے آئے۔ انھوں نے مدینہ منورہ کی زیارت کی اور مسجد نبوی کا جائزہ لیا تو اس کی از سرِ نو مکمل تعمیر اور توسیع کا حکم دیا۔ یہ مسجد نبوی کی پانچویں دفعہ توسیع تھی۔ اس کام کی نگرانی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے پوتے عبداللہ بن عاصم بن عمر اور عبدالملک بن شبیب غسانی نے کی۔ مسجد کی تعمیر جاری تھی کہ عبداللہ بن عاصم فوت ہو گئے۔ ان کی جگہ عبداللہ بن موسیٰ حمصی نگران مقرر ہوئے۔ انھوں نے صرف شمالی طرف سے مسجد میں سو ہاتھ تک کا اضافہ کیا۔ قبلے کی جانب اور مشرق اور مغرب کی طرف کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

[1] وفاء الوفا: 2/519-525، تاریخ المسجد النبوي الشريف، ص: 48.

اس تعمیر نو کا کام چار سال میں مکمل ہوا۔ 161ھ/779ء میں کام کا آغاز ہوا اور 165ھ/782ء میں تکمیل کو پہنچا۔ اس کے بعد مسجد اسی حالت میں برقرار رہی۔ 886ھ تک اس میں کسی نے کوئی توسیع نہیں کی۔ [1]

ابن نجار کہتے ہیں: بنو عباس کے خلفاء مدینہ منورہ کے لیے خصوصی گورنر مقرر کرتے رہے اور مسجد نبوی کی دیکھ بھال کے لیے بھرپور مالی تعاون کرتے رہے۔

مسجد نبوی میں آگ لگنے کا پہلا سانحہ

مسجد نبوی میں دو مرتبہ آگ لگی۔ امام سمہودی کے مطابق پہلی مرتبہ یکم رمضان سن 654ھ کو جمعہ کی رات آگ لگ گئی۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مسجد کے خدام میں سے ایک خادم ابوبکر بن اَوحد مشعل لے کر بتی گودام میں داخل ہوا تو اچانک اُس کے ہاتھ سے مشعل گر پڑی جس سے گودام میں آگ بھڑک اٹھی۔ خادم یہ آگ بجھانے کی کوشش میں ناکام رہا۔ گودام میں چٹائیاں اور دریاں وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھیں۔ شعلے بھڑکے تو چٹائیاں اور دریاں بھی جلنے لگیں، یوں آگ کے شعلے لپک کر چھت تک جا پہنچے۔ اس طرح قبلے کی طرف چھت تیزی سے آگ کی زد میں آکر جلنے لگی۔ گورنر مدینہ کو یہ اطلاع ملی تو وہ اور ان کے معاونین فوراً موقع پر پہنچے۔ لیکن آگ اتنے وسیع پیمانے پہ بھڑک رہی تھی کہ وہ ہر طرح کی کوشش کے باوجود آگ پر قابو نہ پا سکے۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے مسجد کی ساری چھت آگ کی لپیٹ میں آ گئی۔ اس کے نتیجے میں منبر نبوی، دروازے، گودام، مقصورے اور صندوق وغیرہ سب جل کر راکھ ہو گئے۔

اس وقت عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کا دورِ حکومت تھا۔ اُس نے 655ھ میں مسجد کی از سر نو تعمیر کا حکم دیا۔ تعمیر شروع ہوگئی تھی مگر تاتاریوں کے فتنے کے سبب تکمیل نہ ہونے پائی۔ یہ مبارک کام بعد ازاں مصر اور یمن کے حکمرانوں نے مکمل کیا۔ اس سلسلے میں سلطان رکن الدین بیبرس نے بڑا شاندار کردار ادا کیا۔ انھوں نے مسجد کی دو چھتیں اوپر تلے اسی طرح بنوائیں جس طرح آگ لگنے سے پہلے بنی ہوئی تھیں۔

آگ لگنے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت

علامہ قطب قسطلانی نے کہا ہے: اس آگ کے شعلوں میں اللہ کی صفت قہر اور عظمت کا مشاہدہ کیا گیا۔ اس سانحے پر سب خاص و عام لوگ نہایت غمزدہ ہوئے۔ کیا بڑا کیا چھوٹا سب پر ایک طرح کا رعب طاری ہو گیا۔ یہ آگ چونکہ مدینہ کی بڑی آگ کے بعد لگی تھی جس سے نبی ﷺ نے ڈرایا تھا اور پیش گوئی بھی فرمائی تھی۔ اس وقت

[1] وفاء الوفا: 536/2، تاریخ المسجد النبوي الشريف، ص: 49.

اُس آگ سے اہل مدینہ مسجد میں پناہ لینے کی بنا پر محفوظ رہے تھے اور آگ حرم نبوی کے قریب پہنچ کر بجھ گئی تھی۔ اس صورتحال سے اہل مدینہ کے دل میں یہ بات آسکتی تھی کہ مسجد نبوی کے پڑوس کی وجہ سے وہ دنیا کی اس آگ سے محفوظ رہے ہیں تو گناہوں کے باوجود آخرت کی آگ سے بھی محفوظ رہیں گے، چنانچہ انھیں زبان حال سے ایسی زبردست نصیحت حاصل ہوئی جو زبان قال سے نہیں ہوسکتی تھی۔ [1]

مسجد نبوی میں آگ لگنے کا دوسرا المناک سانحہ

سن 656ھ میں دولت عباسیہ کے خاتمے کے بعد مدینہ طیبہ کی خدمت کا اعزاز مصر کے ممالیک کو نصیب ہوا۔ انھوں نے مسجد نبوی کی تعمیر وترقی کا خوب اہتمام کیا۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں کردار سلطان اشرف قایتبائی نے ادا کیا۔

امام سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خلفاء اور بادشاہ خرچ کرنے والوں کے تعاون سے ہمیشہ مسجد نبوی کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ مسجد کی چھت اور دیواروں کی وقتاً فوقتاً دیکھ بھال اور مرمت کراتے رہے۔ اسی طرح منبر اور ستونوں کی مرمت اور زیب وزینت کا کام بھی وقتاً فوقتاً ہوتا رہا۔ ان سلاطین میں سے اشرف قایتبائی کو اللہ تعالیٰ نے مسجد نبوی کی خدمت کے خصوصی شرف سے نوازا اور اس نے مسجد کے ضروری تعمیراتی کاموں میں خوب دل کھول کر پیسہ لگایا۔ [2]

886ھ/1481ء میں رمضان المبارک کی 13 ویں شب تھی جب مسجد نبوی میں اچانک آگ بھڑک اٹھی۔ مسجد نبوی میں آتشزدگی کا یہ دوسرا سانحہ تھا جو ناگہانی طور پر دفعتاً ظہور میں آیا۔ ہوا یوں کہ رئیس المؤذنین شمس الدین ابن خطیب دوسرے مؤذنوں کے ساتھ منارہ رئیسیہ پر اذان دے رہا تھا۔ اس وقت آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

[1] خلاصة الوفاء، ص: 157، وفاء الوفا: 600,599/2. [2] التحفة اللطيفة: 13/1.

مسجد نبوی
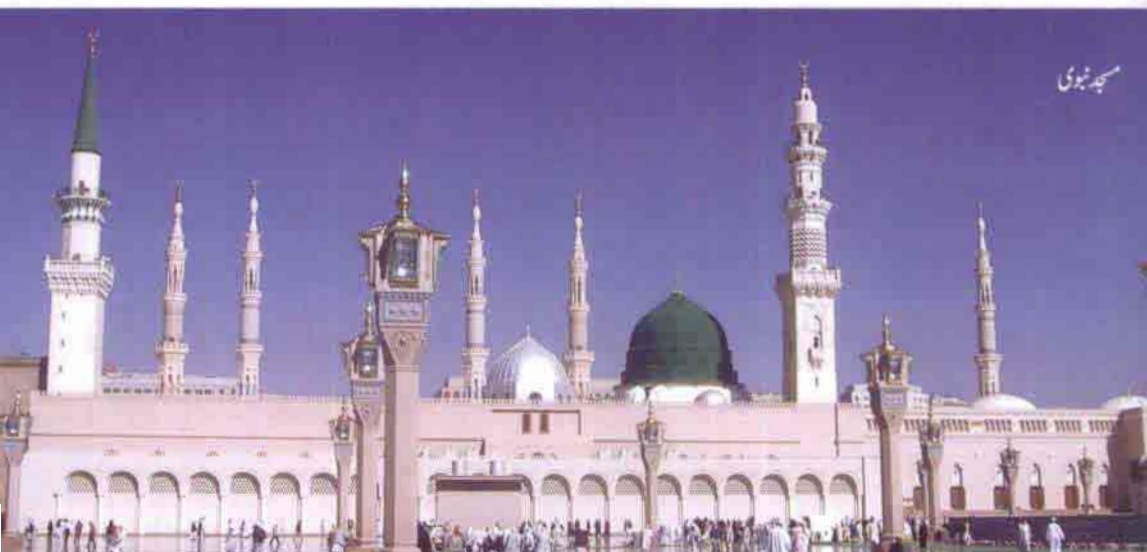
اسی دوران میں اچانک بہت زور سے بادل گرجے اور بجلی چمکی۔ برق و رعد کی یہ کڑک اور چمک اس غضب کی تھی کہ مسجد کے مشرقی جانب مینارہ رئیسیہ کے ایک حصے پر دفعتاً بجلی گر پڑی۔ اس کی زد میں آکر رئیس المؤذنین موقع ہی پر اللہ کو پیارا ہوگیا اور مینار کے ایک حصے کو شدید نقصان پہنچا۔ آسمانی بجلی مینار کے قریب مسجد کی چھت پر بھی گری جس سے دونوں چھتوں میں آگ لگ گئی۔ فوری طور پر مسجد کے دروازے کھول دیے گئے اور اعلان کیا گیا کہ مسجد میں آگ لگ گئی ہے۔ مدینہ کا امیر اور اہل مدینہ بھاگے بھاگے مسجد میں آئے۔ انھوں نے آگ بجھانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر آگ نہیں بجھی۔ آگ بہت شدید تھی۔ اس نے آناً فاناً مسجد کی ساری چھت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بالآخر مسجد کی پوری چھت، کتابوں کی الماریاں، قرآن کے پارے اور مکمل نسخے سب جل گئے۔ البتہ وہ نسخے محفوظ رہے جو جلدی جلدی نکال لیے گئے تھے۔ ایک قبہ بھی بچ گیا۔ یہ قبہ صحن میں تھا۔ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ بڑے بڑے شرارے اُڑ اُڑ کر آس پاس گر رہے تھے۔ اس آگ سے حجرہ مبارک کا اندرونی حصہ محفوظ رہا۔

اس سانحے کے بعد سلطان اشرف قایتبائی نے پوری مسجد نئے سرے سے نہایت مستعدی سے تعمیر کرائی۔ اس کی تکمیل رمضان المبارک کے آخر میں 888ھ/1483ء میں ہوئی۔ انھوں نے اس موقع پر حجرہ شریفہ کی مشرقی جانب سے سوا دو ہاتھ، یعنی تقریباً ایک میٹر تک کی توسیع بھی کرائی۔ انھوں نے مسجد کی ایک ہی چھت ڈالی جس کی اونچائی 22 ہاتھ، یعنی 11 میٹر کے لگ بھگ تھی۔[1]

مجیدی دور میں مسجد نبوی کے حالات و آثار

مصر میں ممالیک کے دور کے بعد 923ھ/1517ء میں مسجد نبوی کا انتظام عثمانیوں کے ہاتھ میں آگیا۔ انھوں نے مسجد نبوی کی بڑی ذمہ داری سے دیکھ بھال کی۔ انھوں نے دیواروں اور ستونوں پر سنگ مرمر لگوایا، بعض نئے دروازے لگوائے اور دیواریں چنوائیں۔ انھوں نے سبز گنبد بھی نیا بنوایا اور اسی طرح کی دوسری اہم اصلاحات کیں۔

سلطان اشرف قایتبائی کی تعمیر کردہ مسجد نبوی تین سو ستتر برس تک قائم رہی۔ لیل و نہار کی اتنی طویل گردشیں بیت جانے کے بعد یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ مسجد کے بعض حصوں میں دراڑیں پڑنی شروع ہوگئیں۔ اس وقت کے شیخ حرم داود پاشا نے سلطان عبدالمجید کو خط لکھا اور مسجد کی ضروریات اور ازسرنو تعمیر کی طرف توجہ دلائی۔ سلطان عبدالمجید اول نے انجینئر رمزی آفندی اور عثمان آفندی کو بھیجا تاکہ مسجد نبوی کی تعمیر نو کے بارے میں ایک جامع رپورٹ تیار کریں

[1] خلاصة الوفاء ص: 159-161.

اور تعمیر کے لیے جس جس چیز کی ضرورت ہو، اس کی نشاندہی کریں۔ یہ سن 1265ھ/1848ء کی بات ہے۔ ان دونوں انجینئروں نے اہل مدینہ کو ساتھ ملا کر مسجد کی تعمیر و تجدید کے لیے تمام مطلوبہ چیزوں کی ایک جامع رپورٹ تیار کی اور آستانہ (استنبول) واپس آ گئے۔ انھوں نے سلطان عبدالمجید کو بتایا کہ مسجد نبوی کی از سر نو تعمیر نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ سلطان نے کمر ہمت باندھی، حلیم آفندی کو تعمیرات کا نگران اعلیٰ بنایا اور اس کی معیت میں ضروری تعمیری اشیاء، تعمیری آلات، مطلوبہ رقم، ماہرین کی جماعت، پتھر تراشنے والے کاریگروں اور مزدوروں کی ایک کھیپ مدینہ منورہ روانہ کر دی۔

مسجد کی تعمیر کے لیے پتھر کی تلاش

سلطان عبدالمجید کے بھیجے ہوئے ماہرین جب ینبع پہنچے تو انھوں نے آغا ابراہیم نامی ایک شخص کو متعدد معاونوں کے ساتھ ینبع ہی کے علاقے سے پتھر اور سنگ مرمر تلاش کرنے بھیجا۔ یہاں انھیں مطلوبہ پتھر نہیں مل سکے۔ چنانچہ وہ اسی تلاش و جستجو میں مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ مدینہ کے اطراف میں انھوں نے چند پہاڑوں کی کئی دن تک کھدائی کی۔ بالآخر ابیار (آبار) علی کے پاس وادی عقیق کے بالمقابل ٹیلوں سے انھیں گوہر مقصود حاصل ہو گیا۔ یہ بہت بڑا پہاڑ تھا۔

وادی عقیق

اس میں سرخ رنگ کے پتھر کی کان تھی۔ اس کا رنگ عقیق کے رنگ کے مشابہ تھا۔ یہاں قریبی پہاڑوں پر سنگ تراشوں کے لیے خیمے لگا دیے گئے۔ بڑے بڑے ہتھوڑے اور پتھر توڑنے کے آلات نصب کیے گئے اور رب ذوالجلال والاکرام کا مقدس نام لے کر پہاڑ کی چوٹی سے کام کا آغاز کیا گیا۔ پہلے مرحلے میں پہاڑ کی چوٹی سے ردی قسم کا بے کار پتھر الگ کیا گیا تو نیچے سے صاف شفاف پتھر کی اصلی کان ظاہر ہو گئی۔ اب سنگ تراش بڑی بڑی چھینیوں کی مدد

سے پتھروں کی لمبی چوڑی سلیں نکالنے لگے۔ یہ پتھر خچروں اور گدھوں پر لاد کر ایک خاص جگہ لے جائے جاتے جہاں انھیں تعمیری کام کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔

سلطان کے بھیجے ہوئے فنی کاریگروں نے مسجد کی شمالی طرف ایک دارالضیافہ کھول دیا۔ اس میں کاتبین، سنگ تراش اور ستون وغیرہ بنانے والوں کے لیے خصوصی کمرے بنائے گئے۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک گول شکل کا احاطہ تعمیر کیا گیا۔ اس کا ایک ہی دروازہ رکھا گیا تاکہ کاریگر، ان کے آلات، جانور اور چھکڑے وغیرہ چوروں سے محفوظ رہیں۔[1] انھوں نے پینے کے پانی کے لیے بھی پچاس ہاتھ گہرا اور دس ہاتھ چوڑا ایک کنواں کھودا اور مدینہ کے باہر چونا، کھریا مٹی اور کچی اینٹیں پکانے کے لیے بھٹیاں لگائیں۔[2]

سن 1277ھ/1861ء میں جب مسجد نبوی کی تعمیر نو کا کام تکمیل کے قریب تھا تو تعمیری منصوبے کے نگران سعد آفندی نے حرم کے شیخ اور اس کے نائب، مدینہ کے حاکم، دیگر امراء اور شہر کی ممتاز شخصیتوں کو دعوت دی کہ وہ اس پہاڑ کو دیکھ لیں جس کا پتھر حرم شریف میں لگایا گیا ہے، چنانچہ یہ لوگ اور ان کے ساتھ اہل مدینہ کی خاصی تعداد بھی اس پہاڑ کو دیکھنے چلی گئی۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ پہاڑ کے دو حصے ہو چکے ہیں اور اس کے بیچ سے پتھر نکالا جا چکا ہے۔ بس اب تھوڑا سا باقی ہے۔ اب پہاڑ کے اوپر بائیں جانب ایک تختی لگی ہوئی ہے جس پر لکھا ہے: ''اس پہاڑ سے حرم نبوی شریف کی تعمیر کے لیے پتھر نکالا گیا۔'' اس تختی کے ساتھ وہ دو چھینیاں بھی آویزاں ہیں جن کی مدد سے محنت کش اس پہاڑ سے پتھر نکالتے تھے۔

ستون اور محرابیں (ڈاٹیں) سرخ پتھر سے بنائی گئیں کیونکہ یہ پتھر تراشنے میں آسان ہے اور اس کا رنگ نہایت خوبصورت ہے۔ بنا بریں یہ عمدہ کاری گری کے کام کے لیے بہت موزوں ہے، البتہ مسجد کی چار دیواری سیاہ حراوی پتھر سے بنائی گئی کیونکہ یہ سرخ پتھر کی بہ نسبت زیادہ ٹھوس اور مضبوط ہے۔[3]

مجیدی عمارت کے تدریجی مراحل

عثمانی ترکوں نے مسجد نبوی کی تعمیر کا آغاز کیا تو انھوں نے بڑی حکمت سے کام لیا۔ انھوں نے ساری مسجد ایک دم نہیں گرائی بلکہ آہستہ آہستہ تھوڑے تھوڑے حصے گرانے شروع کیے تاکہ نمازیوں کو ادائے نماز میں مشکل پیش نہ

[1] اللہ سعودی حکمرانوں کو جزائے خیر دے، انھوں نے اللہ کی شریعت نافذ کر کے پورے جزیرہ نمائے عرب کو چوروں، ڈاکوؤں اور راہزنوں سے پاک کر دیا جبکہ عثمانی سلطنت کی ترقی کے دور میں چوروں پر قابو نہ پایا جا سکا۔ اس میں اصل اعجاز قوانین الٰہی کے نفاذ کا ہے کہ اس میں سب کو بلا امتیاز انصاف ملتا ہے، چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ [2] نزهة الناظرين، ص: 23-25، تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص: 54،55. [3] نزهة الناظرين، ص: 43.

آئے۔ ابتدائی طور پر مسجد کی شمالی طرف مشرقی منارے سے مغربی منارے تک عقبی صحن والی چھتیں مسمار کی گئیں، پھر انھیں تراشے ہوئے سرخ پتھروں سے تعمیر کیا گیا۔ اس جگہ تین تین ستونوں کی قطاروں کے اوپر، جس میں دیواروں کے ستون بھی شامل تھے، قبوں کی شکل میں چھت تعمیر کی گئی۔ ان ستونوں کی اونچائی گیارہ گیارہ ہاتھ تھی۔

عقبی صحن کا شمالی حصہ مکمل کر کے مشرقی جانب توجہ دی گئی۔ یہاں منارہ رئیسیہ تک کچھ حصہ گرا کر تعمیر کیا گیا۔ اس جگہ مسجد کچھ تنگ تھی، لہٰذا انھوں نے باہر کی طرف، جہاں جنازگاہ تھی، سوا پانچ ہاتھ، یعنی تقریباً اڑھائی میٹر کا اضافہ کر کے مسجد کشادہ کر دی۔ اس کے لیے ترک ماہرین نے بہت بڑی بنیاد کھودی، اسے خوب مضبوط کیا، پھر بنیاد کے اندر اور باہر دیوار پر تراشے ہوئے پتھر لگائے۔ دیوار باہر بنانے کی وجہ سے جو جگہ خالی بچی، وہاں انھوں نے ایک کمرہ تعمیر کر دیا۔ اس کے اوپر ایک اور کمرا بنایا۔ اس کی سیڑھیاں کمرے کے اندر ہی بنائی گئیں۔ اس میں حجرہ شریفہ کے کام سے وابستہ بعض چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ نئی تعمیر کردہ دیوار میں بڑی بڑی کھڑکیاں رکھی گئیں۔ ان کھڑکیوں کے اوپر گول روشندان بنائے گئے۔ حجرہ شریفہ کے بالمقابل کھڑکی پر ایک کنگرا بنایا جس پر یہ آیت مقدسہ کندہ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝﴾

”بلاشبہ اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی اس پر درود بھیجو اور خوب سلام بھیجو۔“ [1]

باب جبریل

اس کے اوپر ایک گول پتھر تھا جس پر ہدہد کی کلغی جیسی ایک کلغی بنی ہوئی تھی اور اس پر سونے کا پانی چڑھایا گیا تھا۔ باب جبریل سے منارۂ رئیسیہ تک محرابیں (ڈاٹیں) اور قبے مکمل کر کے معمار اور مزدور مغرب کی طرف آ گئے۔ ادھر مسجد کے صحن کے ایک طرف تین نئے برآمدے تعمیر کیے گئے، پھر معمارانِ حرم نبوی مشرقی جانب آئے۔ یہاں انھوں نے مشرقی منارے سے لے کر باب النساء تک کی تعمیرات گرا کر صحن کے دوسری طرف دو برآمدے از سرِ نو تعمیر کیے۔

بعد ازاں باب النساء اور باب جبریل کا درمیانی حصہ گرا کر نئے سرے سے بنایا۔ اسی طرح مذکورہ دونوں دروازوں

[1] الأحزاب 56:33.

باب النساء

کے درمیان مسجد نبوی کی خدمت کے لیے خود کو وقف کرنے والوں (أغوات) کے کمرے کے ساتھ والا سٹور سرخ پتھروں سے از سر نو تعمیر کرتے ہوئے دو منزلیں بنائیں۔ مسجد کے خدام خاص (أغوات) کے لیے بھی کمرے بنائے۔ انھی میں سے ایک کمرے میں ''محراب تہجد'' بھی ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مسجد کی بقیہ پوری چھت گرادی۔ اب انھوں نے لکڑی کی چھت کے بجائے قبے بنائے۔ مسجد کے تمام ستون اپنی اصل جگہ پر نئے سرے سے بنائے گئے۔ ان ستونوں پر ڈاٹیں (محرابیں) بنائیں، پھر ان ڈاٹوں پر قبے تعمیر کیے۔ بہت سے قبوں میں روشن دان اور پیتل کی جالی دار کھڑکیاں رکھیں تاکہ دن کو مسجد میں روشنی آتی رہے۔ یہ قبے مربع شکل کی پختہ اینٹوں، خالص چونے اور صاف (چکنی) مٹی سے تعمیر کیے گئے۔ ان قبوں میں سے بعض پر لکڑی کی تختیوں کے قبے بھی بنائے گئے۔ ان قبوں میں بھی کھڑکیاں رکھی گئیں تاکہ بارش کے وقت انھیں بند کر دیا جائے اور بارش کا پانی مسجد میں داخل ہونے کا امکان باقی نہ رہے۔

جب روضہ مبارک کی تعمیر کا وقت آیا تو معماروں نے لکڑی کے تختوں سے چھت اور زمین کے درمیان ستونوں کی اوپر والی جانب پر ایک باپردہ جگہ بنالی تاکہ چھت مسمار ہوتے وقت کوئی شور پیدا نہ ہو اور مٹی بھی نیچے نہ گرے۔ اسی طرح حجرہ شریفہ کے اوپر مقصورہ پر بھی چھت سے زمین تک ایک بڑا پردہ ڈال دیا تاکہ حجرۂ مطہرہ میں مٹی داخل نہ ہو۔ یہ اقدام محمد مصطفیٰ ﷺ کے انتہائی ادب کے پیش نظر کیا گیا۔ یہاں سے چھت شدید ضرب لگائے بغیر دھیرے دھیرے ادھیڑی گئی۔ اسی طرح مواجہہ شریفہ کی تعمیر کے وقت بھی زمین سے چھت تک پردہ آویزاں کر کے کام کیا گیا۔

مسجد نبوی کی قبلے والی دیواروں میں ستون نہیں بنائے گئے۔ بس دیوار ہی کے اوپر سے ڈاٹیں (محرابیں) نکال کر ان پر قبے تعمیر کیے گئے۔ اگر اس دیوار میں ستون بنائے جاتے تو اس سے پہلی صف ٹیڑھی ہو جانے کا خطرہ تھا۔ مسجد کی مغربی جانب باب السلام کے پاس جو چار ستون بنے ہوئے ہیں، انھیں منصوبے کے ایک نگران راشد آفندی

نے مسجد کے دیگر کونوں کے ڈیزائن کے مطابق بنایا۔ لوگوں نے کہا بھی کہ یہاں ستون نہ بنائے جائیں مگر ان کی شنوائی نہیں ہوئی، جب اس کے بارے میں عثمانی سلطان عبدالمجید کو شکایت بھیجی گئی تو انھوں نے اُسے روک دیا اور حکم دیا کہ جو ستون بن چکے ہیں، انھیں گرا دیا جائے۔ مگر انھیں ختم کرنے کے لیے بڑی مشقت اٹھانی پڑتی اور بہت زیادہ اسراف ہوتا۔ مزید برآں ستونوں کے ساتھ مسجد کی ملحقہ دیوار بھی گرانی پڑتی، پھر اسے دوبارہ تعمیر کرنا پڑتا۔ اس لیے انھیں برقرار رکھنا مناسب سمجھا گیا چونکہ یہ ستون مسجد کے ایک کونے میں تھے، اس لیے ان کی وجہ سے عمارت کے حسن میں کوئی عیب بھی پیدا نہیں ہوا۔

ایک ستون مواجہہ شریفہ کے سامنے باب البقیع (باب منارہ رئیسیہ) سے باہر نکلنے والے راستے کے دائیں ہاتھ ہے۔ یہ اوپر سے خالی ہے اس پر کوئی چھت نہیں۔ یہ قدیمی ستونوں میں سے ایک ہے اور اسلاف کی یادگار نشانی کی حیثیت سے باقی ہے۔

مجیدی عمارت مقصورہ شریفہ اور جو کچھ اس میں ہے، منبر شریف، مغربی دیوار، محراب نبوی، محراب عثمانی، محراب سلیمانی اور منارہ رئیسیہ (جنوب مشرقی منارہ) کے سوا پوری مسجد کی عمارت کا احاطہ کرتی تھی۔ ان مقامات کو ترکوں نے ان کی مضبوطی اور حُسنِ صناعی کی بنا پر برقرار رکھا۔[1]

محراب اور باب السلام کے قبے

عثمانی ترکوں نے قبلے رخ کی دیوارنئی بنائی تھی۔ محراب عثمانی کے پاس دیوار کے اوپر والے حصے میں محراب کے اوپر کے قبے کی مضبوطی کے لیے دیوار ہی میں ایک ڈاٹ بنائی کیونکہ انھوں نے محراب کا قبہ نیا اور کشادہ بنایا تھا اور اس کے لیے ایک ہی جگہ کئی ستون اکٹھے تعمیر کیے۔ یہ قبہ جدید طرز کا تھا۔ اس کے اطراف میں ڈاٹ نما کھڑکیاں رکھی گئیں۔ یہ قبہ سلطان قایتبائی کے حکم پر دوسری آتش زدگی کے بعد تعمیر کیا گیا تھا۔

اس کے بعد انھوں نے باب السلام تعمیر کرنا شروع کیا۔ اس کے لیے انھوں نے مسجد کے اندر ایک بہت بڑی ڈاٹ تیار کی جس میں صرف دو

باب السلام

[1] وصف المدينة المنورة، ص :58، مرآة الحرمين :466/1، تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص :60,59.

بڑے بڑے پتھر استعمال کیے گئے۔ اسی سے ملتی جلتی ایک ڈاٹ دروازے کے باہر کی طرف بھی تیار کی گئی۔ اس کے اوپر ایک چھوٹا سا قبہ بنایا جو پہلے یہاں نہیں تھا۔ کاریگروں نے ان تعمیرات میں اپنے ہنر کا بڑا خوبصورت نمونہ پیش کیا۔[1]

ایک قبہ گرنے کا سانحہ

عثمانی ترکوں کو مسجد نبوی کی تعمیر شروع کیے ہوئے دو سال کا عرصہ بیت چکا تھا کہ اس دوران میں مسجد کی اگلی طرف سے مواجہہ شریفہ کے سامنے جہاں کھڑے ہو کر زائرین حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر سلام پیش کرتے ہیں، وہاں ایک قدیم قبے کا کچھ حصہ گر گیا۔ یہ شیخ صاوی کے شاگرد شیخ محمد اسکندری کے سر پر گرا۔ انھیں اٹھا کر ان کے گھر لے جایا گیا جہاں وہ زخموں سے جانبر نہ ہو سکے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ سانحہ 1267ھ/1850ء میں پیش آیا۔[2]

اصلی مسجد کی حد

مجیدی عمارت سے پہلے مغربی دیوار کے قریب مسجد کا فرش اصل مسجد کے فرش سے کچھ اونچا تھا۔ اس طرف سے یہ اصل مسجد کی حد تھی۔ عثمانی معماروں نے اس اونچی جگہ کو پست کر کے اصل مسجد کے برابر کر دیا۔ اس پر علامت کے طور پر ستونوں کے سروں پر صرف یہ لکھ دیا: ”حد مسجد النبی ﷺ“۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ علامت اس سے پہلے بھی موجود تھی جیسا کہ امام سخاوی نے لکھا ہے: ”مجھے (سخاوی کو) معلوم ہوا ہے کہ منبر سے پانچویں ستون پر چھت کے قریب یہ عبارت نقش ہے: نهاية المسجد النبوي ”یہ مسجد نبوی کی حد ہے۔“

[1] نزهة الناظرین، ص: 43,42، خلاصة الوفاء، ص: 325. [2] تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص: 56.

نبی ﷺ کے دور میں مسجد نبوی کی حد کے ستون

نبی کریم ﷺ کے زمانے کی اصل مسجد کی قبلے کی جانب سے پہچان یہ ہے کہ ترکوں نے سرخ تراشے ہوئے پتھروں سے ایک چھوٹی سی دیوار بنا دی جس کا سرا کوہان نما بنایا گیا ہے۔ اس دیوار پر پیتل کا جالی دار جنگلہ لگا دیا، پھر اس دیوار میں دروازوں کی مثل کچھ کھلے راستے بنا دیے جو محراب نبوی اور محراب سلیمانی کے دائیں بائیں موجود ہیں۔

شمالی جانب سے مجیدی عمارت کا اختتام اصلی مسجد کی حد ہے۔ اور مشرقی طرف سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے برابر تک مسجد کی حد ہے۔[1]

مسجد کی زیب و زینت

عثمانی ترکوں نے مسجد کے سارے فرش پر اور قبلے کی نصف دیوار تک سنگ مرمر لگوایا۔ ستونوں کو صاف کر کے پتھر ہی کے رنگ جیسا روغن کرا دیا گیا اور ستونوں کے سروں پر زرنگاری کی گئی۔ تمام قبوں کے اندر مختلف قسم کے درختوں، پھولوں اور جاری پانی والی نہروں کے نقوش و نگار بنائے۔ روضہ شریفہ اور اس سے متصل قبلے والی طرف کے ستونوں پر سفید اور سرخ سنگ مرمر لگایا گیا۔ اس سے شمال اور مغرب کی طرف سے روضہ شریفہ کی حد کی ایک خوبصورت علامت بن گئی۔ عثمانیوں نے محراب نبوی شریف، عظمت و جلال والے منبر اور محراب عثمانی کو دوبارہ سونے کے کام سے مزین کرایا۔[2]

مسجد نبوی کے در و بام پر کتابت

استنبول سے ایک ماہر خطاط عبداللہ زہدی آفندی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مسجد کے قبوں، محرابوں، دیواروں

[1] تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص :60,59. [2] تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص :60.

اور ستونوں پر جتنی بھی آیات وغیرہ لکھی ہوئی ہیں، وہ انھی کے فن پارے ہیں۔ یہ حسن خط کا ایسا نفیس اور خوبصورت نمونہ ہیں جن کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ تمام آیاتِ مبارکہ اور احادیث کی کتابت میں تین سال لگے۔ سامنے قبلے کی دیوار پر قرآنی آیات، نبی ﷺ کے اسمائے گرامی اور صفات چار سطروں میں لکھی ہوئی ہیں۔ پہلی سطر میں خط ثلث میں یہ آیت لکھی ہوئی ہے:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ○﴾ (البقرة2:185،186)

اس کے بعد دیگر آیات لکھی ہیں۔

دوسری سطر میں خط عریض میں یہ آیات مقدسہ لکھی ہوئی ہے:

قال اللّٰه تعالٰى: ﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ڼ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ○﴾ (البقرة2:197)

اس کے بعد دیگر آیات لکھی ہیں۔

تیسری سطر میں لکھا ہے:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ○﴾ (النور24:36)

بعدازاں پوری سورۃ الفتح لکھی ہے۔

چوتھی سطر میں نبی کریم ﷺ کے اسمائے گرامی اور آپ ﷺ کی صفات لکھی ہیں جن کی تعداد دو سو ایک ہے۔[1]

منارہ رئیسیہ (باب البقیع) کی طرف سے مسجد سے باہر نکلیں تو دائیں ہاتھ خالی ستون ہے۔ اس پر چھت نہیں، اس کے پاس یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

اَللّٰهُمَّ! شَفِّعْ هٰذَا النَّبِيَّ الْكَرِيمَ لِكَاتِبِ الْحَرَمِ الشَّرِيفِ النَّبَوِيِّ الْفَقِيرِ عَبْدِ اللّٰهِ الزُّهْدِيِّ مِنْ سُلَالَةِ تَمِيمِ الدَّارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ رَبُّهُ الْبَارِي.

''اے اللہ! روز قیامت حرم نبوی شریف کے کاتب، رب کی رحمت کے محتاج عبداللہ زہدی آل تمیم داری (رضی اللہ عنہ)

[1] وصف المدينة المنورة، ص:60، نزهة الناظرين، ص:44، مرآة الحرمين:1/468.

کے حق میں اپنے پیارے نبی کریم ﷺ کی سفارش قبول فرما۔''

پتھر پر حدیث کی کتابت

عثمانی ترکوں نے جب مسجد نبوی کی تعمیر مکمل کرائی تو انھوں نے سرخ پتھر کی ایک بڑی سل تیار کرائی، پھر اسے مسجد کی چھت کے نیچے صحن کی جانب اونچا کر کے قبلہ رو رکھوا دیا۔ معمار کی رائے تھی کہ اس پر اشعار کی شکل میں تعمیرِ مسجد کی تاریخ تکمیل لکھ دی جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے مدینہ کے بلند پایہ ادیب بُلوائے تاکہ وہ یہ تاریخ تحریر کر دیں۔

علماء کی ایک جماعت نے قطعاتِ تاریخ لکھے جنھیں سلطان کی خدمت میں پیش کیا گیا تاکہ وہ اپنے حسبِ ذوق ان میں سے قطعاتِ تاریخ پسند کر لیں۔ سلطان نے مسجد نبوی میں اشعار لکھنے سے منع کر دیا اور آستانہ عالیہ میں دفتر شیخ الاسلام میں ایک مجلس بلائی۔ اس میں علامہ محمد رفیق آفندی نے یہ حدیث مبارک لکھنے کی تجویز پیش کی:

«صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي هٰذَا أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ» [1]

یہ بڑی احسن تجویز تھی۔ حاضرین نے بھی اسے بہت پسند کیا۔ بعدازاں تعمیر کے نگران اسعد آفندی کے نام یہ سرکاری حکم جاری ہوا کہ مذکورہ پتھر پر یہی فرمان نبوی تحریر کر دیا جائے، چنانچہ یہ حدیث مبارک پتھر پر لکھ دی گئی اور اس کے اوپر مور کی شکل کا مُطلّا چوبی تختہ رکھ دیا گیا۔

یہ چوبی تختہ 1908ء میں لی گئی مسجد کی ایک تصویر میں واضح نظر آتا ہے۔ یہ تصویر مجلة المنهل نے شائع کی جو مدینہ منورہ کے متعلق خاص نمبر کی حیثیت سے چھپا تھا۔ اب یہ چوبی تختہ موجود نہیں۔ شاید بعد کے کسی زمانے میں ہٹا دیا گیا۔ [2]

مسجد کی تکمیل اور اس کے مصارف

یہ مقدس و بابرکت تعمیر ذوالحجہ 1277ھ/1861ء میں اسعد آفندی کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ.

اس مقدس تعمیری منصوبے پر مجیدی دور کی ساٹھ لاکھ اشرفیاں صرف ہوئیں۔ یہ خرچ اس سامان کے علاوہ تھا جو بری اور بحری راستے سے لوہے، لکڑی، سیسے، پیتل اور رنگ و روغن کی شکل میں روانہ کیا جاتا تھا۔ اس تعمیر میں تین سو

[1] صحيح البخاري: 1190. [2] تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص: 62,61.

پچاس سے زیادہ معماروں، مزدوروں، سنگ تراشوں، رنگ و روغن کرنے والوں، ترکھانوں، لوہاروں اور ڈھلائی کرنے والوں نے پوری مستعدی سے حصہ لیا۔ خطاطوں، انجینئروں اور نگرانوں کا سٹاف اس کے علاوہ تھا۔[1]

باب المجیدی کے پاس مکاتب کی تعمیر

مجیدی دور میں مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت شمالی طرف سے مسجد کی دیوار کے باہر بعض عمارتیں خریدی گئیں، پھر یہاں بچوں کی تعلیم کے لیے باب مجیدی کے دائیں بائیں اوپر نیچے کمرے بنائے گئے۔ ان کمروں میں لوہے کی جالیاں لگا کر مسجد کے باہر اور اندر کھڑکیاں لگائی گئیں۔[2]

مسجد نبوی کا اہم دروازہ باب المجیدی (ایک عہد کی تصویر)

سعودی دور حکومت میں مسجد نبوی کے احوال و کوائف

سعودی حکومت نے سرِ آغاز ہی حرمین شریفین کی خدمت گزاری کا خصوصی اہتمام کیا۔ ان مقدس ترین مقامات

[1] نزهة الناظرين، ص :44-46، مرآة الحرمين :468/1. [2] نزهة الناظرين، ص :27.

کی توسیع وتعمیر، صفائی ستھرائی، حجاج کرام اور زائرین حرمین کے آرام وراحت کے لیے خصوصی انتظامات کیے اور نہایت فراخدلی سے بھاری رقوم صرف کیں۔ حرمین شریفین سے ان کی نہایت گہری دلچسپی مسجد نبوی کی ان مختلف توسیعات سے عیاں ہوتی ہے جو سعودی دورِ حکومت میں وقتاً فوقتاً ہوئیں، یہاں ہم سعودی حکومت کے چند اہم اقدامات کا جائزہ لیتے ہیں۔

جلالۃ الملک عبدالعزیز آل سعود رحمہ اللہ جب مسجد نبوی کی زیارت اور اللہ کے رسول ﷺ کے حضور سلام پیش کرنے آئے تو انھوں نے مسجد کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسجد میں توسیع کی ضرورت ہے، خصوصاً جب مدینہ کے سرکردہ شہریوں اور بعض زائرین نے حج کے موقع پر زبردست ہجوم کی اطلاع دی تو انھوں نے مسجد نبوی کی توسیع کا پروگرام بنا لیا۔

مسجد نبوی کی پہلی سعودی توسیع

سعودی دور حکومت میں مسجد کی توسیع کا آغاز 5 شوال 1370ھ / جولائی 1951ء کو ہوا۔ اس غرض و غایت سے مسجد کے گرد تینوں اطراف مشرق، مغرب اور شمال میں عمارتیں خریدی گئیں تاکہ انھیں گرا کر مسجد میں وسعت پیدا کی جائے اور نواحی سڑکیں کشادہ بنائی جائیں، چنانچہ مجیدی دور کی مسجد کی توسیع میں شامل شمال کی جانب والے برآمدے گرا دیے گئے۔ ان کا رقبہ 6246 مربع میٹر تھا۔ اس میں 6024 مربع میٹر رقبہ مزید شامل کیا گیا۔ اب وہ کل رقبہ جس پر پہلے سعودی دور حکومت میں تعمیراتی کام ہوا 12270 مربع میٹر ہوگیا۔ مجیدی دور کی مسجد کی جنوبی جانب چھتی ہوئی تھی، اسے اس کی مضبوطی اور خوبصورتی کے پیش نظر اسی طرح برقرار رکھا گیا۔ اس کا رقبہ 4056 مربع میٹر تھا۔ مجیدی دور کی مسجد اور سعودی تعمیر وتوسیع کے بعد مسجد نبوی کا کل رقبہ 16326 مربع میٹر بنتا ہے۔

توسیع وتعمیر کا آغاز

13 ربیع الاول 1372ھ / نومبر 1952ء کو ولی عہد سعود بن عبدالعزیز آل سعود رحمہ اللہ نے اپنے والد ملک عبدالعزیز رحمہ اللہ کی نیابت کرتے ہوئے مسجد کی توسیع وتعمیر کا سنگ بنیاد رکھا۔ سنگ بنیاد کی تقریب میں عالم اسلام کی ممتاز شخصیات نے شرکت کی۔

محمد بن لادن کمپنی کی سرکردگی میں ماہر انجینئروں نے کام کا آغاز کیا۔ توسیع کے لیے مصنوعی پتھروں کی فیکٹری ذوالحلیفہ کے پاس بنائی گئی۔ باقی تعمیراتی سامان، مثلاً: لکڑی، لوہا، سیمنٹ وغیرہ بحری جہازوں کے ذریعے سے ینبع

مدینہ سے مکہ کی جانب میقات ذوالحلیفہ

آتا تھا اور وہاں سے ٹرکوں کے ذریعے سے مدینہ لایا جاتا تھا۔ اس مبارک کام کے سلسلے میں ینبع کی بندرگاہ پر تیس سے زیادہ بحری جہاز تیس ہزار ٹن سے زیادہ تعمیرات کا سامان لے کر لنگر انداز ہوتے رہے۔

جب سعود بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے عنان حکومت سنبھالی تو وہ ربیع الاول 1373ھ/1953ء میں مسجد کی تعمیر کا جائزہ لینے آئے۔ اس موقع پر انھوں نے ایک کونے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کی اقتدا میں چار پتھر اپنے ہاتھ سے رکھے۔ باب ملک سعود سے مسجد میں داخل ہوں تو بائیں ہاتھ مرمر کے چار سفید پتھر نظر آئیں گے جن پر ملک سعود کا

ینبع کی خوبصورت بندرگاہ

مسجد نبوی میں ملک سعود کے نام سے موسوم دروازہ

نام اور تاریخ کندہ ہے۔

مسجد کی تعمیر 1375ھ تک جاری رہی۔ اس تعمیر پر پانچ ملین (5000000) سعودی ریال لاگت آئی۔ 5 ربیع الاول 1375ھ / اکتوبر 1955ء کو ملک سعود بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس تعمیر نو کا افتتاح کیا۔ افتتاحی اجلاس میں بھی عالمِ اسلام کی ممتاز شخصیتوں نے شرکت کی۔

مسجد نبوی کے بیرونی صحن کا منظر

سعودی حکومت کی یہ توسیع کردہ مسجد مستطیل شکل کی تھی۔ اس کی لمبائی 128 میٹر اور چوڑائی 91 میٹر تھی۔ مجیدی عمارت کی شمالی جانب صحن رکھا گیا۔ اس میں سفید رنگ کا وہ مخصوص خنک پتھر لگایا گیا جس پر سورج کی تپش اثر نہیں کرتی۔ اس صحن کے وسط میں تین برآمدوں کی چھت ہے۔ اس نئی تعمیر کی مشرقی جانب ایک دروازے کا نام باب ملک عبدالعزیز اور اس کے بالمقابل مغربی جانب کے دروازے کا نام باب ملک سعود رکھا گیا۔ یہ دونوں دروازے تین تین دروں پر مشتمل ہیں۔ مذکورہ صحن کے بعد شمال میں پانچ برآمدوں کی چھت ہے۔ ہر برآمدے کی چوڑائی چھ چھ میٹر ہے۔ سعودی توسیعی منصوبے کے تحت شمالی دیوار میں تین دروازے رکھے گئے جن کے نام یہ ہیں: باب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ شمال مغربی جانب، باب عبدالمجید درمیان میں اور شمال مشرقی جانب باب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔

سعودی دورِ حکومت کی اس توسیع کے تحت مسجد میں کنکریٹ کے 232 ستون کھڑے کیے گئے۔ مسجد کی چھت مربع شکل کے خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کی اونچائی 12.55 میٹر ہے۔ پہلے مسجد نبوی کے پانچ مینار تھے۔ ان میں سے تین گرا دیے گئے۔ ان میں سے ایک مینار باب الرحمہ کے پاس تھا۔ شمالی طرف سلطان سلیمان کا بنوایا ہوا سلیمانی مینار اور ایک سلطان عبدالمجید کا بنوایا ہوا مجیدی مینار تھا۔ اب نئی عمارت کی مناسبت سے صرف دو نئے مینار تعمیر ہوئے۔ یہ دونوں مینار شمال مشرقی اور شمال مغربی کناروں پر تھے۔ ہر دو میناروں کی بلندی 72 میٹر ہے۔ سعودی میناروں کے ساتھ مل کر اب مسجد کے چاروں کونوں میں چار مینار ہو گئے۔

جب حجاج و زائرین کی تعداد مزید بڑھ گئی تو ملک فیصل بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دورِ حکومت میں مسجد کی مغربی جانب مظلات، یعنی سائبان لگا دیے گئے۔ سائے والی اس جگہ کا رقبہ تقریباً 35000 مربع میٹر ہے۔ یہ 1393ھ / 1973ء

کی بات ہے۔ یہ سائبان دوسری سعودی توسیع تک برقرار رہے۔[1]

مسجد نبوی کی دوسری سعودی توسیع

دوسری سعودی توسیع میں مجیدی دور کی مسجد نبوی اور پہلی سعودی توسیع کو جوں کا توں بحال رکھا گیا۔صرف مجیدی عمارت میں چند تبدیلیاں یا اضافے کیے گئے،مثلاً:

1. محراب نبوی کی تجدید کی گئی۔
2. روضہ شریفہ کے تمام ستونوں کومضبوط کیا گیا اوران پر سفید رنگ کا نیا سنگ مرمر لگایا گیا۔
3. مجیدی دور کے تمام ستونوں کو مستحکم کیا گیا۔ ان کی بنیادوں میں لگے پیتل کے خول مکمل کیے گئے،ستونوں کی ڈھائی ڈھائی میٹر کی بلندی پر پیتل کے کڑے چڑھائے گئے۔
4. سینٹرل ائیر کنڈیشننگ کی گئی۔
5. مجیدی دور کی مسجد کی مشرقی،جنوبی اورمغربی دیواروں پر گرینائٹ پتھر لگا دیا گیا۔ یہ نئی توسیع کی چھت کے برابر تک لگا دیا گیا تا کہ باہر سے دونوں ادوار کی مسجد ایک جیسی نظر آئے۔
6. مجیدی دور کی مسجد کے اندر دیواروں اورستونوں پر سرخ عقیق کے مشابہ روغن کردیا گیا تھا۔ بعد میں نئی اور پرانی تعمیر میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے1414ھ/1994ء میں روغن کا رنگ بدل دیا گیا۔اب ان پر بادامی (Beige) رنگ کا روغن کیا گیا ہے۔
7. قبوں اور دیواروں پر جس طرح پہلے خوبصورت اور رونق افروز نقش و نگار تھے،انھی کا اعادہ کیا گیا۔انھیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ نئے ہیں، پرانے نہیں ہیں۔اسی طرح بعض قرآنی آیات اور دیگر اشیاء پر پہلے کی طرح آبِ زر کا استعمال کیا گیا ہے۔اس کام کے لیے مصور و خطاط محمد صادق معراج الدین وغیرہ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔
8. 1407ھ کے آغاز میں مسجد میں جدید فانوس اورنئی قندیلیں آویزاں کی گئیں۔ان قندیلوں پر سونے کی تہہ چڑھی ہوئی ایک مخصوص دھات بروئے کار لائی گئی ہے اور یہ نیلے نقش و نگار کے شیشوں سے مزین ہیں۔جب یہ روشن ہوکر اپنی بہار دکھاتی ہیں تو ساری مسجد گوہر والماس کی طرح جگمگاتی نظر آتی ہے۔

[1] آثار المدينة المنورة، ص: 113,112، هذه بلادنا، ص: 114-117.

9 رئیسی (جنوب مشرقی حصے والا) مینار اور باب السلام والے مینار میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔
مدینہ منورہ کی ترقی بالخصوص مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع اور خاص طور پر نمازیوں کے لیے جدید ترین اسباب راحت کی فراہمی میں شاہ فہد بن عبدالعزیز آل سعود ؒ نے جو فعال کردار ادا کیا، اس نے شاہ موصوف کو اسلامی تاریخ کی ایک زندۂ جاوید شخصیت بنا دیا ہے۔ یہ کتنی ایمان افروز اور روح پرور حقیقت ہے کہ آج کے دور کی مسجد نبوی اُس پورے علاقے پر محیط ہے جس پر سید الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے عہدِ مبارک کا مدینہ منورہ آباد تھا۔ یہ ایسی مایہ ناز تاریخی حقیقت ہے جس پر پورا عالم اسلام بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

مسجد نبوی فن تعمیر اور خوبصورتی کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس کا تقدس آمیز حسن زائرین کو حیران کر دیتا ہے۔ اس عظیم و جلیل مسجد کے بارے میں اب تک جو کچھ نشر ہوا یا پڑھا اور لکھا گیا، وہ سب کچھ اس کی خوبصورتی اور دل آویزی کی صحیح ترجمانی سے قاصر ہے۔ حق یہ ہے کہ مسجد نبوی کی بے مثل خوبصورتی اور عظمت و جلالت احاطۂ بیان میں نہیں آسکتی۔

مسجد کی توسیع کے اس شاندار منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں امیر مدینہ عبدالمجید بن عبدالعزیز آل سعود ؒ کی محنت بھی پوری طرح کارفرما رہی۔ یہ سب کچھ ربّ ذوالجلال کی توفیق اور اُسی کی قدرت سے پورا ہوا۔

ملک فہد بن عبدالعزیز آل سعود کی توسیع

مسجد نبوی کی توسیع و تجمل کا اہتمام ملک عبدالعزیز کے دور ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ ملک فہد نے بھی اسے جاری رکھا۔ ان کا ہدف یہ تھا کہ مسجد میں زیادہ سے زیادہ نمازیوں کی گنجائش نکل آئے، خصوصاً رمضان المبارک اور حج کے موسم میں زائرین کو کوئی پریشانی نہ ہو، نیز زائرین کو مسجد میں حاضری کے دوران میں ہر قسم کا آرام و راحت بہم پہنچایا جائے۔ مزید برآں یہ ایسی مثالی مسجد ہو جس سے مستقبل میں کئی صدیوں تک فائدہ اٹھایا جا سکے۔

مسجد نبوی کی توسیع کی تختی (1984)

خادم الحرمین الشریفین ملک فہد بن عبدالعزیز ؒ نے بروز جمعہ 9 صفر 1405ھ / 2 نومبر 1984ء کو نئی توسیع کا سنگ بنیاد رکھا۔ سنگ بنیاد کے ایک پتھر پر بسم اللہ لکھی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ دوسرے پتھر پر یہ آیت مقدسہ کندہ ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ ﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ○﴾ (النور 24:36)

مسجد نبوی کی توسیع کی تختی (1994)

اس دوسری تعمیر و توسیع کے منصوبے پر محرم 1406ھ / 1985ء میں کام کا آغاز ہوا اور (1414ھ / 1994ء) تک کی ریکارڈ مدت میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس توسیع کی آخری اینٹ ملک فہد بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے رکھی۔ یہ اینٹ گیٹ نمبر 38 کے ایک جانب نصب ہے اور اس پر یہ عبارت درج ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ - وَتَأَسِّيًا بِرَسُولِ اللّٰهِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ ﷺ قَامَ خَادِمُ الْحَرَمَيْنِ الشَّرِيفَيْنِ الْمَلِكُ فَهْدُ بْنُ عَبْدِالْعَزِيزِ آلُ سُعُودٍ بِوَضْعِ آخِرِ لَبِنَةٍ، يَوْمَ الْجُمُعَةِ ١٤١٤/١١/٤هـ الموافق ١٩٩٤/٤/١٥م فِي تَوْسِعَةِ مَسْجِدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ خِدْمَةً لِلْإِسْلَامِ وَالْمُسْلِمِينَ . وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ .

"اللہ کے نام سے اللہ ہی کی برکت کے ساتھ سیدنا محمد ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے، خادم حرمین شریفین ملک فہد بن عبدالعزیز آلِ سعود بروز جمعہ 4 ذیقعد 1414ھ / 15 اپریل 1994ء کو مسجد نبوی کے توسیعی کام کی آخری اینٹ رکھنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ یہ کام صرف اسلام اور مسلمانوں کی خدمت گزاری کے لیے کیا گیا اور ہر طرح کی تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔"

تاریخ کی سب سے بڑی توسیع

خادم الحرمین الشریفین ملک فہد رحمہ اللہ کے دور میں مسجد نبوی کی توسیع ماضی کی تمام توسیعات سے کہیں زیادہ بڑی اور شاندار توسیع ہے۔ اس نے پہلی سعودی توسیع کو تین اطراف سے مکمل طور پر گھیر رکھا ہے۔ یہ توسیع مشرق کی طرف سے باب النساء کے برابر سے اور مغرب کی طرف سے باب الرحمہ کے برابر سے شروع ہو کر شمالی طرف کی توسیع کے آخر تک چلی گئی ہے۔ مسجد نبوی کا اگلا حصہ اپنی پہلی حالت اور پہلی عمارت پر برقرار رکھا گیا۔ شاید یہ اس لیے کیا گیا تاکہ مجیدی دور کی عمارت اور اس کے نشانات اُجاگر رہیں، ماند نہ پڑنے پائیں۔ اس عمارت کے ستون، برآمدے، چھت اور آرائش وغیرہ پہلی سعودی توسیع کے تحت بنی ہوئی چھت، برآمدوں اور ستونوں کے مشابہ ہیں۔ پہلی سعودی توسیع کے کام اور دوسری سعودی توسیع کے کام کو ایک چھت کے ذریعے ملا دیا گیا ہے۔ اس سے مسجد کے برآمدوں میں یکسانیت

آ گئی ہے۔ نئی توسیع کی دیواروں کے بیرونی حصے پر گرینائٹ پتھر لگایا گیا ہے، نیز اس کے چھ مینار بنائے گئے ہیں جو بالکل پہلی توسیع کے دونوں میناروں جیسی شکل کے ہیں۔ اس عمارت میں تہ خانہ، نچلی منزل اور چھت ہے۔ ہر حصے میں جانے کے لیے الگ الگ دروازے ہیں اور ان کی تعداد ہر حصے کی ضرورت کے مطابق ہے۔

مسجد کے اندر کیمرے، ٹیلی وژن، بجلی، فائر بریگیڈ، میٹھے پانی اور سیوریج وغیرہ کے لیے الگ الگ سسٹم موجود ہے جو بہترین خدمات انجام دے رہا ہے۔ امام کی آواز مسجد کے ہر کونے میں پہنچانے کے لیے جدید الیکٹرانک ساؤنڈ سسٹم کا نظام بروئے کار لایا گیا ہے۔ یہ سپیکر پیتل کے تاجوں میں نصب ہیں جو ستونوں کے اوپر والے حصے میں بنے ہوئے ہیں۔ یہ باہر سے نظر نہیں آتے۔ ماہرین کی زیرنگرانی مسجد کے تہ خانے میں مرکزی ساؤنڈ سسٹم کارفرما ہے۔

دوسری سعودی توسیع کی چند خاص باتیں

نئی توسیع میں فرشی منزل (Ground Flour) کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا رقبہ 82000 مربع میٹر ہے۔ اس کا سارا فرش سنگ مرمر کا ہے۔ اس چھت کی بلندی 12.55 میٹر ہے۔ ستونوں کی تعداد 2104 ہے۔ ایک ستون دوسرے ستون سے 6 میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس طرح درمیان میں 6x6 میٹر کا ایک صحن بن جاتا ہے۔ جہاں ستونوں پر قبے بنے ہوئے ہیں، وہاں ان ستونوں کا درمیانی فاصلہ 18 میٹر ہے۔ یہاں 18x18 میٹر کا ایک صحن بن جاتا ہے۔ نئی توسیع میں اس طرح کے 27 صحن ہیں۔ ان کے اوپر متحرک قبے ہیں جنھیں موسم کی مناسبت سے کھولا اور بند کیا جاتا ہے۔ مزید برآں ان کے ذریعے سے روشنی اور ہوا سے خوب استفادہ کیا جاتا ہے۔

فرشی منزل کے ستون ڈاٹوں تک 5.6 میٹر بلند ہیں۔ مسجد کی سامنے کی ڈاٹیں شامل کر کے کل 3812 ڈاٹیں ہیں۔ ستونوں پر سفید سنگ مرمر گولائی میں لگایا گیا ہے اور ان کے اوپر پیتل کے تاج بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض سپیکروں کے لیے خاص ہیں اور بعض سے اے۔ سی کی ٹھنڈی ہوا نکلتی ہے۔ ان ستونوں کی بنیادوں پر بھی سفید رنگ کا خوبصورت سنگِ مرمر لگایا گیا ہے۔ یہ سفید پتھر ایک خاص قسم کا ہے۔ اس میں مسامات ہیں جو اپنے اندر رطوبت محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ پتھر اٹلی اور سپین سے درآمد کیا گیا ہے۔

مسجد نبوی کی وسعت کا تقابل

پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ مجیدی دور کی چھتی ہوئی مسجد کا رقبہ اور پہلی سعودی توسیع کا رقبہ 16326 مربع میٹر ہے۔ اس میں 28000 نمازیوں کی گنجائش ہے۔

خادم الحرمین الشریفین ملک فہد ﷫ کے دور کی نئی توسیع کا رقبہ 28000 مربع میٹر ہے۔ اس میں 1,50,000

نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد کا اندرونی مجموعی رقبہ 1,56,576 مربع میٹر ہے۔ اس میں 2,68,000 افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔ تاریخِ اسلام میں ملک فہد کے دورِ حکومت میں مسجد نبوی کی یہ سب سے بڑی توسیع ہے۔

مسجد کے اطراف میں میدان یا صحن ہے۔ اس کا رقبہ 2,35,000 مربع میٹر ہے۔ اس میں سے 1,35,000 مربع میٹر رقبہ 4,30,000 نمازیوں کے استعمال میں آ سکتا ہے۔ مسجد اور باہر کے میدانوں میں مجموعی طور پر چھ لاکھ اٹھانوے ہزار (6,98,000) افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔

عورتوں کی جائے نماز

اسلامی تعلیمات کے پیش نظر عورتوں کے لیے نماز ادا کرنے کا الگ اہتمام کیا گیا ہے۔ اس کے لیے نئی توسیع کے شمال مشرق اور شمال مغرب کے کونوں میں لکڑی کے عارضی پردے لگا کر جگہ مختص کی گئی ہے جس میں حسبِ ضرورت کمی یا بیشی بھی کی جا سکتی ہے۔

مسجد کے دروازے

مسجد نبوی کا توسیعی ڈیزائن ایسے انداز کا ہے کہ اس میں نمازیوں کی ضرورت کے پیش نظر بڑی تعداد میں دروازے بنائے گئے ہیں۔ اس سے پہلے مسجد کے 11 دروازے تھے جن میں سے کچھ حالیہ توسیع میں سمٹ آئے ہیں جیسے باب ملک سعود، باب عمر، باب عبدالمجید، باب عثمان اور باب ملک عبدالعزیز۔ بقیہ قدیمی دروازوں اور نئی توسیع کے دروازوں کو مسلسل نمبر وار جوڑ دیا گیا ہے۔ باب السلام سے لے کر آخری دروازے تک ان کی کل تعداد 41 ہے۔ یہ دروازے آمد و رفت کے دباؤ کے لحاظ سے بنائے گئے ہیں۔ کہیں ایک طاق کا دروازہ ہے، کہیں دو، دو

باب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

باب ملک عبدالعزیز

طاقوں کے دروازے ہیں تو کہیں تین، تین اور کہیں پانچ، پانچ طاقوں کے دروازے بنائے گئے ہیں۔ ہر طاق کو ایک دروازہ شمار کریں تو ان کی تعداد 85 بنتی ہے۔ ان میں سے کچھ دروازے صرف تہ خانے میں جانے کے لیے ہیں، کچھ نئی توسیع کی چھت پر جانے کے لیے اور کچھ مشترک ہیں جو نچلی منزل اور چھت پر جانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ بعض دروازے برقی زینوں (Escalator) اور عام زینوں کے لیے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کی آمد و رفت کے لیے الگ الگ دروازے ہیں۔ بعض دروازوں کے ساتھ مسجد کی انتظامیہ کے دفاتر بھی ہیں۔

اہم دروازوں کے نام

باب السلام: یہ پہلا دروازہ ہے۔ یہ مجیدی تعمیر میں جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔

باب الصدیق: یہ دوسرا دروازہ ہے۔ یہ باب السلام سے شمالی جانب ہے۔ یہیں اس کے مقابل خوخۂ ابی بکر واقع تھا۔ اس دروازے کی اندرونی جانب حرم کی پولیس کا دفتر ہے۔

باب الرحمہ: یہ بھی مجیدی تعمیر میں ہے۔ یہ مسجد میں داخلے کا تیسرا راستہ ہے۔

باب ملک فہد: یہ شمار میں اکیسواں دروازہ ہے جو پانچ دروازوں کا مجموعہ ہے۔ یہ باب مجیدی کے بالمقابل شمال کی جانب ہے۔ ان دروازوں کے اوپر کنکریٹ کے سات گنبد ہیں۔ ان کے دائیں بائیں ایک سو چار میٹر بلند دو مینار ہیں۔

باب النساء: یہ بھی مجیدی تعمیر میں ہے، گنتی کے لحاظ سے یہ انتالیسواں دروازہ ہے۔

باب جبریل: شمار میں یہ چالیسواں دروازہ ہے اور مجیدی تعمیر ہی میں ہے۔

باب البقیع: یہ مسجد کے جنوب میں آخری اور اکتالیسواں دروازہ ہے۔

باب البقیع

دروازوں اور راستوں کی بناوٹ

مسجد میں داخلے کے راستے کنکریٹ سے بنائے گئے ہیں۔ ان کی اندرونی طرف سنگ مرمر اور بیرونی طرف گرینائٹ پتھر لگایا گیا ہے۔ دروازے ایک خاص قسم کی لکڑی کے بنائے گئے ہیں جو سویڈن سے درآمد کی گئی ہے۔ دروازوں پر کانسی (Bronze) سے آرائش کی گئی ہے۔ ہر دروازہ تین میٹر چوڑا اور چھ میٹر اونچا ہے۔ ہر دروازے کی پیشانی پر آیت: ﴿ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴾ لکھی ہوئی ہے اور وسط میں اسم گرامی محمد (ﷺ) لکھا ہوا ہے۔

چھتریاں

مجیدی عمارت کی شمالی جانب مستطیل شکل کا صحن ہے یہاں گرمی اور سردی میں ان نمازیوں کو دقت ہوتی تھی جو یہاں بیٹھ جاتے تھے۔ اس پریشانی کے ازالے کے لیے خادم الحرمین الشریفین ملک فہد بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے نہایت خوبصورت اور مضبوط چھتریاں لگوادی ہیں۔ یہ چھتریاں مضبوط موٹے سفید کپڑے، لوہے کے گارڈروں اور آہنی سریوں سے بنی ہوئی ہیں۔ ان گارڈروں پر سفید سنگ مرمر چڑھا ہوا ہے۔ جب یہ چھتریاں کھلی ہوئی ہوتی ہیں تو فوارے کے مانند معلوم ہوتی ہیں۔ جب بند کر دی جاتی ہیں تو چھوٹے چھوٹے خوبصورت میناروں کی طرح نظر

مسجد نبوی کے اندرونی سائبان

آتی ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جن ستونوں پر یہ چھتریاں لگائی گئی ہیں، ان کی بنیادوں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ رکھ دیے گئے ہیں جن سے اے۔ سی کی ٹھنڈی ہوا نکلتی رہتی ہے۔ انھی ستونوں کے اوپر والے حصوں میں تاج نما پیتل اور کرسٹل سے بنی ہوئی سفید لائٹیں لگی ہوئی ہیں۔ ان چھتریوں سے جہاں اے۔ سی کی ٹھنڈک کی حفاظت ہوتی ہے، وہیں ان چھتریوں کی وجہ سے قدرتی موسم سے بھی خوب لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔

متحرک قبے

تازہ ہوا اور روشنی سے استفادے کے لیے چھت میں کئی جگہیں کھلی ہوئی ہیں جنھیں خصوصی پٹڑی پر چلنے والے قبوں سے ڈھانپا گیا ہے۔ قبوں کے نیچے والی جگہ 18x18 میٹر ہے اور ساری مسجد میں ایسی جگہیں ستائیس کی تعداد میں ہیں۔ قبے 3.55 میٹر بلند دیواروں پر بنائے گئے ہیں۔ ایک قبے کا اندر سے نصف قطر 7.35 میٹر ہے۔ ایک قبہ 324 مربع میٹر کے احاطے کو گھیرتا ہے۔ ایک قبے کا عمومی وزن اسّی ٹن ہے۔ اس میں لوہے کے ڈھانچے کا

قیقب نامی جنگلی درخت

وزن 40 ٹن ہے اور چالیس ٹن وزن دیگر میٹریل پر مبنی ہے۔ قبے کے اندرونی طرف 20 م م موٹی خاص قسم کی قیقب نامی جنگلی درخت کی لکڑی استعمال کی گئی ہے۔ اس پر صنوبر کی لکڑی سے ہاتھ کے ساتھ نقش نگاری کی گئی جس کے اندر خالص سونے کے فریموں میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہیں۔ دوسری جگہوں پر خالص سونے کے باریک ورق چسپاں کیے گئے ہیں۔ ہر قبے میں ڈھائی کلو سونے کے اوراق چسپاں ہیں۔ قبے کی بیرونی طرف 25 م م کی جرمن ٹائل گرینائٹ پتھر کی طرح لگائی گئی ہے۔ قبے کی چوٹی پر پیتل کا ایک کلس ہے۔ اس پر سونے کا پترا چڑھایا گیا ہے۔ تمام قبوں کی تزئین کے لیے 67.5 کلوگرام سونا استعمال ہوا ہے۔ یہ قبے مدینہ کے قریب ایک کارخانے میں تیار کیے گئے تھے۔

قبے چلانے کا حیرت انگیز خودکار اہتمام

تمام قبے کمپیوٹر سے چلنے والے برقی نظام کے تحت کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ یہ سارے قبے اکٹھے بھی کھلتے بند ہوتے ہیں اور حسب ضرورت ہر قبے کو جداگانہ طور پر بھی کھولا اور بند کیا جا سکتا ہے۔ ہر ایک قبے کے کھلنے اور بند ہونے میں تقریباً ایک منٹ لگتا ہے۔

ہر قبہ خاص قسم کے فولاد سے بنی ہوئی چار چرخیوں پر حرکت کرتا ہے۔ یہ چرخیاں زنگ آلود یا بوسیدہ نہیں ہوتیں۔ یہ چرخیاں پٹڑی پر چلتی ہیں جس پر ایسی خاص قسم کی دھات چڑھائی گئی ہے جسے زنگ نہیں لگتا۔ ہر پہیے کے ساتھ 2.5 واٹ کی موٹر کام کرتی ہے۔ ان موٹروں میں سے ہر موٹر اس قدر فعال ہے کہ صرف ایک موٹر دیگر موٹروں کی خرابی کی حالت میں پورے قبے کو کھینچنے کی طاقت رکھتی ہے۔ مزید برآں ان قبوں کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ ان کے متحرک ہونے سے کسی قسم کا کوئی شور یا گڑگڑاہٹ نہیں ہوتی۔

نئی توسیع کی چھت

سعودی حکومت کے زیر اہتمام مسجد کی نئی توسیع کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کی چھت پر نماز ادا کرنے کی

سہولت میسر ہے۔ چھت کے 67000 مربع میٹر رقبے میں سے 58,250 مربع میٹر رقبے پر 90,000 نمازی بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ چھت کی 8750 مربع میٹر جگہ متحرک قبوں نے گھیر رکھی ہے۔ چھت پر اسی طرح کا سفید ٹھنڈا پتھر لگا ہوا ہے جیسا حرم مکی میں دھوپ آنے والی جگہوں پر لگایا گیا ہے۔

نئی مسجد کی چھت پر چاروں طرف پانچ میٹر اونچی چھت والے برآمدے بنائے گئے ہیں۔ ان کا مجموعی رقبہ 11,000 مربع میٹر ہے۔ضرورت کے وقت اس چھت کے اوپر ایک اور منزل بھی تعمیر ہوسکتی ہے۔

مسجد کی سیڑھیاں

فرشِ زمین سے چھت پر جانے کے لیے 6 برقی زینے (Escalator) نصب ہیں۔ مزید برآں پیدل چڑھنے کے لیے عام سیڑھیاں بھی بنائی گئی ہیں۔ ان کی تعداد 18 ہے۔

مسجد کے مینار

نئی توسیع کے زمرے میں چھ مینار بنائے گئے ہیں۔ ایک ایک مینار مسجد کے چاروں کونوں میں ایستادہ ہے جبکہ دو مینار شمالی جانب بڑے دروازے ''باب ملک فہد'' کے دائیں بائیں کھڑے ہیں۔ یہ چھ مینار پہلی سعودی توسیع کے زمانے کے دو میناروں کے مشابہ ہیں، تاہم نئے مینار پرانے میناروں سے 32 میٹر بلند ہیں۔ ان میناروں کی ہلال سمیت کل بلندی تقریباً 104 میٹر ہے۔ ہر مینار کے پانچ پانچ حصے ہیں جو مختلف شکلوں کے ہیں۔ کہیں مربع شکل کے ہیں، کہیں سے ہشت پہلو ہیں تو کہیں سے گول ہیں اور کہیں ستون نما ہیں۔ آخر میں بیضوی شکل کا گنبد اور ہلال ہے۔ یہ تانبے کا بنا ہوا ہے۔ بنیاد والے پہلے حصے کے ہر ضلع کی چوڑائی پانچ پانچ میٹر ہے۔ سب سے اوپر بیضوی گنبد اور ہلال کی اونچائی 6.7 میٹر ہے۔ وزن تقریباً ساڑھے چار ٹن ہے۔ ان کے اوپر 14 قیراط سونے کے پترے چڑھے ہوئے ہیں۔

نئی تعمیر کی چار دیواری

دوسری سعودی تعمیر میں مسجد کی دو جڑواں دیواریں بنائی گئیں۔ ان کے درمیان کچھ خلا ہے۔ یہ دیواریں سیمنٹ کے ستونوں کے ذریعے باہم مربوط ہیں۔ اندرونی دیوار 30 سم موٹی ہے جبکہ بیرونی دیوار اوپر سے 30 سم موٹی ہے اور نچلے حصے میں 40 سم موٹی ہے۔ یہ کنکریٹ سے بنی ہوئی ہے۔ تمام دیواریں، محرابیں اور چھتیں کنکریٹ کی بنی ہوئی ہیں۔ مسجد کی اندرونی چھت مصنوعی پتھر سے بنائی گئی ہے۔ یہ پتھر گرینائٹ کے ٹکڑوں، اس کے پاؤڈر اور سفید

اور رنگین سیمنٹ سے بنایا گیا ہے۔

مسجد کی اندرونی دیواروں کی نچلی سطح پر تین میٹر کی بلندی تک رنگین سنگ مرمر لگایا گیا ہے۔ اس سے اوپر والی جگہ پر مختلف قرآنی آیات کی خطاطی کی گئی ہے۔ انھیں جدید فنی اسلوب سے تراشا گیا ہے۔ نئی توسیع کی تمام دیواروں پر اسی طرح آیات کی خطاطی کی گئی ہے۔ خطاطی کی سعادت ترکی کے خطاط سید علی اُورو کو نصیب ہوئی۔

کھڑکیاں

مسجد کی نئی توسیع کے تحت بڑی بڑی، نہایت خوشنما کھڑکیاں بھی نصب کی گئی ہیں تاکہ تازہ ہوا اور قدرتی روشنی سے خاطر خواہ استفادہ کیا جا سکے۔ یہ کھڑکیاں شاہ بلوط یا اسی قسم کی کسی لکڑی سے بنائی گئی ہیں۔ ان کی بیرونی طرف پیتل کی کھڑکیاں ہیں جو انھیں دھوپ کی تمازت اور بارش سے بچاتی ہیں۔ ان کے اوپر گول مصنوعی پتھر کے روشن دان بھی ہیں جن میں رنگین شیشہ جڑا ہوا ہے۔ ہر کھڑکی کے اوپر ایک مصنوعی پتھر نصب ہے جس پر کلمۂ طیبہ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ'' لکھا ہوا ہے۔

مسجد نبوی کی ایک کھڑکی

مسجد نبوی کا صحن

صحن

مسجد کے تین اطراف میں وسیع صحن بنایا گیا ہے۔ اس کے کچھ حصے پر سفید رنگ کا مخصوص ٹھنڈا پتھر اور بقیہ حصے پر گرینائٹ پتھر لگایا گیا ہے۔ اس کا رقبہ 2,35,000 مربع میٹر ہے۔ یہاں 4,30,000 نمازیوں کی گنجائش ہے۔ اسی صحن میں طہارت خانوں میں جانے اور زائرین کی آرام گاہوں کو جانے کے راستے ہیں۔ یہیں زیر زمین کار پارکنگ کی دو منزلہ عمارت تک جانے کے راستے بھی ہیں۔

روشنی کا انتظام

نئی توسیع کے تحت مسجد کو جدید ترین برقی قمقموں سے منور کیا گیا ہے۔ پیتل اور کرسٹل سے بنے ہوئے 68 بڑے فانوس اور 111 چھوٹے فانوس آویزاں ہیں۔ اسی طرح چاروں طرف بجلی کی تقریباً 20450 لائٹیں لگی ہوئی ہیں۔

لاؤڈ سپیکر

مسجد نبوی میں لاؤڈ سپیکر کا جدید ترین خودکار نظام موجود ہے، جگہ جگہ نگرانی کرنے والے خصوصی کیمرے اور ٹیلی ویژن لگے ہوئے ہیں۔ ان کے ذریعے سے پوری مسجد کے چپے چپے کی کڑی نگرانی ہوتی ہے۔ ایمرجنسی لائٹ کا بھی بہترین انتظام ہے۔ اسی طرح آگ لگنے کی صورت میں جائے وقوع کی نشاندہی اور فوری طور پر آگ بجھانے کا نظام بھی موجود ہے۔

ائیر کنڈیشننگ کا مؤثر و منفرد انتظام

پوری مسجد نبوی کے لیے ائیر کنڈیشن کا ایسا خصوصی نظام موجود ہے جس کی ساری دنیا میں کوئی نظیر موجود نہیں۔ یہ سب کچھ خادم الحرمین الشریفین ملک فہد بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے حکم پر اللہ کے مہمانوں کے آرام اور حج وعمرہ کرنے والوں کی راحت کے لیے کیا گیا ہے۔

اخراجات

اس توسیعی منصوبے پر تقریباً 30 ملین ریال خرچ ہوئے۔ ان اخراجات میں اُس زمین کی خریداری جو دوسروں کی ملکیت تھی، ائیر کنڈیشننگ، کار پارکنگ، مرکزی جگہ کی تشکیل نو اور جملہ ذیلی امور شامل ہیں۔[1]

مسجد نبوی کے یہ چند احوال وکوائف قارئین کرام کی آگہی کے لیے مختصراً بیان کر دیے گئے ہیں۔ امر واقع یہ ہے کہ نئے سعودی توسیعی منصوبے کے تحت مسجد نبوی کے زائرین کرام کے لیے جزئیات سمیت اتنی نافع سہولتوں کا انتظام کر دیا گیا ہے کہ کسی زائر کو آرام وراحت میں کسی قسم کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس عظیم گھر کو سدا آباد رکھے اور اس کی تعمیر وتوسیع میں حصہ لینے والوں کے حسنات میں بیش از بیش اضافہ فرمائے۔ آمین۔

[1] تاريخ المسجد النبوي الشريف، ص :85-99.

باب
7
سیرت انسائیکلوپیڈیا
اذان
ابن زید و عمر رضی اللہ عنہما کے خواب اور اذان کی ابتدا، مخیریق رضی اللہ عنہ
کا قبولِ اسلام اور شہادت کی ولولہ خیز تفصیلات

’’بے شک نماز ایمان والوں پر ہمیشہ سے ایسا فرض ہے جس کا وقت مقرر کیا ہوا ہے۔‘‘

(النسآء4:103)

اس باب میں

رسول اللہ ﷺ اسراء و معراج کے بعد بارگاہ ربانی سے نماز کا تحفہ لے کر تشریف لائے تو ایک اہم سوال یہ پیدا ہو گیا کہ مسلمانوں کو مقررہ اوقات پر نماز کے لیے آنے کی اطلاع کس طرح دی جائے؟ یہ باب اسی سوال کا جواب ہے۔ اس بارے میں رسالت مآب ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ متعدد صحابۂ کبار رضی اللہ عنہم نے اپنی اپنی رائے ظاہر فرمائی۔ ایک رائے یہ سامنے آئی کہ گھنٹی بجا کر وقتِ نماز سے آگاہ کیا جائے لیکن اسے عیسائیوں کی مشابہت سے بچنے کے لیے مسترد کر دیا گیا، پھر یہ رائے پیش کی گئی کہ نماز کے وقت ناقوس بجا کر اعلانِ نماز کیا جائے۔ آپ ﷺ نے یہ رائے اس لیے قبول نہیں کی کہ اس طرح یہودیوں سے مشابہت کا رنگ پیدا ہو جائے گا جبکہ اسلام اپنے ہر معاملے میں اس قدر غیور ہے کہ اپنے دامن سے باہر کسی بیگانے طریقے کو ہرگز قبول نہیں کرتا۔ یہ مشورہ ابھی جاری تھا کہ حضرت عبداللہ بن زید اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے خواب دیکھا جس میں ایک شخص نے اَللّٰہُ أَکْبَرُ ، اَللّٰہُ أَکْبَرُ۔ أَشْھَدُ أَنْ لَّا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ ...... کے حقانی بول بتا کر اوقاتِ نماز کے اعلان و اطلاع کا طریقہ بتایا۔ میٹھے اور منور بول پر مبنی یہ ایسا لسانی اور کلامی عمل تھا جو کسی ناقوس یا گھنٹی کا محتاج نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقے کی بڑی خوشی سے منظوری دے دی اور سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو مسجد نبوی کا مؤذن مقرر فرما دیا۔ یہ باب مستند حوالوں کے ساتھ انھی اذکار جمیلہ کی مکمل تفصیل ہے۔

اذان

سارے ادیان کی عبادات میں اجتماعیت کو اولیت حاصل ہے۔ اسلام میں نماز بھی ایک اجتماعی عبادت ہے۔ نماز کی طرف بلانے اور لوگوں کو اطلاع دینے کا طریقہ مختلف ادیان میں مختلف رہا ہے۔ جب نماز فرض ہوگئی اور مدینہ میں اجتماعیت بھی حاصل ہوگئی تو مسلمانوں کے لیے ایک ایسا طریقہ اپنانا لازم قرار پایا جس سے وہ نماز کی طرف بلاوے کی ایک عمدہ مثال پیش کریں۔ بنا بریں جب رسول اللہ ﷺ کو مدینہ طیبہ میں امن و اطمینان اور اسلام کو استحکام نصیب ہوا تو آپ ﷺ نے نماز کے وقت کی اطلاع کے لیے جو طریقہ اختیار فرمایا، وہ اذان کہلاتا ہے۔

اذان: أَذَن سے مشتق ہے جس کے معنی بغور سننے کے ہیں۔ أَذَّنَ يُؤَذِّنُ تَأْذِينًا کے معنی ہوں گے ''نماز کے وقت کی اطلاع دینا۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آذان: أَذَّنَ يُؤَذِّنُ تَأْذِينًا وَّ أَذَانًا وَّ إِيذَانًا سے مصدر ہے۔ اس کے معنی ہوں گے ''ایسا بلند آہنگ اعلان جو کانوں سے سنا جا سکے۔'' اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ○﴾ (یوسف 70:12)

''پھر ایک اعلان کرنے والے نے (بلند آواز میں) اعلان کیا: اے قافلے والو! بے شک تمھی چور ہو۔''

﴿وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (التوبة 3:9) ''اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے منادی کی جاتی ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ﴾ (الحج 27:22) ''اور لوگوں میں حج کی منادی کیجیے۔''

اذان کو عربی میں ''ندا'' بھی کہتے ہیں۔ ندا کے معنی آواز بلند کرنے کے ہیں کیونکہ مؤذن بہ آواز بلند لوگوں کو نماز کی طرف بلاتا ہے۔

اذان کے شرعی معنی ہیں: مخصوص شرعی الفاظ کے ذریعے سے مخصوص اوقات میں نماز کی ادائیگی کے لیے مسلمانوں کو بلانا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اذان قلیل الفاظ کے باوصف عقیدے کے نہایت اہم مسائل پر مشتمل ہے۔ اذان کا آغاز اللہ کی بڑائی سے ہوتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور کمال کو متضمن ہے۔ دوسرے جملے میں توحید کا اثبات اور شریک کی نفی ہے۔ پھر محمد ﷺ کی رسالت کا اقرار ہے۔ رسالت کی گواہی کے بعد مخصوص اطاعت گزاری کی طرف بلاوا ہے جو رسول ہی کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد فلاح و کامرانی کی دعوت ہے جو ہمیشگی کی زندگی ہے۔ گویا اس میں اخروی زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ آخر میں اللہ کی بڑائی اور توحید کی تکرار تاکید مزید کے لیے ہے۔ اذان سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے۔ یہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی دعوت ہوتی ہے اور یہ اسلام کے شعار کا اظہار و اعلان بھی ہے۔

اذان، یعنی نماز کی اطلاع دینے کے لیے بلند آہنگی سے مخصوص الفاظ کہنے میں یہ حکمت پنہاں ہے کہ ہر شخص کے لیے، ہر زمان و مکان میں، ان الفاظ کی ادائیگی آسان ہے بہ نسبت کسی فعلی طریقے کے۔[1]

اذان کے مخصوص الفاظ بلند آہنگی سے بول دینا نہایت آسان ہے۔ اس لسانی و کلامی اطلاع کے برعکس دیگر ادیان میں قرنا پھونک کر یا گھنٹیاں بجا کر اپنی عبادت کی

[1] فتح الباري: 102/2، النهاية: 37/1، شرح العمدة لابن تيمية: 95/2.
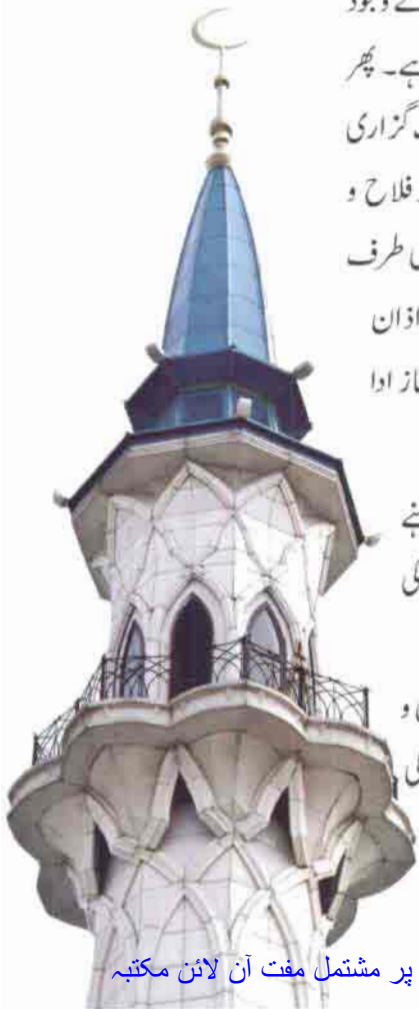
طرف بلانا ایک فعلی اطلاع ہے۔ سبحان اللہ! اسلام نے نماز کے لیے بلانے کا طریقہ بھی کتنا فطری، سادہ اور دلنشین بتایا ہے۔

اذان وحی اور کتاب اللہ کی نص کے ذریعے سے جاری ہوئی۔ صرف ایک صحابی کے خواب سے جاری نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا﴾ (المآئدة 5:58)

''جب تم (انھیں) نماز کی طرف بلاتے ہو تو وہ اسے ہنسی اور کھیل بنا لیتے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ﴾ (الجمعة 62:9) ''جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے......۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے حضرت مالک بن حُویرث رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

«فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أَحَدُكُمْ وَلْيَؤُمَّكُمْ أَكْبَرُكُمْ»

''پھر جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے ایک شخص اذان کہے اور تم میں سے بڑا امامت کرائے۔''[2]

اذان کی ابتدا

مذکورہ دونوں آیتوں میں اشارہ ہے کہ اذان کی ابتدا مدینہ میں ہوئی، البتہ سال میں اختلاف ہے کہ کس سال میں ابتدا ہوئی۔ راجح بات یہ ہے کہ پہلے سال ہی اذان کا آغاز ہو گیا تھا۔ ایک قول کے مطابق دوسرے سال میں آغاز ہوا تھا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مختلف احادیث و آثار سے آغازِ اذان کے بارے میں پائے جانے والے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان ہجرت سے پہلے مکہ ہی میں شروع ہو چکی تھی۔ ان احادیث میں سے طبرانی میں سالم بن عبداللہ عن أبیہ کی سند سے بتایا گیا ہے: جب نبی ﷺ کو اسراء و معراج کرایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اذان کی وحی کی۔ جب آپ واپس آ گئے تو بلال رضی اللہ عنہ کو اذان سکھا دی۔ اس کی سند میں طلحہ بن زید راوی متروک ہے۔ امام دار قطنی نے الأطراف میں انس رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے کہ جب نماز فرض ہوئی تھی تب جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ سے کہا تھا کہ اذان دیجیے۔ اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ اسی طرح ابن مردویہ اور بزار وغیرہ میں بھی احادیث ہیں جن میں اذان کا ذکر ہجرت سے پہلے ہے مگر وہ سب کی سب ضعیف ہیں۔ اگر

[1] سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ الأسوة الحسنة: 1/263,262۔ [2] صحیح البخاري: 628۔

انھیں صحیح تسلیم کیا جائے تو پھر ماننا پڑے گا کہ اسراء و معراج متعدد بار ہوا جن میں سے ایک بار مدینہ میں بھی ہوا۔
اسی طرح محب طبری رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ معراج کی رات میں اذان کے تذکرے کو اذان کے لغوی معنی، یعنی اطلاع دینے پر محمول کیا جائے گا۔ ان کا یہ قول محل نظر ہے کیونکہ اس روایت میں اذان کی مشروع کیفیت واضح کی گئی ہے۔
ابن منذر نے وثوق سے کہا ہے کہ مکہ میں اسراء و معراج کے موقع پر جب نماز فرض ہوئی تو اس وقت نبی ﷺ بغیر اذان دیے نماز پڑھتے تھے یہاں تک کہ آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی اور اذان کے بارے میں مشاورت کی جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔
امام سہیلی رحمہ اللہ نے دونوں اقوال میں بڑے تکلف سے تطبیق کی کوشش کی ہے مگر صحیح اور راجح یہی ہے کہ اس بارے میں صحیح احادیث کو لیا جائے۔ حدیث پر عمل کرنا ہی زیادہ مناسب ہے۔
چنانچہ علامہ سہیلی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: اذان وحی کے بغیر کسی مسلمان کے خواب کے ساتھ خاص کرنے میں یہ حکمت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو معراج کی رات اذان کا طریقہ دکھا دیا گیا اور ساتوں آسمانوں سے بھی اوپر اس کا

مسجد اقصیٰ

مشاہدہ کرا کے اس کی صدا سنائی گئی۔ یہ طریقہ وحی سے زیادہ قوی ہے۔ لیکن اذان کی فرضیت مدینہ منورہ کی طرف ہجرت تک مؤخر کر دی گئی۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو اوقات نماز سے آگاہ کرنے کے لیے جمع کیا تو لوگوں نے نماز کی اطلاع دینے کے مختلف طریقے بتائے۔ اس دوران میں عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے خواب میں اذان کا طریقہ دیکھا۔ اب اس خواب کی رسول اللہ ﷺ کے مشاہدے سے موافقت ہوگئی، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ سچا خواب ہے۔ ان شاء اللہ۔'' اس سے معلوم ہوا کہ خواب کے سچ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے آسمانوں میں جو دکھایا ہے وہ زمین پر سنت (طریقہ جاریہ) بن جائے۔ عمر رضی اللہ عنہ کے خواب کی عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کے خواب سے موافقت اس کی تائید وتقویت کا باعث بنی کیونکہ عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے سکینت وحق جاری ہوتا تھا۔ حکمت الٰہی کا تقاضا یہی تھا کہ اذان غیر نبی کی زبان سے جاری ہو کیونکہ اللہ اپنے بندے کی قدر ومنزلت بڑھانا چاہتا ہے اور اس کا ذکر بلند کرنا چاہتا ہے۔[1]

ہجرت سے پہلے مکہ میں رسول اللہ ﷺ نماز کے لیے صحابہ کو کس طرح جمع کرتے تھے؟ اس کی کہیں صراحت نہیں ملتی، البتہ ہجرت کے بعد مدنی دور کے آغاز میں مشروعیتِ اذان سے پہلے رسول اللہ ﷺ صحابہ کو بغیر ندا دیے اندازے سے نماز کے لیے جمع کرتے تھے۔ جب صحابہ کی تعداد بڑھ گئی تو نبی ﷺ نے نماز کے لیے لوگوں کو اکٹھا کرنے کا طریقہ وضع کرنے کے سلسلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا اور ان کی رائے پوچھی۔ کسی نے کہا: نماز کے لیے حاضر ہوتے وقت ایک جھنڈا گاڑ دیا جائے، جب لوگ اسے دیکھیں گے تو ایک دوسرے کو اطلاع

[1] الروض الأنف :2/355-357، فتح الباري :2/104,105

کرتے ہوئے آجائیں گے۔ کچھ لوگوں نے بُوق یا قَرن (بگل یا نرسنگا) بجانے کی رائے دی۔ یہ رائے آپ ﷺ نے پسند نہیں کی اور فرمایا: ''یہ تو یہودیوں کا عمل ہے۔'' کسی نے ناقوس (گھنٹہ) بجانے کا کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ نصاریٰ کا کام ہے۔'' پھر صحابہ نے عرض کیا: اگر ہم آگ جلا لیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کام تو مجوسی کرتے ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

أَوَلَا تَبْعَثُونَ رَجُلًا يُنَادِي بِالصَّلَاةِ؟

''تم کسی آدمی کو کیوں نہیں بھیج دیتے تاکہ وہ نماز کی منادی کر دیا کرے؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يَا بِلَالُ! قُمْ فَنَادِ بِالصَّلَاةِ»

''بلال! جاؤ اور نماز کی منادی کرو۔''

اس مشورے کے بعد صحابہ اپنے اپنے گھر چلے گئے لیکن عبداللہ بن زید بن عبد ربہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے نماز کے اہتمام میں تفکر کی وجہ سے بہت فکر مند تھے۔ چنانچہ انھیں خواب میں اذان دکھائی اور سکھلائی گئی۔ اذان کے آغاز کی داستان خود عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی زبانی سنیے، وہ فرماتے ہیں:

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب رسول اللہ ﷺ نے ناقوس (گھنٹہ) بجا کر لوگوں کو نماز کے لیے جمع کرنے کا حکم دیا لیکن نصاریٰ سے مشابہت کی بنا پر آپ ﷺ کو یہ طریقہ پسند نہیں تھا۔ اسی رات میں نے خواب میں دیکھا کہ سبز رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ایک شخص ایک ناقوس (گھنٹہ) اٹھائے چلا جا رہا ہے۔ میں نے اسے آواز دی اور کہا: ''اے اللہ کے بندے! کیا تو یہ گھنٹہ بیچنا پسند کرے گا؟'' اس نے پوچھا: ''تم اس کا کیا کرو گے؟'' میں نے کہا: ''ہم اس کے ذریعے سے نماز کی دعوت دیا کریں گے۔'' وہ کہنے لگا: ''کیا میں تمھیں اس سے اچھا طریقہ نہ بتلاؤں؟''

میں نے کہا: ''کیوں نہیں! ضرور بتاؤ۔'' وہ بولا: ''تم یہ کلمات کہا کرو:

اَللّٰهُ أَكْبَرُ ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ — ''اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔''

اَللّٰهُ أَكْبَرُ ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ — ''اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔''

أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ	''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔''
أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ	''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔''
أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ	''میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد اللہ کے رسول ہیں۔''
أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ	''میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد اللہ کے رسول ہیں۔''
حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ	''آیئے نماز کے لیے۔''
حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ	''آیئے نماز کے لیے۔''
حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ	''آیئے کامیابی حاصل کرنے کے لیے۔''
حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ	''آیئے کامیابی حاصل کرنے کے لیے۔''
اَللّٰهُ أَكْبَرُ ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ	''اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔''
لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ	''اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔''

پھر وہ مجھ سے قدرے پیچھے ہٹ گیا اور کہنے لگا: ''پھر جب تم نماز کے لیے کھڑے ہونے لگو تو کہو:

اَللّٰهُ أَكْبَرُ ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ	''اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔''
أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ	''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔''
أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ	''میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک محمد اللہ کے رسول ہیں۔''
حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ	''آیئے نماز کے لیے۔''
حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ	''آیئے کامیابی حاصل کرنے کے لیے۔''
قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ	''بلاشبہ نماز قائم (کھڑی) ہوگئی ہے۔''
قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ	''بلاشبہ نماز قائم (کھڑی) ہوگئی ہے۔''

اَللّٰهُ أَكْبَرُ ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ — ''اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔''

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ — ''اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔''

حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ''صبح ہوئی تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا خواب سنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّهَا لَرُؤْيَا حَقٌّ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ، فَقُمْ مَعَ بِلَالٍ فَأَلْقِ عَلَيْهِ مَارَأَيْتَ فَلْيُؤَذِّنْ بِهِ فَإِنَّهُ أَنْدٰى صَوْتًا مِّنْكَ»

''اللہ کے حکم سے یہ سچا خواب ہے۔ اب تم بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور جو کچھ خواب میں دیکھا ہے، اسے بتا دو، وہ اس کے مطابق اذان دے گا کیونکہ وہ تم سے زیادہ خوش الحان اور بلند آہنگ ہے۔''

پس میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور جو الفاظ میں نے سنے تھے، وہ انھیں بتاتا گیا اور وہ اذان دیتے چلے گئے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس وقت اپنے گھر میں تھے، انھوں نے یہ اذان سنی تو جلدی جلدی اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے آئے۔ کہنے لگے: ''اللہ کے رسول! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے! میں نے بھی اسی طرح کا خواب دیکھا ہے جس طرح انھیں دکھایا گیا ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر طرح کی تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔''[1]

سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما کی فضیلت

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بھی اسی رات خواب میں اذان دکھلائی گئی تھی۔ انھوں نے سوچا صبح جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دوں گا تو بتا دوں گا لیکن عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہما کو ذرا بھی توقف گوارا نہ ہوا۔ وہ رات ہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالیہ میں جا پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا خواب سنا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یقیناً یہ سچا خواب ہے۔''[2]

سنن ابوداود میں عمرو بن مرہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے ابن ابی لیلیٰ سے سنا، وہ فرماتے تھے: نماز تین حالتوں سے گزری ہے، یعنی اس میں اذان سمیت تین طرح کی تبدیلیاں ہوئیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہم سے

[1] سنن أبي داود: 499، جامع الترمذي: 189، مسند أحمد: 43/4، صحيح ابن خزيمة: 192,191/1. [2] الطبقات لابن سعد: 248,247/1، سيدنا محمد رسول الله ﷺ الأسوة حسنة: 263,262/1.

بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَقَدْ أَعْجَبَنِي أَنْ تَكُونَ صَلَاةُ الْمُسْلِمِينَ ـ أَوْ قَالَ: الْمُؤْمِنِينَ ـ وَاحِدَةً حَتَّى لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ أَبُثَّ رِجَالًا فِي الدُّورِ يُنَادُونَ النَّاسَ بِحِينِ الصَّلَاةِ، وَحَتَّى هَمَمْتُ أَنْ آمُرَ رِجَالًا يَقُومُونَ عَلَى الْآطَامِ يُنَادُونَ الْمُسْلِمِينَ بِحِينِ الصَّلَاةِ حَتَّى نَقَسُوا أَوْ كَادُوا أَنْ يَنْقُسُوا»

''یقیناً مجھے یہ بات پسند ہے کہ مسلمانوں (یا فرمایا: مومنوں) کی نماز ایک ہو، یعنی ایک امام کے پیچھے سب مل کر باجماعت نماز ادا کریں یہاں تک کہ میں نے ارادہ کیا کہ کچھ لوگوں کو گلی محلوں میں بھیجوں کہ وہ لوگوں کے رُو برو نماز کے وقت کی پکار لگائیں اور میں نے یہ بھی ارادہ کر لیا کہ میں لوگوں کو حکم دوں کہ وہ قلعوں اور اونچے مکانوں پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کے لیے نماز کے وقت کی پکار لگائیں حتی کہ انھوں نے ناقوس (گھنٹے) بجائے یا وہ اس (فکر میں تھے یا اس) کے قریب تھے کہ گھنٹے بجانے لگیں۔''
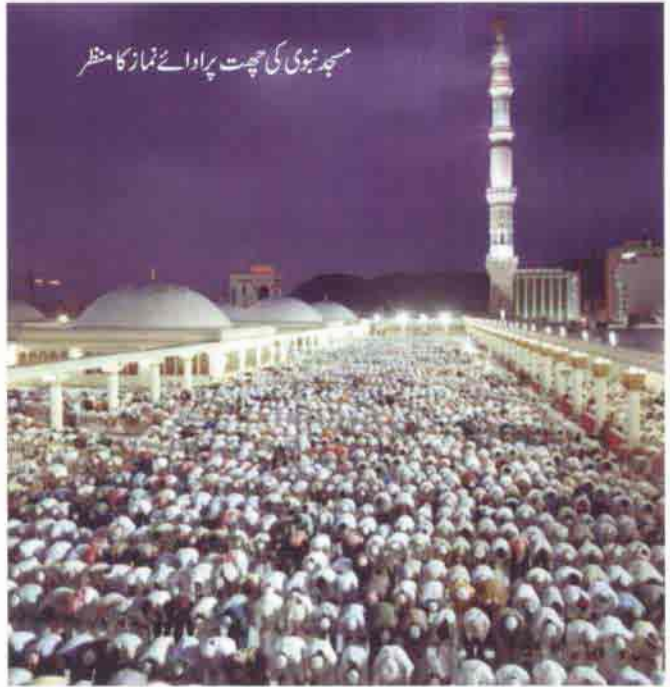
مسجد نبوی کی چھت پر ادائے نماز کا منظر

ابن ابی لیلیٰ نے کہا: ایک انصاری حضرت عبداللہ بن زید بن عبد ربہ رضی اللہ عنہما آئے۔ انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جب سے میں آپ کے پاس سے اُٹھ کر واپس گیا تھا، مجھے نماز کے بارے میں آپ کی فکرمندی کا بے حد احساس تھا حتی کہ میں نے خواب میں ایک آدمی کو دیکھا۔ اس نے دو سبز کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ مسجد نبوی کے پاس (یا اس کی دیوار پر) کھڑا ہو گیا اور اذان کہی، پھر تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ گیا، پھر دوبارہ کھڑا ہو گیا اور پہلے والے کلمات جیسے کلمات کہے، صرف اتنا فرق کیا کہ اس نے قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ کا اضافہ کیا۔

عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: اگر مجھے لوگوں کی یا تمھاری باتوں کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا میں جاگ رہا

تھا، سویا نہیں تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَقَدْ أَرَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا، فَمُرْ بِلَالًا فَلْيُؤَذِّنْ»

''اللہ تعالیٰ نے یقیناً تمھیں اچھا خواب دکھایا ہے۔ بلال (رضی اللہ عنہ) سے کہو کہ وہ اذان دیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے بھی بالکل یہی خواب دیکھا ہے جو اس انصاری نے دیکھا ہے۔ لیکن جب انصاری نے مجھ سے پہلے اپنا خواب بیان کر دیا تو مجھے حیا آ گئی، اس لیے میں نے اپنا خواب بیان نہیں کیا۔''[1]

عبداللہ بن زید اور ابومحذورہ رضی اللہ عنہما کی اذان کا فرق

سنن نسائی میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ اپنی اذان کے حوالے سے تفصیل بیان کرتے ہیں، فرماتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ حنین سے لوٹے تو اہل مکہ میں سے ہم دس افراد رسول اللہ ﷺ کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ ہم نے سنا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے نماز کے لیے اذان دی۔ ہم نے بھی استہزا میں اذان دینا شروع کی۔ رسول اللہ ﷺ نے ہماری اذان کی آواز سنی تو فرمایا: اس طرف سے خوبصورت آواز میں اذان دی گئی ہے، ان لوگوں کو بلایا جائے۔ ہم سب دوستوں کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ باری باری سب اذان دیں۔ ہم سب نے ایک ایک کر کے اذان دی۔ میری باری سب سے آخر میں تھی۔ میری اذان سن کر فرمایا: آگے آ جاؤ، پھر مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا اور میری پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور تین مرتبہ برکت کی دعا کی۔ پھر فرمایا: «اِذْهَبْ فَأَذِّنْ عِنْدَ الْبَيْتِ الْحَرَامِ» ''جاؤ اور اللہ کے عزت والے گھر (بیت اللہ) کے پاس اذان کہو۔'' میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں کیسے اذان کہوں؟ تب رسول اللہ ﷺ نے مجھے اذان سکھائی جیسے کہ تم اب اذان دیتے ہو۔ اس میں چار بار تکبیر (اللّٰہ أکبر) کہیں، دو دو بار شہادتین، یعنی أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ ہلکی آواز میں کہہ کر پھر بلند آواز میں دو دو بار شہادتین کہیں اور دو بار حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ .... حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ ...... کہہ کر صبح کی پہلی اذان میں اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہیں۔

ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے مجھے دہری اقامت بھی سکھائی۔ اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ، أَشْهَدُ أَنَّ

[1] سنن أبي داود: 506.

مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰہِ، حَيَّ عَلَی الصَّلَاۃِ، حَيَّ عَلَی الصَّلَاۃِ، حَيَّ عَلَی الْفَلَاحِ، حَيَّ عَلَی الْفَلَاحِ، قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ، قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ، اَللّٰہُ أَکْبَرُ، اَللّٰہُ أَکْبَرُ، لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ.[1]

اس حدیث سے درج ذیل امور کی وضاحت ہوتی ہے:

1 رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اذان اور اقامت کی تعلیم دی۔

2 اذان اور اقامت کے کلمات کم یا زیادہ رسول اللہ ﷺ ہی نے سکھائے ہیں۔

3 رسول اللہ ﷺ ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو جو اذان سکھائی، وہ صرف سفر میں اذان کی تعلیم نہ تھی بلکہ ابومحذورہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں اور آپ ﷺ کے بعد مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے پاس انھی دہرے کلمات کے ساتھ اذان کہتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ یا کسی صحابی نے ان کا رد نہیں کیا بلکہ سنن نسائی کی روایت (633) میں ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن محیریز رحمہ اللہ کو ان کے مطالبے پر وہی اذان سکھائی جو انھوں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سیکھی تھی اور وہی اذان مکہ میں کہہ رہے تھے۔

مسجد الحرام میں جائے اذان

4 ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کی اذان کے کلمات کے سلسلے میں بہت سے اشکالات پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کا مختصر جواب یہی ہے کہ اشکالات میں پیش کردہ روایات ضعیف ہیں یا ان سے استدلال درست نہیں، نیز ان اشکالات کو درست تسلیم کرنے سے سیدنا ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں سوءِ ظن کا اظہار ہوتا ہے اور بغیر دلیل کے صحابی کی طرف ایک غلطی منسوب کی جاتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اذان میں ترجیع (دو دو بار آہستہ آواز میں شہادتین کہہ کر پھر بلند آواز سے دو دو بار شہادتین کہنا) سنتِ اذان میں سے ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اس کی تعلیم دی ہے۔[2]

[1] سنن أبي داود: 500-505، سنن النسائي: 632-634، مسند أحمد: 3/408، 409. [2] مزید دیکھیے: تحفة الأحوذي: 1/503-506.

سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی اذان میں پندرہ کلمات ہیں اور سیدنا ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کی اذان میں انیس کلمات ہیں جیسا کہ ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَلَّمَهُ الْأَذَانَ تِسْعَ عَشْرَةَ كَلِمَةً وَالْإِقَامَةَ سَبْعَ عَشْرَةَ كَلِمَةً ......

"بے شک رسول اللہ ﷺ نے انھیں (ابومحذورہ کو) انیس کلمے اذان کے سکھائے اور سترہ کلمے اقامت (تکبیر) کے سکھائے......" [1]

فجر کی اذان

مؤذن فجر کی اذان میں حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے بعد دو مرتبہ اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہتا ہے۔ اسے تثویب کہتے ہیں۔ تثویب کے معنی ہیں: نماز کی طرف بلانا۔ اس کی اصل ثوب (بمعنی کپڑا) ہے۔ وہ اس طرح کہ جب دور سے آتے ہوئے کوئی شخص آواز لگاتا ہے تو وہ ساتھ ساتھ کپڑے کو حرکت بھی دے رہا ہوتا ہے تاکہ وہ دور ہی سے نظر آجائے اور اس کی شہرت ہو جائے۔ [2]
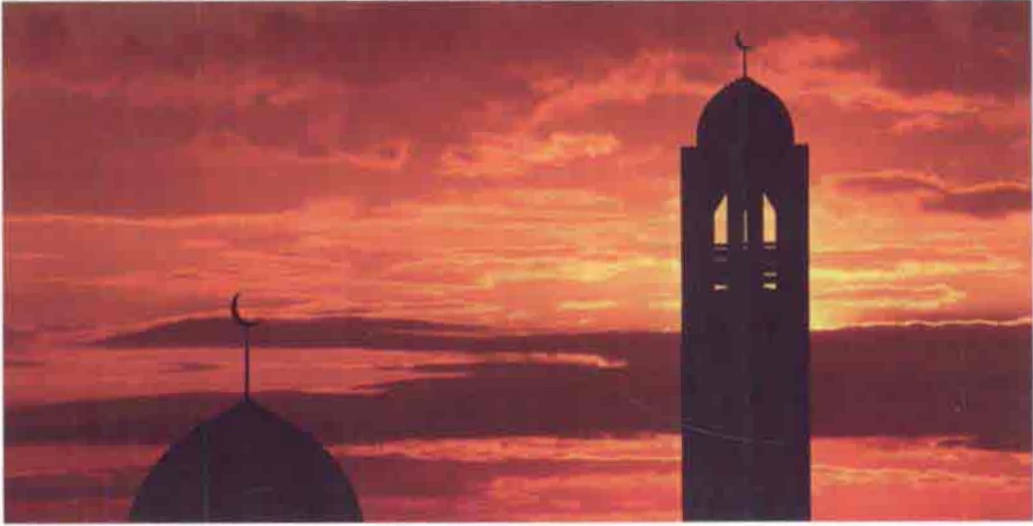
اذان کے وقت کانوں میں انگلیاں ڈالنا اور دائیں بائیں منہ پھیرنا

اذان کہتے ہوئے مؤذن اپنی شہادت کی انگلیاں اپنے دونوں کانوں میں رکھے گا، نیز جب حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ اور حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ پر پہنچے گا تو اپنا چہرہ دائیں اور بائیں طرف موڑے گا۔ سیدنا ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت

1 سنن أبي داود: 502. 2 تاج العروس، مادة: ثوب.

ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کہتے ہوئے دیکھا تو میں بھی اذان میں ان کے منہ کے ساتھ اپنا منہ اِدھر اُدھر پھیرنے لگا۔ [1]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت نقل کی ہے، اس میں دو چیزوں کا اضافہ ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کہتے ہوئے دیکھا جبکہ وہ اپنا منہ (چہرہ) اِدھر اُدھر پھیر رہے تھے اور ان کی (شہادت کی) انگلیاں ان کے دونوں کانوں میں تھیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سرخ چمڑے کے قبے (خیمے) میں تھے۔ [2]

سنن ابوداود میں اس بات کی وضاحت ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ نے صرف گردن (دائیں بائیں) موڑی تھی، خود نہیں گھومے تھے۔ [3]

صحیح مسلم میں اس چیز کی وضاحت پائی جاتی ہے کہ گردن حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ اور حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کہتے ہوئے دائیں بائیں موڑنی ہے۔ صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ ہیں: سیدنا ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ...... بلال رضی اللہ عنہ نے وضو کیا اور اذان دی۔ میں بھی ان کے منہ کے ساتھ ساتھ اپنا منہ پھیرتا رہا، یعنی دائیں بائیں۔ اس وقت وہ حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ اور حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کہہ رہے تھے۔ [4]

مذکورہ روایات سے واضح ہوا کہ مؤذن اذان کہتے ہوئے اپنی شہادت کی دونوں انگلیاں اپنے دونوں کانوں میں رکھے گا۔ کانوں میں انگلیاں رکھنے کے عام طور پر دو فائدے بیان کیے گئے ہیں: ایک تو اس سے آواز بلند ہو جاتی ہے۔ دوسرے، یہ اذان دینے کی علامت ہے۔ اس طرح دور سے مؤذن کی پہچان ہو جاتی ہے، نیز اس سے بہرے شخص کو بھی نماز کے وقت کا پتہ چل جاتا ہے۔ [5]

تثویب کی ابتدا

تثویب کے لفظی معنی ہیں: پکار کے بعد پکار۔ مؤذن جب حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ کہہ کر الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہتا ہے تو گویا نماز کی ایک پکار کے بعد دوسری مرتبہ پکار لگاتا ہے۔ [6]

تثویب کی ابتدا کے بارے میں مختلف احادیث ہیں۔ حفص بن عمر بن سعد کہتے ہیں: سعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن تھے۔ حفص نے کہا: میرے گھر والوں نے مجھ سے بیان کیا کہ بلال رضی اللہ عنہ اذان کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نمازِ فجر کی اطلاع دینے گئے۔ صحابہ نے بتایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سو رہے ہیں۔ بلال رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے کہا: اَلصَّلَاةُ

[1] صحيح البخاري: 634. [2] جامع الترمذي: 197. [3] سنن أبي دود: 520. [4] صحيح مسلم: 503. [5] مزید دیکھیے: فتح الباري: 2/150-152، شرح النووي على صحيح مسلم: 4/293، تحفة الأحوذي: 1/521,520. [6] الزاهر في غريب ألفاظ الشافعي: 1//79.

خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ۔ بعد میں یہی کلمہ فجر کی اذان کا حصہ بن گیا۔

سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما اور ان کے خواب کا قصہ بیان کرنے کے بعد فرمایا: پھر بلال رضی اللہ عنہ نے اذان میں اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا اضافہ کر دیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بلال رضی اللہ عنہ فجر کی پہلی اذان دے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کرنے گئے تو انھیں بتایا گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سو رہے ہیں۔ تب بلال رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے کہا: اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ ''نماز نیند سے بہت بہتر ہے۔'' اس کے بعد اس کلمے کو فجر کی اذان میں سمو دیا گیا۔'' [1]

تثویب (اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ) کے بارے میں ایک اشکال کا ازالہ

امام مالک رحمہ اللہ کی بلاغات میں سے ایک روایت ہے، فرماتے ہیں: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا مؤذن انھیں نمازِ فجر کی اطلاع دینے گیا۔ اس نے انھیں سویا ہوا پایا تو کہا: اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ عمر رضی اللہ عنہ نے اسے حکم دیا کہ وہ یہ کلمہ صبح کی اذان میں کہے۔ [2]

اس خبر یا اثر کے پیش نظر بعض لوگ یہ کہہ دیتے ہیں: اذانِ صبح میں اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا اضافہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ اس اشکال کا ازالہ درج ذیل امور سے ہوتا ہے:

[1] السنن الكبرٰى للبيهقي: 423,422/1، سنن ابن ماجه: 716. [2] الموطأ للإمام مالك: 86/1، حديث: 158.

1 سابقہ سطور سے واضح ہوتا ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی اطلاع دینے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نیند کی حالت میں پاکر بطور ادب اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہا۔ اس جملے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم صادر فرمایا کہ اسے اذانِ فجر میں کہو۔ گویا اذان میں اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کے الفاظ کا اضافہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حکم سے ہوا، اس لیے اسے غیر شرعی نہیں کہا جا سکتا۔

2 سن آٹھ ہجری میں غزوۂ حنین کے بعد جب سیدنا ابومحذورہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: اللہ کے رسول! مجھے اذان کا مسنون طریقہ سکھا دیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اذان کی تعلیم دی اور فرمایا: صبح کی اذان میں (یہ بھی) کہو: اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ ''نماز نیند سے بہت بہتر ہے، نماز نیند سے بہت بہتر ہے۔''[1]

3 حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت معضل یا مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔[2]

4 بالفرض سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے یہ بات سنداً ثابت ہو بھی جائے تب بھی اس کی توجیہ یہی ہے کہ ان کلمات کی اصل جگہ اذان فجر ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔ یہ کلمات اذانِ فجر ہی میں کہے جائیں۔ دیگر اوقات میں کسی کو نیند سے بیدار اور خبردار کرنے کے لیے ان کلمات کا استعمال جائز نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی لیے بطور خاص تنبیہ فرمائی۔

5 حضرت انس رضی اللہ عنہ تثویب کے متعلق فرماتے ہیں:

مِنَ السُّنَّةِ إِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ فِي أَذَانِ الْفَجْرِ: حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، قَالَ: اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ مَرَّتَيْنِ ......

''یہ سنت ہے کہ مؤذن اذانِ فجر میں حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے بعد دو مرتبہ الصلاة خير من النوم کہے۔''[3]

6 ایک روایت میں ہے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

مَاكَانَ التَّثْوِيبُ إِلَّا فِي صَلَاةِ الْغَدَاةِ إِذَا قَالَ الْمُؤَذِّنُ: حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، قَالَ: اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ، مَرَّتَيْنِ

---

[1] سنن أبي داود: 500، مسند أحمد: 409,408/3، صحيح ابن حبان (ابن بلبان): 575,574/4 و 578، سنن الدارقطني: 236/1. [2] مشكاة المصابيح تحقيق الشيخ الألباني: 206/1. [3] صحيح ابن خزيمة: 202/1، حديث: 386، سنن الدارقطني: 242/1، واللفظ له، السنن الكبرى للبيهقي: 423/1.

”تثویب صرف فجر کی نماز کے لیے کہی جاتی تھی۔ جب مؤذن حيّ على الفلاح کہتا تو اس کے بعد دو مرتبہ الصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ بھی کہتا تھا۔“ [1]

7 ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے یہی کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ یہ روایت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کسی صحیح سند کے ساتھ مروی ہو جس سے دلیل پکڑی جا سکے، نہ اس کی صحت معلوم ہے۔ اسے صرف ابن ابوشیبہ نے ہشام بن عروہ سے اور انھوں نے ایک ایسے آدمی سے نقل کیا ہے جس کا نام اسماعیل ہے۔

8 نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صبح کی اذان میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ یا حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کا اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہنا محفوظ و ثابت ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان کا مفہوم یہ ہوگا کہ صبح کی اذان دینے کے لیے ایک مخصوص جگہ ہے، وہ یہاں میرے پاس نہیں کہی جائے گی، گویا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ امر ناپسند کیا کہ مؤذن امیر کے دروازے پر آ کر ایک اور اذان دے جیسا کہ بعض نے یہ طریقہ ایجاد کر لیا تھا۔

9 تثویب (اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ) علماء اور عوام الناس کے ہاں مشہور تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ گمان کیا جائے کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا علم ہی نہیں تھا، اس لیے انھوں نے بلال رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اور ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو مکہ میں حکم دیا کہ وہ اذان میں اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہا کریں۔

10 ابن عبدالبر رحمہ اللہ کی تاویل کے مانند باجی رحمہ اللہ کا قول ہے: اس سے یہ احتمال ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے لفظ اَلصَّلَاةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ اذان کے علاوہ کسی اور جگہ پر کہنے سے روکا ہو اور فرمایا ہو کہ اسے اس کی اصل جگہ صبح کی اذان ہی میں کہو، اذان کے سوا کہیں اور نہ کہو۔ یہ اچھی تاویل ہے۔ اس کا تعین تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دور میں ہو چکا تھا۔ [2]

اقامت

سیدنا عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہما کو فرشتے نے خواب میں اذان کے ساتھ ساتھ اقامت بھی سکھا دی بلکہ اس کا طریقہ بھی سمجھا دیا جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان ہو چکا ہے۔ اقامت کو تثویب بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ بھی سابقہ تعریف کے مطابق ایک بار نماز کے لیے بلانے کے بعد دوسری بار بلانا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ أَدْبَرَ الشَّيْطَانُ لَهُ ضُرَاطٌ حَتّٰى لَا يَسْمَعَ التَّأْذِينَ، فَإِذَا قُضِيَ النِّدَاءُ أَقْبَلَ

---

[1] شرح مشكل الآثار :15/365، سنن الدارقطني :1/242. [2] تفصیل کے لیے دیکھیے: شرح الزرقاني على الموطأ للإمام مالك :1/217,218.

حَتّٰی إِذَا ثُوِّبَ لِلصَّلَاةِ أَدْبَرَ حَتّٰی إِذَا قُضِيَ التَّثْوِيبُ أَقْبَلَ حَتّٰی يَخْطُرَ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ نَفْسِهِ ......»

''جب اذان کہی جاتی ہے تو شیطان بادِ شکم چھوڑتا ہوا بھاگ جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اذان کی آواز نہیں سنتا۔ جب اذان مکمل ہو جاتی ہے تو واپس آ جاتا ہے حتی کہ جب نماز کے لیے اقامت کہی جاتی ہے تو پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے یہاں تک کہ جب اقامت پوری ہو جاتی ہے تو پھر آ جاتا ہے اور آدمی کے دل میں وسوسے ڈالتا ہے......۔''[1]

صحیح مسلم میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا ثُوِّبَ لِلصَّلَاةِ فَلَا تَأْتُوهَا وَأَنْتُمْ تَسْعَوْنَ......»

''جب نماز کے لیے اقامت کہی جائے تو تم دوڑتے ہوئے نہ آؤ......۔''[2]

[1] صحيح البخاري :608. [2] صحيح مسلم :602.

بادشاہی مسجد کا دلکش منظر

مُخیریق کا اسلام

ابن ہشام، ابن کثیر اور بلاذری وغیرہ نے مُخیریق رضی اللہ عنہ کا تعلق بنوثعلبہ بن فطیون سے بتایا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کا تعلق الاصابہ میں بنونضیر سے اور فتح الباری میں بنوقینقاع کے باقی ماندہ افراد سے بتایا ہے جو بنونضیر کے ساتھ رہتے تھے۔[1] امام بلاذری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ بنونضیر سے نہیں تھے۔[2]

یومِ سبت کو مسترد کر دیا

امام ابن ہشام نے لکھا ہے: ''محمد بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ مخیریق رضی اللہ عنہ یہود کے بڑے عالم اور مالدار فرد تھے۔ ان کے پاس کھجور کے باغوں کی شکل میں وسیع جائداد تھی۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی صفاتِ عالیہ اور اپنے علم کی بنا پر پہچانتے تھے۔ دین کی محبت ان کے دل و دماغ میں رچی ہوئی تھی۔ وہ آخر تک اسی رنگِ اخلاص میں ڈوبے رہے۔ غزوۂ اُحد کے دن، جو ہفتہ کے روز پیش آیا، یہود سے کہنے لگے: اے یہود کی جماعت! اللہ کی قسم! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کرنا تمھارے لیے برحق ہے۔ وہ لوگ کہنے لگے: ''آج اَلسَّبْت (ہفتہ کا دن) ہے۔'' مخیریق رضی اللہ عنہ نے کہا: تمھارے لیے ہفتہ (کی پابندی لازم) نہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنا اسلحہ اٹھایا اور میدان احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے۔ انھوں نے اپنی قوم کو وصیت کی کہ اگر آج میں شہید ہوگیا تو میرا سارا مال محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے ہے۔ جہاں اللہ چاہے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ مال وہیں خرچ کریں گے۔

جب جنگ شروع ہوئی تو مخیریق رضی اللہ عنہ بھی مشرکین سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مُخَيْرِيقٌ خَيْرُ يَهُودَ» ''مخیریق یہود میں سے بہترین فرد ہے۔''[3]

مخیریق کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحسین

مخیریق رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام اور ان کے مال کے بارے میں حافظ ابن حجر اور علامہ محمد شمس الحق عظیم آبادی رحمہما اللہ

[1] السيرة لابن هشام: 514/2، السيرة النبوية لابن كثير، ص: 310، الإصابة: 46/6، فتح الباري: 244/6. [2] أنساب الأشراف: 339/1. [3] السيرة لابن هشام: 518/2.

لکھتے ہیں: مخیریق رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تھا اور غزوۂ اُحد میں شہادت سے سرفراز ہوئے تھے۔ آپ بہت مالدار تھے۔ مدینہ میں ان کے سات باغ تھے جن کے نام یہ ہیں: اَلْمِیْثَب، اَلصَّائِفَۃُ، الدَّلَال، حُسْنٰی، بُرقۃ، اَلْأَعْواف (یا اَلْمِعْوان) اور مَشْرَبۃ أمّ إبراھیم۔[1]

مخیریق رضی اللہ عنہ کے اسلام کے بارے میں دکتور علی الصلابی لکھتے ہیں: ''ان کے اسلام کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ذہبی نے تجرید أسماء الصحابة اور ابن حجر نے الإصابہ میں امام واقدی سے نقل کیا ہے کہ مخیریق رضی اللہ عنہ اسلام کی حالت میں فوت ہوئے۔ امام سہیلی نے الروض میں بیان کیا ہے کہ مخیریق رضی اللہ عنہ مسلمان تھے۔ انھوں نے یہ بات اس بنیاد پر کہی ہے کہ ابن اسحاق نے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان نقل کیا ہے: «مُخَیْرِیقٌ خَیْرُ یَهُودَ» ''مخیریق یہود میں سے بہترین فرد تھا۔''[2]

[1] الإصابة 6/47,46، عون المعبود: 8/137. [2] السيرة النبوية للصلابي: 2/112,111.

مدینہ میں کھجوروں کا باغ

مواخاتِ مدینہ

کفار اور منافقین سے دوستی کی ممانعت، انصار و مہاجرین
میں مواخات اور اصحاب صفہ کا تذکارِ جمیل

”اور اس نے ان (مومنوں) کے دلوں میں الفت ڈال دی،

اگر آپ دنیا بھر کے سب خزانے خرچ کر دیتے تو بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے

لیکن اللہ ہی نے ان میں الفت ڈالی۔“ (الأنفال 8:63)

اس باب میں

مکہ مکرمہ سے ہجرت کے بعد رسالت مآب ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینہ میں امن اور تحفظ کی فضا تو میسر آ گئی لیکن آپ ﷺ کا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مدینہ میں رہنے سہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ آپ ﷺ بڑی شدت سے محسوس فرماتے تھے کہ مہاجرین مکہ کو مدینہ کی معیشت میں شامل کرنا ضروری ہے تاکہ مہاجرین اپنی گزر بسر کا قابلِ اطمینان انتظام کر سکیں۔ یہ مسئلہ آپ ﷺ نے انصار اور مہاجرین کے مابین مواخات قائم فرما کر بڑی خوش اسلوبی سے حل کیا۔ اس موقع پر انصار و مہاجرین میں محبت و اخوت اور ایثار و قربانی کے بے مثال مظاہرے دیکھنے میں آئے۔ انصار مہاجرین پر اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہو گئے لیکن مہاجرین مکہ بھی اتنے غیور، خود دار اور باوقار تھے کہ انھوں نے خود اپنے دست و بازو سے روزی کمائی۔ کھجوروں کے باغوں میں محنت مزدوری کی۔ بعض مہاجر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تجارت کا پیشہ اپنا لیا۔ اس طرح انھوں نے نہ صرف اپنی معیشت کا سامان مہیا کر لیا بلکہ انصار کے وہ مصارف بھی ادا کر دیے جو انھوں نے ابتدا میں مہاجرین کی گزر بسر کے لیے کیے تھے۔ حکم وراثت کی منسوخی، فضیلت انصار، رسول کریم ﷺ کی انصار سے محبت، انصار کے بارے میں نبی ﷺ کی وصیت اور اصحاب صفہ کے حالات و واقعات کی تفصیلات اس باب کی زینت ہیں۔

مواخاتِ مہاجرین و انصار

سیاست وحکومت کے قیام و استحکام کی سب سے پہلی اور فوری ضرورت یہ ہے کہ ریاست کے باشندے آپس میں حسن سلوک سے رہیں اور تمام اہم مسائل و معاملات میں ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کے جذبے سے کام لیں۔ جو معاشرہ اس خوبی سے خالی ہوگا وہ کبھی مہذب معاشرہ نہیں کہلا سکتا۔ نہ جھگڑالو لوگوں کی سوسائٹی میں کوئی مضبوط حکومت قائم ہوسکتی ہے۔ تمدنی اور سیاسی یکجہتی کا پہلا مطالبہ ہی افرادِ معاشرہ کا اتحاد و اتفاق ہے۔ جدید دور کی ترقی یافتہ حکومتوں نے افراد معاشرہ کے باہمی اتحاد کی بنیادیں آج ڈھونڈی ہیں جبکہ اسلام نے یہ سبق ڈیڑھ ہزار سال پہلے ہی سکھا دیا تھا۔

حق یہ ہے کہ مختلف ومتضاد مزاج کے بکھرے ہوئے لوگوں کو باہمی محبت کے رشتے میں پرو دینا، اس دنیا کا سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ یہ اللہ تعالی کی خاص رحمت، اسلام کی زبردست جوہری قوت اور رسول اللہ ﷺ کی بے مثل حکمت وفراست ہی تھی جس نے اُن جھگڑالو عربوں کو توحید سے منور کر کے بھائی بھائی بنا دیا جن کی چمکتی ہوئی تلواریں صدیوں سے ایک دوسرے کا خون کرتی چلی آرہی تھیں۔ وہی لوگ جو پہلے قبائلی عصبیت اور کینہ و انتقام

وادیٔ مکہ جہاں سے نبی ﷺ نے درسِ توحید کا آغاز کیا اور ہجرت فرمائی

کے مجسمے تھے، اسلام قبول کرتے ہی ان میں باہمی اخوت و محبت کی ایسی پاکیزہ روح بیدار ہوگئی کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کے لیے اپنی جان اور مال سمیت سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہوگئے۔ خاص طور پر مسلمانوں کی یہ باہمی محبت و اخوت اُس وقت اپنی معراج پر پہنچ گئی جب اللہ کے رسول ﷺ مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ میں جلوہ افروز ہوئے اور آپ ﷺ نے مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ میں مواخات قائم فرمائی۔ یہ اپنی نوعیت کا ایسا اکلوتا اور البیلا واقعہ ہے جس کی تاریخ عالم میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ آیئے تاریخ کے آئینے میں اِس رفیع الشان مواخات کا منظر پوری تفصیل سے دیکھیے۔

رسول کریم ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے مدینے میں یہود کا معاشی غلبہ پایا۔ وہ بڑے خوش اوقات تھے اور فارغ البالی نے ان کی زندگی کی رنگینیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ زرخیز زمینیں، گھنے نخلستان اور شاداب باغات ان کے قبضے میں تھے۔ صنعت و تجارت پر ان کی اجارہ داری تھی۔ بازاروں اور منڈیوں میں بھی انھی کا سکہ چلتا تھا۔ غرض ان تمام وجوہ کی یکجائی سے وہ بڑے سرمایہ دار بن گئے تھے۔

مدینہ منورہ کے سرسبز کھیت

مدینہ کا ایک نخلستان

مدینہ کی زرعی پیداوار

مسجد نبوی رسول اللہ ﷺ کے عہد کے مدینہ منورہ پر محیط ہے

اپنی اس بالادستی سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے معاشی استحصال کے ذریعے سے اوس وخزرج کو اپنا دست نگر بنالیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی مدینہ منورہ آمد کے بعد اوس اور خزرج کی زندگی میں شمع نبوت نے اُجالا کیا۔ اب انھیں انصار کہا جانے لگا تھا۔

یہود کے مقابلے میں انصار بہ ہمہ وجوہ شکستہ حال تھے۔ ہجرتِ نبوی سے پہلے ہی وہ جنگ بُعاث اور دیگر لڑائیوں میں نہ صرف اپنی اہم افرادی قوت ضائع کر چکے تھے بلکہ معاشی اعتبار سے اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ یہودیوں کے مقروض بن کر سود در سود کے پنجے میں جکڑے جا چکے تھے۔ اسی معاشی دباؤ کی وجہ سے وہ بڑی حد تک یہود کے زیر اثر تھے۔ اس میں شک نہیں کہ انصار تھوڑی بہت تجارت کرتے تھے۔ ان کے مراکز خرید وفروخت بھی تھے مگر تجارتی رموز سے وہ یکسر نابلد تھے۔ عملاً مدینہ کی تجارت پر ان کا کوئی اقتدار نہ تھا۔ اگرچہ زراعت ان کا آبائی پیشہ تھا مگر مالی اعتبار سے کمزور ہونے اور زرخیز زمینوں کی قلت کے سبب وہ اس میں بھی خاطر خواہ ترقی نہ کر سکے۔ اب جہاں تک مہاجرین کا تعلق ہے تو یہ بات مسلّمات میں سے ہے کہ وہ سینکڑوں برس سے فن تجارت میں مشغول تھے۔ یوں وہ اس کی نزاکتوں سے بخوبی واقف اور اس پیشے کے امام تھے۔

جن لوگوں نے مکہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی، انھیں مختلف معاشی، معاشرتی اور طبی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بات تو ایک معلوم ومعروف حقیقت ہے کہ مہاجرین اپنے اہل وعیال اور اپنا بیشتر مال و دولت مکہ ہی میں چھوڑ کر آ گئے تھے۔ یہ لوگ تجارت میں تو مہارت رکھتے تھے، جو قریش کا خاص امتیازی وصف تھا، لیکن انھیں زراعت اور صنعت کے شعبوں کی شُد بُد بھی نہیں تھی جبکہ مدینے کا سارا معاشی نظام زراعت اور صنعت ہی کی بنیاد پر قائم تھا۔

مہاجرین مکہ کے ایک جمے جمائے معاشرے سے اُٹھ کر آئے تھے اور مدینہ میں پوری طرح قدم جما نہیں پائے تھے۔ اس لحاظ سے وہ ایک طرح کی عبوری اور اضطراری حالت میں تھے۔ یوں یہ ایک خاص آزمائش طلب دور تھا۔ تجارت کے لیے سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ مہاجرین کے دل اگرچہ ایمان سے لبریز تھے مگر قریش مکہ نے ان کا مال و متاع لوٹ لیا تھا۔ ان کے جیب و دامن خالی تھے، اس لیے مہاجرین فوری طور پر ایک نئے معاشرے میں اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ مدینے کی نوزائیدہ ریاست بے شمار مسائل سے دوچار تھی جن میں سرفہرست مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ تھا۔ ان لٹے پٹے بے سروسامان مہاجرین کا اپنے اہل وعیال سے اب کوئی رابطہ نہ تھا۔ اس وجہ سے وہ مدینہ میں تنہائی کا شکار تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ نئے شہر کی آب وہوا بھی مکہ کی فضا سے مختلف تھی۔ اس وجہ سے کچھ مہاجرین بخار میں مبتلا ہو گئے۔ انھیں فوری توجہ اور ایسے برتاؤ اور دیکھ بھال کی ضرورت تھی جو محض

میزبانی کی عمومی رسوم تک ہی محدود نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ محض اپنی ذاتی اور نجی حیثیت سے مدینہ تشریف نہیں لے گئے تھے بلکہ آپ ﷺ اہل مدینہ کے مسلّمہ قائد اور پیغمبر کی حیثیت سے پہنچے تھے۔ اس قیادت و پیشوائی کا تقاضا تھا کہ آپ مدینہ کے تمام باشندوں کی قیادت و رہنمائی فرمائیں اور جن مسلمانوں نے اپنا گھر بار، مال و متاع سب کچھ قربان کر کے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی، ان کی معاشی آسودگی اور آباد کاری کا انتظام کریں، علاوہ ازیں اسلامی معاشرے کی تشکیل و تنظیم اور اس کی سالمیت و اتحاد کا مسئلہ بھی توجہ طلب تھا۔ یہ مسائل اپنی اہمیت کے اعتبار سے فوری حل کے متقاضی تھے۔ ان پُر پیچ مسئلوں اور مشکلات پر قابو پانے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے بے مثل تدبر اور حکمت سے کام لیا۔ آپ ﷺ نے پہلا جامع اور مؤثر قدم یہ اٹھایا کہ انصار و مہاجرین کے درمیان رشتۂ مواخات (بھائی چارہ) قائم فرما دیا۔

پھر رنگ، نسل، وطن، زبان اور طبقاتی اختلافات ختم کرنے کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے نبی ﷺ کے ذریعے دین اسلام میں وہ اعلیٰ اصول وضع فرما دیے جن کی کسی اور دین میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس آیت کریمہ میں اسلامی معاشرے کی بنیاد اُجاگر کر دی گئی ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝﴾

"اے لوگو! بلاشبہ ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بلاشبہ اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا (وہ ہے جو) تم میں سے زیادہ متقی ہے، بلاشبہ اللہ بہت علم والا، خوب باخبر ہے۔"[1]

رسول اللہ ﷺ نے اسی آسمانی اصول کی تشریح ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَلَا! إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَّإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ۔ أَلَا! لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى أَعْجَمِيٍّ وَّلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ، وَلَا لِأَحْمَرَ عَلٰى أَسْوَدَ وَلَا أَسْوَدَ عَلٰى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوٰى»

"اے لوگو! آگاہ رہو، تمھارا پروردگار ایک ہے۔ تمھارا باپ (آدم) ایک ہے۔ خبردار! کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، نہ کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت ہے، نہ کسی سیاہ فام کو سفید فام پر فضیلت ہے اور نہ کسی گورے کو کالے پر برتری ہے۔ بزرگی اور برتری کا دار و مدار اللہ کے خوف اور تقویٰ پر ہے۔"[2]

[1] الحجرٰت 13:49. [2] مسند أحمد: 411/5.

نبی کریم ﷺ نے جب ہجرت کے بعد مدینہ منورہ کو اپنی مستقل قیام گاہ بنالیا تو آپ ﷺ نے سب سے پہلے

مسجد نبوی کی جدید عمارت کا ایک خوبصورت منظر

مسجد تعمیر کی۔ یہ اسلامی معاشرے کی پہلی بنیاد تھی۔ یہیں سے بلند پایہ اسلامی معاشرہ وجود میں آیا اور مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق و کردار کی مشعلیں روشن ہوئیں۔

اس مسجد کی بنیادوں میں جس طرح پتھر ایک دوسرے سے پیوست ہوکر مرکز اسلام کی رفیع الشان عمارت بن گئے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین و انصار کو اخوت و مودت کی لڑی میں پروکر اسلامی معاشرے کی تشکیل و تعمیر فرمائی۔ یہ جذبۂ اخوت اتنا مضبوط تھا کہ اس کے باعث وہ بالکل یک جان دو قالب بن گئے۔ مواخات کا عمل ایک ایسا اقدام تھا جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے مسجد نبوی کی تعمیر سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس کا مقصد اسلامی معاشرے میں باہمی الفت کو فروغ دینا اور اسے محکم کرکے اس کے خدوخال اجاگر کرنا تھا۔ اس اقدام کے نتائج و ثمرات کا جائزہ لیا جائے تو بلاشبہ اسے ایک غیر معمولی کارنامہ کہا جائے گا۔

اگر جسم کا کوئی عضو تکلیف میں مبتلا ہوتو سارا جسم اذیت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ یہ ایسی ہی اخوت اور ایسی محبت و مودت تھی جس کی برقی قوت سے جہالت کی تمام تاریکیاں نابود ہوگئیں۔ عصبیت اور غرور کے تمام بت ٹوٹ گئے۔ قبائلی رنجشیں اور باہمی رقابتیں جلوۂ سراب بن گئیں۔ ہر ادنیٰ و اعلیٰ، کالا گورا اور اسود و احمر اسلامی دھارے میں شامل ہوگیا۔ وہی لوگ جو پہلے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اب ایثار و وفا کیشی کے مجسمے بن گئے اور حسد اور کینہ مبدل بہ رشک ہوگیا۔ کفر و ضلالت اور جہالت و گمراہی کے سارے بادل چھٹ گئے اور آفتابِ نبوت پوری

آب و تاب سے علم و آگہی کی ضیا پاشیاں کرنے لگا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے رگ و پے میں یہ بات سرایت کر گئی تھی کہ ان کی تمام تر وفاداری مسلم قیادت ہی کے لیے ہوگی۔ ان کے اخلاص کا محور و مرکز عقیدۂ توحید اور ان کا جینا اور مرنا صرف اعلائے کلمۃ اللہ (اللہ کے حکم کی سربلندی) کے لیے ہوگا۔ انھوں نے انھی مقاصد کے حصول کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین بنالیا۔ وہ اللہ، اس کے رسول اور اہلِ ایمان کے وفادار تھے۔ ان کی تاریخ ایسے سنہرے واقعات سے درخشاں ہے جو اس امر کی دلیل ہیں کہ انھوں نے ولاء (وفا داری، حمایت، محبت، جاں نثاری) کے معانی حقیقی معنویت کے ساتھ پوری گہرائی سے سمجھ لیے تھے اور اسی پر وہ زندگی بھر عمل پیرا رہے۔

مہاجرین و انصار کے درمیان قائم ہونے والے بھائی چارے کی بنیاد صرف عقیدۂ توحید تھا۔ عقیدۂ توحید ہی وہ بنیاد ہے جس پر یہ عمارت استوار کی جا سکتی تھی کیونکہ متضاد نظریات یا عقائد کے حامل دو افراد کو بھائی بھائی بنا کر ایک کر دینا اور یہ سمجھ لینا کہ وہ عقیدے یا نظریے کی اس تفریق کے باوجود ایک ہو جائیں گے، بالکل بے تکی بات اور خیالی پلاؤ پکانے کے مترادف ہے، خاص طور پر جب اس فکر یا عقیدے کا اثر اس کے حامل کی عملی زندگی پر ایک خاص طرزِ عمل کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی عقیدہ مواخات کے عمل میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عقیدے نے تقویٰ اور عملِ صالح کے سوا تمام امتیازات مٹا کر مسلم معاشرے کے سب انسانوں کو اللہ کا عبادت گزار بنا دیا تھا۔[1]

خود قرآن کریم نے ابنائے امت کے مابین اخوت اور بھائی چارے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝﴾

"اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ رہو اور تم اپنے آپ پر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے احسان سے بھائی (بھائی) بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، پھر اس نے تمھیں اس میں گرنے سے بچا لیا، اللہ تعالیٰ اسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتیں بیان کرتا ہے۔ شاید کہ تم ہدایت پاؤ۔"[2]

[1] فقه السيرة للبوطي، ص: 219. [2] آل عمرٰن 3:103.

ایک اور موقع پر فرمایا:

﴿وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۚ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

''اور اس نے ان (مومنوں) کے دلوں میں الفت ڈال دی اگر آپ دنیا بھر کے سب خزانے خرچ کر دیتے تب بھی ان کے دلوں میں (باہمی) الفت پیدا نہ کر سکتے تھے لیکن اللہ ہی نے ان (کے قلوب) میں الفت ڈالی۔ بے شک وہ زبردست (اور) خوب حکمت والا ہے۔'' [1]

ان آیات میں عام طور پر قائم ہونے والی مواخات کا تذکرہ تھا۔ مدنی دور میں قائم ہونے والی مواخات خاص نوعیت کی تھی جو شرعی حکم کے تحت تھی اور اس کے نتیجے میں اہل ایمان پر کچھ حقوق و فرائض عائد ہوئے جن کی اہمیت تمام مسلمانوں کے عام حقوق و فرائض سے کہیں زیادہ تھی۔ [2]

اسلامی تعلیمات کے مطابق تمام اہلِ ایمان ایک دوسرے کے دوست اور بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ عالی ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝﴾

''مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں، لہٰذا تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' [3]

اسلام انتہائی پاکیزہ اور مقدس مذہب ہے، یہ دو روئی کو پسند نہیں کرتا۔ دل میں ایمان بھی ہو اور مشرکین اور یہود و نصاریٰ سے تعلقات بھی، اسلام میں اس کی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد صحابۂ کرام نے اپنے مشرک اور کافر خونی رشتوں اور دوستانہ تعلقات کو ہیچ سمجھا اور اپنے اہل ایمان بھائیوں کو اپنا حقیقی رشتے دار سمجھا۔ قرآن مجید نے اہل ایمان کی کافروں سے دوستی و رشتہ داری کی بڑی قباحت بیان کی اور اسے ظلم قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾

''اے مومنو! اگر تمھارے باپ اور بھائی ایمان کے بجائے کفر کو پسند کریں تو تم (ہرگز) انھیں دوست نہ بناؤ اور تم میں سے جو ان کو دوست بنائیں گے، وہی لوگ ظالم ہیں۔'' [4]

[1] الأنفال 63:8. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 240/1. [3] الحجرٰت 10:49. [4] التوبة 23:9.

اس آیت میں اہل ایمان کے لیے کفار کی طرف قلبی میلان رکھنے کا حکم امتناعی جاری کیا گیا ہے۔ دوسری طرف خاص طور پر اہلِ کتاب کی اطاعت، ان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے اور ان کی طرف میلان رکھنے سے بھی روکا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ ٱلْيَهُودَ وَٱلنَّصَٰرَىٰٓ أَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُۥ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّٰلِمِينَ ۝﴾

''اے مومنو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو بھی ان سے دوستی رکھے گا تو وہ بے شک انھی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''[1]

سید قطب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''ہر چند سابقہ آیت میں خطاب مدنی مسلمانوں سے ہے لیکن یہ خطاب درحقیقت بیک وقت قیامت تک دنیا کے تمام کونوں میں بسنے والے ہر مسلمان کے لیے ہے۔ جب یہ حکم نازل ہوا تو اہل ایمان کو اس علیحدگی کی فوری ضرورت تھی کیونکہ مسلمان یہود و نصاریٰ سے گھل مل کر رہتے تھے اور ان کے آپس میں دوستی، تعاون، تجارت اور ہمسائیگی کے تعلقات تھے جو زمانۂ قدیم سے استوار چلے آ رہے تھے، خاص طور پر عربوں اور یہود کے باہمی تعلقات ایک مسلّمہ معمول کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ ایسے حالات میں یہود کو بآسانی موقع ملتا تھا کہ وہ دینِ حق کے خلاف سازشوں کا جال بچھانے میں اپنا مکارانہ کردار ادا کریں۔ مسلمانوں کے لیے قرآن کریم کا پیغام یہ تھا کہ وہ نئے معاشرے کی تشکیل میں عقیدۂ توحید پر قائم رہیں اور اہلِ کفر سے مکمل طور پر علیحدگی اختیار کریں۔

ایک سچے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ اور دیگر کفار کے معاملے میں اخلاقی اقدار کو ملحوظ خاطر رکھے لیکن اس کے قلبی رجحانات صرف اللہ، اس کے رسول اور اہلِ ایمان ہی کی طرف ہونے چاہئیں۔ مسلمانوں میں نسل در نسل یہ شعور مسلسل اجاگر رہنا چاہیے اور علیحدگی و امتیاز قائم کرنے کی تحریک ہر علاقے میں اٹھنی چاہیے۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے منافقین سے دوستانہ تعلقات رکھنے کی بھی ممانعت فرمائی ہے۔ یہ طبقہ اللہ کے دین کا دشمن اور کفار کا دلی دوست ہوتا ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿بَشِّرِ ٱلْمُنَٰفِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ ٱلَّذِينَ يَتَّخِذُونَ ٱلْكَٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِن دُونِ ٱلْمُؤْمِنِينَ ۚ أَيَبْتَغُونَ عِندَهُمُ ٱلْعِزَّةَ فَإِنَّ ٱلْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۝﴾

[1] المآئدة 5:51. [2] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 911/2.

''(اے نبی!) منافقوں کو خبردار کر دیجیے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے، جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کافروں کے ہاں عزت تلاش کرتے ہیں؟ بے شک عزت تو ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔'' [1]

کفار و منافقین سے محض رشتہ ناتہ توڑنے ہی کا حکم نہیں بلکہ ان سے جہاد و قتال کا بھی حکم ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ وہ دوزخ کا ایندھن ہیں:

﴿يَآيُّهَا النَّبِيُّ جٰهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۗ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۝﴾

''اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے اور ان کا (اصل) ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ لوٹ کر جانے کی بدترین جگہ ہے۔'' [2]

اسلام نے مومنین کے لیے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کا ایک مثالی معیار مقرر کر دیا ہے اور وضاحت سے بتایا ہے کہ اہل ایمان کو کیسے لوگ دوست بنانے چاہئیں، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۝ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۝﴾

''تمھارے دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکاۃ دیتے ہیں اور وہ رکوع کرنے والے ہیں۔ اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول اور ان لوگوں سے دوستی رکھتا ہے جو ایمان لائے ہیں تو (وہ اللہ کا گروہ ہیں اور) یقیناً اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔'' [3]

ہمارے مقدس احسن الخالقین نے انسان کی آنکھیں بالطبع حُسن کی طلبگار اور دل تمنا آشنا بنایا ہے۔ اسلام نے ان جمالیاتی تقاضوں کی تکمیل کا نہایت حسین اہتمام کیا ہے۔ اسلام کی پہلی تعلیم ہی یہ ہے کہ ہر مسلمان کے دل کو ہر آن ہر گھڑی صرف اللہ رب العزت ہی کی رضا کا طلبگار رہنا چاہیے اور اس کی آنکھوں کو صرف حسنِ سیرت کے شہ پارے دیکھنے اور اپنے عمل میں سمونے چاہئیں۔ اس دنیا میں سیرت کے حُسن سے بڑھ کر اور کوئی خوبصورتی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے فیضانِ تربیت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حُسنِ فکر اور اعمالِ صالحہ کی دلربائیوں کے ایسے جیتے جاگتے نمونہ بن گئے تھے جس کی کوئی مثال پیشتر کے کسی ماضی میں نظر آتی ہے نہ آیندہ کبھی دکھائی دینے کا کوئی امکان ہے۔ افسوس! ان بے حِس دلوں پر جو رُوح کی پاکیزگی اور فکر و عمل کے بے مثل حُسن سے بھی متاثر نہ

[1] النسآء 4:138،139. [2] التوبة 9:73. [3] المآئدة 5:55،56.

ہوں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی بے داغ سیرت کی ساری خوبصورتیاں نمایاں کر دیں لیکن مشرکین مکہ اس قدر سیاہ باطن اور شقی القلب تھے کہ وہ عمل کی طہارت اور فکر کے جمال سے بھی متاثر نہ ہو سکے۔ بلکہ الٹا انھوں نے ان نفوسِ قدسیہ کو اتنا ستایا کہ انھیں اپنا سب کچھ قربان کر کے ہجرت کرنی پڑی۔ جب سوختہ ساماں مہاجرین کا یہ گروہ مدینہ منورہ پہنچا تو انھوں نے اہلِ مدینہ کو اپنے استقبال کے لیے ماہیِ بے آب کی طرح بے چین پایا جو دنیا میں انصار کا لقب پا کر زندۂ جاوید ہو گئے اور آخرت میں اعلیٰ و ارفع مقام پا گئے۔ یہ اپنے مہاجرین بھائیوں کے ساتھ شیر و شکر کی طرح رشتہ مواخات میں جڑ گئے اور اپنے ایثار سے ایسے حُسنِ معاشرت کا مظاہرہ کیا کہ مدینہ منورہ اسلامی معاشرے کا مثالی نمونہ بن گیا۔ اس محبت، بھائی چارے اور جاں سپاری کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے انتہائی رحیم و شفیق بھائی بن گئے۔ اس حقیقت کی منظر کشی قرآن کریم نے یوں کی ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر بہت سخت ہیں اور آپس میں نہایت مہربان۔"[1]

علامہ اقبال رحمہ اللہ نے اصحاب رسول کی اس باہمی محبت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

قرآنِ کریم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ تصویر پیش کر کے گویا اس امر کا اعلان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں عزت بخشی ہے۔ وہ کافروں کے لیے سخت ہیں، چاہے کافروں کی صفوں میں خود ان کے آباء ان کے بھائی اور ان کی اولاد ہی کیوں نہ موجود ہو۔ اخوت کی جو منظر کشی اس آیت میں کی گئی ہے، درحقیقت وہی دینی اخوت کی اصلی تفسیر ہے۔

دینی اخوت کے اسی مستحکم جذبے نے مسلمانوں کو بڑے سے بڑے چیلنج کا مقابلہ کرنے کی ہمت عطا کی۔ دینی بھائی چارے کے احساس ہی نے مسلمانوں کی صفوں کو بنیان مرصوص بنا دیا۔ یکجہتی کا یہ خوشگوار احساس ان کی قوت و سطوت میں اضافے کا باعث بنا اور اسی کے سبب سے انھیں سب پر غلبہ اور بالادستی حاصل ہو گئی۔[2]

تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نیکی کے کام میں باہمی مدد کی تفسیر، پوری دنیا کے لیے مشعل راہ، اخلاق و کردار کے مجسم مینارۂ نور اور عدل و انصاف کی عملی تصویر بن گئے۔ ان کے قائم کردہ معاشرے میں ہر بڑا چھوٹے پر نظرِ عنایت کر رہا تھا، ہر غنی فقیر پر جود و سخا کے دریا بہا رہا تھا اور ہر قوی ضعیف کا دست و بازو بن گیا تھا۔

[1] الفتح 29:48. [2] شرح رسالة التعليم للدكتور محمد عبد الله الخطيب، ص: 296.

تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم شب و روز درسگاہِ نبوت سے فیض یاب ہوتے تھے اور تعلیمات رسالت کے فروغ کے لیے ہر آن کمر بستہ رہتے تھے۔ اسلامی اخوت نے تمام مسلمانوں کو برابر کر دیا۔ مسلمانوں کے معاشرے میں معلم دین اور ہادیِ قوم ہونا نہ کسی خاندان کے لیے مخصوص تھا، نہ کسی گھرانے تک محدود بلکہ ہر مسلمان اپنے علم کی حد تک معلم اور اپنے جہل کے درجے تک متعلم تھا۔ جس طرح جاہل کے لیے سیکھنا فرض تھا، اسی طرح عالم کے لیے سکھانا فرض ٹھہرا۔

حالت یہ ہوگئی کہ اس مثالی معاشرے کے تمام افراد ایک دوسرے پر جان نچھاور کرنے لگے۔ ایک دوسرے کے معاون و مددگار بن گئے، کیا چھوٹا کیا بڑا، سب ایک ہی شعور و آگہی کے راستے کے راہی بن گئے۔ وہ ایک دوسرے کے لیے سب کچھ قربان کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ ایک فرد کی قوت پوری جماعت کی قوت کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتی تھی۔ ایک کی کمزوری کے ازالے کے لیے پوری جماعت سرگرم عمل ہو جاتی تھی۔ جو بے وزن تھا، وہ اپنے بھائیوں سے مل کر بھاری ہوگیا۔ اس محبت و مودت نے شرافت و سخاوت، دولت و ثروت، رسم و رواج، لباس، وضع قطع، طور طریقے، تجارت، ہنرمندی، غرضیکہ تمام تمدنی خوبیوں میں مساوات قائم کر دی۔ دین اسلام اور مواخاتِ مدینہ کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کے سب تعلقات ہیچ ہیں۔ اسلام دنیاوی خوشیوں کو مکدر نہیں بلکہ دنیاوی رنج اور خوشی دونوں کو انسان کی نظر میں حقیر اور ناچیز کر دیتا ہے۔ جو شخص غصے کو پی جائے، انتقام نہ لے، جھوٹ نہ بولے، غیبت نہ کرے، حریص نہ ہو، طمع نہ کرے، جابر و سخت گیر نہ ہو، ممسک و بخیل نہ ہو، مغرور و متکبر نہ ہو، نہ کسی سے لڑے نہ جھگڑے، نہ کسی سے حسد کرے، نہ کسی کو دیکھ کر جلے، عافیت میں شاکر، مصیبت میں صابر، ہنس مکھ، بردبار، متحمل، متواضع، منکسر، مستغنی، نفس پر ضابط، قانع، سیر چشم، متوکل اور ثواب و عاقبت کا امیدوار ہو، دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی خوش بخت اور کامیاب انسان نہیں ہوسکتا۔ مواخاتِ مدینہ نے ہر مسلمان کو ایسا ہی معیاری اور محترم مسلمان بنا دیا۔

معاشرے کی ایسی انفرادی اور اجتماعی خوبیاں روئے زمین کے کسی خطے اور دین اسلام کے علاوہ کسی اور دین میں پانا ناممکن ہے۔ اسلام کی برکت سے معاشرے میں امن و سکون اور تحفظ و آزادی کی جو فضا میسر آئی، کسی دوسرے معاشرے میں اس کی ایک جھلک بھی نہیں ملتی۔

اسی اخوت کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن کریم میں یوں بیان فرمایا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ ''مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں۔''[1] اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے کہ نہ قبیلے کا فرق ہو، نہ علاقائی حدود حائل

[1] الحجرٰت 10:49۔

سیدنا بلال حبشی اور سیدنا عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے منسوب قبریں

ہوں اور نہ رنگ و نسل سے فرق پڑے۔ سلمان فارسی، بلال حبشی اور صہیب رومی رضی اللہ عنہم کو عرب میں کیا درجہ ملا اور کیسے کیسے حقوق ملے! یہی اصل حقوقِ انسانی اور معراج مواخات ہے۔

اخوت کے حقوق

مواخات کی اہمیت نے اسلام میں حقوق و واجبات طے کر دیے ہیں۔ ہر انسان کے لیے ان مثالی حقوق و واجبات کی پاسداری کرنی ضروری ہے۔ دین اسلام انھیں فرائض میں شامل کرتا ہے۔ اس اخوت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت گنواتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾

”اور تم اپنے آپ پر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے احسان سے بھائی (بھائی) بن گئے۔“[1]

اسی کی مثال دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سورۂ حشر میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾

”اور (ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین کے مدینہ آنے) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے، اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو۔“[2]

اس اخوت و مساوات کا ایک اصول یہ بیان کیا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ﴾

[1] آل عمران 3:103۔ [2] الحشر 59:9۔

''اے ایمان والو! مردوں کی کوئی جماعت دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائے، ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا (مذاق اڑائیں) ہوسکتا ہے کہ وہ (عورتیں) ان سے بہتر ہوں۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے اس باہمی محبت ومودت کو پروان چڑھانے کے لیے مزید رہنمائی فرمائی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾

''اور تم آپس میں (ایک دوسرے پر) عیب نہ لگاؤ، نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارو، ایمان (لانے) کے بعد فاسقانہ نام (سے پکارنا) برا ہے اور جنھوں نے توبہ نہ کی، وہی (لوگ) ظالم ہیں۔''[2]

معاشرے کا امن، اصلاح اور فلاح اخوت ومساوات میں مضمر ہے۔ اس تعلق کو مضبوط بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''اے ایمان والو! بہت سی بدگمانیوں سے بچو، بلاشبہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں اور تم ایک دوسرے کی جاسوسی نہ کرو اور نہ تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے تو (ظاہر ہے کہ) تم اسے ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا (اور) نہایت رحم فرمانے والا ہے۔''[3]

نبی ﷺ نے معاشرتی برائیوں کو واضح کرتے ہوئے ان سے اجتناب کرنے کی تلقین فرمائی اور ایسی جامع اور مؤثر رہنمائی فرمائی جو ہمیشہ ہر دور میں ہر معاشرے کی اصلاح کی ضامن رہے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَنَاجَشُوا، وَلَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ، وَكُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ! إِخْوَانًا، اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ، وَلَا يَخْذُلُهُ، وَلَا يَحْقِرُهُ، اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا» وَيُشِيرُ إِلٰى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مِرَارٍ: «بِحَسْبِ امْرِیءٍ مِّنَ الشَّرِّ أَنْ يَّحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ»

[1] الحجرٰت 11:49. [2] الحجرٰت 11:49. [3] الحجرٰت 12:49.

''تم ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، نہ دھوکہ دو، نہ بغض رکھو، نہ آپس میں دشمنی کرو اور نہ تم میں سے کوئی ایک بھائی کی خرید و فروخت پر اپنی خرید و فروخت کرے، اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر ظلم کرے، نہ اسے رسوا کرے، نہ اسے حقیر سمجھے۔ تقویٰ اور پرہیز گاری یہاں ہے۔ (یہ بات کہتے ہوئے) آپ ﷺ نے اپنے سینے کی طرف تین بار اشارہ فرمایا۔ کسی آدمی کی بُرائی کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ اپنے بھائی کو حقیر سمجھے، ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر خون، اس کا مال اور اس کی عزت (پامال کرنا) حرام ہے۔'' [1]

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ، وَمَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ، كَانَ اللّٰهُ فِي حَاجَتِهِ، وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً، فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ اس پر ظلم نہ کرے، نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑے۔ جو اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے، اللہ اس کی ضرورت پوری کرتا ہے اور جو مسلمان اپنے بھائی کو کسی مشکل سے نکالتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے روز قیامت کی مشکلات میں سے کسی مشکل سے نکالے گا اور جو اپنے بھائی کے عیبوں پر پردہ ڈالے گا، اللہ قیامت کے دن اس کے عیبوں پر پردہ ڈالے گا۔'' [2]

جب بھی کوئی جھگڑا ہو جائے یا باہمی یگانگت میں رخنے پڑنے شروع ہو جائیں تو اس کی اصلاح کا آپ ﷺ نے ایک تیر بہدف طریقہ بیان فرمایا:

«أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلَ مِنْ دَرَجَةِ الصِّيَامِ وَالصَّلَاةِ وَالصَّدَقَةِ؟» قَالُوا: بَلٰى يَارَسُولَ اللّٰهِ! قَالَ: «إِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ، وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ الْحَالِقَةُ»

''کیا میں تمھیں روزوں، نمازوں اور صدقات سے بھی افضل عمل نہ بتاؤں؟'' صحابہ کہنے لگے: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا: ''(وہ عمل) آپس کے میل جول اور روابط کو بہتر بنانا ہے (اور اس کے برعکس) آپس کے میل جول میں پھوٹ ڈالنا (دین کو) مونڈ دینے والی خصلت ہے۔'' [3]

---

[1] صحيح مسلم :2564، مسند أحمد :277/2. [2] صحيح البخاري :2442، صحيح مسلم :2580. [3] سنن أبي داود: 4919.

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معاشرے کا فساد ختم کرنے کی غرض سے کسی خلاف حقیقت بات کہنے کو بھی جھوٹ نہیں بتلایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِي يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ، فَيَنْمِي خَيْرًا أَوْ يَقُولُ خَيْرًا»

''وہ شخص جھوٹا نہیں جو لوگوں کے درمیان صلح کرائے، وہ شخص کوئی اچھی بات پہنچائے یا اس سلسلے میں کوئی اچھی بات کہے۔''[1]

فی الجملہ دین اسلام نے معاشرے کی اصلاح اور ترقی کے لیے اتنے دلکش اور مؤثر فلاحی اصول وضع فرما دیے ہیں جو اخوت و مودت کی اساس ہیں۔ اگر ان فرامین پر عمل کیا جائے تو ہر شخص اپنی مشکلات پر آسانی سے قابو پا سکتا ہے۔

اہل مکہ اسلام کے بدترین دشمن تھے۔ وہ مسلمانوں کو جان سے مار دینے کے درپے رہے یہاں تک کہ انھوں نے رہبرِ انسانیت حضرت محمد ﷺ کو قتل کرنے کے لیے بھی طرح طرح کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کیے اور مظلوم و مقہور مسلمانوں پر اس قدر ظلم و ستم ڈھائے کہ لاقانونیت کی وجہ سے ہر فرد مشکل اوقات میں اپنے قبیلے کی پناہ لینے پر مجبور تھا۔ اگر کسی مسلمان کا قبیلہ اس کی حمایت و امداد سے دست بردار ہو جاتا تھا تو وہ کہیں سے بھی کوئی مدد نہ پا سکتا تھا اور اپنے قبیلے کی مدد کے بغیر وہ اس جاہلی معاشرے میں باعزت زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نبی معظم ﷺ سے اپنے جاں نثار ساتھیوں کی یہ بے بسی اور بے کسی نہ دیکھی جاتی تھی۔ اس لیے آپ ﷺ نے ضرورت محسوس کی کہ ایسا معاشرہ تشکیل دیا جائے جس کی بنیاد عقیدۂ توحید اور دین حنیف پر استوار ہو اور ہر طرح کی ذات پات، امیری غریبی اور رنگ و نسل کے امتیازات مٹ جائیں۔

بلاذری لکھتے ہیں: نبی مکرم ﷺ نے مہاجرین کے درمیان اس بنیاد پر نظام مواخات قائم فرمایا کہ وہ حق کی پاسداری کے لیے ایک دوسرے کے معاون ہوں گے، چنانچہ جن مہاجر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان مواخات قائم کی گئی، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

حضرت حمزہ اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما۔

حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما۔

حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما۔

[1] صحيح البخاري: 2692.

جوارِ رسول میں سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر ؓ کی آخری آرام گاہ

حضرت زبیر بن عوام اور حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ۔

حضرت عبیدہ بن حارث اور حضرت بلال حبشی ؓ۔

حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ۔

حضرت ابوعبیدہ بن جراح اور حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ ؓ۔

حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل اور حضرت طلحہ بن عبیداللہ ؓ۔

سیدنا عثمان ؓ کا مرقد (البقیع)

خود حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی ؓ سے رشتہ مواخات مستحکم فرمایا۔[1]

امام ابن قیم اور حافظ ابن کثیر ؒ کے مطابق مہاجرین مکہ کے مابین مواخات قائم نہیں کی گئی۔ امام ابن قیم فرماتے ہیں: کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین مکہ کے درمیان مواخات قائم کی تھی اور

[1] أنساب الأشراف: 318/1.

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا مواخاتی بھائی بنایا تھا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مدینہ منورہ میں مواخات قائم کی گئی

مدینہ منورہ میں سیدنا علی بن ابی طالب کی طرف منسوب مسجد

کیونکہ مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم کرنے کی ضرورت تھی، تاہم مہاجرین مکہ کی آپس میں مواخات کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ان کے درمیان تو اخوت اسلام کا عام رشتہ قائم تھا اور ان کے درمیان ان کی باہمی قرابت داری بھی موجود تھی۔ مزید برآں وہ ایک ہی شہر کے باسی تھے جبکہ مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کرنے کی واقعی ضرورت تھی۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے بقول بعض اہل علم مہاجرین کی مواخات کا انکار کرتے ہیں۔ اس کی انھوں نے وہی وجہ بیان کی ہے جو حافظ ابن قیم نے ذکر کی ہے۔[2]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مہاجرین کے مابین مواخات کا انکار کرتے ہیں، بالخصوص نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مابین مؤاخات کو تسلیم نہیں کرتے کیونکہ مؤاخات کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کا خیال رکھیں اور باہم محبت سے پیش آئیں۔ یہی سبب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے کسی صحابی کے درمیان، یا باہم مہاجرین کے مابین مواخات قائم کرنے کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔[3]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ ایک نص کی تردید ہے جس کی بنیاد قیاس پر رکھی گئی ہے۔ اس روایت کو رد کرنے سے مواخات کی حکمت نظر انداز ہوجاتی ہے۔ بہت سے مہاجر ایسے تھے جو دوسرے مہاجر بھائیوں کے

[1] زادالمعاد:3/64,63. [2] البداية والنهاية :3/226، السيرة النبوية للصلابي :1/542. [3] دیکھیے: منهاج السنة النبوية : 7/358-364.

مقابلے میں دولت، قبائلی تعلق اور جسمانی قوت کے لحاظ سے زیادہ مضبوط تھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک کمزور اور ایک طاقتور کے درمیان مواخات قائم کردی تاکہ وہ ایک دوسرے کی مدد کرسکیں۔ اسی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کس بنا پر اپنے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے درمیان مواخات قائم کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے بعثت سے پہلے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اُن کے عہد طفولیت ہی سے اپنی کفالت میں لے لیا تھا، اسی زمانے سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ مسلسل آپ ﷺ کی سرپرستی میں رہ رہے تھے۔ اسی طرح حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے درمیان مواخات قائم ہوئی۔ دونوں اصحاب کے درمیان مواخات ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور یہ دونوں اصحاب مہاجر تھے۔[1]

زیادہ قرین قیاس بات یہی ہے کہ مہاجرین کی مواخات مکہ کے بجائے مدینہ میں ہوئی تھی جیسا کہ مستدرک حاکم کی روایت میں صراحت ہے۔[2] بلاذری کے انداز سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مہاجرین کی مواخات مدینہ ہی میں ہوئی تھی اور یہ ان میں باہمی وارث ہونے کے اعتبار سے تھی۔[3]

مہاجرین کے لیے انصار کے تمام تر مالی ایثار اور فیاضی کے باوجود ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک ایسا نظام قائم کر دیا جائے جس میں مہاجرین کو قانونی طور پر ایک باعزت مقام حاصل ہو جائے۔ بالخصوص مہاجرین کا مرتبہ اس بات کا متقاضی تھا کہ ان کے مسائل اس طرح حل کیے جائیں کہ وہ خود کو انصار پر بوجھ نہ سمجھیں۔ بنابریں مواخات کے نظام کو ایک قانونی حیثیت دے دی گئی۔

مواخات کو قانونی حیثیت دینے کے بارے میں روایات میں معمولی اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم تمام راوی اس بات پر متفق ہیں کہ یہ قانون سازی ہجرت کے پہلے برس ہی عمل میں آگئی تھی۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ کیا یہ قانون تعمیر مسجد نبوی کے دوران بنایا گیا یا اس کے بعد نافذ کیا گیا۔ ابن عبدالبر کا خیال ہے کہ ہجرت کے پانچویں مہینے میں اس نظام کو قانونی حیثیت دی گئی۔ ابن سعد اسے غزوۂ بدر سے پہلے متعین کرتے ہیں، تاہم وہ بھی کسی تاریخ کا تعین نہیں کرتے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے مہاجرین و انصار کے درمیان ہمارے گھر میں مواخات قائم کی۔ بلاذری کہتے ہیں: مہاجرین میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کو رسول اللہ ﷺ نے کسی انصاری کے ساتھ رشتۂ مواخات میں منسلک نہ کیا ہو۔

[1] فتح الباري :339/7. [2] المستدرك للحاكم :14/3، السلسلة الضعيفة :351. [3] أنساب الأشراف :318/1.

مہاجرین اور انصار کے 90 افراد کے درمیان مواخات قائم کی گئی، ان میں 45 مہاجرین اور 45 انصار تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ رشتۂ مواخات میں منسلک ہونے والے مہاجرین وانصار کی تعداد سو تھی۔

نبی ﷺ نے فرمایا: ''آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔'' اس کے بعد نبی ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: یہ میرا بھائی ہے۔[1] اس کے علاوہ سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب، جو اللہ اور اس کے رسول کے شیر اور رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے، اور زید بن حارثہ کو، جو رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے، سابقہ اخوت پر برقرار رکھا۔ یہ دونوں مہاجرین تھے۔[2]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: انصار نبی ﷺ سے کہنے لگے: ہمارے اور مہاجرین کے درمیان تمام نخلستان تقسیم کر دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! نخلستانوں کی ملکیت اور محنت کا انتظام آپ اپنے ہاتھ میں رکھیں، ہمیں پھلوں میں شریک کرلیں۔'' انصار کہنے لگے: سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا ''ہم نے سن لیا اور ہم مطیع ہو گئے۔''[3]

عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ إِخْوَانَكُمْ قَدْ تَرَكُوا الْأَمْوَالَ وَالْأَوْلَادَ وَخَرَجُوا إِلَيْكُمْ» فَقَالُوا: أَمْوَالُنَا بَيْنَهُمْ قَطَائِعُ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «أَوْ غَيْرُ ذٰلِكَ» قَالُوا: وَمَا ذَاكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: «هُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْرِفُونَ الْعَمَلَ فَتَكْفُونَهُمْ وَتُقَاسِمُونَهُمُ الثَّمَرَ» قَالُوا: نَعَمْ.

''تمھارے بھائی مال اور اولاد چھوڑ کر تمھاری طرف آئے ہیں۔'' انصار کہنے لگے: ہمارا مال ہمارے اور ان کے درمیان تقسیم فرما دیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس کے علاوہ بھی ایک حل ہو سکتا ہے۔'' انصار نے پوچھا: اللہ کے رسول! وہ کیا ہو سکتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ ایسے لوگ ہیں جو (کاشتکاری) نہیں جانتے، تم انھیں کام میں شریک کرو اور پھل آپس میں تقسیم کرلو۔'' وہ کہنے لگے: ہم ایسا ہی کریں گے۔''[4]

اب ذیل میں اُن مہاجرین وانصار کے اسمائے گرامی درج کیے جاتے ہیں جو باہم بھائی بھائی بنائے گئے:

اسمائے مہاجرین	اسمائے انصار
جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (یہ اس وقت حبشہ میں تھے۔)	معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	خارجہ بن زہیر رضی اللہ عنہ

[1] [ضعيف] السيرة لابن هشام (محقق): 130/2. [2] فتح الباري: 339,338/7. [3] صحيح البخاري: 2325. [4] السيرة النبوية لابن كثير، ص: 228، تفسير الطبري، الحشر 9:59.

عمر بن خطاب ؓ — عتبان بن مالک ؓ

ابوعبیدہ بن عبداللہ بن جراح ؓ، ان کا نام عامر بن عبداللہ تھا۔ — سعد بن معاذ بن نعمان ؓ

عبدالرحمٰن بن عوف ؓ — سعد بن ربیع ؓ

زبیر بن عوام ؓ — سلمہ بن سلامہ بن وقش ؓ۔ بعض کہتے ہیں کہ زبیر بن عوام کا بھائی عبداللہ بن مسعود ؓ کو بنایا گیا تھا۔

عثمان بن عفان ؓ — اوس بن ثابت بن منذر ؓ

طلحہ بن عبیداللہ ؓ — کعب بن مالک ؓ

سعید بن زید بن عمرو بن نفیل ؓ — ابیّ بن کعب ؓ

مصعب بن عمیر بن ہاشم ؓ — ابوایوب خالد بن زید ؓ

ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ ؓ — عباد بن بشر بن وقش ؓ

عمار بن یاسر ؓ — حذیفہ بن یمان یا ثابت بن قیس بن شماس ؓ

ابوذر بریر یا جندب بن جنادہ غفاری ؓ — منذر بن عمر المُعنق ؓ

حاطب بن ابی بلتعہ ؓ — عویم بن ساعدہ ؓ

سلمان فارسی ؓ — ابوالدرداء ؓ

بلال ؓ — ابورویحہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن الخثعمی ؓ [1]

سعد بن ابی وقاص ؓ — محمد بن مسلمہ ؓ

عبداللہ بن مسعود ؓ — سہل بن حنیف ؓ

عبداللہ بن جحش ؓ — عاصم بن ثابت بن ابی الاقلح ؓ

عبیدہ بن حارث بن مطلب ؓ — عمیر بن حُمام ؓ

طفیل بن حارث ؓ — سفیان بن نسر ؓ

حصین بن حارث ؓ — عبداللہ بن جبیر ؓ

عثمان بن مظعون ؓ — عباس بن عبادہ بن نضلہ ؓ

[1] السیرۃ لابن ہشام: 2/505-507، السیرۃ النبویۃ لابن کثیر، ص: 227,226.

عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ	معاذ بن ماعص رضی اللہ عنہ
صفوان بن وہب رضی اللہ عنہ	رافع بن معلّٰی رضی اللہ عنہ
مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ	عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ
ذو الشمالین رضی اللہ عنہ	یزید بن حارث رضی اللہ عنہ
ابوسلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ	سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ
عامر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ	خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ
عبداللہ بن مظعون رضی اللہ عنہ	قُطبہ بن عامر رضی اللہ عنہ
شماس بن عثمان رضی اللہ عنہ	حنظلہ بن ابی عامر رضی اللہ عنہ
ارقم بن ابی الارقم رضی اللہ عنہ	ابوطلحہ بن زید بن سہل رضی اللہ عنہ
زید بن الخطاب رضی اللہ عنہ	معن بن عدی رضی اللہ عنہ
عمرو بن سراقہ رضی اللہ عنہ	سعد بن زید الاشہلی رضی اللہ عنہ
عاقل بن بکیر رضی اللہ عنہ	مبشر بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ
عبداللہ بن مخرمہ رضی اللہ عنہ	فروہ بن عمرو البیاضی رضی اللہ عنہ
خنیس ابن حذافہ رضی اللہ عنہ	منذر بن محمد بن عقبہ رضی اللہ عنہ
ابوسبرہ بن ابورہم رضی اللہ عنہ	عبادہ بن خشخاش رضی اللہ عنہ
مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ	زید بن المُزَیّن رضی اللہ عنہ
ابومرثد غَنَوی رضی اللہ عنہ	عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ
عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ	مُجذّر بن زیاد رضی اللہ عنہ
عامر بن فُہیرہ رضی اللہ عنہ	حارث بن صمّۃ رضی اللہ عنہ
مِہجع مولیٰ عمر رضی اللہ عنہ	سُراقہ بن عمرو بن عطیہ رضی اللہ عنہ [1]

مہاجرین وانصار کی اس فہرست میں کہیں کہیں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مہاجر مذکورہ انصاری کے علاوہ کسی اور انصاری کے ساتھ بھائی چارے میں منسلک بتائے گئے ہیں۔ ابن جوزی نے اس فہرست کے علاوہ بھی کئی

[1] سبل الہدیٰ والرشاد: 367,366/3.

اصحاب کی مواخات کا تذکرہ کیا ہے۔[1] مقریزی نے ان جوڑیوں کی تعداد 186 بتائی ہے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ بعض جوڑیوں کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: جعفر بن ابی طالب اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کی مواخات کے بارے میں غور وفکر کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ ابن ہشام نے کہا ہے کہ جعفر رضی اللہ عنہ فتح خیبر کے سال مدینہ تشریف لائے تھے جبکہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بہت پہلے پیش ہو چکے تھے۔ مہاجرین کو اپنا جوڑی بند ساتھی بنانے کے لیے انصار میں مقابلہ بھی پایا جاتا تھا۔ انصار مہاجرین کی آباد کاری کے اس حد تک متمنی و مشتاق تھے کہ مہاجرین کو اپنانے کے لیے بعض دفعہ قرعہ اندازی کی نوبت بھی آ گئی جیسا کہ صحیح بخاری میں عبداللہ بن مظعون رضی اللہ عنہ کے حوالے سے مذکور ہے کہ انھیں بذریعہ قرعہ منتخب کیا گیا۔[3]

اسی طرح ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جوڑی امام احمد اور امام مسلم رحمہ اللہ کی اس روایت کے خلاف ہے جسے انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوعبیدہ بن جراح اور ابوطلحہ رضی اللہ عنہما کے درمیان مواخات قائم کی تھی۔[4] یہ ابن اسحاق کی مذکورہ روایت سے زیادہ معتبر ہے۔[5] واللہ اعلم.

مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کے قیام کے لیے جو قانون بنایا گیا، اس کے نتیجے میں باہم بھائی بھائی بننے والے ہر دو افراد کو ایک دوسرے کے اوپر خاص حقوق حاصل ہو گئے، جن میں سے ایک یہ تھا کہ وہ باہم معاونت کریں گے جو کسی خاص معاملے تک محدود نہ ہوگی بلکہ زندگی کے ہر مرحلے اور تمام نشیب و فراز میں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط رہیں گے۔ رُوحانی اور مادی مسائل بھی وہ یک جان ہو کر حل کریں گے یہاں تک کہ مواخات کے نظام میں یہ امر بھی شامل تھا کہ دو افراد جو آپس میں بھائی قرار دیے گئے ہیں، قطع نظر دیگر رشتہ داروں کے وہ ایک دوسرے کی وراثت کے بھی حقدار ہوں گے۔ ان تمام حقوق نے مواخات کے رشتے کو اتنا مضبوط اور گہرا کر دیا کہ اس کے آگے خونی اور نسلی تعلق بھی ماند پڑ گیا۔

مہاجرین و انصار کے درمیان قائم ہونے والی مواخات کی تقویت کا باعث وہ عقیدہ تھا جس نے انسانیت کو ہزاروں معبودوں کی چوکھٹ سے اُٹھا کر ایک اللہ کی بندگی کی طرف بلایا۔ انھوں نے دل و جان سے اس دعوت پر لبیک کہا اور لات، منات، عُزّیٰ اور دیگر معبودانِ باطلہ کو ٹھوکر مار کر ایک اللہ کے آگے جھک گئے۔ اس دینِ حنیف کا پہلا سبق یہ تھا کہ جو کہو، وہ کر کے بھی دکھاؤ۔ اس دین نے ایمان اور عمل دونوں کو یکجا کرنے کی یکساں تعلیم دی۔ رشتۂ اخوت کی اس مقدس لڑی میں پروئے ہوئے افراد معاشرے میں رائج کھوکھلے نعروں سے کوسوں دور تھے۔ اُن

[1] المنتظم: 3/71-76. [2] تلقيح فهوم أهل الأثر، ص: 50. [3] صحيح البخاري: 1243، 7003. [4] صحيح مسلم: 2528، مسند أحمد: 3/152. [5] السيرة النبوية لابن كثير، ص: 228.

کی حالت وہی تھی جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے:

﴿اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾

''بس مومنوں کی تو بات ہی یہ ہے جب وہ اللہ اوراس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے مابین فیصلہ کرے تو وہ کہتے ہیں: ہم نے سنا اور اطاعت کی اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''[1]

مسلمان جب علم وعمل کی تصویر بنے تو یہ اخوت بڑی مضبوط اور دیرپا ثابت ہوئی اور اس کی بدولت اللہ کے دین اور اس کے نبی ﷺ کو تقویت ملی جس کے مثبت اثرات دعوت دین کے تمام مراحل میں نہایت روشن نظر آئے۔ مواخات کا خوش کن اثر اس وقت بھی ظاہر ہوا جب نبی مکرم ﷺ کی وفات کے بعد سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ چنا گیا تھا۔ انصار کو اُن کے نفوس نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ غلبے اور تسلط کے فطری جذبات اور حکمرانی کی خواہش کے زیر اثر امت کا شیرازہ بکھیرنے کا باعث بنیں، چنانچہ جلد ہی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر مہاجرین و انصار کے دونوں گروہوں کا اتفاق ہو گیا۔

مواخات مدینہ کا عمل ایک عظیم الشان سیاسی و انقلابی سوچ کا نتیجہ تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے مہاجرین و انصار کے دلوں میں الفت ڈال دی اور اُن کے اندر محبت کے جذبات راسخ کر دیے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اس بے مثال بھائی چارے اور الفت و محبت کے سلسلے کو دوام بخشنے کے لیے انتھک محنت کی۔ وہ اس رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

اس عمل میں انصار کا کردار نمایاں طور پر نہایت شاندار اور جاندار تھا جسے بیان کرنے کے لیے سیرت نگاروں نے زبان و بیان کی سحر آفرینیوں سے کیسا ہی فائدہ اٹھایا ہو لیکن وہ اس دلکشی اور جمال آفرینی کو نہیں پا سکے جو اللہ تعالیٰ کے اِس بیانِ ذی شان میں موجود ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ڵ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (الحشر 9:59)

''اور (ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین کی مدینہ تشریف آوری)

[1] النور 51:24۔

سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو بھی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''[1]

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انصار کے حق میں پانچ باتوں کی شہادت دی ہے:

1 انصار کا مہاجرین کی آمد سے پہلے مدینہ میں جگہ بنانا اور ایمان لانا۔

2 مہاجرین کے لیے محبت کے جذبات۔

3 مہاجرین کو جو کچھ دیا جائے، انصار اس کے ضرورت مند نہیں تھے یا ان کے دلوں میں اس سے حسد پیدا نہیں ہوا۔

4 مہاجرین کو اپنی ذات پر ترجیح دینا، چاہے خود تنگی کا سامنا کرنا پڑے۔

5 یہ لوگ اپنے نفوس کے لالچ سے محفوظ رکھے گئے۔ نتیجتاً یہ فلاح پانے والے ہیں۔[2]

﴿مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ میں جس پہل کو انصار کی مدح قرار دیا گیا ہے، اس میں اشارہ تھا کہ وہ مہاجرین کے حقوق پہچانیں جنھوں نے محض اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے لیے اپنے گھربار اور مال ومتاع کی قربانی دی۔ اللہ کے دین اور پیغمبر کی مدد کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ صرف اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے مکہ جیسے قریۂ جمال و جلال کو خیر باد کہا جہاں ان کی آبائی جائیدادیں اور قریبی رشتے دار تھے۔ وہ انصار سے پہلے ایمان لائے اور ان کے ساتھ بلدۂ امن مدینہ میں آ کر رہنے لگے۔ یوں مہاجرین کے لیے ایمان اور مدینہ میں رہائش اختیار کرنے کا عمل پورا ہو گیا۔ پہلے پہل ایمان قبول کرنے کی فضیلت میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔ عقیدۂ توحید کی بنیاد پر قائم ہونے والے بھائی چارے (مواخات) کی عمارت کو انصار نے مدد اور پناہ کے دو مضبوط ستونوں کا سہارا دیا اور انھوں نے اپنی خالص محبت و فدویت کا محور بے سروسامان مہاجرین کو بنالیا۔ ان کی یہ خوبی بیان کرتے ہوئے کہا گیا: ﴿يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ﴾ کہ وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کی طرف آئیں۔ انصار میں یہ خوبی اللہ سے محبت کی وجہ سے پیدا ہوئی جسے اللہ نے ان کی فضیلت اور مہاجرین کے مقابلے میں انصار کا امتیازی وصف قرار دیا۔ مہاجرین کے دل بھی انصار کی محبت سے سرشار تھے اور انصار اخلاصِ محکم سے بہرہ ور تھے جو اللہ کی خاطر محبت کا ثمرہ تھا۔ ان کے متعلق کہا گیا: ﴿وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا﴾ ''اور وہ

[1] هجرة الرسول و صحابته في القرآن والسنة لأحمد عبد الغني، ص:245. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان:2/284.

اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے۔"

﴿ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ ﴾ میں انصار کی مہاجرین سے محبت پر مبنی وصف کی جس احسن پیرائے میں مدح سرائی کی گئی ہے، وہ قیامت تک ہوتی رہے گی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان باللہ کو ہر حال میں حرزِ جان بنائے رکھنا، مال و منال اور گھر بار کی قربانی دینا اور اللہ کی راہ میں بہر صورت نکلنا لازوال فضیلت کے اعمال ہیں جبکہ دنیاوی مال و متاع تو فانی ہے۔

﴿ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا ﴾ میں انصار کی جس محبت اور اخلاص کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ اس خوبی کی وجہ سے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔ یہ اسی محبت کا اثر تھا کہ انھوں نے مہاجرین کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور ایثار کی اعلیٰ مثال قائم کی۔

﴿ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ "اور وہ انھیں اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود ان (انصار) کو سخت ضرورت ہو۔" یہ محبت سے حاصل ہونے والے نتیجے کا بیان ہے۔ یہ محبت ایمان کے چشمے سے جاری ہوئی تھی۔ اس محبت نے انصار کو اتنی بلندی پر فائز کر دیا کہ قدیم و جدید تاریخ میں کوئی بھی اس مقام پر نہ پہنچ سکا۔

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو پچھلی آیت میں سچائی کا اور انصار کو اس آیت میں فلاح و کامیابی کا پروانہ بخشا۔ انصار کی سابقہ صفات کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سے بخیلی کی نفی فرمائی اور انھیں جود و سخا کے عظیم مرتبے پر فائز کر دیا: ﴿ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ "اور جو لوگ اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیے گئے، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"[1]

ایک نکتے کی بات یہ ہے کہ قرآن نے انصار کی تعریف سے پہلے مہاجرین کی تعریف کی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ ﴾

"(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔"[2]

گھر کی فراہمی پر انصار کی تعریف کی اور گھر بار ہی قربان کرنے پر مہاجرین کی مدح و ستائش کی کیونکہ انھوں نے اللہ کے فضل اور اس کی رضا کی تلاش میں گھر گنوایا تھا۔ انھوں نے اللہ کے دین کی مدد کی تو اللہ نے ان کی مدد کی۔

[1] ملخص از محمد رسول اللہ ﷺ (صادق عرجون): 3/94-98. [2] الحشر 8:59.

انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا اور اللہ اور اس کے رسول کی خاطر اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کو دوسروں کے لیے نمونہ بنا دیا اور فرمایا:

﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾

''پھر اگر وہ (اہل کتاب) اس چیز پر ایمان لائیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو یقیناً وہ ہدایت پا جائیں گے۔''[1]

ان غریب الدیار مہاجرین نے اللہ کے رسول کی مدد کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح کرتے ہوئے فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾

''یہی لوگ سچے ہیں۔''[2]

دوسری طرف عام مسلمانوں کو ان کی پیروی کرنے اور ان کی معیت اختیار کرنے کا حکم دیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور سچ بولنے والوں کے ساتھ ہو جاؤ۔''[3]

اسلامی معاشرہ محبت سے سرشار ہوتا ہے

عقیدۂ توحید اور اللہ کے لیے باہمی محبت کی بنیاد پر قائم ہونے والا بھائی چارہ امت مسلمہ کی تعمیر و ترقی میں بڑا نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔[4] یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نئے اسلامی معاشرے میں الحب في الله، یعنی اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کی روح پھونک دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُولُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: أَيْنَ الْمُتَحَابُّونَ بِجَلَالِي؟ اَلْيَوْمَ أُظِلُّهُمْ فِي ظِلِّي، يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلِّي»

''بلاشبہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''میرے جلال کی خاطر محبت کرنے والے کہاں ہیں؟ آج میں انھیں اپنے سائے میں جگہ دیتا ہوں۔ آج کے دن میرے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں۔''[5]

ابومسلم خولانی روایت کرتے ہیں کہ میں نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے کہا: اللہ کی قسم! میں آپ سے محبت کرتا

---

[1] البقرة 2:137. [2] الحشر 59:8. [3] التوبة 9:119. [4] محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 3/129. [5] صحيح مسلم: 2566، مسند أحمد: 2/237 و 535، الموطأ للإمام مالك: 2/952.

ہوں اور اس سے مجھے کوئی دنیاوی غرض نہیں کہ اسے حاصل کرنے کی خاطر میں آپ سے محبت کروں، نہ مجھے آپ سے کسی رشتہ داری کی بنا پر یہ محبت ہے۔ انھوں نے پوچھا: پھر کس بنا پر آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟ میں نے جواب دیا: اللہ کی خاطر۔ انھوں نے مجھے میرے کمر بند سے کھینچا، پھر کہا: اگر تمھارا دعوائے محبت سچا ہے تو تمھیں مبارک ہو، میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنا تھا، آپ فرماتے تھے:

«اَلْمُتَحَابُّونَ فِي اللّٰهِ فِي ظِلِّ الْعَرْشِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ يَغْبِطُهُمْ بِمَكَانِهِمُ النَّبِيُّونَ وَالشُّهَدَاءُ»

''اللہ کی خاطر محبت کرنے والے عرش کے سائے میں ہوں گے جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ ان کے اس مرتبے پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے۔''

ابومسلم کہتے ہیں: پھر میں وہاں سے نکلا اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ انھیں معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث سنائی۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا، وہ اپنے رب تبارک وتعالیٰ سے بیان کرتے ہیں:

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی قبر

«حُقَّتْ مَحَبَّتِي عَلَى الْمُتَحَابِّينَ فِيَّ، وَحُقَّتْ مَحَبَّتِي عَلَى الْمُتَنَاصِحِينَ فِيَّ، وَحُقَّتْ مَحَبَّتِي عَلَى الْمُتَزَاوِرِينَ فِيَّ، وَحُقَّتْ مَحَبَّتِي عَلَى الْمُتَبَاذِلِينَ فِيَّ، وَهُمْ عَلَى مَنَابِرَ مِنْ نُورٍ، يَغْبِطُهُمُ النَّبِيُّونَ وَالصِّدِّيقُونَ بِمَكَانِهِمْ»

''محض میرے لیے آپس میں محبت کرنے والوں پر میری محبت لازم کر دی گئی۔ میرے بارے میں ایک دوسرے سے ہمدردی کرنے والوں پر میری محبت حق ہوگئی۔ میری رضا جوئی کے لیے ایک دوسرے کی زیارت کرنے والوں پر میری محبت ثابت کر دی گئی۔ میری خاطر ایک دوسرے پر خرچ کرنے والوں پر میری محبت لازم قرار پائی۔ یہ لوگ نور کے منبروں پر ہوں گے اور ان کے عالی مرتبہ ہونے کی وجہ سے انبیاء اور صدیقین بھی ان پر رشک کریں گے۔''[1]

انصار کے ایثار کی چند مثالیں

نبی ﷺ کے متعدد فرامین لوگوں کو محبت، باہمی تعاون اور ایک دوسرے کا احترام کرنے کا درس دیتے ہیں تاکہ کوئی مالدار فقیر پر، حاکم محکوم پر اور طاقتور کمزور پر برتری نہ جتا سکے۔

مدینہ منورہ کے نئے قائم شدہ مثالی معاشرے میں اللہ کی خاطر محبت کا بڑا اچھا اور نمایاں اثر ظاہر ہوا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس کھجوروں کے درخت سب انصار سے زیادہ تھے۔ بیرحاء نامی باغ جو مسجد نبوی کے بالمقابل تھا، انھیں بہت پسند تھا۔ نبی ﷺ وہاں تشریف لے جاتے تھے اور اس کا خوش گوار پانی نوش فرماتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝﴾

''تم ہرگز بھلائی نہ پاسکو گے جب تک ان چیزوں میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنھیں تم پسند کرتے ہو اور تم جو بھی چیز خرچ کرو گے تو بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔''[2]

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پاسکتے جب تک تم اپنی پیاری سے پیاری چیز خرچ نہ کرو۔'' مجھے بیرُحاء

[1] صحيح ابن حبان: 338/2، حديث: 577، مسند أحمد: 239/5، جامع الترمذي: 2390. [2] آل عمرٰن3: 92.

باغ سب سے زیادہ پسند ہے، میں اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ میں اس کے ثواب اور اللہ کے ہاں اس کے ذخیرہ ہونے کی امید رکھتا ہوں۔ اب آپ ﷺ اسے جہاں چاہیں صرف کریں۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

«بَخٍ! ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ، ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ، وَ قَدْ سَمِعْتُ مَا قُلْتَ، وَ إِنِّي أَرٰى أَنْ تَجْعَلَهَا فِي الْأَقْرَبِينَ»

''خوب! یہ تو بڑی آمدنی والا مال ہے۔ یہ تو بہت ہی نفع بخش مال ہے۔ میں نے تمھاری بات سن لی ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم اسے اپنے ضرورت مند قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کر دو۔''

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اسی طرح کروں گا۔ انھوں نے وہ باغ اپنے چچا زاد بھائیوں اور دیگر اقارب میں تقسیم کر دیا۔[1]

عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ الحب في اللّٰه اور باہمی تعاون کی ایک عمدہ مثال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''جب ہم مدینہ پہنچے تو نبی ﷺ نے میرے اور سعد بن ربیع کے درمیان بھائی چارہ قائم کر دیا۔ سعد نے کہا: ''میں انصار کا سب سے مالدار آدمی ہوں۔ میں آپ کے لیے اپنا آدھا مال پیش کرتا ہوں اور میری دو بیویاں ہیں۔ آپ انھیں دیکھ لیں۔ ان میں سے جو آپ کو پسند ہو میں اسے طلاق دے دوں گا۔ جب وہ عدت گزار لے تو آپ اس سے نکاح کر لیں۔'' میں نے کہا: ''مجھے ان چیزوں کی مطلق ضرورت نہیں۔ مجھے تو آپ کسی ایسے بازار کا رستہ بتائیں جہاں کاروبار ہوتا ہو۔'' سعد رضی اللہ عنہ نے انھیں قینقاع کے بازار کا پتہ بتا دیا۔ صبح ہوئی تو عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ وہاں پہنچ گئے۔ شام کو منافع میں کچھ پنیر اور گھی لے آئے۔ وہ روزانہ اسی طرح (خرید وفروخت) کرتے رہے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ان کے لباس پر زردی کے نشانات دیکھے تو دریافت فرمایا: «تَزَوَّجْتَ؟» ''کیا تم نے شادی کر لی ہے؟'' عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے کہا: ''جی ہاں!'' آپ ﷺ نے پوچھا: «وَمَنْ؟» ''کس سے؟'' عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''ایک انصاری خاتون سے۔'' آپ ﷺ نے حق مہر کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ایک نواۃ (پانچ درہم یا 14.875 گرام) کے برابر سونا دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ» ''ولیمہ کرو، چاہے ایک بکری ہی سے ہو۔''[2]

اس روایت میں ایک طرف سعد رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھرپور تعاون کا اظہار ہوا تو دوسری طرف عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی طرف سے زبردست خود اعتمادی، خودداری اور عزتِ نفس کا مظاہرہ کیا گیا۔ یہ صرف عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ہی

[1] صحيح البخاري: 1461، صحيح مسلم: 998، السيرة النبوية الصحيحة للعمري: 254/1. [2] صحيح البخاري: 2048 و 3780، صحيح مسلم: 1427.

کی سوچ نہیں تھی بلکہ اکثر مہاجرین اپنے انصاری بھائیوں کے گھر رہے، لیکن وہ محنت مزدوری کرنے لگے حتی کہ اپنی محنت کی آمدنی سے گھر خرید لیے اور خود کفیل ہو گئے۔ ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم وغیرہ ایسے ہی مہاجرین میں سے تھے۔

خیر خواہی

بھائی چارے کے اس عظیم رشتے نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا خیر خواہ بنا دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے سلمان فارسی اور ابودرداء رضی اللہ عنہما کے مابین مواخات قائم کی۔ ایک دن سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ابودرداء رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لائے۔ ام درداء رضی اللہ عنہا کو پراگندہ حالت میں دیکھا تو وجہ دریافت کی۔ ام درداء رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ آپ کے بھائی کسی قسم کی کوئی دنیاوی حاجت نہیں رکھتے۔ اسی دوران میں ابودرداء رضی اللہ عنہ بھی آ گئے۔ کھانا تیار ہوا تو ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں تو روزے سے ہوں، اس لیے کھانا نہیں کھاؤں گا۔'' سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا جب تک آپ بھی میرے ساتھ نہ کھائیں گے۔'' ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کھانا کھا لیا۔ رات ہوئی تو ابودرداء رضی اللہ عنہ عبادت کے ارادے سے بیدار ہوئے۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ابھی سو جاؤ۔'' وہ سو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ قیام کے ارادے سے بیدار ہوئے۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دوبارہ سو جانے کو کہا۔ رات کا آخری پہر ہوا تو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اب اٹھ جاؤ۔'' اور دونوں نے اکٹھے تہجد کی نماز پڑھی۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے نصیحت کی: ''ابودرداء! تمھارے رب کا تم پر حق ہے۔ اسی طرح تمھاری جان اور تمھارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرو۔'' رسول اللہ ﷺ کے پاس جب یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «صَدَقَ سَلْمَانُ» ''سلمان نے سچ کہا۔''[1]

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی کی خیر خواہی کی اور ان کی عملاً اصلاح اور دینی رہنمائی فرمائی اور بتایا کہ ہر صاحبِ حق کا حق ادا کرنا بھی عبادت ہے۔ گھر والوں کے حقوق ادا کرنا، رات کو آرام کی نیند سونا اور دن کو متواتر نفلی روزوں کے بجائے کھانا پینا یہ سب امور عباداتِ الٰہی میں داخل ہیں۔

انصار کی مہاجرین کو پیشکش

انصار نے نہ صرف مہاجرین کی صدق دل سے غمخواری کی تھی بلکہ دنیا کی ہر بھلائی میں انھیں فوقیت دی تھی۔ ان کے سچے ایمان اور خالص محبت کی یہ بڑی مستند نشانی تھی۔ اس سلسلے میں انصار کی طرف سے کیے جانے والے ایثار بھرے اقدامات کا مہاجرین کے دلوں پر گہرا اثر ہوا۔

---

[1] صحيح البخاري: 1968 و 6139، جامع الترمذي: 2413.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ انصار نے نبی ﷺ سے گزارش کی کہ ہمارے کھجوروں کے باغات ہیں، آپ انھیں ہمارے اور مہاجرین بھائیوں کے درمیان تقسیم فرما دیجیے۔ آپ ﷺ نے انکار کر دیا تو انھوں نے مہاجرین سے کہا: ''آپ ہمارے باغات میں کام کریں۔ ہم پیداوار میں شریک رہیں گے۔'' یہ بات سب نے تسلیم کی۔ [1]

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ انصار نے نبی ﷺ سے اپنے کھجوروں کے باغات اپنے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم کرنے کی درخواست کی تھی۔ آپ ﷺ نے یہ باغ تقسیم کرنے کے بجائے کوئی ایسا طریقہ تلاش کیا جس میں انصار کو نقصان نہ ہو اور ان کے اموال سے ان کی ملکیت بھی زائل نہ ہو۔ اسی دوران جب انصار نے کام اور پیداوار میں شراکت کی بات کی تو آپ ﷺ نے اس تجویز کو پسند فرمایا کیونکہ اس میں مہاجرین کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا سامان بھی تھا اور انصار کی ملکیت بھی برقرار تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین کو انصار کے ساتھ باغات کو پانی دینے اور فصل کی نگہبانی کے کام میں لگا دیا اور انصار نے انھیں باغات کی پیداوار میں شریک کر لیا، چنانچہ سب نے یہ بات برضا و رغبت تسلیم کر لی۔ [2]

مہاجرین انصار کا ہاتھ بٹانے لگے، تاہم مہاجرین کے امدادی کام کے باوجود زیادہ تر کام انصار خود اپنے ہاتھوں ہی انجام دیتے تھے۔ مہاجرین نے انصار کی کرم فرمائی اور ایثار کا شکریہ ادا کیا اور نبی ﷺ سے کہا: ''ہم نے انصار جیسے لوگ آج تک نہیں دیکھے۔ وہ کام تو تھوڑا لیتے ہیں اور معاوضہ زیادہ دیتے ہیں۔ ہم باغبانی میں ان کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، وہ ہمیں پیداوار سے وافر حصہ دیتے ہیں۔ اب تو ہمیں یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ سارا ثواب وہی حاصل کر لیں گے۔'' نبی ﷺ نے فرمایا:

«لَا، مَا أَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِمْ وَ دَعَوْتُمُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَهُمْ»

''نہیں، جب تک تم ان کا ذکر خیر کرتے رہو گے اور اللہ تعالیٰ سے ان کے حق میں دعا کرتے رہو گے (تم بھی برابر کے شریک ثواب رہو گے)۔'' [3]

اخروی اجر و ثواب کی طرف مہاجرین کا یہ اشارہ اخروی زندگی پہ ان کے ناقابلِ شکست یقین کا پتہ دیتا ہے۔ یہی یقینِ کامل تھا جس نے ان کی ساری زندگی پر غلبہ پا لیا تھا۔ [4]

[1] صحيح البخاري: 2325. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 30/4. [3] جامع الترمذي: 2487، مسند أحمد: 201,200/3، واللفظ له، المصنف لابن أبي شيبة: 68/9. [4] التاريخ الإسلامي للحميدي: 406/4.

نبی مکرم سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ نے انصار کی اس عزت افزائی اور مروت و بھلائی کا بدلہ دینے کا ارادہ فرمایا۔ اس حوالے سے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے انصار کو بلایا تاکہ بحرین کا علاقہ انھیں مرحمت فرما دیں۔ مگر انصار نے اسے لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا: ''پہلے ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی ایسا ہی علاقہ عنایت فرمائیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے انھیں صبر کرنے کی نصیحت فرمائی اور حوض کوثر پر ملنے کی بشارت دی۔ فرمان نبوی ہے:

«إِمَّا لَا، فَاصْبِرُوا حَتَّى تَلْقَوْنِي، فَإِنَّهُ سَيُصِيبُكُمْ بَعْدِي أَثَرَةٌ»

''اگر تم انکار ہی کرتے ہو تو میرے بعد بھی صبر کرنا یہاں تک کہ مجھے حوض کوثر پر ملو کیونکہ میرے بعد دوسروں کو تم پر ترجیح دی جائے گی۔'' [1]

فتح خیبر کے بعد مہاجرین کی حالت بہتر ہوئی تو انھوں نے انصار کے عطیے واپس کر دیے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کو ایک نخلستان استعمال کے لیے دیا۔ آپ نے وہ نخلستان اسامہ کی والدہ

[1] صحيح البخاري :3794.

خیبر کا ایک قلعہ

ام ایمن رضی اللہ عنہا کو عطا کر دیا تھا۔ فتح خیبر کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بھی وہ نخلستان واپس کر دیا اور ام ایمن کو ایک اور باغ کے کچھ درخت مرحمت فرمائے۔

بھائی چارے نے مہاجرین کی اجنبیت ختم کر دی، مہاجرین اپنے گھر کے افراد اور خاندان سے دور تھے۔ انصار نے ان کے لیے ہمدردی اور تسکین و تسلی کا سامان فراہم کر دیا۔ اس اخوت بھری فضا میں باہمی تعلقات کی مضبوطی اور ایک نئی ریاست کے قیام جیسے مقاصد عالیہ حاصل ہوئے۔ بلاشبہ کوئی بھی ریاست یا قبیلہ بھائی چارے اور باہمی محبت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، نہ اس میں مساوات اور باہمی تعاون کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔[1]

اپنے ہاتھ سے کمانے کا باوقار اصول

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اسلامی تعلیمات سے یہ سبق سیکھا کہ اپنے ہاتھوں سے کمایا ہوا رزق عین عبادت ہے۔ مہاجرین و انصار کے مابین رشتۂ اخوت کی وجہ سے ایسی انسانی اور معاشرتی اقدار وجود میں آئیں جو اس سے پہلے پورے قبائلی معاشرے میں ناپید تھیں۔ یہ اقدار اسی جدید اور قابلِ رشک اسلامی معاشرے کا حصہ بنیں۔ ان میں سرفہرست معاملہ خود اپنے ہاتھ سے کسب رزق کے وسائل مہیا کرنا تھا۔ مہاجرین نے ابتدا میں انصار بھائیوں کی مہمان نوازی بڑی خوشی سے قبول کی، لیکن وہ انتہائی خوددار اور غیرت مند بھی تھے۔ وہ مستقل طور پر انصار کے کندھوں پر بوجھ بننے کے بجائے خود حصولِ رزق کے مواقع کی تلاش میں نکلے۔ ان میں بعض تجارت سے اور بعض کھیتی باڑی کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھے کہ وہ دوسروں پر بوجھ بننے اور کسی سے کچھ لینے کے بجائے خود محنت کر رہے ہیں۔ نبی ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی»

''اوپر والا (دینے والا) ہاتھ نیچے والے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔''[2]

مہاجرین مکہ نے اس ارشاد عالی کو حرز جان بنا لیا تھا اور وہ دل کی گہرائیوں سے یہ یقین رکھتے تھے کہ یقیناً دینے والا ہاتھ اللہ کے نزدیک لینے والے ہاتھ سے زیادہ پسندیدہ اور بہتر ہے۔

قبائلی عصبیت کا خاتمہ

جاہلی معاشرے میں تعصب ہی کو بنیادی حیثیت حاصل تھی اور علاقائی اور قبائلی رقابت کی جڑیں بڑی گہری

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 3526/6. [2] صحیح البخاري: 1427، صحیح مسلم: 1033.

تھیں۔ اس عصبیت اور رقابت کو ختم کرنا آسان کام نہ تھا۔ بھائی چارے کا عمل اسی تعصب و رقابت کے خاتمے کا انتہائی مؤثر طریقہ تھا۔

آج کل مسلمانوں کی صفوں میں موجود بعض نادان داعی حضرات کے دلوں میں علاقائی تعصب نے جگہ بنا رکھی ہے۔ یہ ایک ایسا مہلک مرض ہے جس کے سبب نہ صرف اسلام کے پاکیزہ دامن پر دھبہ لگا ہے بلکہ امتِ اسلامیہ کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی ہے۔ یوں امت اپنے اصل مقاصد کو بھول کر طرح طرح کے علاقائی، نسلی، لسانی اور فرقہ وارانہ تعصبات کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ شہر شہر اور بستی بستی پھیلی ہوئی اسلامی تحریکیں طرح طرح کے تعصب کا پرچار کرتی نظر آتی ہیں۔[1]

مؤرخین نے اسلامی معاشرے کی وحدت اور اس جہاد کا خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے جو ہمیشہ جاری رہے گا اور مسلسل بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ دشمنانِ اسلام نے مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پھیلانے کے لیے بہت سی تدابیر اختیار کیں۔ لیکن ان کی یہ مذموم کاوشیں اس لیے ناکامی سے دوچار ہوئیں کہ مدمقابل ایمانی قوت کا حامل ایسا معاشرہ تھا جس کے اجزائے ترکیبی اس قدر مضبوط اور آپس میں مربوط تھے کہ نہ تو انھیں جدا کیا جا سکتا تھا اور نہ ان کے باہمی تعلقات میں کوئی رخنہ ڈالا جا سکتا تھا۔[2]

وحدتِ امت کی بنیاد

اسلامی معاشرے کی مضبوطی کے اسباب میں افرادِ امت کی ربانی منہج پر تربیت کرنا، نیک سیرت لوگوں کی قیادت، فرقہ بندی سے اجتناب اور وحدت امت جیسے گرانقدر اصولوں پر عمل کی کرشمہ گری شامل تھی۔[3]

امت مسلمہ کی ترقی کا باعث عقیدۂ توحید پر یقین، اسلام کے ساتھ سچا اور بہت گہرا تعلق، تلاشِ حق کی جستجو اور جذبۂ اخوت کا فروغ تھا۔ اسی مضبوط بھائی چارے کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ کی صفوں میں اتحاد، ہم آہنگی اور یکجہتی جیسی خوبیاں اُجاگر ہوئیں۔

اخوت ومحبت کا یہ عدیم المثال عمل اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت تھی جو اس نے اپنے مخلص، پرہیز گار اور قابل قدر بندوں پر کی تھی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَاَلَّفَ

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 286/2. [2] محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 152/3. [3] فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي، ص: 253.

بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۚ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○﴾

''اور اگر وہ (کفار) آپ کو دھوکا دینا چاہیں تو بے شک آپ کے لیے اللہ کافی ہے، وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ساتھ آپ کو قوت بخشی اور اس نے ان (مومنوں) کے دلوں میں الفت ڈال دی، اگر آپ دنیا بھر کے سب خزانے خرچ کر دیتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہیں کر سکتے تھے لیکن اللہ ہی نے ان میں الفت ڈالی۔ بے شک وہ سب پر غالب (اور) کمال حکمت والا ہے۔'' [1]

اخوت ایک ایسی ایمانی قوت کا نام ہے جو مسلمان میں جذبۂ صادق، باہمی عزت و محبت کا احساس اور ایسا غیر متزلزل اعتماد پیدا کرتی ہے جس کی بنیاد خالص اسلامی منہج پر ہوتی ہے۔ یہی وہ سرچشمہ ہے جس سے تعاون، ایثار، شفقت، درگزر، ہمدردی، امدادِ باہمی اور مہذب جذبے جنم لیتے ہیں۔ گویا ایمان اور اخوت ایک ہی حقیقتِ عظمیٰ کے دو لازم و ملزوم جلوے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○﴾

''مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں، لہٰذا تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' [2]

ایمان کی مٹھاس بھی جذبۂ اخوت سے سرشار مسلمان ہی محسوس کر سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ: أَنْ يَكُونَ اللّٰهُ وَ رَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَ أَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ، وَ أَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ»

''تین وصف جس آدمی میں پائے جائیں، وہ ایمان کی حلاوت محسوس کر لے گا: اللہ اور اس کا رسول اسے سب سے زیادہ محبوب ہو جائیں، وہ کسی انسان سے صرف اللہ کی رضا کے لیے محبت رکھے اور کفر کی طرف لوٹنا اس قدر برا جانے جس قدر وہ آگ میں ڈالے جانے کو برا جانتا ہے۔'' [3]

وراثت کا حکم منسوخ ہو گیا

انصار نے مہاجرین کا جس فراخدلی، محبت اور مخلصانہ جذبات سے استقبال کیا، انھیں قیام گاہ فراہم کی، ان کے لیے زندگی کی جملہ ضروریات مہیا کیں اور ان کی زندگی کو آسان بنایا، تاریخ انسانی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ

[1] الأنفال 8:62، 63. [2] الحجرٰت 49:10. [3] صحيح البخاري: 16، صحيح مسلم: 43.

بھائی چارہ عملی طور پر ان کی زندگی کا جوہر بن گیا تھا۔ یہ مواخات کوئی اسمی، رسمی یا علامتی چیز نہیں تھی بلکہ یہ تو ایک جیتی جاگتی ناقابلِ فراموش حقیقت اور انصار و مہاجرین کے مابین فروغ پذیر عملی تعلقات کا نام تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے میثاقِ اخوت کو سب کے لیے ایک اہم ذمہ داری قرار دیا تھا جس کے نہایت مثبت اور انقلاب انگیز نتائج برآمد ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے قرابت داروں سے صرف نظر کرتے ہوئے سلسلۂ وراثت کو بھی اسی مواخات کی بنیاد پر قائم فرما دیا تاکہ اسلام کے اساسی تصورات میں یہ عمل ایک مسلمہ حقیقت بن کر اُجاگر ہو۔ مطلب یہ کہ مواخات محض برائے نام رشتہ نہیں بلکہ یہ ایک ایسا مضبوط اور ناقابلِ شکست بندھن تھا جس کے اثرات و فوائد معاشرے میں اوپر سے لے کر نچلی سطح تک صاف دکھائی دیتے تھے اور بہت نمایاں طور پر محسوس کیے جاتے تھے۔ یہ فضا آگے چل کر معاشرتی نظامِ انصاف کی بنیاد بن گئی۔

مواخات کی اساس پر قائم ہونے والا نظامِ وراثت ایک مُدت کے بعد منسوخ کر دیا گیا۔ اس کی حکمت یہ تھی کہ حکم ناسخ کی بنیاد بھی اسلامی اخوت پر تھی۔ ہجرت کے فوراً بعد ابتدائی مرحلے میں انصار و مہاجرین کے درمیان اخوت کے تعلقات قائم کرنے اور مہاجرین سے ہمدردی کی یقیناً اشد ضرورت تھی۔ مہاجرین اپنے گھر بار اور اہل و عیال مکہ میں چھوڑ کر مدینہ میں انصاری بھائیوں کے ہاں آئے تھے۔ ایسے حالات میں ایک خاص ذمہ داری کا احساس اجاگر کرنے کی دعوت ناگزیر تھی ۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اخوت کے مضبوط رشتے کی بنیاد رکھی۔ وقت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ آپس کے دینی تعلقات اور مواخات کا بندھن تمام رشتہ داریوں سے زیادہ مضبوط ہو، چنانچہ وراثت کا نظام اسی مواخات کی بنیاد پر قائم کر دیا گیا۔ جب مہاجرین کی زندگی معمول پر آکر پوری طرح بحال ہوگئی، ایک مضبوط اسلامی ریاست معرض وجود میں آ گئی، مہاجرین مدینہ کی فضا کے عادی ہو گئے، اجنبیت ختم ہوگئی، سلسلۂ روزگار چل نکلا اور بدر کے غنائم کے سبب کچھ خوشحالی میسر آ گئی تو وراثت کا نظام بشری تقاضوں کے مطابق اُن عام قوانین پر لوٹ آیا جن کی اساس صلہ رحمی پر تھی۔ اب بھائی چارے کی اساس پر قائم نظامِ وراثت ختم کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ۭ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾

''اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور تمھارے ساتھ (مل کر) جہاد کیا تو وہ بھی تمھی میں سے ہیں اور اللہ کی کتاب میں (خون کے) رشتے دار آپس میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ بے شک

اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''[1]

یہ آیت کریمہ اخوت کی بنیاد پر قائم نظامِ وراثت کے لیے ناسخ ثابت ہوئی لیکن باہمی تعاون بھلائی اور خیر خواہی کا جذبہ بدستور موجزن رہا۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۚ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا﴾

''ماں باپ اور قریبی رشتہ دار جو مال چھوڑ جائیں، اس میں ہم نے ہر ایک کے لیے وارث بنائے ہیں اور جن سے تمھارا عہد بندھ چکا ہو، انھیں ان کا حصہ دو، بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔''[2]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''﴿مَوَالِيَ﴾ سے مراد ورثاء ہیں۔ مہاجرین جب مدینہ تشریف لائے تو مواخات کے تحت مہاجر انصاری کا وارث بنتا تھا اور اصلی رشتہ دار کو کچھ نہیں ملتا تھا، پھر اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ﴾ نازل ہوا تو وراثت کا یہ نظام ختم کر دیا گیا۔'' انھوں نے مزید کہا: ''اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ﴾ سے مراد ایک دوسرے کی مدد، ہمدردی اور خیر خواہی ہے، لہٰذا اب وراثت ختم ہو چکی ہے، البتہ ان کے حق میں وصیت کی جا سکتی ہے۔''[3]

[1] الأنفال 8:75. [2] النسآء 4:33. [3] صحیح البخاري: 2292، 4580 و 6747، سنن أبي داود: 2922، السنن الکبرٰی للنسائي: 11037.

انصار کی عظمت و فضیلت

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا ہے: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ﴾ ''اے ایمان والو! تم اللہ کے مددگار بن جاؤ۔'' پھر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی مثال بیان فرمائی ہے کہ انھوں نے اپنے حواریوں سے یہ سوال کیا: ﴿مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ﴾ ''اللہ کی راہ میں میرا مددگار کون ہے؟''[1]

اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو اللہ کی مدد کرنے کا حکم دیا ہے کہ وہ ہر حالت میں تن من دھن سے اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اہل مکہ کے ظلم وستم اور دشنام طرازیوں سے تنگ آکر حج کے موسم میں یہ پکار لگائی:

«مَنْ يُؤْوِينِي، مَنْ يَنْصُرُنِي حَتَّى أُبَلِّغَ رِسَالَةَ رَبِّي وَلَهُ الْجَنَّةُ؟»

''کوئی ہے جو مجھے پناہ دے اور میری مدد کرے تاکہ میں اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچا دوں اور اس کے لیے جنت ہو؟''[2]

یہ پیغام سن کر اہل یثرب اوس وخزرج نے پیغمبر اسلام اور اہل اسلام کو پناہ دی اور رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر نبوت کے بارھویں سال بیعت کی۔ اس بیعت میں کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ارشاد فرمائیں اور اپنی ذات اور رب تعالیٰ کے سلسلے میں جو چاہیں، ہم سے عہد لے لیں۔

نبی ﷺ نے فرمایا:

«أُبَايِعُكُمْ عَلٰى أَنْ تَمْنَعُونِي مِمَّا تَمْنَعُونَ مِنْهُ نِسَاءَكُمْ وَأَبْنَاءَكُمْ»

''میں تم سے بیعت لیتا ہوں کہ تم جس چیز سے اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہو، اسی سے تم میری حفاظت بھی کرو گے۔''

اس کے بعد سیدنا براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کا ہاتھ تھام لیا اور عرض کی: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو

[1] الصف 14:61. [2] مسند أحمد 322/3.

سچا نبی بنا کر بھیجا! ہم آپ کی اُسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح خود اپنی عزت کی حفاظت کرتے ہیں۔ اے اللہ کے رسول! آپ ہم سے بیعت لے لیجیے۔ اللہ کی قسم! ہم نے جنگوں کا دودھ پیا ہے اور ہم اسلحے کی کاٹ کے ماہر ہیں۔ نسل در نسل سے ہمارا یہی شیوۂ شجاعت چلا آرہا ہے۔ [1]

اللہ تبارک و تعالیٰ کو ان کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ جب انھوں نے اس بیعت کے تمام مطلوبہ تقاضے احسن طور پر بہ تمام و کمال پورے کر دکھائے تو انھیں انصار کا لقب عطا فرمایا۔ غیلان بن جریر فرماتے ہیں: میں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

أَرَأَيْتَ اسْمَ الْأَنْصَارِ كُنْتُمْ تُسَمَّوْنَ بِهِ أَمْ سَمَّاكُمُ اللّٰهُ؟ قَالَ: بَلْ سَمَّانَا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ.

''انصار'' کا لقب آپ لوگوں نے خود اختیار کیا تھا یا اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا؟ انھوں نے جواب دیا: ہمیں یہ لقب اللہ تعالیٰ ہی نے عطا فرمایا ہے۔'' [2]

عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کو عیسیٰ علیہ السلام نے شام و یونان کی طرف بھیجا کہ وہ وہاں تبلیغ و دعوت کا فرض انجام دیں لیکن انھیں چنداں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اسی وجہ سے ان کی قوم گمراہ ہوگئی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے انصار کی مدح قرآن مجید میں اس طرح فرمائی:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ ﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے (مہاجرین کو) جگہ دی اور (ان کی) مدد کی، وہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے۔'' [3]

انصار نے بیعت کا حق ادا کر دیا اور اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ بھرپور تعاون کر کے ان کے گزشتہ تمام دُکھوں اور زخموں پر محبت و الفت کا ایسا مرہم رکھا کہ مہاجرین کو یہ خدشہ پیدا ہوگیا کہ کہیں سارے کا سارا اجر و ثواب انصار ہی نہ لے جائیں اور ہم محروم رہ جائیں، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کا ذکر جمیل ان کی اسی خوبی کے ساتھ بیان فرمایا ہے:

﴿ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾

''اور وہ اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو۔'' [4]

[1] السيرة لابن هشام :442/2. [2] صحيح البخاري :3776. [3] الأنفال8:74. [4] الحشر 9:59.

مسلمان جب ہجرت کر کے مدینہ پہنچ رہے تھے، انصار نے انھیں خلوص کے ساتھ ٹھکانا دیا۔ نبی ﷺ جب مدینہ تشریف لے گئے تو انصار کے بچے آپ ﷺ کے استقبال کے لیے ترانے الاپ رہے تھے۔ قبیلوں کے جوان اسلحے سمیت آ آ کر بیعت کر رہے تھے۔ انصار کی مروت کا اندازہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی پیشکش سے لگایا جاسکتا ہے۔ سیدہ ام سُلیم انصاریہ رضی اللہ عنہا اپنے بیٹے انس کو خدمت نبوی کے لیے پیش کر دیتی ہیں۔

غزوات و سرایا میں انصار کی شجاعت و بسالت کی مثالیں سب کے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ احد کے مقام پر نبی ﷺ پر فدا ہوتے ہیں۔ وہ تیروں اور تلواروں کے وار اپنے ہاتھ پر روکتے ہیں اور

جبل احد جس کے دامن میں غزوۂ احد برپا ہوا

دشمن پر تیروں کی بارش کرتے ہیں۔ نبی ﷺ نے ان کی شجاعت کی خوب داد دی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے سعد بن حارث کے بعد ایسا فدائی نہیں دیکھا جس کے لیے نبی ﷺ نے اپنے ماں باپ کو اکٹھا کیا ہو، آپ نے فرمایا: «اِرْمِ، فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي» ''تیر چلاؤ، تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں!''

انصار کی شجاعت کا اندازہ ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کی شمشیر زنی سے بھی ہوتا ہے۔ نبی ﷺ نے دریافت کیا: میری تلوار کا حق کون ادا کرے گا؟ ابو دجانہ انصاری رضی اللہ عنہ کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں۔ انصار کی جانفشانی کا حال سعد بن معاذ کی بیعت سے بھی معلوم ہوتا ہے جن کی وفات پر عرشِ الٰہی بھی حرکت میں آ گیا تھا۔ ابوحنظلہ انصاری کا جذبۂ اطاعت و جہاد دیکھیں کہ زفاف کی رات جہاد کا حکم ہوا تو سیدھے میدان جہاد میں جا پہنچے اور خوب داد شجاعت دی۔ ان کی شہادت پر ملائکہ نے غسل دیا۔

بقیع میں سیدنا معاذ بن جبل اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما

دین کے بارے میں انصار کی جستجو اور لگن کا اندازہ معاذ بن جبل کے ذوقِ علمی سے بھی ہوتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

«وَأَعْلَمُهُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ»

’’ان میں سے حلال و حرام کے متعلق زیادہ علم رکھنے والے معاذ بن جبل ہیں۔‘‘ [1]

یہ وہی معاذ ہیں جن کی شبیہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملتی تھی۔

سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی قبر جو جنگ موتہ میں شہید ہوئے

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کا شوقِ شہادت ملاحظہ کریں، کہاں 3 ہزار مسلمان! کہاں 2 لاکھ رومی! عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بڑے دبدبے سے معرکے میں داخل ہوتے ہیں، دور تک کافروں کو تہ تیغ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک ہاتھ کٹتا ہے تو دوسرے ہاتھ میں علم اُٹھا لیتے ہیں۔ وہ بھی کٹ جاتا ہے تو علم کو گود میں لے کر کافروں کا قلع قمع کرتے جاتے ہیں، وہ اسلام کا پرچم سرنگوں نہیں ہونے دیتے حتی کہ جامِ شہادت نوش کر لیتے ہیں۔

ذہانت و فطانت ملاحظہ کرنی ہو تو جامع القرآن زید بن ثابت کو دیکھیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

«إِنَّهُ يَأْتِينِي كُتُبٌ مِّنْ أُنَاسٍ، وَلَا أُحِبُّ أَنْ يَقْرَأَهَا كُلُّ أَحَدٍ، فَهَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تَتَعَلَّمَ كِتَابَ السُّرْيَانِيَّةِ»

’’میرے پاس بہت سے لوگوں کے خطوط آتے ہیں۔ مجھے پسند نہیں کہ انھیں ہر شخص پڑھے۔ کیا تم سریانی زبان لکھنی پڑھنی سیکھ سکتے ہو؟‘‘

زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس حکم کے بعد میں نے 17 دنوں میں پوری سریانی زبان سیکھ لی۔ [2]

سریانی تحریر کا ایک نمونہ

تعلق باللہ ملاحظہ کرنا ہو تو یہ حدیث سنیں:

«كَمْ مِّنْ أَشْعَثَ أَغْبَرَ ذِي طِمْرَيْنِ لَا يُؤْبَهُ لَهُ، لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ، مِنْهُمْ الْبَرَاءُ بْنُ مَالِكٍ»

’’کتنے ہی پراگندہ حالت، غبار آلود، مفلس و نادار اور ناقابل توجہ افراد ایسے عالی رتبہ ہیں کہ اگر وہ

[1] مسند أحمد: 281/3. [2] المعجم الكبير للطبراني: 156,155/5.

اللہ پر قسم ڈال دیں تو یقیناً اللہ اسے پورا کر دے گا۔ براء بن مالک بھی انھی میں سے ہیں۔'' [1]

سب سے بڑھ کر انصار میں مہاجرین سے محبت کا جذبہ ملاحظہ کریں، جب نبی ﷺ وفات پا گئے تو خلافت کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اس موقع پر اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے انصار سے کہا: ''تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ مہاجرین میں سے تھے۔ ان کا خلیفہ بھی مہاجرین ہی میں سے ہونا چاہیے۔ ہم پہلے رسول اللہ ﷺ کے انصار و مددگار تھے اور اب ہم پر لازم ہے کہ ہم ان کے خلیفہ کے بھی انصار ہوں۔'' [2]

اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کی تلاوت سننے کے لیے آسمان سے فرشتے نازل ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے انصار کو خوشخبری دی ہے کہ وہ ان سے راضی ہے اور اس بات پر ان کی ستائش کی ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾

''اور مہاجرین اور انصار میں سے (قبول اسلام میں) سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنھوں نے احسان کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔'' [3]

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے انصار کو کامیابی اور فلاح کا سرٹیفکیٹ عطا فرمایا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾

''اور (ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے

[1] جامع الترمذي: 3854. [2] رجال حول الرسول، ص: 327. [3] التوبة 9:100.

والے ہیں۔“ [1]

انصار کی شان

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَوْ أَنَّ الْأَنْصَارَ سَلَكُوا وَادِيًا أَوْ شِعْبًا لَسَلَكْتُ فِي وَادِي الْأَنْصَارِ، وَ لَوْلَا الْهِجْرَةُ لَكُنْتُ امْرَءًا مِّنَ الْأَنْصَارِ»

”انصار جس وادی یا گھاٹی میں چلیں گے، میں بھی انھی کی وادی میں چلوں گا۔ اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔“ [2]

یہ ایک مکمل حدیث کا کچھ حصہ ہے۔ خطابی کہتے ہیں: اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ انصار کے دلوں کو مطمئن کیا جائے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرمان کے ذریعے ان کی شان بیان کی ہے۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر معاملے میں معاونت کا عہد پورا کیا اور کامل وفاداری کا ثبوت پیش کر دکھایا۔ [3]

انصار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (انصار کے) بچوں اور عورتوں کو آتے دیکھا (میرا خیال ہے کہ یہ لوگ کسی شادی کی تقریب سے آ رہے تھے) تو آپ ان کی عزت افزائی کے لیے کھڑے ہو گئے اور تین بار فرمایا: «اَللّٰهُمَّ! أَنْتُمْ مِّنْ أَحَبِّ النَّاسِ إِلَيَّ» ”اللہ گواہ ہے! تم مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو۔“ [4]

انصار سے محبت ایمان کی نشانی ہے

براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

«اَلْأَنْصَارُ لَا يُحِبُّهُمْ إِلَّا مُؤْمِنٌ، وَ لَا يُبْغِضُهُمْ إِلَّا مُنَافِقٌ، فَمَنْ أَحَبَّهُمْ أَحَبَّهُ اللّٰهُ، وَ مَنْ أَبْغَضَهُمْ أَبْغَضَهُ اللّٰهُ»

”انصار سے صرف مومن ہی محبت رکھے گا اور ان سے صرف منافق ہی بغض رکھے گا، لہٰذا جو ان سے محبت کرے گا، اللہ اس سے محبت کرے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا، اللہ بھی اس سے بغض رکھے گا۔“ [5]

[1] الحشر 9:59. [2] صحیح البخاري: 3779 و 7244، مسند أحمد: 410/2، والسنن الکبریٰ للنسائي: 8261. [3] فتح الباري: 142/7. [4] صحیح البخاري: 3785، صحیح مسلم: 2508. [5] صحیح البخاري: 3783، صحیح مسلم: 75.

انصار کی عفت و پاکدامنی کی گواہی

عفت یا پاکدامنی اچھے خاندان سے تعلق رکھنے پر دلالت کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انصار کی پاکدامنی کی گواہی دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی گواہی سے بڑھ کر کسی کی عظمت و جلالت کا ثبوت اور کیا ہوگا، چنانچہ عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَا يَضُرُّ امْرَأَةً نَزَلَتْ بَيْنَ بَيْتَيْنِ مِنَ الْأَنْصَارِ، أَوْ نَزَلَتْ بَيْنَ أَبَوَيْهَا»

''جو اکیلی عورت انصار کے دو گھروں کے درمیان رہتی ہو یا اپنے والدین کے گھر ہو، اسے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔''[1]

انصار کے بارے میں نبی ﷺ کی وصیت

انصار نے اللہ تعالیٰ کے دین کی نشر و اشاعت کی خاطر بڑی جدو جہد کی۔ دین کے دفاع میں انھوں نے عظیم کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس راہ میں انھوں نے زمانے کی سرد و گرم ہواؤں کی مطلق پروا نہ کی اور دین کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کیا۔ انصار کی اس بے مثال تگ و دو کا تذکرہ قرآن کے ان سنہرے حروف میں قیامت تک جگمگاتا رہے گا:

﴿لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''یقیناً اللہ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار پر مہربانی فرمائی جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں آپ کی پیروی کی، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل بہک جانے کو تھے، پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی۔ بے شک وہ ان پر بہت شفقت کرنے والا (اور) نہایت رحم فرمانے والا ہے۔''[2]

یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے انصار کے متعلق یہ وصیت کی تھی کہ ان میں سے نیکی کرنے والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے اور خطا کاروں کو معاف کر دیا جائے۔ آپ ﷺ نے تاکید کی تھی کہ ان سے معاملہ کرتے ہوئے ڈرانے دھمکانے کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«الْأَنْصَارُ كَرِشِي وَ عَيْبَتِي، وَالنَّاسُ سَيَكْثُرُونَ وَ يَقِلُّونَ، فَاقْبَلُوا مِنْ مُحْسِنِهِمْ وَ تَجَاوَزُوا

[1] مسند أحمد: 257/6، المستدرك للحاكم: 83/4، صحيح ابن حبان: 257/16. [2] التوبة 117:9.

عَنْ مُّسِيئِهِمْ»

''انصار میرے مخلص ساتھی اور ہم راز ہیں۔ لوگ عنقریب کثرت سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوں گے اور انصار کی تعداد کم ہوتی جائے گی۔ تم ان کے نیکوکاروں کی نیکی تسلیم کرو اور خطا کاروں سے صرفِ نظر کرو۔'' [1]

حافظ ابن حجر ؒ اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں: ''انصار کی تعداد کم ہو جائے گی۔ دراصل یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قبائلِ عرب و عجم یکے بعد دیگرے اسلام قبول کریں گے اور ظاہر ہے ان کی تعداد انصار کی تعداد سے کئی گنا زیادہ ہے۔ افزائشِ نسل کا جو سلسلہ انصار میں جاری ہے، وہ قبائلِ عرب و عجم میں بھی جاری رہے گا، یوں انصار کی تعداد دوسروں کی نسبت ہمیشہ کم ہی رہے گی۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعے سے بتا دیا گیا ہو کہ انصار کی تعداد گھٹ جائے گی، چنانچہ آپ ﷺ کی پیش گوئی پوری ہوئی۔ آج اکنافِ عالم میں سیدنا علی بن ابی طالب ؓ کی ثابت شدہ اولاد کی تعداد انصار کے دونوں قبائل اوس و خزرج کی ثابت شدہ نسل سے کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ بات میں نے ان کثیر افراد سے قطع نظر کرتے ہوئے کہی ہے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ انصار کی اولاد ہیں جبکہ ان کے پاس اس امر کی کوئی دلیل نہیں۔'' [2]

سیدنا انس ؓ ہی بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی ﷺ گھر سے نکلے۔ راستے میں انصار سے ملاقات ہوئی تو فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! إِنِّي لَأُحِبُّكُمْ، إِنَّ الْأَنْصَارَ قَدْ قَضَوْا مَا عَلَيْهِمْ، وَ بَقِيَ الَّذِي لَهُمْ، فَأَحْسِنُوا إِلٰى مُحْسِنِهِمْ وَ تَجَاوَزُوا عَنْ مُّسِيئِهِمْ»

''قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! یقیناً میں تم لوگوں سے محبت کرتا ہوں۔ بلاشبہ انصار نے اپنی ذمہ داری خوب نبھائی ہے۔ اب ان کا حق باقی رہ گیا ہے۔ لوگو! تم ان کے نیکوکاروں سے اچھا سلوک کرنا اور ان کے خطا کاروں سے درگزر کرنا۔'' [3]

سیدنا ابوقتادہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر انصار کے لیے یہ ارشاد فرماتے سنا:

«......فَمَنْ وَّلِيَ أَمْرَ الْأَنْصَارِ فَلْيُحْسِنْ إِلٰى مُحْسِنِهِمْ وَلْيَتَجَاوَزْ عَنْ مُّسِيئِهِمْ، وَ مَنْ أَفْزَعَهُمْ

[1] صحيح البخاري: 3801، صحيح مسلم: 2510. [2] فتح الباري: 155/7. [3] مسند أحمد: 187/3، السنن الكبرٰى للنسائي: 8328، صحيح ابن حبان: 256/16 و261، حديث: 7266 و7271، مسند أبي يعلى: 409/6.

فَقَدْ أَفْزَعَ الَّذِي بَيْنَ هٰذَيْنِ ۔ وَ أَشَارَ إِلٰى نَفْسِهٖ ۔ »

''جو انصار کے معاملات کا والی بنے وہ ان کے نیکوکار سے اچھا برتاؤ کرے اور ان کے خطا کار سے درگزر کرے اور جو انھیں ڈرائے دھمکائے تو وہ جان لے کہ اس نے اسے دھمکایا جو ان دونوں کے مابین ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے آپ نے خود اپنی طرف اشارہ فرمایا۔''[1]

[1] مسند أحمد: 307/5، المستدرك للحاكم: 79/4، الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 151.

اصحاب صفہ

رشتۂ مؤاخات میں بندھ جانے والے اصحاب النبی اپنے اپنے حقوق کی پاسبانی اور ایک دوسرے کے فرائض کی تکمیل میں بڑھ چڑھ کر جاں نثاری دکھا رہے تھے۔ کچھ ایسے نفوس عالیہ بھی تھے جنھیں دنیا کی اغراض اور نفسانی خواہشات اپنے دینی فرائض کی ادائیگی میں حائل نظر آتی تھیں، چنانچہ وہ ہمہ وقت تعلیم و تعلم میں لگے رہتے تھے۔ وہ صرف نبی ﷺ کی محبت سے سرشار اور اسلامی تعلیمات کے گرویدہ تھے۔ انھیں اسلامی تعلیمات کے مقابلے میں مال و جاہ سے کوئی غرض نہ تھی۔ ان کے روز و شب کی ضروریات بس قوت لَا یَمُوت پر منحصر تھیں۔ وہ مال و دولت

صفہ کا چبوترہ (مسجد نبوی)

کے حریص تھے نہ اس کے چھوٹ جانے پر انھیں ملال تھا۔ نہ وہ اپنی ضروریات کے لیے اغنیاء کی طرف دیکھتے تھے۔ ان کی زندگی کی خوشیاں اپنے خالق سے راز و نیاز پر موقوف تھیں۔ ان کی محبت کے تمام رنگ اپنے معبود کی عبادت سے آراستہ تھے۔ ان کی التجاؤں کی تمام ادائیں اپنے اللہ سے لگاؤ میں جلوہ نُما تھیں۔ یہ حقیقی اہل اللہ تھے۔ انھیں بس یہی غم رہتا تھا کہ ہم اپنے رب کی عبادت میں کسی کوتاہی کے مرتکب نہ ہوں اور دین سیکھنے میں کاہلی کا شکار نہ ہونے پائیں۔

صفہ اور اہل صفہ

عربی میں صفہ سائبان یا چھتی ہوئی جگہ کو کہتے ہیں۔ ہجرت نبوی کے بعد وہ اصحاب جو مؤاخات کے رشتے میں نہیں بندھے یا جن کے جاننے والے مدینہ میں نہیں تھے، وہ صفہ میں قیام کرتے تھے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صفہ مسجد نبوی کی پچھلی جانب چھتی ہوئی سایہ دار جگہ ہے۔ جن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا گھر بار نہ ہوتا، یہ جگہ اُنھی کے ٹھہرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ [1]

سب سے پہلے مہاجرین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے صفہ میں رہائش اختیار کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مختلف اطراف و اکناف سے وفود آتے تھے۔ ان میں جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتے اور پھر آپ ہی کی رفاقت وصحبت میں رہنے کے مشتاق ہوتے، وہ بھی اسی صفہ میں قیام کرتے تھے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت تک مستقل طور پر صفہ ہی میں رہائش پذیر رہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ صفہ میں مستقل اور عارضی طور پر رہائش اختیار کرنے والے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان رابطے کا فرض بھی انجام دیتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی اصحاب صفہ میں سے کسی کو بلانا چاہتے تو آپ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے اسے بلاتے کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ان تمام حضرات سے خوب واقف تھے بلکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اصحاب صفہ میں سے کون کون عبادات اور جہاد میں کس درجے پر ہے۔ مہاجرین اور بیرون شہر سے آنے والے حضرات کے علاوہ انصار میں سے بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جنھوں نے صفہ ہی میں رہنا پسند کیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی پسند اور اپنے اختیار سے زاہدانہ زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، باوجودیکہ ان کی مالی حالت مستحکم تھی اور مدینہ میں ان کے گھر بار بھی موجود تھے، مثلاً: کعب بن مالک، حنظلہ بن ابی عامر اور حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہم وغیرہ۔

اصحاب صفہ کے نام اور ان کی تعداد

اہل صفہ کی تعداد مختلف اوقات میں کبھی کم کبھی زیادہ ہوتی رہی۔ جس زمانے میں مدینے کے باہر سے وفود آتے تھے تو ان کی تعداد بڑھ جاتی تھی اور جب یہ وفود واپس چلے جاتے تو تعداد گھٹ جایا کرتی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ یہ تعداد بہت زیادہ بڑھ جاتی تھی یہاں تک کہ اکیلے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بعض اوقات اَسّی اَسّی لوگوں کی ضیافت کرتے تھے جبکہ باقی اہل صفہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مہمان ہوتے تھے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے: اہل صفہ کی تعداد چھ سو سے سات سو تک ہے لیکن یہ ایک ہی وقت میں اکٹھے

[1] فتح الباري: 727/6.

نہیں رہتے تھے۔ ان میں سے جو شادی کر لیتا، کسی سفر پر نکل جاتا یا کسی غزوے میں چلا جاتا تھا، وہ اہل صفہ کے زمرے سے خارج ہو جاتا تھا۔ ایک ہی وقت میں ان کی تعداد عموماً ستر کے قریب ہوتی تھی۔ صاحب عشرہ مبشرہ سیدنا سعد بن ابی وقاص، سیدنا ابوہریرہ، خبیب اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم بھی اہل صفہ کے ساتھ قیام فرما رہے۔[1]

حلیۃ الاولیاء میں ابونعیم رحمہ اللہ نے ان اصحاب کو اہل صفہ میں شمار کیا ہے:

1. اوس بن اوس (حذیفہ) ثقفی
2. اسماء بن حارثہ اسلمی
3. الاغر مزنی
4. براء بن مالک انصاری
5. ثابت بن ضحاک انصاری
6. ثابت بن ودیعہ انصاری
7. ثقیف بن عمرو بن شمیط اسدی
8. جرہد بن خویلد اسلمی
9. جعیل بن سراقہ الضمری
10. جاریہ بن حمیل بن شبہ
11. حذیفہ بن اسید غفاری
12. خبیب بن زید بن عاصم انصاری
13. حارثہ بن نعمان انصاری
14. حازم بن حرملہ اسلمی
15. حنظلہ بن ابی عامر الراہب انصاری
16. حجاج بن عمرو اسلمی
17. الحکم بن عمیر الثمالی
18. حرملہ بن ایاس
19. خباب بن ارت
20. خنیس بن حذافہ سہمی
21. خالد بن زید ابوایوب انصاری
22. خریم بن فاتک اسدی
23. خریم بن اوس الطائی
24. خبیب بن یساف بن عتبہ
25. دکین بن سعید المزنی
26. عبداللہ ذوالبجادین
27. رفاعہ ابولبابہ انصاری
28. ابورزین
29. زید بن خطاب
30. سفینہ ابوعبدالرحمن مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
31. سعد بن مالک ابوسعید خدری
32. سالم مولی ابوحذیفہ
33. سالم بن عبید الاشجعی
34. سالم بن عمیر
35. سائب بن خلاد
36. شقران مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] مجموع الفتاویٰ: 11/81۔

37 شداد بن اسید
38 صہیب بن سنان
39 صفوان بن بیضاء
40 طخفہ بن قیس الغفاری
41 طلحہ بن عمرو بصری
42 الطفاوی الدوسی
43 عبداللہ بن مسعود
44 ابو ہریرہ عبدالرحمٰن بن صخر الدوسی
45 عبداللہ بن عبدالاسد مخزومی
46 عبداللہ بن حوالہ ازدی
47 عبداللہ ابن ام مکتوم
48 عبداللہ بن عمرو بن حرام انصاری
49 عبداللہ بن انیس
50 عبداللہ بن زید جہنی
51 عبداللہ بن حارث بن جزء الزبیدی
52 عبداللہ بن عمر بن الخطاب
53 عبدالرحمٰن بن قرط
54 عبدالرحمٰن بن جبر بن عمرو
55 عتبہ بن غزوان
56 عقبہ بن عامر جہنی
57 عباد خالد غفاری
58 عمرو بن عوف مزنی
59 عمرو بن تغلب
60 عویم بن ساعدہ انصاری
61 عبید مولیٰ رسول اللہ ﷺ
62 عکاشہ بن محصن اسدی
63 عرباض بن ساریہ
64 عبداللہ بن حبشی خثعمی
65 عتبہ بن عبدالسلمی
66 عتبہ بن الندر سلمی
67 عمرو بن عبسہ سلمی
68 عبادہ بن قرص
69 عیاض بن حمار مجاشعی
70 فضالہ بن عبید انصاری
71 فرات بن حیان عجلی
72 ابوفراس اسلمی
73 قرۃ بن ایاس مزنی
74 ابومرثد کناز بن حصین غنوی
75 کعب بن عمرو انصاری
76 ابوکبشہ مولیٰ رسول اللہ ﷺ
77 مسطح بن اثاثہ ابوعباد
78 مسعود بن الربیع القاری
79 معاذ ابوحلیمہ قاری
80 واثلہ بن معبد جہنی
81 وابصہ بن معبد جہنی
82 ہلال مولیٰ مغیرہ بن شعبہ

83 یسار ابوفکیہہ مولیٰ صفوان بن امیہ

84 بشیر بن الخصاصیہ ضباری

85 ابومویہبہ مولیٰ رسول اللہ ﷺ

86 ابوعسیب مولیٰ رسول اللہ ﷺ

87 ابوریحانہ شمعون ازدی

88 ابوثعلبہ خشنی

89 ربیعہ بن کعب اسلمی

90 ابوبرزہ اسلمی

91 معاویہ بن الحکم السلمی

92 بلال بن رباح [1]

ابونعیم ؒ واحد مصنف ہیں جنھوں نے اصحاب صفہ میں سے مشہور ناموں کی طویل فہرست فراہم کی ہے۔ انھوں نے زیادہ تر اسماء ابن الاعرابی اور ابوعبدالرحمٰن السلمی (م 412ھ) سے نقل کیے ہیں۔ ابونعیم نے بعض ایسے حضرات کے اسماء بھی اس فہرست میں شامل کیے ہیں جو باقاعدہ اصحاب صفہ میں شامل نہیں تھے۔ اسی وجہ سے چند ایسے حضرات کے نام بھی اس فہرست میں ہیں جو اہل مدینہ تھے لیکن انھوں نے اپنی پسند اور اختیار سے زاہدانہ زندگی اختیار کی۔ چونکہ اہل صفہ کا تعلق کسی خاص قبیلے سے نہیں تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ انھیں الاوفاض کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کے معنی ہیں: ملے جلے لوگ۔ اہل صفہ کو اس نام سے موسوم کیے جانے کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ان میں سے ہر شخص اپنے پاس چمڑے کا ایک تھیلا رکھتا تھا جسے وفضہ کہا جاتا تھا۔ یہ تھیلا کھانا رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، لیکن پہلی توجیہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ [2]

اہل صفہ کا لباس

اصحاب صفہ کے پاس اتنا لباس بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ جسم کو گرمی اور سردی سے صحیح طور پر بچا سکیں اور اپنا تن بدن پوری طرح ڈھانپ سکیں۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل صفہ میں سے ستر آدمی ایسے تھے جن کے پاس ایک بھی چادر نہیں تھی۔ [3]

ایک دوسری روایت میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے اہل صفہ کے ستر آدمیوں کو دیکھا کہ ان کے پاس ایک ایک کپڑا ہوتا تھا۔ وہ کپڑا بھی کسی کے گھٹنے ڈھانپ رہا ہوتا اور کسی کا کپڑا اس سے کچھ نیچے ہوتا تھا۔ ان میں سے جب کوئی رکوع کرتا تو وہ کپڑے کو مضبوطی سے پکڑ لیتا تھا تاکہ اس کی ستر پوشی قائم رہے۔ [4]

سیدنا عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ ہمارے پاس صفہ میں تشریف لاتے اور ہم حوتکیہ پہنے ہوتے تھے۔ حوتکیہ سر پر باندھنے والے ایک قسم کے کپڑے کو کہتے تھے۔ [5]

[1] حلية الأولياء: 1/425-471، 2/3-41. [2] مسند أحمد: 6/390، 391. [3] حلية الأولياء: 1/416. [4] حلية الأولياء: 1/416. [5] مسند أحمد: 4/128.

تغذیہ بخش کھجور

بعض اوقات ان کا لباس اتنا ناکافی ہوتا تھا کہ وہ اس حالت میں باہر نکلنے سے شرم محسوس کرتے تھے۔ [1]

اصحاب صفہ کی خوراک

اصحاب صفہ کو کھانے پینے کی چیزوں میں بڑی قلت کا سامنا تھا۔ وہ اپنے روز و شب فقر و فاقہ میں بسر کرتے تھے۔ ان کی خوراک عموماً کھجوروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ دو دو افراد کو ہر روز کھجوروں کی متعین مقدار مرحمت فرماتے تھے۔ نبی ﷺ کے ایک صحابی بیان فرماتے ہیں: میں مدینہ آیا۔ یہاں میرا کوئی شناسا نہیں تھا۔ میں صفہ میں قیام پذیر ہوگیا۔ ایک آدمی کے ساتھ میری جوڑی بن گئی۔ ہم دونوں کو روزانہ ایک مُدّ (525 گرام) کھجوریں ملا کرتی تھیں۔ ایک دن نبی ﷺ نے نماز پڑھائی۔ جب آپ نماز کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے تو اصحاب صفہ میں سے ایک آدمی کہنے لگا: کھجوروں نے ہمارے بطن جلا دیے ہیں اور خُنُفْ (معمولی سوت سے تیار کی جانے والی بھدی یمنی چادریں) پھٹ گئی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے ہوگئے اور فرمانے لگے: ''اللہ کی قسم! اگر مجھے روٹی اور گوشت میسر ہوتا تو میں تمھیں کھلاتا۔'' اسی روایت میں ہے، صحابی کہتے ہیں: میں اور میرے ساتھی نے اٹھارہ دن ایسے گزارے کہ درختوں کے پتوں کے سوا ہمارے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ پھر انصار نے ہم سے غمگساری کی اور ہمیں کھلایا پلایا۔ [2]

ثرید: عربوں کی مرغوب خوراک

بسا اوقات رسول اللہ ﷺ گھر میں کھانے کی قلت کے باوجود اصحاب صفہ کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دیتے تھے۔ آپ اکثر ان کی ضیافت دودھ سے کیا کرتے تھے اور کبھی کبھار جَشِیشَہ (گوشت یا کھجور

جو کی فصل

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور للعمري: 265/1. [2] مسند أحمد: 487/3.

سے ملا کر پکائی گئی روٹی) کھلاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے انھیں حیسہ پیش کیا۔ یہ کھانا کھجور، آٹے اور مکھن کو ملا کر بنایا جاتا تھا۔ ایک موقع پر ثرید بھی عطا فرمایا۔[1]

ایک دفعہ آپ ﷺ نے پکے ہوئے جو سے بھری ہوئی رکابی اصحاب صفہ کے سامنے رکھی اور فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! جو کھانا تم دیکھ رہے ہو، فقط یہی کھانا ہے جو آج رات محمد (ﷺ) کے گھر میں موجود ہے۔''[2]

بعض حالات میں اصحاب صفہ کی ضیافت بڑی عمدہ ہوتی تھی۔ عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما اصحاب صفہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ وہ محتاج تھے، نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ كَانَ عِنْدَهُ طَعَامُ اثْنَيْنِ فَلْيَذْهَبْ بِثَالِثٍ وَ إِنْ أَرْبَعٌ فَخَامِسٌ أَوْ سَادِسٌ»

''جس کسی کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو، وہ تیسرا آدمی ساتھ لیتا جائے اور اگر کسی کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہو تو وہ پانچواں آدمی لے جائے، اسی طرح چھٹا۔''[3]

اسی طرح بعض دفعہ اصحابِ صفہ کی دودھ سے ضیافت کی گئی۔ اس سلسلے میں ایک بڑا مشہور واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھوک کے مارے زمین پر پیٹ کے بل لیٹ جاتا تھا۔ کبھی میں بھوک کے مارے اپنے پیٹ پر پتھر باندھا کرتا تھا۔ ایک دن میں اس راستے پر بیٹھ گیا جہاں سے صحابہ گزرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گزرے، میں نے ان سے کتاب اللہ کی ایک آیت کے بارے میں پوچھا، میرے پوچھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ مجھے کچھ کھلا دیں مگر وہ (اس آیت کا ظاہری مطلب سمجھا کر) چلے گئے اور کوئی بات نہیں کی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ میرے پاس سے گزرے، میں نے ان سے بھی قرآن مجید کی ایک آیت پوچھی۔ پوچھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ مجھے کچھ کھلا پلا دیں مگر وہ بھی چلے گئے اور کوئی بات نہیں کی۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ میرے پاس سے گزرے، آپ مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ آپ ﷺ نے میرے چہرے سے میری مراد سمجھ لی۔ فرمانے لگے: ''اے ابوہر!'' میں نے کہا: لبیک اے اللہ کے رسول! فرمایا: ''میرے ساتھ چلو۔'' آپ چلنے لگے۔ میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے چل پڑا، پھر آپ ﷺ اپنے کاشانۂ مبارک میں داخل ہوگئے۔ میں نے داخلے کی اجازت چاہی تو مجھے اجازت مل گئی۔ جب آپ داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے گھر دودھ کا ایک پیالہ پایا۔ آپ نے اپنے محترم اہلِ خانہ سے پوچھا: ''یہ دودھ کا پیالہ کہاں سے آیا

[1] السيرة النبوية الصحيحة للعمري :265/1. [2] الطبقات لابن سعد :256/1. [3] صحيح البخاري :602.

ہے؟'' آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ فلاں شخص نے آپ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''اے ابوہر!'' میں نے کہا: میں حاضر ہوں اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: ''جاؤ اور تمام اہل صفہ کو بلا لاؤ۔'' ابوہریرہ فرماتے ہیں: اہل صفہ اسلام کے مہمان تھے، ان کی کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ نہ ان کے اہل خانہ تھے، نہ ان کے پاس مال تھا، نہ کوئی ان کا مددگار تھا۔ جب بھی آپ ﷺ کے پاس کوئی صدقہ آتا تو آپ اصحاب صفہ کو اس میں ضرور شریک کرتے تھے۔

ابوہریرہ کہنے لگے: اصحاب صفہ کو بلانا مجھے اچھا نہ لگا۔ میں نے سوچا آخر یہ دودھ ہے ہی کتنا کہ سارے صفہ والوں میں تقسیم ہو۔ اس کا حق دار تو میں ہی تھا کہ یہ دودھ پیتا اور اپنی قوت بحال کرتا۔ جب اصحاب صفہ آئیں گے تو آپ ﷺ مجھے حکم دیں گے اور میں یہ دودھ انھیں دے دوں گا، پھر تو مجھے اس دودھ میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ میں (یہ سوچتا سوچتا) اصحاب صفہ کے پاس پہنچا، انھیں بلایا، وہ آئے تو انھوں نے اجازت طلب کی۔ اجازت دی گئی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوہر!'' میں نے کہا: لبیک اے اللہ کے رسول! فرمایا: ''یہ پیالہ لے لو اور انھیں دے دو۔'' چنانچہ میں نے پیالہ لے لیا۔ ہر آدمی کو میں وہ پیالہ دیتا جاتا تھا، وہ اس سے پیتا، سیر ہوتا اور مجھے پیالہ لوٹا دیتا تھا۔ پھر دوسرے آدمی کو دیتا، وہ پیتا اور سیر ہوتا یہاں تک کہ ہوتے ہوتے میں رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس پہنچ گیا اور سب لوگ سیر ہو گئے۔ میں نے وہ پیالہ لیا اور آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ ﷺ نے مجھے دیکھا اور تبسم فرمانے لگے، پھر فرمایا: ''اے ابوہریرہ!'' میں نے کہا: لبیک! اے اللہ کے رسول! فرمایا: ''اب تم اور میں باقی رہ گئے ہیں۔'' میں نے کہا: جی ہاں! اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: ''بیٹھ جاؤ اور پیو۔'' میں بیٹھ گیا اور پینے لگا۔ اس دوران آپ ﷺ مجھ سے بار بار فرماتے رہے ''اور پیو۔ اور پیو!'' یہاں تک کہ میں نے کہا: اب نہیں، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا رسول بنا کر بھیجا ہے! میں اب مزید نہیں پی سکتا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے دے دو۔'' میں نے وہ پیالہ آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ ﷺ نے اللہ کی تعریف کی اور اس کا نام لے کر بقیہ دودھ پی لیا۔[1]

محمد بن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب شام ہوتی تو نبی ﷺ اہل صفہ کو اپنے صحابہ میں تقسیم کر دیتے۔ کوئی صحابی ایک کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہے، کوئی دو کو اور کوئی تین کو یہاں تک کہ ایک صحابی دس ساتھیوں کو ساتھ لے گیا۔

[1] صحيح البخاري: 6452.

معاویہ بن الحکم سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: ایک دن میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صفہ میں تھا۔ آپ ﷺ نے ایک ایک انصاری کے ساتھ اہل صفہ میں سے ایک ایک، دو دو اور تین تین آدمی کر دیے یہاں تک کہ ہم چار رہ گئے اور رسول اللہ ﷺ پانچویں تھے۔ آپ نے ہمیں اپنے ساتھ لے لیا اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: «یَا عَائِشَةُ! عَشِّینَا» ''اے عائشہ! ہمیں رات کا کھانا کھلاؤ۔'' [1]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: مجھ پر تین دن ایسے بھی گزرے کہ مجھے کھانا نصیب نہیں ہوا۔ میں نے صفہ کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو میں چلتے چلتے گر پڑتا تھا۔ بچوں نے کہنا شروع کر دیا: ابوہریرہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ جب میں صفہ پہنچا تو وہاں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپ ﷺ ثرید کا ایک بڑا پیالہ لائے تھے اور اہل صفہ اس میں سے کھا رہے تھے۔ میں ان کے ارد گرد گھومنے لگا تاکہ وہ مجھے دیکھ کر بلا لیں۔ وہ کھانا ختم کر کے کھڑے ہو گئے۔ پیالے کے کناروں میں ثرید کے کچھ حصے کے علاوہ پیالا بالکل صاف ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے جمع کیا تو وہ ایک لقمہ بن گیا۔ آپ ﷺ نے اسے اپنی انگلیوں پر رکھا اور مجھ سے فرمایا: ''بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ۔'' اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں اسے کھانے لگا، کھاتا رہا، کھاتا رہا یہاں تک کہ میں سیر ہو گیا۔ [2]

ہر چند ان حضرات کو ضروریات زندگی نہایت کم میسر تھیں، پھر بھی ان کے اندر لالچ پیدا نہیں ہوا بلکہ ان کے آپس کے برادرانہ تعلقات بہت مضبوط تھے۔ وہ ایک دوسرے کے حقوق و واجبات سے بخوبی واقف تھے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ جب اصحاب صفہ کھجوریں کھانے کے لیے ایک جگہ اکٹھے ہوتے تھے تو ان میں سے اگر کوئی صاحب دو کھجوریں اکٹھی کھا لیتا تو اپنے ساتھیوں سے کہہ دیتا کہ میں نے دو کھجوریں ایک ساتھ کھائی ہیں، تم لوگ بھی اسی طرح کھاؤ۔ وہ یہ بات اس لیے کہا کرتے تھے مبادا وہ خود اپنے ساتھیوں سے زیادہ کھا لیں۔ [3]

رسول اللہ ﷺ بذات خود اصحاب صفہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کے پاس روزانہ تشریف لے جاتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی تیمارداری کرتے۔ آپ ﷺ نے انھیں کبھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ آپ انھیں زیادہ اہمیت دیتے اور بہت خیال رکھتے۔ جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو وہ آپ ﷺ سے کہنے لگیں: اے اللہ کے رسول! کیا میں اپنے صاحبزادے کی طرف سے عقیقہ نہ کروں؟ آپ ﷺ نے مشورہ دیا: ''بچے کا سر مونڈھ کر بالوں کے برابر چاندی اہل صفہ اور مساکین پر صدقہ کر دو۔'' [4]

اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نے انھیں عقیقے کی رخصت دے دی تھی۔ امام بیہقی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

---

[1] فتح الباري :346/11. [2] فتح الباري :349/11. [3] حلية الأولياء :416/1. [4] مسند أحمد :391,390/6.

کا ارادہ تھا کہ آپ بذاتِ خود سیدنا حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے عقیقہ کریں، چنانچہ آپ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اس کے علاوہ صدقہ کرنے کا حکم دیا اور وہ ان دونوں کے بالوں کے وزن کے برابر چاندی کا صدقہ تھا۔[1] جیسا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«عَقَّ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ بِكَبْشَيْنِ كَبْشَيْنِ»

''رسول اللہ ﷺ نے سیدنا حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے دو دو مینڈھے عقیقے میں ذبح کیے۔''[2]

ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ جنگی قیدی لائے گئے۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو معلوم ہوا تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور درخواست کی کہ انھیں ایک باندی عنایت کر دیں جو گھر کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹا سکے کیونکہ امورِ خانہ داری کی مشقت نے انھیں تھکا دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی کی اس گزارش پر فرمایا:

«لَا أُعْطِيكُمْ وَأَدَعُ أَهْلَ الصُّفَّةِ تَلَوَّى بُطُونُهُمْ مِنَ الْجُوعِ»

''نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں تمھیں دے دوں اور اہل صفہ کو چھوڑ دوں کہ ان کے پیٹ بھوک کی شدت سے بل کھاتے رہیں۔''[3]

ستر انصاری ایسے تھے جنھیں قُرّاء کہا جاتا تھا، یعنی قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے۔ یہ اصحاب صفہ کا خیال رکھتے تھے۔ یہ لوگ راتوں کو قرآن کی تلاوت کرتے اور قرآن کی آیات پر غور وفکر کرتے تھے اور دن کے وقت مسجد میں پانی بھر کر لاتے، لکڑیاں کاٹ کر فروخت کرتے اور اس سے جو رقم حاصل ہوتی اس سے کھانا خرید کر اصحابِ صفہ اور دوسرے غریب مسلمانوں کو کھلاتے تھے۔[4]

سیدنا محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو یہ تجویز پیش کی کہ جب انصاریوں کی کھجوریں پک جائیں تو ہر باغ والا

[1] السنن الكبرٰى للبيهقي :304,303/9، إرواء الغليل :404/4. [2] سنن النسائي :4224. [3] مسند أحمد :79/1.
[4] مسند أحمد :270/3.

درختوں سے لگی پر بہار کھجوریں

کھجوروں کا ایک ایک خوشہ اہل صفہ اور دوسرے مسکینوں کو صدقہ کرے گا، چنانچہ اسی پر عمل شروع ہو گیا۔ [1]

اصحاب صفہ نے اپنے آپ کو حصول علم کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہ حضرات مسجد میں قیام پذیر تھے۔ مسجد میں ان کے شب و روز عبادت و ریاضت میں گزرتے تھے۔ انھوں نے قرآن کریم کی تلاوت اور رسول اللہ ﷺ کی سنت مطہرہ کو حرز جان بنا لیا تھا۔ چونکہ وہ عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے، اس لیے انھیں کسب معاش کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی، اس وجہ سے وہ نہایت مفلسی کی زاہدانہ زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا باعث عار سمجھتے تھے۔ تنہائی میں نوافل کی ادائیگی اور ذکر الٰہی میں مشغول رہا کرتے تھے۔ ان میں کچھ افراد نے پڑھنا لکھنا بھی سیکھ لیا تھا۔

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں اہل صفہ میں سے بعض لوگوں کو قرآن اور لکھنا پڑھنا سکھاتا تھا۔ [2] ان میں چند ایسے بھی تھے جو علم کے اوج کمال پر پہنچے۔ ان میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ ان کی آپ ﷺ سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ ہر لمحہ سائے کی طرح آپ کے ساتھ ساتھ رہتے۔ آپ ﷺ جو کچھ بیان فرماتے، اسے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتے۔ رسول اللہ ﷺ کی اکثر احادیث انھی سے مروی ہیں۔

اہل صفہ نے اپنے آپ کو محض علم و عمل ہی کے لیے وقف نہیں کیا بلکہ انھوں نے معاشرتی زندگی میں بھی گراں قدر حصہ لیا۔ جہاد ایسے اہم فریضے سے وہ کیسے پیچھے رہ سکتے تھے جن کا ایک ایک سانس اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول ﷺ میں بسر ہوتا تھا۔ صفوان بن بیضاء، زید بن خطاب، خریم بن فاتک اسدی، خبیب بن یساف، سالم بن عمیر اور حارثہ بن نعمان جو بدر میں شہادت سے سرفراز ہوئے، اہل صفہ میں سے تھے۔ غزوہ احد میں غسیل الملائکہ حنظلہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، اسی طرح حدیبیہ میں جرہد بن خویلد اور ابوسریحہ غفاری رضی اللہ عنہما، خیبر میں ثقیف بن عمرو رضی اللہ عنہ، تبوک میں عبداللہ ذوالبجادین رضی اللہ عنہ اور یمامہ میں سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہما نے شہادت کا رتبہ پایا۔ یہ سبھی اہل صفہ میں سے تھے۔ گویا ان کی راتیں نماز اور ذکر الٰہی میں اور دن میدانِ جہاد میں صرف ہوتے تھے۔ [3]

شہر نبوی کا ایک چوراہا

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 268/1. [2] سنن أبي داود: 3416. [3] السيرة النبوية الصحيحة للعمري: 264,263/1.

اصحاب صفہ فکر و عمل کے پیکرِ جمیل تھے۔ صبر و قناعت اور للّٰہیت ان کے رگ و ریشے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ سے ان کا خاص تعلق تھا۔ اسلام کا سب سے پہلا مدرسہ مکہ میں دارارقم اور مدینہ میں مسجد نبوی کے اندر صفہ تھا۔ یہیں سے علم کے انوار پوری دنیا میں پھیلے۔ قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی بڑی مدح فرمائی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝﴾

”(صدقات تو) ان ضرورت مندوں کے لیے ہیں جو اللہ کے کاموں میں ایسے مشغول ہوں کہ (اپنے روزگار کے لیے) زمین میں دوڑ دھوپ نہ کر سکتے ہوں، ناواقف شخص ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے انھیں مال دار خیال کرے، تم انھیں ان کے چہروں سے پہچان لو گے، وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے اور تم اپنے مال میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہو، بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔“ [1]

[1] البقرة 2:273.

اعلام، اماکن اور متفرق مضامین

(بہ اعتبار حروف تہجی)

اعلام

اسرائیل ولفنسن: ڈاکٹر اسرائیل ابوذویب ولفنسن نے 1899ء میں اشکنازی یہودی خاندان میں آنکھ کھولی۔ فلسطین میں تعلیم پائی۔ لغت عربی، علوم اسلامیہ اور یہودی علوم سیکھے، پھر جامعہ مصر میں داخلہ لے لیا۔ یہ پہلا یہودی طالب علم تھا جس نے جامعہ مصر سے ڈاکٹریٹ کی سند لی۔ اس کا استاذ ڈاکٹر طٰہٰ حسین تھا۔ اس کی تالیفات میں مشہور کتابیں تاریخ الیهود في بلاد العرب، تاریخ اللغات السامیة ہیں۔ اسرائیل ابوذویب کی وفات 1980ء میں ہوئی۔

امام برزنجی (1250-1317ھ): ان کا نام جعفر بن اسماعیل بن زین العابدین بن شریف حسینی مدنی ہے۔ مدینہ میں شوافع کے مفتی اور قاضی تھے۔ سلطان عبدالمجید عثمانی کے دور میں مسجد نبوی کی تعمیر نو کے وقت یہ حاضر تھے۔ "نزهة الناظرين في مسجد سيد الأولين والآخرين" انھی کی تالیف ہے۔ یہ کتاب 1277ھ میں مصر سے شائع ہوئی تھی۔ (الأعلام: 122/2)

خبیب بن اساف (یساف): خبیب بن اساف بن عِنَبَہ بن عمرو بن خدیج بن عامر بن جشم بن الحارث بن الخزرج الانصاری خزرجی۔ جس وقت مہاجرین ان کے ہاں رہائش پذیر ہوئے، اس وقت تک یہ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ جس وقت نبی اکرم ﷺ بدر کے لیے روانہ ہوئے تو راستے میں خبیب رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی۔ نبی ﷺ نے انھیں اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے معاً اسلام قبول کرلیا۔ (الاستيعاب، ص: 236، السيرة النبوية لأبي شهبة: 468/1)

عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ: عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ بن عبدالعزیٰ بن عثمان بن عبدالدار بن قصی بن کلاب بن مرہ قرشی یہ جس وقت سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو مدینہ چھوڑنے گئے، اس وقت مسلمان نہیں تھے۔ انھوں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حدیبیہ کے بعد ہجرت کی اور اسلام قبول کیا۔ پھر فتح مکہ کے موقع پر نبی اکرم ﷺ کے ساتھ شریک ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے کلید بیت اللہ لے کر پھر واپس انھیں اور ان کے چچیرے بھائی شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ کو مرحمت فرمائی۔ نبی ﷺ کی وفات کے بعد یہ مدینہ چھوڑ کر مکہ آگئے اور وہیں وفات پائی۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ (النسآء 58:4)۔ (الجمهرة لابن الكلبي، ص: 202، الطبقات لابن سعد: 252/4، أسد الغابة: 211/3)

مغلطائی (689-762ھ/1290-1361ء): علامہ علاء الدین مغلطائی بن قلیج بن عبداللہ مصری حنفی رحمہ اللہ علم و فضل والے گھرانے میں پروان چڑھے۔ اپنے زمانے کے کثیر علماء سے مختلف علوم و فنون سیکھے۔ حدیث، تاریخ، ادب اور علم الانساب پر مہارت رکھتے تھے۔ ابن سیدالناس کے بعد مدرسہ مظفریہ مصر میں مدرس رہے۔ ان کی سو سے زائد کتب ہیں، ان میں سے الزهر الباسم في سيرة أبي القاسم اور شرح سنن ابن ماجه لمغلطاي مشہور ہیں۔ (الأعلام: 275/7، شرح سنن ابن ماجه لمغلطاي: 7-5/1)

اماکن

ابطح: وادی میں پانی کے بہاؤ کی جگہ جہاں چھوٹے چھوٹے سنگریزے رہ جاتے ہیں۔ مکہ اور منیٰ کی درمیانی وادی کو ابطح کہا جاتا ہے۔ یہ منیٰ کے زیادہ قریب ہے۔ اسی وادی کو محصب اور خیف بنی کنانہ بھی کہا جاتا ہے۔ (معجم البلدان، مادۃ: الأبطح)

تناضب: یہ مکہ کے قریب ایک مقام ہے۔ دراصل یہ درخت کی ایک قسم ہے۔ (الروض الأنف: 298/2)

حرۂ بنی بیاضہ: یہ حرہ مدینہ منورہ کے شمال میں ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس میں ہزم النبیت بستی ہے جہاں بنوخزرج کی ایک شاخ بنو بیاضہ بن عامر بن زُریق آباد تھے۔ یہیں نقیع الخضمات نامی نشیبی میدان میں انصار نے سب سے پہلا جمعہ ادا کیا تھا۔ (عون المعبود: 400,399/3)

ذی طویٰ: زیریں مکہ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اس مقام کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو ہند میں اتارا گیا تو وہ پیدل مکہ کی طرف چل دیے۔ ذی طویٰ کے مقام پر فرشتے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کہنے لگے: اے آدم! ہم یہاں آپ کا دو ہزار سال سے انتظار کر رہے ہیں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب آدم علیہ السلام مکہ تشریف لائے تو انھوں نے اپنے نعلین ذی طویٰ مقام پر اتار دیے تھے۔ (الروض الأنف: 300/2)

زغابہ: یہ مدینہ کے قریب جرف کی طرف ایک چراگاہ تھی۔ اس کے نام کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابو عبید البکری نے زعابہ (عین کے ساتھ) ۔ ایک مرفوع روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ایک اعرابی کے متعلق فرمایا: ''اس نے مجھے ایک اونٹنی ہدیہ کی ہے جو میری ہی تھی۔ میں اسے اپنے گھر والوں کی طرح پہچانتا ہوں۔ وہ مجھ سے زغابات کے دن گم ہوگئی تھی۔ اس کے بدلے میں، میں نے اسے چھ جوان اونٹ دیے ہیں مگر وہ پھر بھی ناراض ہے۔......'' (مسند أحمد: 292/2، الجامع الصحیح، دیکھیے: معجم البلدان، مادۃ: زغابۃ)

سرف: یہ مکہ کی ندیوں میں متوسط طویل ندی ہے، نیز مکہ سے چھ میل کے فاصلے پر ایک مقام کا نام سرف ہے۔ (معجم البلدان: 212/3)

عبداللہ بن اُریقط لیثی: بنو دیل سے تھے۔ انھوں نے ہجرت مدینہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رہبری کے فرائض انجام دیے تھے۔

غابہ: ابوجابر اسدی کا قول ہے کہ لوگوں کی ایک جماعت کو بھی غابہ کہتے ہیں اور گھنی جھاڑیوں والے جنگل کو بھی جہاں سے لوگ ایندھن حاصل کرتے ہیں اور دیگر فائدے اٹھاتے ہیں۔ یہ مدینہ سے شام کی طرف ایک جگہ کا نام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا منبر اسی جنگل کی جھاؤ کی لکڑی سے بنایا گیا تھا۔ سلع پہاڑ اور ''غابہ'' کے درمیان آٹھ میل (تقریباً 13 کلومیٹر) کا فاصلہ تھا۔ (معجم البلدان، مادۃ: غابۃ)

إضاءۃ بنی غفار: یہ مکہ سے دس میل کے فاصلے پر تناضب کے قریب سرف کے بالائی جانب ایک مقام ہے۔ (معجم البلدان: 214/1، الروض الأنف: 299/2)

متفرقات

اوقیہ: ایک اوقیہ 122.472 گرام کا ہوتا ہے۔

دانق: یہ بھی وزن کی اکائی ہے۔ اس میں 510.3 ملی گرام ہوتے ہیں۔

رطل: ایک رطل کا وزن 393.660 گرام ہے۔

صاع: ایک صاع 2.100 کلوگرام کا ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک ایک صاع ڈھائی کلو کا ہوتا ہے۔

عرق: ایک پیمانہ ہے جس میں 15 صاع ہوتے ہیں۔ ایک صاع چار مُد کا ہوتا ہے۔ (إحكام الأحكام شرح عمدة الأحكام: 217/2، عون المعبود: 217/6)

فرق: یہ بھی ایک پیمانہ ہے۔ اس کا وزن 6.298 کلوگرام ہوتا ہے۔

قنطار: اس کی مقدار میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق ایک قنطار میں 70 ہزار دینار ہیں۔ ایک قول سات ہزار دینار کا بھی ہے۔ تیسرا قول 120 رطل کا ہے۔ چوتھا قول 1000 مثقال کا ہے۔ ایک قول 1200، اوقیہ کا بھی ہے۔ موجودہ دور میں مصر و شام کے علاقوں میں ایک قنطار 100 رطل کے مساوی ہے۔ (فتح الباري /31، معجم لغة الفقهاء، ص: 371)

قیراط: ایک قیراط 255.1 ملی گرام کا ہوتا ہے۔

محاقلہ: بالیوں میں کھڑی کھیتی کو اس جنس کے غلے کے عوض فروخت کرنا بیع المحاقلہ کہلاتی ہے، جیسے گندم کے کھیت کے بدلے گندم فروخت کرنا۔

مخابرہ: یہ مزارعت ہی کی ایک قسم ہے، وہ یہ کہ مزارع اور مالک زمین کے درمیان پیداوار کے نصف، ثلث یا ربع پر معاملہ طے ہو جائے، یعنی مزارع اپنی محنت کے بدلے میں کل پیداوار کا $\frac{1}{2}$ یا $\frac{1}{3}$ یا $\frac{1}{4}$ وصول کرے، باقی پیداوار مالک زمین کی ہوگی۔ یہ بیع مطلقاً حرام نہیں بلکہ اسی صورت میں حرام ہے جب مالک یا مزارع کھیتی کے کسی مخصوص حصے کی پیداوار اپنے لیے مختص کر لے۔ اگر تخصیص نہ ہو تو پھر جائز ہے۔

مزابنہ: درخت پر لگے ہوئے پھل کو اسی جنس کے اتارے ہوئے خشک پھل کے عوض فروخت کرنا بیع المزابنہ ہے، مثلاً: خشک کھجوروں کے عوض درخت پر لگی تازہ کھجوروں کی بیع یا خشک انگور (کشمش) کے بدلے بیلوں پر لگے ہوئے انگوروں کی بیع کرنا۔

معاومہ: کسی معین درخت کے پھل کی پے در پے کئی برسوں کے لیے ایک ہی قیمت پر بیع کرنا معاومہ کہلاتا ہے۔

منارہ رئیسیہ: قدیم مسجد نبوی کا جنوب مشرقی مینار، منارۂ رئیسیہ کہلاتا ہے۔

مُد: ایک مد 524.880 گرام کا ہوتا ہے۔

نواۃ: پھل کی گٹھلی کو کہتے ہیں، نیز یہ وزن کی اکائی بھی ہے۔ اس کا وزن 14.875 گرام بنتا ہے۔

وسق: یہ وزن کی اکائی ہے جس میں 125.971 کلوگرام ہوتے ہیں۔

رہبرِ انسانیت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے "اسوۂ حسنہ" ہیں۔ آپ ﷺ کی اتباع کیے بغیر دنیا و آخرت میں کوئی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات اور عظیم کارناموں پر سب سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کتبِ سیرت کے اس ہجوم نجوم میں دارالسلام کا زیرِ نظر سیرت انسائیکلوپیڈیا "اللؤلؤ المکنون" اپنی نوعیت کا نہایت منور، منفرد اور ممتاز علمی و تحقیقی ارمغانِ عقیدت ہے۔ ان شاء اللہ آپ کو اس کے مطالعے سے رسالت مآب ﷺ کی مقدس زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں علم و بصیرت کی بھرپور روشنی ملے گی۔

یہ سیرت انسائیکلوپیڈیا کی چوتھی جلد ہے۔ اس کا آغاز اُس منفرد واقعے سے ہوتا ہے جب رسالت مآب ﷺ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور وہاں سے آسمانوں کی سیر کے لیے لے جایا گیا جہاں آپ کو جنت اور دوزخ کے مناظر دکھائے گئے اور امتِ مسلمہ کے لیے پانچ نمازوں کا تحفہ عطا ہوا۔ اس کے بعد آپ بیعات عقبہ، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور رسول اللہ ﷺ کی ہجرت مدینہ کے ایمان افروز انقلابی واقعات پڑھیں گے۔ فضائل مدینہ سے آگاہ ہوں گے، پھر مسلمانوں کے دینی، دفاعی، سیاسی اور سماجی مرکز کی حیثیت سے مسجد نبوی کی تعمیر کے روح پرور مناظر جلوہ نما ہوں گے۔ بعد ازاں آپ کو اذان کے آغاز کا پس منظر معلوم ہوگا۔ پھر آپ انصارِ مدینہ اور مہاجرین کے مابین مواخات کی وہ منفرد سرگزشت پڑھیں گے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اِسی مواخات کی تفصیل، انصار کی رُوحِ ایثار اور مہاجرین کی خودداری و استغنا سے یہ حقیقت روشن ہوگی کہ انسان کی اصل عظمت اللہ رب العزت کے حضور عاجزی اور اللہ کے غیر سے بے نیازی ہے۔